كفىٰ بالمرء كذباً ان يحدث بكل ما سمع (حدیث رسولؐ)
آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات بیان کرے

مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت

حصہ دوم

قرآن، حدیث، تاریخ اور فن رجال کی روشنی میں

تالیف

علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی

شائع کردہ

الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ رجسٹرڈ

C-39 سکندر آباد کالونی لیاقت آباد کراچی فون: 0300-2717970

نام کتاب ——— مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت حصہ دوم
نام مؤلف ——— علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلویؒ
صفحات ——— ۴۴۸

قیمت کتاب ——— ۲۵۰/ روپے
مطبع ——— روحانی ڈائجسٹ پریس۔ ناظم آباد

ناشر

الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کراچی

رابطہ کیلئے: 39-C سکندر آباد کالونی لیاقت آباد کراچی
فون: 0300-2717970

سرخیاں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گذارش احوال واقعی (۲)

کتاب کے حصہ اوّل میں گذارش پیش خدمت کرنے کے بعد مزید عرض کرنے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آرہی اس لئے کتاب کے اس حصہ دوم میں کوئی خاص گذارش پیش نہیں کی جارہی۔ لہٰذا اگر سابقہ گذارش کو اس حصہ دوم سے بھی متعلق کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ البتہ اطلاع کے لئے یہ عرض کرنا مناسب نہ ہوگا کہ ہمارے معزز قارئین میں حصہ اوّل کی پذیرائی ہماری توقعات کے مطابق بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہوئی اور افادیت کے پیش نظر بے حد پسند کیا گیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ جس کسی نے بھی کتاب حاصل کی، اس نے صرف ایک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کو دوسروں کے لئے بھی کئی کئی کتابیں متعدد بار حاصل کرنی پڑیں۔ لوگوں کے تجسس کا یہ عالم ہے کہ کتاب پڑھنے کے بعد ہر شخص یہ دریافت کر رہا ہے کہ حصہ دوم کب تک شائع ہو جائے گا وغیرہ۔ مختصراً یہ کہ ہمارے کرم فرما حضرات نے ہماری تحقیق کو بہت پسند کیا ہے اور معلومات افزا قرار دیا ہے اور اس کو عام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، جس کے لئے وہ انشاء اللہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر پانے کے مستحق ہوں گے۔ ہم ایسے تمام حضرات کے ممنون ہیں جنہوں نے اپنے قول و عمل سے ہماری کاوشوں میں ساتھ دیا اور مصنف کتاب اور ادارہ کی ہمت افزائی کی۔

ادارہ اپنی سابقہ گذارش کے حوالے سے اپنے قارئین خصوصاً علماء و دانشوروں کو ایک بار پھر متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ اس تحقیقی کاوش کو عوام کے لئے فائدہ مند بنانے کے لئے حکومت پر زور ڈالنے کی ضرورت ہے کہ وہ ایسی شر انگیز داستانوں کی نشر و اشاعت کے تمام راستے بند کرے اور ہر سطح کی درسی کتابوں سے ان کا اخراج عمل میں لائے، تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں ان سے متاثر نہ ہونے پائیں، جیسے کہ گذشتہ نسلیں اب تک متاثر ہوتی چلی آرہی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے عوامی نمائندے قومی و صوبائی اسمبلیوں میں نہایت مفید کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو حق کا ساتھ دینے اور شر سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارا ناصر و مددگار ہو۔ آمین۔

وما علینا الا البلاغ۔   معتمد عمومی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۰

حکومت اسلامیہ پاکستان کی خدمت میں (۲)

بسلسلہ مطالبہ مندرجہ کتاب ہذا حصہ اوّل، گزارش کی جاتی ہیکہ حصہ اوّل کو مسلمانوں نے بے انتہا پسند کیا ہے اور اپنی اپنی طور پر اس کی تشہیر بھی کی ہے اور بے شمار حضرات نے اس کو اپنی جانب سے تحفہ کے طور پر دوسروں میں بھی تقسیم کیا ہے، جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ مسلمان اس قسم کی غلط او بے بنیاد روایتوں سے ترک تعلق کرنے کا قوی جذبہ رکھتے اور چاہتے ہیں کہ آئندہ آنے والی نسلیں بھی ان غلط روایتوں کی بھول بھلیوں میں گم نہ ہونے پائیں جن میں وہ خود گم ہو گئے تھے اور اب جگانے سے ہوش میں آ گئے ہیں اور بھول بھلیوں سے نکلنا چاہتے ہیں۔ وہ بدقسمت ہی ہو گا جو اس چکر سے نکلنا پسند نہ کرے گا۔

چنانچہ مسلمانوں کی اس جائز اور معقول خواہش کے پیش نظر حکومت اسلامیہ پاکستان سے مکرر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جن مذہبی داستانوں کی حقیقتوں پر سے پردے اٹھائے گئے اور انکے مکروہ چہرے سامنے لائے گئے ہیں اور انکے متعلق جو تحقیق پیش کی جا چکی ہے پیش کی جا رہی ہے، اور آئندہ بھی پیش کی جائیگی ان کی پوری طرح جانچ پڑتال کرے معقول صحیح پائی جائے تو انکو قبول کرتے ہوئے مسلمانوں کو انکے شر سے محفوظ کرنے کی خاطر ضروری قدم اٹھائے اور ہمارے ادبی ذخیرے میں شر پیدا کرنیکی غرض سے جو مواد داخل کر دیا گیا ہے اور جسکے شر کو محسوس نہ کرنیکی بنا پر بعض اہل علم حضرات نے بھی اپنی اپنی تصنیفات میں جگہ دیدی ہے اس کے اثر کو ناکارہ بنایا جائے اور جیسا کہ سابق میں عرض کیا جا چکا ہے، ریڈیو ٹیلیویژن اور تمام دیگر ذرائع ابلاغ سے اس قسم کی غلط باتوں کی تشہیر کو ممنوع قرار دیا جائے اور ہر سطح کی درسی کتب سے بھی انکا اخراج عمل میں لایا جائے، تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں بھی محفوظ رہ سکیں۔ تا وقتیکہ اس اور اس جیسی دیگر قسم کی تدابیر اختیار نہ کی جائیں گی، ہماری سیرت اور تاریخ کی کتابیں صحت کے ساتھ ہرگز مرتب نہ کی جا سکیں گی غلط باتوں کے پرچار کی مزید اجازت کسی اعتبار سے درست نہ کہلائے گی۔

جناب صدر پاکستان اور جناب وزیراعظم پاکستان کی دین اسلام اور بانی اسلام سے والہانہ عقیدت و محبت کو محسوس کرتے ہوئے یہ توقع کیجاتی ہے کہ اس ضمن میں جلد ہی مناسب اقدام کئے جائینگے جسکے لئے نہ صرف مسلمانان پاکستان اور ادارہ ہی احسان مند ہونگے بلکہ تمام دنیا کے مسلمان بھی، کیونکہ ایسے اقدام سے انکی آنکھیں کھلنے کے بھی قوی امکان موجود ہیں۔

"ادارہ"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مقدمہ

حدیث کو پرکھنے کے لئے دو فن بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ فن روایت اور فن درایت۔ فن روایت کی متعدد اقسام ہیں۔ اصول حدیث۔ جرح و تعدیل، اسماء الرجال اور علل وغیرہ۔ عام طور پر حدیث کے صحت و ضعف کو پہچاننے کے لئے محدثین ان ہی فنون سے کام لیتے ہیں۔ اگرچہ برصغیر میں ان فنون کی کتابیں بھی کتب خانوں کی زینت کے کام آتی ہیں۔ لیکن فن درایت سے چند محدثین اور فقہاء نے صرف فقہی مسائل میں کام لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب متقدمین میں یہ فن ایک محدود طبقہ میں مقید رہا تو موجودہ کم علمی اور اندھی تقلید کے دور میں اس کا وجود ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔ ہم نے اپنی کتابوں میں حتی الامکان یہ سعی کی ہے کہ ان ہر دو فنون سے قارئین کو آشنا کرایا جائے۔ تاکہ قارئین خود بھی غور و فکر سے کام لے کر مناسب فیصلہ کر سکیں۔ اسی لئے ہم سطور ذیل میں فن درایت پر کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں:۔

اصول درایت

اس اصول کی بنیاد بھی قرآن مجید نے رکھی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس خبر کو اس طرح پھیلایا کہ بعض صحابہ بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ "صحیح بخاری" اور "صحیح مسلم" میں ہے کہ حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت مسطحؓ بن اثاثہ بھی قاذفین میں شریک تھے۔ اور اسی سبب سے ان پر حد قذف جاری کی گئی۔ قرآن مجید میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ۔ النور ۱۱

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے یہ تہمت لگائی وہ تم میں کا ایک گروہ تھا۔

تفسیر جلالین وغیرہ میں منکم کی تفسیر ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

جماعة من المؤمنين — مؤمنین کی ایک جماعت

یہ صورت حال بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ صحابۂ کرام کو مخاطب کرکے فرماتا ہے۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ النور ۱۶

کیوں نہ تم نے یہ بات سنتے ہی یہ کہا کہ ہمارے لئے یہ بات کہنا مناسب نہیں۔ آپ کی ذات اس الزام سے پاک ہے۔ یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔

حالانکہ اصول روایت کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کئے جاتے۔ اور یہ تحقیق کی جاتی کہ یہ راوی ثقہ ہیں یا غیر ثقہ، معتبر ہیں یا غیر معتبر۔ پھر ان کی شہادت لی جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ حکم دیا کہ تم نے یہ بات سنتے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ بہتان عظیم ہے۔ یعنی یہ بات اس لائق نہ تھی کہ اسے تسلیم کیا جائے۔ اس کا تو آنکھیں بند کرکے انکار کر دینا چاہئے تھا۔

اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اگر کوئی بات خلاف عقل وقیاس کی جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ واقعہ قطعاً غلط ہے۔ اس کے لئے راویوں کی چھان بین کی قطعاً ضرورت نہیں۔

اس انداز فکر کو درایت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح فن روایت کی ابتدا دور صحابہ میں رکھی گئی۔ اسی طرح فن درایت کی ابتدا بھی دورِ صحابہ میں ہوئی۔

دورِ صحابہ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو باقی رہتا ہے یا نہیں۔ اتفاق سے حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بیان کیا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا۔ پھر تو گرم پانی پینے سے بھی وضو ٹوٹ جانا چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابو ہریرہؓ کو ضعیف الروایت نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ روایت ان کے نزدیک خلاف عقل تھی۔ اس لئے انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ بلکہ یہ تصور کیا کہ بات سننے یا سمجھنے میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

اسی باعث جب تدوین حدیث کا دور شروع ہوا تو ائمہ محققین نے جہاں روایت کے اصول وضع

گئے وہاں باقاعدہ درایت کے اصول بھی وضع کئے۔ امام ابن الجوزی فرماتے ہیں۔

جس حدیث کو دیکھو کہ وہ عقل یا اصول مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ موضوع ہے۔ اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر۔ اسی طرح سے وہ احادیث قابل اعتبار نہیں جو محسوسات اور مشاہدات کے خلاف ہوں اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو۔ یا وہ حدیث جس میں ذراسی بات پر سخت عذاب کی دھمکی یا معمولی کام پر بڑے اجر کا وعدہ ہو۔ یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے۔ مثلاً یہ حدیث کہ کدو کو ذبح کئے بغیر نہ کھاؤ۔ اسی لئے بعض محدثین نے لغویت کو اس کے راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے۔ یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں۔

کبھی یہ قرائن راوی کے متعلق ہوتے ہیں جب کہ راوی ایسی حدیث بیان کرے جو کسی اور نے بیان نہ کی ہو۔ اور خود راوی جس سے روایت کر رہا ہے اس سے ملاقات نہ ہو۔

یا ایسی حدیث ہو کہ جس کو صرف ایک راوی بیان کرتا ہو، حالانکہ وہ معاملہ ایسا ہو کہ اس سے اور دل کو بھی واقفیت ہونی چاہئے تھی۔ جیسا کہ خطیب بغدادی نے "الکفایہ" کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے۔

یا ایسی روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا تذکرہ ہو۔ اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اس کو بیان کرتے۔ مثلاً یہ واقعہ کہ فلاں سنہ میں فلاں شخص نے حاجیوں کو حج سے روک دیا۔

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی۔ اور اس کے متعلق اس تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس کے رواۃ معتبر ہیں یا نہیں:۔

۱۔ جو روایت عقل سلیم کے خلاف ہو۔

۲۔ جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔ مثلاً پیشاب پاخانہ ناپاک ہے۔ یہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جسے دنیا کی تمام امتیں تسلیم کرتی آئیں اور تمام انبیاء کرام ان کو نجس قرار دیتے رہے۔ اگر کوئی راوی یہ بیان کرے کہ فلاں شخص نے پیشاب پی لیا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سکوت اختیار فرمایا۔ اور پھر اس کہانی کے ذریعہ یہ مسئلہ ثابت کیا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بول و براز پاک ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں یہی تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ذہن ہی گندہ ہے جو بول و براز سے بھرا ہوا ہے۔

۳۔ محسوسات اور مشاہدے کے خلاف ہو۔

۴۔ قرآن مجید۔ یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو۔ اور اس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ مثلاً کسی روایت میں خون پینے کا ذکر۔ حالانکہ خون کا کتاب اللہ، سنت رسول اور اجماع امت سے حرام ہونا ثابت ہے۔ ایسی روایت قطعاً مردود ہوگی۔

۵۔ جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔ مثلاً جو بیری کا درخت کاٹے گا۔ اُلٹے منہ جہنم میں جھونکا جائے گا۔

۶۔ معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

۷۔ وہ روایت رکیک المعنی ہو، مثلاً کدو ذبح کئے بغیر نہ کھاؤ۔

۸۔ راوی کسی ایسے شخص سے روایت کر رہا ہو جس سے اس کی ملاقات بھی نہیں۔ اور کوئی اور شخص اسے روایت نہیں کرتا۔

۹۔ جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اُس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو۔ لیکن ایک راوی کے علاوہ اسے کسی اور نے روایت نہ کیا ہو۔

۱۰۔ روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وہ وقوع میں آتا تو سینکڑوں اشخاص اسے روایت کرتے۔ مثلاً سورج کا ٹوٹنا۔ لیکن اس کے باوجود صرف ایک راوی اسے روایت کر رہا ہو۔

ملا علی قاری نے "موضوعات کبیر" کے خاتمہ میں حدیثوں کے نا معتبر ہونے کے متعدد اصول تفصیل سے لکھے ہیں۔ ہم یہ اصول حصہ اول کے مقدمہ میں پیش کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں ان اصول کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

محدثین کرام نے ان اصول سے اکثر جگہ کام لیا ہے اور ان سے کام لیتے ہوئے بہت سی روایتوں کا رد کیا ہے۔

مثلاً ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ معاف کر دیا تھا۔ اور معافی کی دستاویز لکھوا دی تھی۔ ملا علی قاری اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ مختلف وجوہات

کے باعث باطل ہے :-

۱- اس معاہدہ پر حضرت سعدؓ بن معاذ کی گواہی بیان کی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ غزوۂ خندق ۵ھ میں وفات پا چکے تھے۔ اور جنگ خیبر ۷ھ میں ہوئی۔

۲- دستاویز میں کاتب کی حیثیت سے امیر معاویہؓ کا نام لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے۔

۳- اس وقت تک جزیہ کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ کیونکہ جزیہ کا حکم قرآن مجید میں ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے وقت نازل ہوا۔

۴- دستاویز میں تحریر ہے کہ یہودیوں سے بیگار نہ لی جائے گی۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

۵- خیبر والوں نے اسلام کی شدید مخالفت کی تھی۔ ان سے جزیہ کیسے معاف کیا جا سکتا تھا۔

۶- عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی۔ تو اہل خیبر سے یہ جزیہ کیسے معاف کیا جا سکتا تھا۔

۷- اگر جزیہ معاف کیا جاتا تو یہ اس امر کی دلیل ہوتی کہ وہ اسلام کے بہی خواہ، دوست اور ہمدرد ہیں۔ حالانکہ وہ چند روز بعد ملک بدر کر دیئے گئے۔

تقریباً یہی دلائل خطیب بغدادی نے تاریخ میں پیش کئے ہیں لیکن کسی محدث نے اس کے راویوں پر بحث کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ، معلوم ہوا کہ اگر راوی کوئی ایسا واقعہ بیان کرے جو قرائن کے خلاف ہو تو اس واقعہ کو تسلیم نہیں کیا جائے گا خواہ اسے ثقہ راوی کیوں نہ روایت کریں۔ وہ روایت کسی صورت میں تسلیم نہ کی جائے گی۔

ایک نکتہ قابل غور یہ ہے کہ جب راوی کوئی واقعہ بیان کرتا ہے۔ اس میں غور طلب امر یہ ہوتا ہے کہ اس نقل میں کس قدر حصہ اصل واقعہ سے متعلق ہے، اور کس قدر راوی کے تخیل اور قیاس کا۔ تلاش وجستجو کے بعد یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ واقعہ وجود

ہی میں نہیں آتا۔ وہ صرف راوی کا تخیل ہوتا ہے۔ جسے وہ الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات سے ناراض ہوکر علیحدگی اختیار کی تو عام شہرت یہ پھیلی کہ آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق دیدی۔ حتیٰ کہ اس کی اطلاع قبا میں حضرت عمرؓ کو بھی دی گئی حضرت عمرؓ یہ خبر سُن کر مسجد نبوی آئے۔ مسجد میں صحابہ جمع تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کو طلاق دیدی۔

حضرت عمرؓ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو اس خبر کے سلسلہ میں آپ سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں میں نے طلاق نہیں دی۔

یہ حدیث بخاری میں متعدد جگہ پر مختلف الفاظ میں مذکور ہے۔ کتاب النکاح میں جہاں یہ روایت مذکور ہے۔ وہاں حافظ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں، جو خبریں شائع اور عام ہوجاتی ہیں۔ گو اُن کے راوی کثرت سے ہوں۔ لیکن اگر ان خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو اُن کا سچا ہونا ضروری نہیں چنانچہ اُس انصاری نے جس نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی اور اُن صحابہ نے جنہیں حضرت عمرؓ نے منبر کے پاس دیکھا تھا۔ طلاق کا جو یقین کرلیا۔ اُس کی صورت یہ ہوئی ہوگی۔ کہ کسی شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے ازواج سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اور چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت نہ تھی۔ لہٰذا اُس نے یہ قیاس کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی۔ اُس نے یہ خبر پھیلا دی۔ اور لوگ اسے ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اولاً جس شخص نے یہ خبر پھیلائی ہو وہ منافق ہو۔ فتح الباری ج ۹ ۱۵۷

غور کیجئے کہ مسجد نبوی میں تمام صحابہ جمع ہیں۔ اور سب یہ بیان کر رہے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو طلاق دیدی۔

صحابۂ کرام سب ثقہ اور عادل ہیں۔ اور ان کی کثیر تعداد اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے۔ لیکن جب اس کی تحقیق کی جاتی ہے تو ثابت یہ ہوتا ہے کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ بلکہ یہ صرف ایک تخیل اور قیاس تھا۔

اس سے یہ بات سامنے آگئی کہ صرف سند دیکھ کر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ واقعہ بھی صحیح ہے۔

بعض اوقات راوی ثقہ ہوتے ہیں لیکن واقعہ درست نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کی تحقیق کے لئے درایت کے اصول درکار ہوں گے۔

امام ابن الجوزی نے جو یہ فرمایا ہے کہ جو روایت عقل کے خلاف ہو، اس کے رواۃ پر جرح وتعدیل کی ضرورت نہیں۔ وہ روایت قطعاً ناقابل اعتبار ہے۔ لیکن یہ اصول غور طلب ہے۔ اس لئے کہ عقل کی کوئی حد معینہ نہیں۔ اگر اس کی کھلی اجازت دیدی جائے۔ تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا انکار کر دے گا۔ کہ یہ میرے نزدیک خلاف عقل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے۔ عام تخیل یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوں۔ اور سلسلۂ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو، اس روایت کو ہر صورت میں قبول کیا جائے گا۔ خواہ وہ روایت خلاف عقل کیوں نہ ہو۔

مثلاً "تلک الغرانیق العلی" والی روایت۔ جس میں یہ بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ النجم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ شیطان نے آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلوائے۔ جن میں بتوں کی تعریف ہے۔

متعدد محدثین نے اس روایت کو ناقابل اعتبار قرار دیا۔ اور اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ پیش کی کہ اگر ایسی صورت پیش آتی تو بہت سے لوگ اسلام چھوڑ بیٹھتے۔ حالانکہ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔

حافظ ابن حجر فتح الباری میں یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

یہ تمام اعتراضات اصول کے مطابق چل نہیں سکتے۔ اس لئے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوں اور ان کے ماخذ مختلف ہوں تو یہ اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ نہ کچھ اصل ہے۔
فتح الباری ص۳۳۳ ج ۸

لیکن اگر یہ امر قبول کر لیا جائے کہ ایسا کوئی نہ کوئی واقعہ بلکہ ایسا خطرناک حادثہ پیش آیا ہے تو گویا حافظ ابن حجر اور ان جیسے دیگر روایت پرست یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ دوران وحی اور دوران تلاوت شیطان

جو چاہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلوانے پر قدرت رکھتا تھا۔ گویا پوری نبوت اور پورا قرآن ایک روایت کے سبب کالعدم ہو جاتا ہے۔ ایسی روایت اور ایسے معتبر راویوں کو گیا شہد لگا کر چاٹتا ہے۔

اسی باعث محدثین اور محققین کا ایک گروہ دلائل عقلیہ اور قرائن کے باعث ایسی روایت کو تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے۔ روایت پر تنقید کا یہ طریقہ کار دور صحابہ میں شروع ہو چکا تھا۔ جو محدثین کے آخر دور تک قائم رہا۔ اگرچہ اکثریت آنکھیں بند کر کے ایمان لانے والوں ہی کی رہی۔

حضرت ابوہریرہؓ نے جب یہ حدیث بیان کی کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس پر عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا تھا۔ اس سے تو لازم آتا ہے کہ گرم پانی سے وضو نہ ہونا چاہئے۔ اس پر حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ صاحبزادے جب حدیث سنو تو باتیں نہ بنایا کرو۔

گویا حضرت ابوہریرہؓ اس کے قائل تھے کہ روایت کو من وعن قبول کیا جائے۔ اور ابن عباسؓ روایت پر عقلی لحاظ سے غور کرنے کے قائل تھے۔ گویا ان کا نظریہ تھا کہ جو روایت خلاف عقل وقیاس ہو۔ اور قرائن اسے قبول کرنے کی اجازت نہ دیتے ہوں۔ اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

"صحیح مسلم" کے مقدمہ میں ہے کہ ایک بار حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے روبرو حضرت علیؓ کے فیصلے پیش کئے گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ایک ذراع کے بقدر چھوڑ کر باقی کتاب پر قلم پھیر دیا۔ اور فرمایا۔

واللہ ما قضی بھذا علی الا ان یکون ضل	اللہ کی قسم علیؓ یہ فیصلے گمراہ ہوئے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ نے ان فیصلوں کو دیکھ کر اپنے ذہن سے یہ فیصلہ کیا کہ یہ صحیح نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس کی سند اور راویوں کا پتہ چلائیں، اور پھر اگر راوی معتبر ہیں تو اسے قبول کریں۔

صحیحین کی احادیث تنقید سے بالاتر نہیں

صحیح بخاری باب صلوۃ النوافل جماعۃ میں ہے کہ محمود بن الربیعؓ نے ایک محفل میں یہ حدیث بیان

کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص خالصتاً لا الٰہ الا اللہ کہے گا۔ اللہ اس پر آگ حرام کر دیگا۔
اس محفل میں حضرت ابوایوبؓ انصاری بھی موجود تھے۔ جن کے مکان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات ماہ قیام فرمایا تھا۔ انہوں نے یہ حدیث سُن کر فرمایا۔

واللہ ما اظن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما قلت قط۔ — اللہ کی قسم میں ایسا نہیں سمجھتا کہ آپ نے ایسی بات فرمائی ہوگی۔

محمود بن الربیعؓ چھوٹے درجہ کے صحابی تھے۔ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کو اُن کے ثقہ ہونے میں کوئی کلام نہ تھا۔ لیکن چونکہ یہ حدیث ان کے نزدیک اصول شرعیہ اور قیاس کے خلاف تھی۔ لہٰذا یہ اس پر یقین نہ کر سکے۔ اور بولے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہ فرمایا ہوگا۔

اگرچہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن الربیعؓ نے مدینہ آکر حضرت عتبانؓ سے اس حدیث کی تصدیق کر لی۔ لیکن اس سے اصل مسئلہ پر کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُن کو محمود بن الربیعؓ پر شبہ نہیں تھا۔ بلکہ انہیں اصل روایت پر شبہ ہو رہا تھا۔ اگر اُن سے حضرت عتبانؓ بھی یہ روایت بیان کرتے تب بھی یہی بات پیدا ہوتی۔ گویا انہیں شبہ یہ ہے کہ راوی نے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ یا وہ صحیح طور پر پورے الفاظ یاد نہیں رکھ سکے۔

ممکن ہے کہ حضرت ابوایوبؓ کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو رہا ہو کہ جب لا الٰہ کہنے والے پر دوزخ حرام ہوگئی تو ایسی صورت میں عمل کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس لئے اُن کا ذہن اس روایت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوا ہو۔

پھر بعض اوقات راوی روایت سننے میں غلطی کر جاتا ہے۔ جیسا کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے بعض صحابہ سے فرمایا۔ بے شک تم سچے لوگوں سے روایت کرتے ہو۔

ولکن السمع قد یخطئ — لیکن سننے میں بھی کبھی غلطی ہو جاتی ہے

حضرت عمار بن یاسرؓ نے جب حضرت عمرؓ کے سامنے تیمم جنابت کی روایت بیان کی تو حضرت عمرؓ کو یقین نہیں آیا۔ بلکہ مسلم میں ہے کہ انہوں نے فرمایا

اتق اللہ یا عمار — اے عمارؓ اللہ سے ڈرو

حالانکہ حضرت عمارؓ کا بیان تھا کہ امیر المؤمنین اُس وقت آپ بھی میرے ساتھ تھے لیکن تب بھی امیر المؤمنین کو یقین نہیں آیا۔ گویا جہاں حضرت عمرؓ کو حضرت عمارؓ کی حدیث پر اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ وہاں حضرت عمارؓ کی نظر میں حضرت عمرؓ بھول رہے تھے۔ چنانچہ اسی باعث جب حضرت ابو موسیٰؓ اشعری نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے سامنے حضرت عمارؓ کی حدیث پیش کی تو حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اے ابو موسیٰؓ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عمرؓ کو عمارؓ کی اس روایت پر اطمینان نہ تھا۔ (بخاری۔ باب التیمم)

حضرت عائشہؓ کے رُوبرو جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ مردے پر زندوں کے رونے سے مردے کو عذاب ہوتا ہے۔ تو انہوں نے اس سبب سے اس روایت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ قرآن کی اس آیت کے خلاف ہے۔

اَلَّاتَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ النجمؑ ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھا سکتا

حالانکہ اس کے راوی حضرت عمرؓ تھے۔ اور ان کے ثقہ ہونے میں کس کو شک ہو سکتا تھا۔ اس لحاظ سے تو یہ روایت صحیح تھی۔

ایک مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق دی جائے تو عدت پوری ہونے تک شوہر پر اس کے کھانے پینے اور رہائش کا انتظام واجب ہے۔

فاطمہؓ بنت قیس ایک صحابیہ تھیں۔ انہیں ان کے شوہر نے طلاق دیدی۔ اُن کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نان و نفقہ اور مکان نہیں دلوایا۔ انہوں نے یہ روایت حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہم ایک عورت کے کہنے پر کتاب اللہ اور سنت رسول کو نہیں چھوڑ سکتے جس کی نسبت ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس نے یہ واقعہ یاد رکھا یا بھول گئی۔ مسلم ص۴۸۵ ج ۱

امام شعبیؒ نے ایک مجلس میں فاطمہؓ کی روایت بیان کی تو اسود بن یزید نے انہیں کنکریاں ماریں کہ تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو۔ پھر حضرت عمرؓ کا اعتراض بیان کیا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے روبرو جب فاطمہؓ کی روایت کا ذکر آیا تو فرمانے لگیں۔

مالفاطمۃ خیران تذکر ھذا اگر فاطمہ یہ حدیث بیان کرتی ہے تو پھر

الحدیث ۔ بخاری ص۴۸۵ ج۱ ۔ ص۸۰۳ ج۲ — اس کے پاس کوئی خیر نہیں۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

اما انه لاخیر لها فی ذکر ذلك، — بہرصورت یہ روایت ذکر کرنے سے فاطمہؓ کو

بخاری ص۸۰۲ ج۲ ۔ مسلم ص۴۸۵ ج۱ — کوئی خیر حاصل نہ ہوگی۔

قاسم بن محمد کا بیان ہے کہ ام المؤمنین نے ایک بار فاطمہؓ سے مخاطب ہوکر فرمایا تھا۔کیا تو اللہ سے

نی نہیں۔ بخاری ص۸۰۳ ج۲

سوید بن سعید "صحیح مسلم" کا ایک راوی ہے۔اس نے یہ حدیث بیان کی کہ جس نے عشق کیا، اسے

ل میں چھپائے رہا، اور پاک دامن رہا۔اور پھر اسی حالت میں اس کی موت ہوگئی تو وہ شہید مرا۔

حافظ ابن القیم "زاد المعاد" میں اس روایت کو دلائل عقلی سے باطل ثابت کرکے لکھتے ہیں۔

فلو کان اسناد هذا الحدیث — اگر اس حدیث کی سند سورج کی طرح

کالشمس کان غلطا و وهما۔ — روشن بھی ہوتی ۔تب بھی یہ روایت غلط ہوتی۔

حتیٰ کہ امام یحییٰ بن معین نے اسی روایت کے باعث اس سوید کو کذاب قرار دیا۔

صحیح مسلم کتاب الجہاد باب الفئ میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس

جھگڑتے ہوئے آئے ۔حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا۔

اقض بینی و بین هذا الکاذب — میرے اور اس جھوٹے گناہگار، غدار

الآثم الغادر الخائن۔ — اور خائن کے مابین فیصلہ کر دیجئے۔

چونکہ ایک صحابی دوسرے صحابی کی شان میں اس قسم کے الفاظ نہیں نکال سکتا۔اسی لئے متعدد

محدثین نے اپنے نسخہ سے یہ الفاظ نکال دیئے۔اور علامہ مازری اس کی نسبت لکھتے ہیں۔

اذا انسدت طرق تاویلها نسبنا — جب اس کی تاویل کے تمام راستے بند ہو

الکذب الی رواتها۔ مسلم ص۹۱ ج۲ — جائیں گے ۔تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے

بخاری میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا۔

حافظ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں۔ مثلاً قوم ثمود کے مکانات، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قد اس قدر لمبے نہ تھے۔ مجھے آج تک اس اشکال کا جواب نہیں ملا۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے کہیں گے کہ اے اللہ تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت کے روز مجھے رسوا نہ کرے گا۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

وقد استشکل الاسماعیلی ھذا الحدیث من اصلہ وطعن فی صحتہ۔ فتح الباری ج ۸ ص ۳۸۴	حافظ اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے۔ اور اس کی صحت پر کلام کیا ہے۔

عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا۔ اس پر بندروں نے جمع ہو کر اسے سنگسار کیا۔

حافظ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں۔ اس بنا پر اس حدیث کا انکار کیا کہ جانور مکلف نہیں ہوتے۔ اس لئے ان کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہو سکتا ہے اور نہ یہ سزا جاری ہو سکتی ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

ابن عبدالبر نے عمرو بن میمون کے اس قصے سے انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلف کی طرف زنا کی نسبت ہے۔ اور جانوروں پر حد قائم کرنا بیان کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر حافظ ابن عبدالبر کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں۔ کیونکہ اگر سند صحیح ہے تو غالباً یہ بندر جن ہوں گے۔

اس تمام بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ پہلے محدثین کرام بخاری و مسلم کی اُن روایات پر جرح کرتے رہے جو اُن کی نظر میں خلاف عقل یا اصول شرعیہ کے خلاف تھیں۔ ان حضرات میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہ تھا کہ بخاری و مسلم کی ہر روایت پر ایمان لانا ضروریات دین میں داخل اور اُن پر

شبہ کرنا گناہ عظیم ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ سند کے معتبر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ روایت بھی صحیح ہو۔ بعض اوقات سند معتبر ہوتی ہے لیکن دیگر وجوہات کے باعث روایت غلط ہوتی ہے۔

تصحیح و تضعیف ایک ظنی شئے ہے

کسی محدث کا کسی حدیث کو صحیح کہنا اس امر کی دلیل نہیں ہوتا کہ وہ حدیث فی الواقع صحیح بھی ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی حدیث کو ضعیف کہتے ہیں تو یہ روایت کے ضعف کی دلیل نہیں ہوتا کیونکہ تصحیح و تضعیف ایک اجتہادی شئے ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم کا کسی حدیث کو صحیح کہہ کر اپنی کتاب میں تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ حدیث ان دونوں اماموں کی نظر میں صحیح ہے۔ اُن کا اجتہاد اسے صحیح قرار دے رہا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ دیگر ائمہ کا اجتہاد اسے ضعیف سمجھتا ہو۔ الغرض یہ دونوں فیصلے ظنی ہیں۔ اور ظنی کا مقام قطعی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ قطعی شئے تو صرف کتاب اللہ ہے۔

علامہ ابن تیمیہ اپنی کتاب "رفع الملام عن ائمۃ الاعلام" میں تحریر فرماتے ہیں۔

اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ائمہ مقبولین میں جنہیں امت میں قبول عام حاصل رہا ہے، کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث میں آپ کی سنت سے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی عمداً مخالفت [کر]سکے۔ لیکن جب ان میں سے کسی کا ایسا قول پایا جائے جو صحیح حدیث کے خلاف ہو۔ تو اس حدیث کو چھوڑنے [م]یں کوئی عذر نہ ہوگا۔

پھر ابن تیمیہ عذروں اور اسباب پر بحث کرتے ہوتے لکھتے ہیں۔

ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ اپنے اجتہاد سے حدیث کے ضعیف ہونے کا اعتقاد ہو۔ جب کہ دوسرے [ا]س روایت کو صحیح سمجھتے ہوں۔ اس کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ [ح]دیث کو بیان کرنے والا ایک محدث، راوی کو ضعیف سمجھتا ہے۔ اور دوسرا محدث اسے ثقہ سمجھتا ہے۔ رجال کی معرفت ایک وسیع علم ہے۔ اور رجال کے علماء کے فیصلے اور ان کے حالات اس سلسلہ میں اتفاق [اختلا]ف کے لحاظ سے ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے دیگر علوم کے علماء کے اپنے میدان میں۔

چوتھا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک ثقہ حافظ راوی کی حدیث میں ایک محدث چند شرائط پیش کرتا ہے۔ جن میں دوسرا محدث مخالفت کرتا ہے۔ مثلاً بعض محدثین اس شرط کے قائل ہیں کہ ہر حدیث کو کتاب و سنت پر پیش کیا جائے۔ (اگر ان کے خلاف ہو تو اسے قبول نہ کیا جائے) بعض محدثین نے یہ شرط رکھی ہے کہ حدیث اگر اصول قیاس کے خلاف ہو تو راوی حدیث کا فقیہ ہونا ضروری ہے۔ نیز بعض نے یہ شرط رکھی ہے (اور وہ حنفیہ ہیں) کہ جس حدیث کا ایسے معاملہ سے تعلق ہو جو عام لوگوں کو پیش آتا رہتا ہے۔ اس حدیث کا مشہور ہونا ضروری ہے۔ رفع الملام عن ائمۃ الاعلام ص ۱۵-۱۷

بہرحال یہ بات محدثین کے نزدیک مسلمات میں سے ہے کہ کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف کہنا ایک امر اجتہادی ہے۔ اور کسی مجتہد کا اجتہاد دوسرے مجتہد پر حجت نہیں ہوتا۔ وہ خود غور و خوض کے بعد فیصلہ کرے گا۔ وہ پہلے مجتہد سے اتفاق بھی کر سکتا ہے۔ اور اختلاف بھی۔ لہٰذا جن احادیث کو کسی محدث نے صحیح سمجھا ہے اور اسے اپنی کسی ایسی کتاب میں تحریر کیا ہے جس میں اس نے صرف صحیح احادیث جمع کرنے کا اہتمام کیا ہو۔ جیسا کہ امام بخاری، امام مسلم، امام ابن خزیمہ، امام ابو عوانہ، امام ابن حبان، امام ابن السکن اور امام حاکم وغیرہ نے، تو وہ احادیث بایں معنی صحیح ہیں کہ ان کے مصنفین نے ان کو صحیح سمجھا ہے، وہ فی الواقع صحیح بھی ہو سکتی ہیں اور غیر صحیح بھی۔ ایک مصنف اپنی کسی روایت کو زیادہ سے زیادہ اس کی سند کے اعتبار سے صحیح کہہ سکتا ہے لیکن ممکن ہے کہ اس میں کوئی ایسی مخفی علت موجود ہو جو اسے صحت کے زمرے سے خارج کر رہی ہو اور مصنف کا ذہن اس طرف نہ گیا ہو۔

محدثین کرام کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی ہم کہنے پر مجبور ہیں کہ بہرصورت وہ انسان تھے۔ اُن سے غلطی اور بھول ہر دو ممکن ہیں۔ اُن دونوں امور سے کوئی شخص معصوم نہیں۔ لہٰذا ان کا کسی حدیث کو صحیح کہنا یا اپنی صحیح میں نقل کرنا حرف آخر نہیں بن سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی صحت کا اغلب گمان پیدا ہو سکتا ہے۔

محقق ابن الہمام اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

مسلم نے اپنی صحیح میں بہت سے ایسے راویوں سے روایات لی ہیں جو جرح کے عیوب سے بری

نہیں ہیں۔ ایسے ہی بخاری میں بھی راویوں کی ایک جماعت ہے جن پر اعتراض کیا گیا ہے تو راویوں کے ثقہ اور ضعیف ہونے کا مدار علماء کے اجتہاد پر ٹھہرا۔ ایسے ہی شرائط کے بارے میں بھی ہے کہ ایک محدث نے کسی ایک شرط کا لحاظ ضروری سمجھا ہے۔ مگر دوسرے نے اس شرط کو لغو قرار دیا ہے۔ ایسے ہی وہاں بھی جہاں ایک محدث نے کسی راوی کو ضعیف کہا ہے۔ اور دوسرے محدث نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ ایک ایسے شخص کا دل تو مطمئن ہو سکتا ہے جو نہ مجتہد ہو، اور نہ اس نے راویوں کے حالات کی خود تحقیق کی ہو۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ اکثر محدثین نے کیا کہا ہے۔ لیکن ایک مجتہد اور اس آدمی کو جس نے راویوں کی خود تحقیق کی ہو کسی شرط کو قبول کرنے اور نہ کرنے میں اطمینان نہیں ہو سکتا۔ وہ خود اپنی رائے قائم کرے گا۔ فتح القدیر ص ۱۱۵ ج ۱

لہٰذا کسی حدیث کی سند کو دیکھ کر۔ یا یہ دیکھ کر کہ فلاں حدیث فلاں کتاب میں وارد ہوئی۔ اس کے صحت و ضعف کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ عوام کی بات اور ہے۔ ان کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ اکثر اہل علم نے فلاں روایت کو صحیح کہا ہے۔

لیکن جس شخص میں خود بات کو پرکھنے۔ رواۃ کے حالات کی جانچ پڑتال کرنے۔ موافق و مخالف قرائن کو پرکھنے کا سلیقہ ہو۔ وہ اتنی سی بات سے مطمئن نہیں ہو سکتا کہ روایت۔ بخاری، مسلم یا کسی اور معتبر کتاب میں آگئی ہے۔ یا اکثر اہل علم نے اس کو قبول کر لیا ہے۔ اسے یہ حق دینا ہوگا۔ کہ وہ تمام ضروری امور پر غور کرنے کے بعد خود اپنی ایک رائے قائم کرے۔

صحیحین پر تنقیدات۔ حضرات سلف میں سے سب ہی نے حدیث کی تمام کتابوں پر تنقید کی ہے۔ اور ہر کتاب میں ایسی روایات کی نشان دہی کی ہے۔ جو ان کے نزدیک صحیح نہیں۔ حتیٰ کہ بخاری و مسلم کی صحیحین پر بھی تنقیدیں کی گئی ہیں۔

علامہ ابوالفتاح دمشقی۔ اصول الجرح والتعدیل کے باب میں۔ قواعد علوم الحدیث (مؤلفہ مولانا ظفر احمد عثمانی) کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

امام بدرالدین عینی حنفی نے عمدۃ القاری ج ۱ ص ۸ میں ابن الصلاح کی اسی بات کا ذکر کرکے لکھا

ہے کہ ان تمام راویوں میں جرح مفسر موجود ہے۔ پھر انہوں نے اُن رواۃ میں جو جرحیں تھیں انہیں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ دارقطنی نے اپنی کتاب "الاستدراکات" اور "التتبع" میں بخاری و مسلم کے خلاف دوسو حدیثوں پر کلام کیا ہے۔ اور ابومسعود دمشقی نے بھی ان دونوں کتابوں پر استدراکات لکھے ہیں ایسے ہی ابوعلی غسانی نے بھی اپنی کتاب "تقیید المہمل" میں دونوں کتابوں کی روایات پر اعتراضات کئے ہیں۔

حافظ عراقی نے اپنے "الفیہ" کی شرح میں ج ۱ ص ۲۸ بخاری و مسلم کی دو حدیثیں بیان کی ہیں جن پر تنقید کی گئی ہے۔ پہلی حدیث بخاری کی حضرت انسؓ سے معراج کے بارے میں ہے کہ وہ بعثت سے پہلے ہوئی تھی یعنی اس سے پہلے کہ آپؐ پر وحی آئی۔ اور اسی میں آپ کا سینہ چاک کیا گیا تھا۔

دوسری حدیث مسلم کی ابن عباسؓ سے ہے جو ابوسفیانؓ کے اپنی بیٹی ام حبیبہؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کرنے کے بارے میں ہے۔

حافظ عراقی نے اس کے بعد لکھا ہے۔ کہ میں نے "الشرح الکبیر" میں ان دو کے علاوہ اور بھی بہت سی حدیثیں ذکر کی ہیں۔ اور میں نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں وہ تنقیدات بیان کر دی ہیں جو صحیحین کی احادیث کی تضعیف کے سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں۔ اور ان تنقیدات کا جواب بھی دیا ہے۔ جو اس موضوع پر زیادہ واقفیت حاصل کرنا چاہے انہیں اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ قواعد علوم الحدیث ص ۱۶۹ ص ۱۷۰۔

خراب حافظہ والوں سے روایت — امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی صحیحین میں ایسے راویوں سے بھی روایات لی ہیں، جن کا حافظہ آخر عمر میں جواب دے گیا تھا۔

حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب "فتح الباری" کے مقدمہ میں اس امر کو تسلیم کیا ہے۔ اور حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اس کا جواب بھی دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

جب امام بخاری ایسے لوگوں سے روایات لیتے ہیں جن کا حافظہ آخر عمر میں خراب ہو گیا تھا تو ظاہر یہ ہے کہ امام بخاری نے اُن راویوں کے اُن شاگردوں سے روایات لی ہوگی جنہوں نے خرابی حافظہ

اور اختلاط سے قبل احادیث سنی تھی۔ فتح الباری ج ۲ ص ۲۱ ۱۲۶

ظاہر ہے کہ حافظ ابن حجر کی یہ توجیہ محض حسن ظن پر مبنی ہے۔جس کی انہوں نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ نہ اس کی کوئی مثال پیش کی ہے۔کہ فلاں راوی جس کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، اس سے بخاری و مسلم کے راوی نے خرابی حافظہ سے پہلے حدیث سنی تھی۔یہ محض ایک دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔جس کا آج تک کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔بلکہ شخصیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس اصول کو نظر انداز کیا گیا۔اور حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ دیا گیا کہ چونکہ اس کی روایت بخاری و مسلم میں پائی جاتی ہے۔لہٰذا ان حضرات نے ضرور اس پر عمل کیا ہوگا لیکن وہاں کیا کیا جائے گا کہ جہاں بخاری نے ایسے راویوں سے روایت لی ہو جن کا حافظہ سدا ہی سے خراب تھا۔ مثلاً شریک بن عبداللہ بن ابی نمر، اور عاصم بن بہدلہ۔ان کا تو ہمیشہ سے حافظہ خراب تھا۔یہاں حافظ ابن حجر کے لئے حسن ظن کی تاویل ممکن نہیں۔

ضعیف راویوں سے روایت۔

امام ابن ابی الوفا قرشی اپنی کتاب "الکتاب الجامع" ج ۲ ص ۴۲۸ (جو الجواہر المضیہ کے حاشیہ پر ہے) فرماتے ہیں کہ۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جس راوی سے بخاری و مسلم نے روایت کر دی وہ پُل سے پار ہو گیا (یعنی اُس پر کوئی تنقید نہیں کی جا سکتی) یہ محض شخصیت پرستی ہے۔اس بات میں کوئی وزن نہیں چنانچہ امام مسلم نے اپنی کتاب میں لیث بن ابی سلیم وغیرہ جیسے ضعیف راویوں سے روایتیں کی ہیں۔لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ایسے ضعیف راویوں سے مسلم نے اپنی کتاب میں محض مقابلہ کرنے کے لئے نیز شواہد اور متابعات پیش کرنے کے لئے روایت کر دی ہے۔مگر اس بات میں کوئی جان نہیں۔کیونکہ حافظ رشید الدین عطار نے اپنی کتاب "الفوائد المجموعہ فی شان ما وقع فی مسلم من الاحادیث المقطوعہ" میں کہا ہے کہ مقابلہ کرنا۔اور شواہد و متابعات پیش کرنا ایسے امور ہیں جن سے کسی حدیث کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔مگر کتاب مسلم تو ایسی کتاب ہے جس میں مصنف نے صرف صحیح احادیث پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے۔تو کسی حدیث کا حال اُن حدیثوں سے کیا خاک معلوم ہو سکتا ہے جو خود مسلم میں ضعیف سندوں سے مذکور ہیں۔
(ابوالوفا قرشی بر حاشیہ الجواہر المضیہ)

معلوم ہونا چاہئے کہ اَنَّ اور عَنْ ایسے الفاظ ہیں جو عام طور پر مدلّس راوی استعمال کرتے ہیں اور جب مدلّس ان الفاظ کو استعمال کرتا ہے تو درمیان سے راوی ساقط کیا جاتا ہے۔ اور روایت منقطع ہوتی ہے۔ اسی لئے محدثین کا فیصلہ یہ ہے کہ مدلّس کی حدیث معنعن یعنی عن والی روایت قابل قبول نہیں۔ اتفاق سے بخاری و مسلم میں ایسی حدیثیں بہت سی ہیں۔ لیکن متاخرین علماء شخصیت پرستی میں مبتلا ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ اس قسم کی حدیثیں اگر بخاری و مسلم میں پائی جائیں تو وہ قابل قبول اور متصل ہیں لیکن اگر دیگر کتابوں میں پائی جائیں تو وہ منقطع ہیں۔ حالانکہ یہ خالص شخصیت پرستی کے علاوہ کچھ نہیں۔ متقدمین کے یہاں کوئی ایسا اصول نہ تھا۔ بلکہ اس اصول کو بے اصولی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مسلم نے اپنی کتاب میں عن ابی الزبیر عن جابر کی سند سے بہت سی حدیثیں عَنْ کے لفظ سے روایت کی ہیں۔ حفاظ حدیث کہتے ہیں کہ ابو الزبیر جابرؓ کی حدیثوں میں تدلیس سے کام لیتے ہیں۔ لہٰذا ابو الزبیر کی وہ روایات جو عَنْ کے لفظ سے مروی ہوں وہ اس قابل نہیں کہ انہیں قبول کیا جائے ابن حزم اور عبد الحق نے لیث بن سعد سے نقل کیا ہے۔ کہ انہوں نے ابو الزبیر سے کہا مجھے نام بنام وہ حدیثیں سنایئے جو خود آپ نے جابرؓ سے سنی ہوں۔ تاکہ میں انہیں آپ سے سُن لوں۔ ابو الزبیر نے وہ احادیث سنائیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ کل سترہ حدیثیں تھیں۔ چنانچہ لیث بن سعد نے وہ احادیث سُن لیں۔ حالانکہ مسلم میں لیث کے علاوہ مختلف طریقوں سے عن ابی الزبیر عن جابر۔ عن کے ساتھ بے شمار حدیثیں ہیں۔ گویا یہ سب روایات منقطع ہوئیں۔ اسی طرح بخاری میں بہت سے مدلسین سے عن کے ذریعہ روایات مروی ہیں۔ مثلاً اعمش۔ ابو اسحاق سبیعی۔ سعید بن ابی عروبہ۔ قتادہ اور سفیان بن عیینہ وغیرہ۔

صحیحین میں غلطیاں

مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے حجۃ الوداع کے سلسلہ میں نقل کیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے روز مکہ تشریف لے گئے۔ اور طواف افاضہ فرمایا۔ پھر مکہ ہی میں ظہر کی نماز پڑھی۔ اور پھر منیٰ لوٹ آئے۔

لیکن مسلم ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے طواف افاضہ فرمایا۔ پھر منیٰ لوٹ آئے۔ اور ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھی۔ یہاں اگر لوگ شخصیت پرستی اور روایت پرستی میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں دوبارہ نماز اس لئے پڑھی ہو تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بھی جائز ہے۔ظاہر ہے کہ یہ صرف تاویلات ہیں۔مولویوں کی اس "ہوسکتا" نے دین کی ہیئت ہی بدل کر رکھ دی ہے۔
اسی لئے ابن حزم ان دونوں روایتوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک روایت قطعاً جھوٹی ہے۔

بخاری نے معراج کی حدیث بیان کی۔اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ معراج وحی نازل ہونے یعنی نبوت سے قبل ہی ہوئی۔حفاظ حدیث نے ان الفاظ پر سخت اعتراضات کئے ہیں۔یہ فقرہ شریک بن عبداللہ بن ابی نمر کی روایت میں ہے۔ان کا حافظہ خراب تھا۔وہ حدیث میں بڑی غلطیاں کرتے ہیں۔حفاظ حدیث نے اس روایت کو ضعیف بلکہ ابن حزم نے منکر کہا ہے۔

مسلم نے ابوسفیان سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اسلام لانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین درخواستیں کیں۔جو آپ نے قبول فرمائیں۔یہ روایت ہم نے اسی کتاب میں تزویج ام حبیبہؓ کے تحت پیش کی ہے۔محدثین کو اس روایت پر سخت اعتراضات ہیں۔حتیٰ کہ ابن حزم نے اسی روایت کے باعث عکرمۃ بن عمار کو کذاب قرار دے دیا۔

حفاظ حدیث کا بیان ہے کہ امام مسلم نے جب اپنی صحیح لکھ کر مکمل کی تو اسے امام ابوزرعہ کے رُوبرو پیش کیا۔تو امام ابوزرعہ نے ان پر سخت نکیر کی۔اور ناراض ہو کر فرمایا۔

تم نے اس کا نام صحیح رکھا ہے۔تم نے اہل بدعت وغیرہ کے لئے سیڑھی مہیا کر دی ہے۔جب اُن کا کوئی مخالف اُن کے سامنے کوئی حدیث پیش کرے گا۔تو وہ کہیں گے کہ یہ حدیث صحیح مسلم میں تو ہے نہیں (لہٰذا یہ حدیث قابل اعتبار نہیں۔جیسا کہ آج کل لوگ کہتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری میں نہیں)

اللہ امام ابوزرعہ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔انہوں نے جو کچھ فرمایا تھا۔فی الواقع ایسا ہی پیش آیا۔
الجواہر المضیئۃ ج ۲ ص۴۲۸ ابن ابی الوفاء قرشی کا یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں۔

امام مسلم نے جو ایسی احادیث نقل کی ہیں جن میں ضعیف راوی منفرد ہیں۔ان کو صحیح قرار دینا بہت مشکل ہے جیسا کہ ابن ابی الوفاء قرشی نے بیان کیا ہے۔تو ان کے ضعیف ہونے میں کوئی شک نہیں۔کیونکہ ہر تلوار کی دھار میں دندانہ پڑ ہی جاتا ہے۔اور ہر عمدہ گھوڑا ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے۔یہ بات کتاب کے مجموعی اور اجمالی

جب کوئی مصنف اپنی کتاب کو ابھی مکمل نہ کر سکا ہو تو وہ بطور یادداشت کے بہت سی چیز
لکھ لیا کرتا ہے۔ وہ اصل کتاب کا جزو نہیں ہوتیں۔ مگر حسن عقیدت کے تحت اپنے استاد کے ہا
جو چیز بھی لکھی ہوئی شاگردوں کو ملی۔ انہوں نے اسے استاد کی تحریر سمجھتے ہوتے کتاب میں داخل کر دی
۵۔ کہا جاتا ہے کہ خود امام بخاری سے صحیح بخاری کو ہزاروں نے سنا۔ بلکہ بعض حضرات اس
کی تعداد نوے ہزار بیان کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ اس وقت کا قاعدہ اور دستور تھا۔ لازماً سب لوگوں
نے لکھ بھی لیا ہوگا۔ لیکن ان ہزاروں میں سے صرف چار نسخے ابن حجر تک پہنچے۔ اور ہم تک اس کا صرف
ایک نسخہ پہنچ سکا۔ معلوم نہیں وہ نوے ہزار نسخے کہاں غائب ہوگئے۔ اگر وہ تمام نسخے مل جاتے تو معلوم
نہیں ان میں کسی قدر اختلافات پائے جاتے۔ بلکہ زندگی ان کو ایک دوسرے سے ملانے میں گزر جاتی۔

غیر فقہی احادیث کی تنقید نہ ہو سکی

فقہی مسائل کے سلسلہ میں روایات کی جانچ پڑتال فقہائے کرام نے کافی کر دی ہے۔ بلکہ ان
کے درمیان اختلافات کی بنیاد یہی ہے۔ کہ درایت کی رو سے بعض فقہاء کے نزدیک بعض روایات
صحیح نہیں۔ اور دوسرے فقہاء کے نزدیک صحیح ہیں۔

روایتی لحاظ سے صحت وضعف کا فیصلہ کرنا محدثین کا کام تھا جو انہوں نے سرانجام دیا۔ اور درایت
کی رو سے احادیث کو پرکھنا فقہاء کا کام تھا۔ وہ انہوں نے انجام دیا۔ لیکن فقہاء کا میدان مسائل فقہیہ ہی
تھے۔ فقہی مسائل سے متعلق جو احادیث ان کے سامنے آئیں۔ انہوں نے ان پر طویل بحثیں کر کے حقیقت
واضح کر دی۔ کتب فقہ اور شروح حدیث میں اس کی تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں۔

سیر، مغازی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی، ازواج مطہرات کے حالات، صحابہ کرام
کے باہمی تنازعات، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے حالات، وغیرہ یہ ایسے مسائل ہیں
جن کا تعلق سیرت و تاریخ سے ہے۔ اور سیرت و تاریخ کے موضوع پر آج تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔
ہمارے یہاں تاریخ اور سیرت کی جو کتابیں مستند مانی جاتی ہیں۔ افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ

حیثیت سے صحیح ہونے میں حائل نہیں ہوسکتی۔ اور بخاری کے علاوہ دیگر کتابوں پر اس کی فضیلت میں کوتاہی پیدا نہیں کرسکتی، کیونکہ قلیل اور نادر چیزوں کی طرف التفات نہیں کیا جاتا رحالانکہ اب زمانہ الٹا ہے تھوڑی سی خامی دیکھ کر تمام کتاب پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ بلکہ ایک بہت بڑا طبقہ بخاری و مسلم پر اسی لحاظ سے دشنام طرازی پر اترا ہوا ہے۔ (بلکہ اس طبقہ میں بعض علماء بھی شامل ہیں) اور حق بات وہی ہے جو ہم نے پہلے کہی تھی کہ دونوں کتابوں کا اصح ہونا دوسری کتابوں کے مقابلہ میں صرف مجموعی اور اجمالی حیثیت سے ہے۔ تفصیلی طور پر ایک ایک حدیث سے متعلق نہیں۔ قواعد علوم الحدیث ص۶۷

مذکورہ بالا تصریحات سے جو خود محدثین کرام اور حفاظ حدیث کی تصریحات ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے:۔

۱۔ کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف کہنا۔ نیز کسی راوی کو ثقہ اور ضعیف قرار دینا محض ایک ظنی اور اجتہادی شئے ہے۔ یہ فیصلہ قطعی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جس حدیث کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے۔ وہ صحیح نہ ہو۔ ایسے ہی جسے انہوں نے ضعیف قرار دیدیا وہ ضعیف نہ ہو۔

۲۔ بخاری و مسلم میں ضعیف راویوں، مدلسین اور خراب حافظہ والے راویوں بلکہ شیعہ راویوں کی روایتیں بھی ہیں۔ لہٰذا ہر وہ حدیث جو بخاری و مسلم میں ہو اس کا صحیح ہونا ضروری نہیں۔ اگرچہ بیشتر صحیح ہوتی ہیں۔

۳۔ علمائے محدثین نے خود بخاری و مسلم میں ضعیف حدیثوں کی نشان دہی کی ہے۔ چنانچہ امام دارقطنی نے صحیحین کی دو سو روایتوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔ حافظ ابومسعود دمشقی اور ابوعلی غسانی نے باقاعدہ صحیحین کے لئے استدراکات کے نام سے دو مجموعے تیار کئے جن میں اُن حدیثوں کو یکجا کر دیا گیا ہے، جن پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ حافظ عراقی نے بھی اس موضوع پر باقاعدہ ایک کتاب تصنیف کی ہے۔

۴۔ ہمارے محدثین نے عام طور پر زیادہ تر اسناد پر زور دیا ہے۔ اور سند دیکھ کر حکم لگا دیا ہے کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف ہے۔ انہوں نے عموماً درایت سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ ایسی ایسی فحش غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں جن کی کوئی تاویل ممکن نہیں ہے۔ مثلاً معراج نبوت سے قبل ہوچکی تھی۔ شرح صدر بچپن میں ہوا تھا۔ حضرت ابوسفیانؓ نے حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح کرنے کی درخواست کی تھی۔ حجۃ الوداع میں طواف افاضہ

فرماکر۔ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھی تھی۔ظہر کی نماز پڑھ کر منیٰ گئے تھے۔غزوہ بنی قریظہ میں آپ نے حکم دیا تھا کہ ظہر کی نماز بنو قریظہ میں پڑھی جائے، نہیں۔ یہ حکم دیا تھا کہ عصر کی نماز بنو قریظہ میں پڑھی جائے۔عیاذاً باللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا۔اور آپ پر اس کا اثر بھی ہو گیا تھا وغیر ذٰلک۔

بعض اوقات فقہا نے درایت **درایت سے صحیح السند حدیث رد کی جا سکتی ہے۔** سے کام لیتے ہوئے صحیح السند روایات کو بھی قبول نہیں کیا۔

مثال کے طور پر قلتین کی حدیث کو لے لیجئے۔اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ پانی کی مقدار جب دو قلہ ہو تو وہ کسی نجاست کے گرنے سے ناپاک نہیں ہوتا۔

قلہ بڑے مٹکے کو کہتے ہیں۔جس میں پانچ سو رطل یعنی سوا چھ من پختہ پانی آجاتے۔یہ حدیث بلحاظ سند صحیح ہے۔مگر درایت کی رو سے اس میں جو خامیاں ہیں ان کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔

فقہائے شافعیہ نے اس کی سند دیکھ کر اسی کے مطابق فتوی دیدیا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی اپنی کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" باب اسباب اختلاف مذاہب الفقہاء میں لکھتے ہیں:۔

اس کی مثال حدیث قلتین ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔اور بہت سے طریقوں سے مروی ہے جو بیشتر اس سلسلہ سند پر منتہی ہوتے ہیں۔ولید بن کثیر۔محمد بن جعفر بن زبیر سے وہ عبداللہ سے یا ولید محمد بن عباد بن جعفر سے وہ عبید اللہ بن عبداللہ سے۔پھر عبداللہ اور عبید اللہ دونوں حضرت عبداللہ بن عمر سے۔پھر اس سند کے بعد اس کے بہت سے طریقے شاخ در شاخ پھیلے۔

عبداللہ اور عبید اللہ دونوں اگرچہ ثقہ راوی ہیں۔لیکن ان علماء میں سے نہیں جن پر فتوی کا دارومدار اور لوگوں کا اعتماد تھا۔اس وجہ سے یہ حدیث نہ سعید بن المسیب کے عہد میں ظاہر ہوئی اور نہ زہری کے زمانہ میں۔اور نہ اس پر مالکیہ ہی چلے اور نہ حنفیہ۔چنانچہ ان سب نے اس پر عمل نہیں کیا۔

گویا درایت کے لحاظ سے روایت میں یہ نقص پیدا ہوا کہ ابن عمرؓ ہمیشہ مدینہ میں قیام پذیر رہے۔

مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ یعنی سعید بن المسیب سالم بن یسار اور عروۃ بن الزبیر وغیرہم اور پھر ان کے بعد امام مالک اور ان کے شاگردوں تک یہ حدیث پہنچنی چاہئے تھی۔ مگر ان میں سے کسی کے پاس یہ حدیث نہیں پہنچی اور نہ کوئی اس کا قائل ہوا۔ لہٰذا یہ حدیث قابل اعتماد نہیں ہوسکتی۔

اس تقریر کا مقصد یہ ہے کہ ایک صحابی حدیث بیان کرے۔ اور پھر اس کی بیان کردہ وہ حدیث اسی شہر کے افراد میں سے کسی فرد کو معلوم نہ ہو جہاں وہ صحابی رہتا ہے۔ اس سے وہ روایت مشکوک ہو جاتی ہے، کہ کہیں یہ اس صحابی کی جانب غلط روایت تو منسوب نہیں کر دی گئی۔ یا اس صحابی کے مشہور شاگردوں اور اولاد میں سے کوئی روایت نہ کرے لیکن ایک غیر متعلق شخص اسے روایت کرے۔ تو یہ طریقۂ کار روایت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔

حافظ ابن القیم نے "تہذیب سنن ابی داؤد" میں اس حدیث پر بڑی لمبی بحث فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

یہ حدیث حلال و حرام اور پاک و ناپاک کا فیصلہ کرنے والی ہے۔ اور پانیوں کے بیان میں اس کی وہی حیثیت ہے جو زکوٰۃ کے سلسلہ میں اوسق کی۔ اور مختلف نصابہائے زکوٰۃ کی ہے۔ (اوسق وسق کی جمع ہے۔ یہ کھجوروں کے ناپنے کا ایک پیمانہ تھا)

پھر یہ حدیث صحابہ میں کیوں مشہور اور شائع نہیں ہوئی کہ خلف اس کو سلف سے نقل کرتے چلے آتے۔ حالانکہ امت کو نصابہائے زکوٰۃ سے بڑھ کر اس کی شدید ضرورت ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ بیشتر لوگوں پر فرض نہیں ہوتی لیکن پاک پانی سے وضو کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس لحاظ سے اس حدیث کا نقل کرنا اسی طرح واجب قرار پاتا ہے، جس طرح کہ پیشاب کی نجاست اور اس کے دھونے کی فرضیت کا نقل کرنا۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ اس حدیث کا بجز حضرت عبداللہ بن عمر اور ان سے بجز عبیداللہ اور عبداللہ کے کوئی راوی نہیں۔ پھر نافع۔ سالم۔ ایوب اور سعید بن المسیب کدھر چلے گئے۔ اور اہل مدینہ اور ان کے علماء اس سنت سے جس کا نکاس ان ہی کے یہاں ہے کہاں غافل ہو گئے۔ حالانکہ خلق اللہ میں اس سنت کی سب سے زیادہ ضرورت انھی کو تھی کیونکہ پانی کی ان کے یہاں بڑی قلت تھی۔ اور یہ بات بالکل بعید ہے

کہ یہ سنت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ہوتی، اور ان کے ساتھیوں میں اور ان کے شہر میں جو اہل علم تھے ان ہی سے مخفی رہتی۔ اور ان میں سے کوئی بھی اس سنت کی طرف نہ جاتا۔ اور نہ وہ لوگ اس کو روایت کرتے۔ اور نہ آپس میں اس کا چرچا کرتے۔ حالانکہ جو شخص بھی انصاف سے کام لے گا۔ اُس پر اس بات کا مخفی رہنا ناممکن ہوگا۔ پس یہ سنت عظیم المرتبت اگر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ہوتی تو ان کے اصحاب اور اہل مدینہ سب لوگوں سے زیادہ اس کے قائل ہوتے۔ اور سب سے زیادہ اس کو روایت کرتے۔ سو اس سے بڑھ کر اور کیا شذوذ ہو سکتا ہے۔ اور جب کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے شاگردوں میں سے کوئی ایک فرد بھی اس تحدید کا قائل نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ کے پاس اس بارے میں کوئی سنتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ تھی۔ تہذیب سنن ابی داؤد ص ۸۵-۸۷

شاہ ولی اللہ دہلوی اور علامہ ابن القیم کے اقوال نقل کرنے کے بعد مولانا عبدالرشید نعمانی اپنی کتاب "ابن ماجہ اور علم حدیث" میں لکھتے ہیں۔

قلتین کی طرح آمین بالجہر کی حدیث بھی ہے۔ چنانچہ محدث دارقطنی اس کو اپنی "سنن" میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

قال ابو بکر ھذہ سنۃ تفرد بھا اھل الکوفۃ	ابو بکر عبداللہ بن ابی داؤد سجستانی کا بیان ہے کہ یہ وہ سنت ہے جس کی روایت صرف اہل کوفہ نے کی ہے۔

اور اس پر مستزاد یہ کہ خود علمائے کوفہ میں سے کسی کا اس روایت پر عمل نہیں۔

اسی طرح خیار مجلس کی حدیث کہ نہ اس پر فقہائے سبعہ نے عمل کیا۔ اور نہ فقہائے کوفہ نے۔ اور حدیث مصراۃ۔ (وہ دودھ کا جانور جس کا دودھ چند وقت نہ دوہا جائے۔ تاکہ خریدار یہ دیکھ کر کہ یہ جانور بہت دودھ والا ہے۔ دھوکا کھا کر زیادہ قیمت دے دے) کہ جو کوئی ایسا جانور خریدے وہ اس کے دوہنے کے بعد اختیار رکھتا ہے کہ چاہے اس کو رکھے اور چاہے واپس کر دے۔ اور اس کے ساتھ ایک صاع خرما بائع کو دیدے۔ یہ اس دودھ کا عوض ہے جو خریدار نے نکالا ہے۔

اس روایت پر نہ امام ابو حنیفہ کا عمل ہے اور نہ امام مالک کا۔ اور دوسری وہ تمام روایات کہ جن پر عہد صحابہ و تابعین میں ائمہ کا فتویٰ نہ تھا۔ ان سب روایات کے بارے میں فقہاء اور ارباب روایت کا نقطۂ نظر بالکل جدا جدا تھا۔ فقہاء ان تمام روایات کو تعامل و توارث سلف کی روشنی میں جانچتے تھے۔ اور ارباب روایت صرف صحت سند پر مدار رکھتے تھے۔ ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۰۳

ان تصریحات سے یہ بات سامنے آگئی کہ شاہ ولی اللہ اور علامہ ابن القیم نے قلتین کی حدیث کو صرف اس بنیاد پر رد کر دیا ہے۔ کہ معاملہ بہت اہم اور لوگوں کی عام ضرورت سے متعلق تھا۔ لیکن اس روایت کو صحابہ میں سے صرف حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور تابعین میں سے صرف عبید اللہ اور عبد اللہ بیان فرما رہے ہیں۔ اتنے اہم مسئلہ کو ایک بڑی جماعت کو بیان کرنا چاہئے تھا۔ لہٰذا روایت سند کے اعتبار سے کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو وہ قابل اعتماد نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد مولانا عبد الرشید نعمانی صاحب نے اور بھی چند مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ مثلاً آمین بالجہر خیار مجلس اور بیع مصراۃ کی حدیثیں جو ان کے نزدیک اس لئے قابل اعتماد نہیں ہیں کہ انہیں ایک شہر کے لوگ روایت کرتے ہیں۔ دوسرے شہروں کے لوگ روایت نہیں کرتے۔ اور سند کے لحاظ سے صحیح ہونے کے باوجود اسی شہر کے علماء و فقہاء انہیں قبول نہیں کرتے۔

صحاح ستہ میں ہر طرح کی حدیثیں ہیں

اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ ہمارے علماء و فقہاء نے تسلیم کیا ہے کہ حدیث کی تمام کتابوں میں ہر حدیث صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ہر کتاب میں ضعیف احادیث موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں خود محدثین کی تصریحات ہم تفصیل کے ساتھ اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔

مزید برآں علامہ ابن تیمیہ کی بھی ایک تصریح مولینا عبد الرشید نعمانی نے پیش فرمائی ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف فرماتے ہیں۔

"اور کبھی موضوع سے مراد وہ روایت ہوتی ہے کہ جس کے ثبوت کی نفی معلوم ہو۔ اگرچہ اس کے

بیان کرنے والے نے قصداً غلط بیانی نہ کی ہو، بلکہ روایت کرنے میں چوک گیا ہو۔ اور ایسی روایتیں مسند میں موجود ہیں۔ بلکہ سنن ابی داؤد اور سنن نسائی میں بھی ہیں۔ بلکہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم تک میں بعض احادیث میں اس قسم کے الفاظ آگئے ہیں۔ ابن ماجہ وعلم حدیث ص ۲۱۱

واضح رہے کہ بھول چوک اور سہو ونسیان ہر شخص سے ممکن ہے۔ اگر کسی سے بھول چوک ہو جائے، لیکن اس کی نیت خراب نہ ہو تو اس سے اس کی عظمت و بزرگی میں کوئی فرق نہیں آجاتا۔ ایسی بھول چوک تو خاتم المعصومین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہو گئی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اس پر شاہد ہے۔ اسی طرح تمام محدثین سے بھول چوک ہوتی ہے۔

مثلاً امام بخاری نے باب احداد المرأۃ علی غیر زوجہا کے تحت حسب ذیل روایت نقل کی ہے۔

زینبؓ بنت ابی سلمہ کا بیان ہے کہ جب شام سے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر آئی تو ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے زردی (ابٹن) منگوا کر اپنے دونوں رخساروں پر اور دونوں کلائیوں پر ملا اور فرمانے لگیں کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہ سنا ہوتا تو مجھے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو عورت اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے۔ اس کو یہ روا نہیں کہ وہ سوائے شوہر کے اور کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے۔ شوہر پر البتہ عورت کو چار ماہ دس دن تک سوگ کرنا پڑے گا۔ بخاری ج ۱ ص ۱۷۰

یہ روایت اگرچہ صحیح ہے۔ مگر اس میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ ام المؤمنین ام حبیبہؓ کے والد ماجد حضرت ابوسفیانؓ کی وفات کی خبر شام سے آئی۔ یہ غلط ہے۔ حضرت ابوسفیانؓ کا انتقال ۳۲ھ یا ۳۳ھ میں مکہ معظمہ میں ہوا تھا۔ اسی لئے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے :۔

اس روایت کی جتنی سندات ہیں اُن میں کہیں مذکور نہیں کہ یہ خبر شام سے آئی تھی۔ یہ الفاظ صرف سفیان بن عیینہ نے نقل کئے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کا وہم ہے۔

محدث احمد علی سہارنپوری بخاری کے حاشیہ میں رقم طراز ہیں۔

ابن حجر لکھتے ہیں یہ راوی کا وہم ہے۔ اس لئے کہ ابوسفیانؓ کا انتقال متفقہ طور پر مکہ میں ہوا۔

شام میں توام حبیبہؓ کے بھائی یزیدؓ بن ابی سفیان کا انتقال ہوا تھا۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ سنن دارمی اور مسند احمد میں روایت میں یہ الفاظ آئے کہ جب ام حبیبہؓ کے پاس شام سے ان کے بھائی کی موت کی خبر آئی۔ حاشیہ بخاری ج ۱ صـ۱۷۰ ۔

اسی طرح صحیح بخاری باب مناقب عثمانؓ میں ولیدؓ بن عقبہ پر شراب کی حد لگانے کے سلسلہ میں آیا ہے پھر حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو بلا کر یہ حکم دیا کہ ولیدؓ کو کوڑے لگائیں۔ چنانچہ انہوں نے ولیدؓ کو اسی کوڑے مارے حالانکہ دیگر صحیح ترین روایات سے ثابت ہے کہ ولیدؓ کو اسی نہیں، بلکہ چالیس کوڑے مارے گئے تھے، جیساکہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے۔

غزوہ بنی قریظہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب سے واپسی پر صحابہ کرام کو یہ ہدایت فرمائی تھی۔ کہ کوئی شخص ظہر کی نماز راستہ میں نہ پڑھے۔ بلکہ ظہر کی نماز بنو قریظہ پہنچ کر پڑھنی ہے۔ صحیح مسلم میں یہ روایت انہی الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔ لیکن امام بخاریؒ نے "باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب" میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے۔

لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظة۔ کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے یہ روایت ایک ہی استاد اور ایک ہی سند سے نقل کی ہے۔ اہل سیر اور مورخین متفق ہیں کہ یہ حکم عصر کے سلسلہ میں دیا گیا تھا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ میری تحقیق یہ ہے کہ یہ تمام غلطی بخاری کے استاد عبداللہ بن محمد بن اسماء سے ہو رہی ہے۔ وہ کبھی ظہر کہتے ہیں اور کبھی عصر۔ بخاری ج ۲ صـ۵۹۱

کوئی کتاب تنقید سے بالاتر نہیں

الغرض یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جو احادیث آگئی ہیں۔ وہ تنقید سے بالاتر ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ان کی کوئی روایت غلط نہیں ہے۔ خود محدثین

لام نے صحیحین میں غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس سے ان کتابوں کی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ایک تو اکثریت ان میں صحیح احادیث کی ہے۔ اور جو بھی حکم جاری کیا جاتا ہے۔ وہ اکثریت کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ اور ثانیاً بقیہ تمام کتب احادیث کے مقابلہ میں صحیح ترین ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی مشہور اہل حدیث عالم نے "مسک الختام" میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے یہی بات نقل فرمائی ہے۔ بلکہ نواب صاحب خود لکھتے ہیں۔

ان چھ کتابوں کو "اصول ستہ" "صحاح ستہ" "کتب ستہ" اور "امہات ستہ" کہتے ہیں شیخ عبد الحق محدث دہلوی "اشعتہ اللمعات" میں فرماتے ہیں کہ چھ کتابیں جو اسلام میں مشہور ہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ اور بعض کے نزدیک ابن ماجہ کے بجائے مؤطا ہے۔ اور صاحب جامع الاصول نے مؤطا ہی کو اختیار کیا ہے۔ اور ان کتابوں میں حدیث کی جتنی قسمیں ہیں یعنی صحیح، حسن اور ضعیف سب موجود ہیں۔ اور ان کو صحاح اکثریت کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ مسک الختام ج ا ص ۱۷

موجودہ دور میں بعض علماء نے جو یہ تصور کر لیا ہے، کہ بخاری و مسلم کی تمام روایات نہ صرف صحیح بلکہ شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ اگر وہ تحقیقی کتابوں کا مطالعہ کرتے تو اُن کا یہ مغالطہ دور ہو جاتا۔

اور بعض حضرات نے تو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے ہوئے صحیحین کو قرآن کے برابر قرار دے دیا۔ مشہور مفکر قرآن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے ایک مضمون میں جو معراج کے سلسلہ میں اخبار جنگ مورخہ ۱۱۔ اپریل ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ لکھتے ہیں:۔

"ہم فی الواقع اتنے خوش قسمت ہیں کہ وہ واقعہ مفصل طور پر حدیث کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اور دوسرے یا تیسرے طبقہ کی کتابوں کی نہیں ہے۔ بلکہ متفق علیہ ہے۔ جس کا پایہ جیسا کہ عرض کیا گیا جا چکا ہے۔ روایت اور سند کے اعتبار سے تقریباً قرآن مجید کے برابر ہے۔"

واقعتاً ڈاکٹر صاحب بہت ہی خوش قسمت ہیں کہ ان کے پاس اب تین تین قرآن موجود ہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ اُس دور میں اور لوگوں نے بھی صحیح کتابیں لکھی تھیں۔ ان بے چاروں نے آخر کون سا قصور کیا تھا جو ان کی کتابوں کو اس برابری کی نعمت سے نوازا نہیں گیا۔ مثلاً صحیح ابن حبان، صحیح ابوعوانہ

صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن السکن۔ اس طرح قرآنوں کی تعداد سات تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ وہ قرآن بھی شامل کر لئے جائیں جو جناب "غائب" لے کر غائب ہو گئے" تو اس تعداد میں کچھ اور اضافہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے حضرت مالکؓ بن صعصعہ کی جو حدیث پیش کی ہے وہ قتادہ عن انس کی سند سے مروی ہے۔ لیکن دوسرے مقام پر بخاری نے اس حدیث کو شریک عن انس کی سند سے نقل کیا جس میں یہ الفاظ ہیں کہ معراج نبوت سے قبل ہوئی۔ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں یہ روایت منکر ہے۔ ببیں تفاوت از کجا تا بکجا۔

ڈاکٹر صاحب اس مضمون کی پہلی قسط میں جو ۷ اپریل کو شائع ہوئی تحریر فرماتے ہیں:۔

"سند کے اعتبار سے قوی ترین احادیث وہ ہیں جو صحیحین میں ہیں۔ یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں۔ ان میں سے بھی وہ احادیث جو ان دونوں میں موجود ہوں۔ جن کی صحت پر یہ دونوں امام متفق ہو گئے ہوں۔ وہ اپنی سند کے اعتبار سے قرآن مجید کے آس پاس پہنچ جاتی ہیں"۔

یعنی جو صرف بخاری یا صرف مسلم میں موجود ہوں، ان کا فاصلہ کچھ تھوڑا سا زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ آس پاس کا مفہوم ہم یہی سمجھ پاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مزید رقم طراز ہیں:۔

"اس متفق علیہ حدیث میں جو تفاصیل آئی ہیں۔ انہیں ہمیں من و عن ماننا ہوگا"۔ (اخبار جنگ ۷ اپریل ۱۹۸۶ء)

بخاری و مسلم میں واقعۂ معراج حضرت ابوذرؓ سے بھی مروی ہے۔ اور انہوں نے جو تفصیلات بیان کی ہیں۔ اُن میں اور اس روایت کی تفصیلات میں فرق ہے۔ بلکہ بعض امور میں تضاد پایا جاتا۔ اسے من و عن کیوں نہ قبول کیا جائے؟

صحیح بخاری کے نسخے

علامہ عبدالرشید نعمانی دارالعلوم ندوۃ العلماء کتاب "ابن ماجہ اور علم حدیث" میں لکھتے ہیں۔
امام بخاری کی اس کتاب کو اگرچہ ہزارہا آدمیوں نے سنا لیکن امام موصوف کے جن تلامذہ سے صحیح بخاری کی روایت کا سلسلہ چلا وہ چار بزرگ ہیں:۔

۱۔ ابراہیم بن معقل بن الحجاج النسفی المتوفی ۲۹۴ھ

۲۔ حماد بن شاکر النسفی المتوفی ۳۱۱ھ

۳۔ محمد بن یوسف الفربری المتوفی ۳۲۰ھ

۴۔ ابوطلحہ منصور بن محمد بن علی بن قرینۃ البزدوی المتوفی ۳۲۹ھ

ان میں اول الذکر دونوں بزرگ حنفی عالم ہیں۔ اور ابراہیم بن معقل ان سب میں اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ وہ حافظ الحدیث بھی تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے "فتح الباری" کے شروع میں اپنا سلسلہ سند ان چاروں حضرات تک بیان کر دیا ہے۔

فربری نے امام بخاری سے الصحیح کا دوبار سماع کیا۔ ایک بار ۲۴۸ھ میں اپنے وطن فربر میں جب امام ممدوح وہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ دوسری بار ۲۵۲ھ میں خود بخارا جاکر۔ اس کے باوجود کچھ حصہ ابوحاتم الوراق سے سننا پڑا۔ ملاحظہ ہو۔ سیرۃ البخاری مولانا عبدالسلام مبارک پوری۔

اس سے ذرا کچھ پہلے علامہ عبدالرشید نعمانی حاشیہ میں لکھتے ہیں۔
اگرچہ کتاب سولہ سال کی مدت میں تمام ہوگئی۔ مگر نظر ثانی اور اضافہ کا سلسلہ آخر دم تک جاری رہا۔ یہی وجہ ہے کہ فربری کے نسخہ میں جنہوں نے اس کو امام بخاری سے بعد میں سنا ہے۔ حماد بن شاکر کے نسخہ سے دو سو اور ابراہیم بن معقل کے نسخہ سے تین سو احادیث زیادہ مروی ہیں۔ تدریب الراوی صفحہ ۳۰

صحیح بخاری زیر تکمیل تھی

صحیح بخاری کے موجودہ نسخے میں جو حدیث اور ترجمۃ الباب (عنوان باب) میں بہت سے مقامات پر بے ربطی اور سوء ترتیب نظر آتی ہے۔ اور جس کی شکایت شاہ ولی اللہ نے اپنے مکتوبات ص۱۷۱ میں بایں الفاظ کی ہے:۔

در عقد تراجم سوئے ترتیب و تقریر یا ور دریاں آید۔ و اہل علم را مطمح نظر مطالب علمیہ می باشد نہ تراجم و ترتیب

ے شیشہ صاف از نباشد گو سفاں درد باش
رندے آشام را بایں تکلفہا چہ کار !!

اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ بعض مقامات پر امام ممدوح نے اضافہ کرنا چاہا تھا، مگر اس کو موقع نہ مل سکا۔ چنانچہ کہیں باب قائم کر دیا تھا۔ مگر اس کے تحت حدیث درج کرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ کہیں حدیث لکھ لی تھی لیکن باب قائم نہ کر سکے تھے۔ بہر حال کتاب کے بہت سے مقامات اسی طرح تشنۂ تکمیل ہی تھے کہ امام بخاری نے اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی بعد کو ناسخین نے اپنی صوابدید کے مطابق جن ابواب میں چاہا ان حدیثوں کو نقل کر دیا۔ چنانچہ حافظ ابوالولید باجی اپنی کتاب "اسماء الرجال البخاریؒ" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

ہم سے حافظ ابوذر ہروی نے بیان کیا کہ ہمیں ابو اسحٰق مستملی نے بتایا کہ میں نے صحیح بخاری کو اس کے اصل نسخہ سے جو فربری کے پاس موجود تھا نقل کیا تو میں نے دیکھا کہ اس میں بعض چیزیں تو ناتمام ہیں اور بعض چیزوں کی تبییض ہو چکی ہے۔ چنانچہ بعض تراجم ابواب ایسے تھے کہ ان کے بعد کچھ درج نہ تھا۔ اور بعض حدیثیں ایسی تھیں کہ ان پر ابواب نہ تھے۔ پھر ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیا۔

باجی کہتے ہیں کہ اس بیان کی صحت کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ ابو اسحٰق مستملی، ابو محمد سرخسی، ابوالہیثم کشمیہنی اور ابو زید مروزی نے جو صحیح بخاری کی روایتیں کی ہیں۔ ان سب کی روایتوں میں باہم

تقدیم و تاخیر کا اختلاف ہے۔ حالانکہ اصل نسخہ جس سے نقل کیا ہے ایک ہی ہے۔ یہ اختلاف اس لئے ہوا کہ ہر ایک نے جو کچھ کتاب کے حاشیہ یا اس کے ساتھ کسی پرچہ پر لکھا ہوا پایا، اس کو اپنے اندازے سے کہ یہ عبارت فلاں جگہ کی ہونی چاہئے اسی جگہ نقل کر دیا چنانچہ یہ چیز اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دو دو اور دو سے زائد ترجمۃ الباب لکھے ہوئے ہیں۔ مگر ان میں حدیثیں نہیں ہیں۔

حافظ سلیمان بن خلف ابوالولید الباجی المتوفی ۴۷۴ھ کا بیان ہے کہ یہ چیز میں نے یہاں اس لئے ذکر کی ہے کہ ہمارے اہل وطن ایسے معنی کی دُھن میں لگے رہتے ہیں کہ جس سے ترجمۃ الباب اور حدیث میں باہمی ربط قائم ہو سکے۔ اور وہ اس سلسلے میں بے جا تاویلات کی بلا وجہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ مقدمہ فتح الباری ج ۱ صـ۶ ۔ ابن ماجہ اور علم حدیث صـ۲۱۳

یہ تمام تفصیلات پڑھنے کے بعد جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ صحیح بخاری ایک زیر تصنیف کتاب تھی۔ امام بخاری اسے مکمل نہیں کر پائے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اور ہمارے پاس جو ان کی کتاب پہنچی ہے۔ وہ ایک زیر تکمیل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ وہ اس میں برابر اضافے کرتے رہتے تھے۔ اور نظر ثانی فرماتے رہتے تھے۔ جہاں آپ اس میں اضافے فرماتے وہاں کچھ حصے کاٹتے بھی رہے ہوں گے۔ کیونکہ زیر تصنیف کتاب میں یہ دونوں باتیں ہوتی ہیں۔

۳۔ احادیث کی تعداد مختلف نسخوں میں مختلف تھی۔ ایک نسخہ میں دو سو حدیثیں کم تھیں۔ تو دوسرے نسخے میں تین سو احادیث کم تھیں۔

۴۔ اصل کتاب میں بہت سی احادیث حاشیہ پر لکھی ہوئی تھیں۔ اور کچھ حدیثیں الگ پرچوں پر لکھی ہوئی پائی گئیں۔ اور نقل کرنے والوں نے اپنی صوابدید کے مطابق ان کو بھی اصل کتاب میں شامل کر دیا۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اصل کتاب میں شامل نہ ہوں۔ بلکہ امام بخاری نے انہیں محض اپنی یادداشت کے طور پر حاشیہ میں یا الگ پرچوں پر لکھ لیا ہو۔ معلوم نہیں اگر زندگی میں انہیں کچھ اور موقع دستیاب ہوتا تو وہ ان چیزوں کو اصل کتاب میں شامل کرتے یا نہ کرتے۔

ان میں سے بیشتر سبائیوں کی وضع کردہ ہیں۔ہمارے یہاں بنیادی کتابیں ابن جریر طبری کی تاریخ الامم والملوک اور ابن اسحٰق کی کتاب المغازی ہے (جس کا خلاصہ سیرت ابن ہشام ہے) بعد کی تمام تاریخوں کی بنیاد انہی پر قائم ہے۔اور ان دونوں میں سے کوئی شخص بھی روایت کے اعتبار سے ثقہ اور حجت نہیں، حتیٰ کہ یہ مسلمہ امر ہے کہ ہر دو ایرانی النسل اور سبائی مسلک کے پیروکار تھے۔ان کی کتابیں تاریخ وسیر کے نام سے تبرا سے معمور نظر آتی ہیں۔ہم ان کا تفصیلی جائزہ حصہ اول میں پیش کر چکے ہیں۔

اسی طرح کتب احادیث میں ان موضوعات سے متعلق جو احادیث آگئی ہیں۔اُن کی بھی آج تک چھان پھٹک نہیں ہوئی۔محدثین نے انہیں اس لئے نظر انداز کر دیا کہ ان روایات کا تعلق فضائل سے ہے۔اور فضائل کے سلسلہ میں یہ اصول بنالیا گیا ہے کہ ہر روایت چلتی ہے لیکن موجودہ دور میں اس چالو مال نے عقائد کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لہٰذا ان روایات کو چالو مال سمجھ کر نظر انداز کرنا بہت خطرناک ہے۔بلکہ ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ میں فضائل علی وغیرہ سے متعلق روایات پڑھ کر ایک نو آموز شیعہ تو بن سکتا ہے۔سچا اہل سنت ہرگز نہیں بن سکتا۔

فقہاء نے ان کی طرف اس لئے توجہ نہیں فرمائی کہ ان روایات کا فقہی مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا۔اور اور تاریخ وسیر میں، ابوحنیفہ، مالک، شافعی، اور احمد بن حنبل جیسا کوئی ایسا امام نہیں گزرا جو درایت کے نقطۂ نظر سے ان احادیث و روایات کا جائزہ لیتا۔اسے ہماری تاریخ کا صرف المیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ فقہی مسائل سے ہٹ کر دوسرے موضوعات سے متعلق جو روایات صحاح ستہ، یا صحیحین میں داخل ہو گئی ہیں، اسی طرح وہ تاریخی روایات جن کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابۂ کرام سے ہے، ان کا درایت و روایت ہر دو لحاظ سے جائزہ لے کر ان کی حقیقت عوام کے سامنے واضح کی جائے۔ہم نے مذہبی داستانوں کے نام سے جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کا یہ دوسرا حصہ قارئین کرام کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اور بعد ازاں تیسرا حصہ بھی انشاءاللہ پیش کیا جائے گا۔یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم اسی خارزار سے کس طرح اپنے جسم اور دامن کو بچاتے ہوئے پار ہو رہے ہیں، اس کا فیصلہ قارئین فرمائیں گے۔ ہاں قارئین سے یہ ضرور استدعا ہے کہ وہ ہماری ہدایت

ونجات کے لئے دعا ضرور فرمائیں۔ تاکہ ان کی دعاؤں کے طفیل ہم اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

خبر واحد۔ ایک اور بحث خبر واحد کی ہے۔ خبر واحد وہ روایت ہے جس کے سلسلہ سند میں روایت کا دارو مدار کسی مقام پر صرف ایک راوی پہ موقوف ہو۔ اور کوئی اور شخص اس روایت کو نقل نہ کرر ہا ہو۔ اس قسم کی روایت کی قبولیت وعدم قبولیت اور یقینی وظنی ہونے میں اختلاف ہے۔ معتزلہ تو اس کے قائل ہیں کہ خبر واحد قطعاً ناقابل قبول ہے لیکن یہ ان کا انکار خلاف عقل ہے۔ ہم روزمرہ زندگی میں ہمہ وقت اس قسم کی روایات پر فوری یقین کر لیتے ہیں۔ اور کوئی جرح نہیں کرتے۔ مثلاً ایک شخص ہم سے آ کر کہتا ہے کہ تمہیں فلاں شخص بلا رہا ہے۔ یا باہر سے آ کر کہتا ہے کہ سڑک پر حادثہ ہو گیا۔ ہم فوراً اسے قبول کرتے ہیں۔ اور ہرگز یہ کہہ کر رد نہیں کرتے کہ یہ خبر واحد ہے، لہذا ہم اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس کے برعکس اکثر محدثین اس کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں لیکن درحقیقت یہ تفریط ہے۔ صحابہ کا طرز عمل اس کے خلاف ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری حضرت عمرؓ کی خدمت میں گئے۔ اور تین بار اجازت طلبی کی چونکہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، کچھ جواب نہ ملا۔ وہ واپس چلے گئے۔ حضرت عمر نے کام سے فارغ ہو کر انہیں بلوا بھیجا۔ اور واپسی کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے کہا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تین بار کی اجازت طلبی کے بعد اگر جواب نہ ملے تو واپس چلے جاؤ۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اس روایت پر گواہ لاؤ۔ ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری نے اس پر شہادت پیش کی تو حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا۔

حضرت عمرؓ نے اس روایت کا انکار اس بناء پر نہیں کیا تھا۔ کہ حضرت عمرؓ خبر واحد کو قبول کرنا نہیں چاہتے تھے۔ حالانکہ انہوں نے اُس خبر واحد کو قبول کر لیا تھا جو ان کے انصاری بھائی نے اُن سے بیان کی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو طلاق دیدی۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ حضرت عمر خبر واحد کی قبولیت کے منکر نہ تھے۔

نیز یہ بھی ممکن نہیں کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک حضرت ابو موسیٰ اشعری ثقہ نہ تھے، اس لئے اُن کی روایت

کو رد کر دیا۔ حالانکہ حضرت عائشہؓ نے حضرت عمرؓ کی پیش کردہ ایک روایت کا انکار کر دیا تھا۔ اس کی صرف یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ چونکہ حضرت عمرؓ ایک عرصہ دراز تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے۔ اور انہوں نے یہ حدیث نہ سنی تھی۔ حالانکہ حدیث ایسے امر کے متعلق تھی جو عموماً پیش آتا رہتا ہے۔ لہذا اس کا علم اکثر کو ہونا چاہئے تھا۔ اسی لئے حضرت عمرؓ کو اس پر یقین نہ آیا۔ اور شہادت طلب کی۔

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی۔ میراث کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں۔ اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں مجھے کوئی روایت معلوم ہے۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے شہادت دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایسے اہم مسئلہ میں تنہا ان کی شہادت کافی نہیں سمجھی۔ جب ایک اور صحابی حضرت محمد بن مسلمہؓ نے شہادت دی تو حضرت ابوبکرؓ نے دادی کو میراث دلوائی۔

اسی طرح جنین (پیٹ کا بچہ) کی دیت کے متعلق حضرت عمرؓ نے حضرت مغیرہؓ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی۔ اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔

اسی بنا پر فقہائے احناف کا یہ اصول ہے کہ خبر واحد ظنی الثبوت ہے۔ اس سے قطعیت ثابت نہیں ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ خبر واحد کی صحت اور عدم صحت یا ظن وقطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر مبنی ہے۔ ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے۔ کہ فلاں نے تم کو بلایا ہے۔ تو راوی کی ثقاہت اور اعتبار کے مسلّم ہونے کے بعد ہم کو بھی اس واقعہ کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہوتا لیکن اگر یہی شخص یہ کہے کہ فلانے نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا۔ تو ذہن شک وشبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لئے ہم دوسروں سے پوچھتے پھرتے ہیں۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اگر کوئی تنہا راوی یہ بات نقل کرے کہ آپؐ فلاں موقعہ پر سپید کپڑے پہنے باہر تشریف لائے۔ تو ہمیں اس کو تسلیم کرتے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ لیکن اگر یہی راوی یہ کہے کہ آپؐ ایک روز برہنہ بدن باہر تشریف لے آئے۔ جیسا کہ اس قسم کی ایک روایت ہے۔ تو ہم اس خبر واحد کو اتنی اہم بات کے لئے ہرگز کافی نہ سمجھیں گے۔ اور اس کے ثبوت کے لئے مزید شہادت ضروری خیال کریں گے۔ اس قسم کی بہت

سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔لیکن چونکہ مقدمہ بہت طویل ہوگیا ہے۔اس لئے ہم اس وقت اتنی سی معروضات پر اکتفا کرتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ ہمیں راہ حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔اور اس پر مستقیم رکھے۔آمین ثم آمین

ماخوذ از کتاب: فقہ القرآن
(جلد اوّل)

مشہور عام روایات کی تحقیق

علم طلب کرو، خواہ چین سے کرو

یہ ایک ایسی روایت ہے جو ہر کس و ناکس کی زبان پر ہر وقت جاری رہتی ہے۔ ہم بھی اسے بچپن سے سنتے آرہے ہیں۔ بلکہ اچھے اچھے علماء و خطباء اپنی اپنی تقریروں میں یہ روایت ضرور بیان کرتے ہیں۔ بلکہ اب تو اس روایت نے سرکاری اعزاز بھی حاصل کرلیا ہے۔ موجودہ حکومت نے تو اسے ایک ٹریڈ مارک کی صورت دیدی ہے۔ اور چونکہ اس کا اظہار اکثر و بیشتر جناب صدر کی زبان مبارک سے بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے اس روایت کو صدارتی ایوارڈ کا رتبہ بھی میسر آگیا ہے۔

لیکن یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ بچپن سے لے کر آج تک ہمیں یہ حدیث کی کسی کتاب میں نظر نہیں آئی۔ اور تمام محققین نے اس کا رد کیا۔ لیکن پھر بھی یہ امر بیل کی طرح پھیلتی ہی رہی محققین نے جس شد و مد سے اس کا رد کیا ہے۔ اُس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس روایت کا وجود صدیوں قبل ہی ختم ہوجاتا، لیکن روایت پرستوں کی سلامتی کے بل بوتے پر یہ آج تک نہ صرف زندہ ہے۔ بلکہ روز بروز پروان چڑھ رہی ہے۔

بحث سے قبل یہ امر ضرور ذہن نشین کرلیں کہ نبی جس علم کی دعوت کے لئے مبعوث کیا جاتا ہے۔ وہ ہرگز وہ علم نہیں ہوتا جنہیں دنیا علم سے تعبیر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی نبی نے سائنس، انجینئرنگ، ڈاکٹری اور دیگر پیشوں کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ ان امور کو یہ کہہ کر لوگوں کی مرضی و منشا پر چھوڑ دیا گیا کہ

انتم اعلمکم با مور دنیاکم — تم اپنے دنیا وی کاموں کو زیادہ جانتے ہو۔

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ نبی جس علم کی تعلیم کے لئے آتا ہے۔ وہ علم، علم احکام الٰہی، علم آخرت اور علم لدنی کہلاتا ہے۔ اس علم کے حصول کے لئے صحابہ کرام اپنے اپنے علاقہ چھوڑ کر مدینہ جایا کرتے تھے،

انہیں مدینہ آنے کا حکم دیا جاتا۔ انہیں یہ حکم کبھی نہیں دیا گیا کہ مدینہ چھوڑ کر چین کے چکر لگائیں، ظاہر ہے کہ مدینہ آمد کا مقصد اسلام تھا۔ اور مدینہ چھوڑ کر چین بھاگ جانے کا مقصد کفر کہلاتا۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز ایسی بات نہیں فرما سکتے تھے جس سے آپ کے نصب العین کو نقصان پہنچے۔ اور نہ آج تک تاریخ میں کسی نے علم دین کے لئے چین کا سفر کیا ہے۔ بلکہ آج بھی وہاں کے جتنے سفر ہوتے ہیں۔ وہ سب سیاسی یا پیشہ ورانہ نوعیت ہی کے ہوتے ہیں۔

اب رہا محدثانہ نقطۂ نگاہ تو اس کے لئے ہم یہ عرض کر دیں، کہ اگر کوئی روایت حدیث کی قدیم ترین کتابوں میں یعنی وہ کتابیں جو دوسری اور تیسری صدی میں وجود میں آئیں، پائی جاتی ہے، تو پھر تو اس پر غور کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ روایت ان قدیم کتابوں میں موجود نہیں تو بقول شاہ ولی اللہؒ "وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ابتدائی صدیوں میں اس روایت کا کوئی وجود نہ تھا تو اس صورت میں یہ بعد کی صدیوں میں کیسے وجود میں آگئی۔ یہ امر اُس کے موضوع ہونے کی دلیل ہوگا۔ اور اگر اس کا کوئی وجود تھا۔ تو کسی نہ کسی کو نقل کرنا چاہئے تھا۔ اُن سب کا نقل نہ کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ اُن حضرات کے نزدیک یہ روایت مردود تھی۔ اور ہرگز اس قابل نہ تھی کہ اسے کسی معتبر کتاب میں نقل کیا جاتے الغرض ایسی روایت دونوں صورتوں میں مردود ہوگی" (حجۃ اللہ البالغہ)

آیئے ہم دیکھیں اور غور کریں کہ ابتدائی کتابوں میں اس روایت کا وجود ہے یا نہیں۔ تو قدیم کتابوں میں وہ کتابیں جو ہمارے ہاتھوں تک پہنچی ہیں۔ وہ حسب ذیل کتب ہیں۔ مؤطا امام مالک۔ کتاب الآثار ابو یوسف، کتاب الآثار امام محمد، کتاب الام للشافعی۔ کتاب الرسالہ، مسند حمیدی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ مسند احمد بن حنبل سنن سعید بن منصور، سنن دارمی، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، صحیح ابن السکن، المنتقیٰ لابن الجارود، سنن دارقطنی، معانی الآثار طحاوی، مشکل الآثار وغیرہ ان میں سے کسی کتاب میں اس کہانی کا کوئی وجود نہیں۔

سب سے اول یہ کہانی حاکم ابو عبداللہ النیسابوری المتوفی ۴۰۵ھ نے "المستدرک" میں نقل کی محققین کے نزدیک "المستدرک" میں ہر قسم کی رطب و یابس بھری ہوئی ہیں۔ اور علماء حاکم کی کسی روایت پر اس وقت

تک اعتماد نہیں کرتے۔ جب تک ذھبی اسے صحیح قرار نہ دیں۔

امام ابو الفرج عبدالرحمان بن علی بن الجوزی القرشی المتوفی ۵۹۷ھ اپنی "الموضوعات" میں لکھتے ہیں۔

یہ روایت کہ علم طلب کرو خواہ چین سے کرو۔ اسے حاکم نے روایت کرکے لکھا ہے کہ اس روایت کو ابو عاتکہ سے حسن بن عطیہ کے علاوہ کوئی نقل نہیں کرتا۔

یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً ثابت نہیں۔ حسن بن عطیہ کو ابوحاتم رازی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ جہاں تک ابو عاتکہ کا تعلق ہے تو بخاری کہتے ہیں یہ منکر الحدیث ہے۔ ابن حبان المتوفی ۳۵۴ھ لکھتے ہیں اس روایت کی کوئی اصل نہیں۔ الموضوعات ج ۱ ص ۲۱۵

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر بن علی بن احمد المقدسی المعروف بابن القیسرانی الشیبانی المتوفی ۵۰۷ھ اپنی "تذکرۃ الموضوعات" میں لکھتے ہیں۔

یہ روایت کہ علم طلب کرو، خواہ چین سے کرو، اس کا راوی ابو عاتکہ ہے۔ جس کا نام طریف بن سلیمان ہے۔ یہ منکر الحدیث ہے۔ اور یہ روایت منکر ہے۔ تذکرۃ الموضوعات ص ۳۹

علامہ عبدالرحمان بن علی بن محمد بن عمر الشیبانی الشافعی الاثری لکھتے ہیں۔

علم طلب کرو، خواہ چین سے کرو، کیونکہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہ روایت حضرت انسؓ کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بیان کیا جاتا ہے۔ یہ روایت ضعیف ہے۔ بلکہ ابن حبان کہتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں۔ اور ابن جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔

تمییز الطیب من الخبیث فی ما یدور علی السنۃ الناس من الحدیث ص ۲۴

جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

یہ حدیث کہ علم طلب کرو، خواہ چین سے کرو، اسے حسن بن عطیہ نے ابو عاتکہ کے ذریعہ حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں۔ یہ روایت باطل ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔ حسن بن عطیہ ضعیف ہے اور ابو عاتکہ منکر الحدیث ہے۔

سیوطی آگے لکھتے ہیں۔

اس روایت کو ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی المتوفی ۴۵۸ھ نے اپنی "شعب الایمان" میں اور حافظ ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد المعروف بابن عبدالبر المالکی الاندلسی المتوفی ۴۶۳ھ نے "کتاب العلم" میں ایک اور سند سے بھی نقل کیا ہے۔ لیکن اس کی سند میں یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کذاب ہے۔

ذھبی نے "میزان" میں یہ روایت احمد بن عبداللہ الجویباری سے نقل کی ہے لیکن وہ احادیث گھڑنے میں مشہور ہے۔ اللآلی المصنوعہ فی احادیث الموضوعہ ج ۱ ص ۱۹۳

حافظ شمس الدین ابوالخیر محمد بن عبدالرحمان السخاوی المتوفی ۹۰۲ھ اپنی مشہور زمانہ کتاب "المقاصد" میں لکھتے ہیں۔

یہ حدیث بیہقی نے "شعب" میں خطیب نے "رحلہ" میں، ابن عبدالبر نے "جامع العلم" میں اور دیلمی نے اپنی "مسند" میں ابوعاتکہ طریف بن سلیمان کے ذریعہ نقل کی ہے۔ نیز ابن عبدالبر نے اسحاق بن ابراہیم کے ذریعہ بھی نقل کی ہے۔ اور یہ دونوں حضرات انسؓ سے نقل کرتے ہیں لیکن یہ روایت دونوں سندات سے ضعیف ہے! ابن حبان کہتے ہیں یہ باطل ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔ اور ابن جوزی نے اسے موضوعات میں داخل کیا ہے۔
المقاصد الحسنہ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتہرۃ علی الالسنہ ص ۶۳

علامہ محمد طاہر پٹنی المتوفی ۹۸۶ھ لکھتے ہیں۔

علم طلب کرو خواہ چین سے کرو۔ یہ روایت ابن عدی اور بیہقی نے نقل کی ہے۔" یہ یہ روایت مشہور ہے لیکن اس کی تمام سندات ضعیف ہیں۔ تذکرۃ الموضوعات ص ۱۷

محمد بن طاہر المقدسی المتوفی ۵۰۷ھ لکھتے ہیں۔

اس روایت کا راوی ابوعاتکہ طریف بن سلیمان ہے جو منکر الحدیث ہے۔ تذکرۃ الموضوعات ص ۲۹

موجودہ دور کے ایک بہت بڑے محدث علامہ ناصر الدین البانی نے ان تمام تفصیلات کو اپنی کتاب میں جمع کر کے اُن پر خوب کھل کر بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

یہ حدیث کہ علم طلب کرو خواہ چین سے کرو۔ یہ باطل ہے۔ اسے ابن عدی نے "کامل" میں ابونعیم نے "اخبار اصفہان" میں ابن علیک النیسابوری نے "الفوائد" میں ابوالقاسم القشیری نے "الاربعین" میں خطیب

نے "تاریخ" اور "حلیہ" میں ابن عبدالبر نے "جامع بیان العلم" میں اور ضیاء الدین المقدسی نے "المنتقی" میں ذکر کیا ہے۔
لیکن ان سب نے اسے حسن بن عطیہ کے ذریعہ ابو عاتکہ طریف بن سلیمان سے نقل کیا ہے۔ اور وہ حضرت انس رض سے ناقل ہے۔

ابن عدی کہتے ہیں یہ جملہ کہ اگرچہ چین سے کرو، اسے سوائے حسن بن عطیہ کے کوئی روایت نہیں کرتا۔
یہی بات خطیب نے اپنی تاریخ میں۔ اور خطیب سے قبل حاکم نے بیان کی ہے۔ جیسا کہ حاکم سے ابن المحب نے "الفوائد" میں نقل کیا ہے۔

لیکن یہ امر غور طلب ہے۔ کیونکہ عقیلی نے ضعفاء میں حماد بن خالد الخیاط کے ذریعہ یہ روایت ابو عاتکہ سے نقل کر کے لکھا ہے۔ کہ یہ جملہ خواہ چین سے کرو درست نہیں۔ اس لئے کہ اسے ابو عاتکہ کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا اور وہ متروک الحدیث ہے۔ اور یہ جملہ کہ علم طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس میں بھی ضعف پایا جاتا ہے۔

ابو عاتکہ اس روایت میں تمام آفت ابو عاتکہ کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے۔ بلکہ عقیلی نے تو اسے انتہائی ضعیف قرار دیا ہے۔ بخاری کہتے ہیں منکر الحدیث ہے۔ نسائی کہتے ہیں ثقہ نہیں۔ ابو حاتم کہتے ہیں۔ اس کی روایت ردی ہوتی ہے۔ سلیمانی کہتے ہیں۔ ابو عاتکہ احادیث وضع کرنے میں مشہور ہے۔

ابن قدامہ نے "المنتخب" میں دوری سے نقل کیا ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین سے اس ابو عاتکہ کے بارے میں دریافت کیا۔ تو انہوں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ مروزی کا بیان ہے۔ کہ امام احمد کے روبرو یہ روایت بیان کی گئی۔ تو انہوں نے اس کا شدت سے انکار فرما دیا۔

ابن الجوزی نے اسے موضوعات میں نقل کر کے کہا ہے کہ ابن حبان لکھتے ہیں۔ اس روایت کی کوئی اصل نہیں۔ سخاوی نے بھی "المقاصد" میں اس کا اقرار کیا ہے۔ لیکن سیوطی نے ابن جوزی کا رد کرتے ہوئے "اللآلی" میں لکھا ہے۔

کہ اس روایت کی دو سندات اور ہیں۔ ایک سند تو یہ ہے کہ اس روایت کو یعقوب بن ابراہیم العسقلانی

نے زہری کے واسطہ سے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے ۔لیکن خود یہ بھی کہتے ہیں کہ اس یعقوب کو ذھبی نے کذاب کہا ہے۔

دوسری سند کے ذریعہ یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے ۔لیکن اس کی سند میں احمد بن عبداللہ الجوباری ہے جو احادیث وضع کرنے میں مشہور زمانہ ہے۔

ناصر الدین البانی فرماتے ہیں اس سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ ابن جوزی کا رد کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ السلسلۃ للاحادیث الضعیفہ ج ا ص ۴۱۳

جلال الدین سیوطی کی کتاب "اللآلی المصنوعۃ" کا ابتداء سے آخر تک مطالعہ کرنے کے بعد ظاہر یہ ہوتا ہے کہ ہر مقام پر سیوطی ابن الجوزی کے رد کے لئے چاروں طرف ہاتھ پیر مارنے کی کوشش ناتمام کرتے رہے ہیں لیکن جب ہم انجام پر پہنچتے ہیں تو محسوس یہ ہوتا ہے کہ سیوطی بلا وجہ ہاتھ پاؤں مار رہے تھے ہاں سیوطی کی کتاب سے ہمیں اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ ہر روایت کے بارے میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کہاں کہاں پائی جاتی ہے۔ان میں سے بیشتر کتب تو ایسی ہوتی ہیں۔جن کا آج کوئی وجود نہیں۔ اور متعدد کتب ایسی ہوتی جو حدیث کی کتابیں ہی متصور نہیں ہوتیں۔آیئے اب امام ذہبی کی زبانی کچھ ان راویوں کا حال ملاحظہ فرمالیجئے۔

یعقوب بن ابراہیم العسقلانی۔ ذھبی لکھتے ہیں یہ کذاب ہے۔اسی نے یہ روایت وضع کی ہے کہ جس نے میری امت کو چالیس احادیث یاد کرائیں ،قیامت کے روز اس کا حشر علماء کے ساتھ ہوگا۔

اس کذاب کی اس جھوٹی کہانی کا یہ اثر پیدا ہوا ہے کہ سینکڑوں علماء نے اپنے اپنے تخیل کے تحت چہل احادیث لکھ ڈالیں۔بلکہ کچھ لوگ جب کچھ اور تصنیف نہ کر سکے تو انہوں نے صرف چہل حدیث ہی لکھ کر خود کو مصنفین میں داخل کر لیا۔

احمد بن عبداللہ الجوباری۔ اسے جوئباری بھی کہا جاتا ہے۔جوبار ضلع ہرات میں ایک بستی ہے۔ شخص احمد شوق کے لقب سے مشہور تھا۔

ابن عدی کہتے ہیں ابن کرام اس سے احادیث اور اس کی سندات وضع کراتا۔ اور پھر اُن روایات کو اپنی کتابوں میں اپنے مسلک کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا۔ ابن کرام نے اس کے واسطہ سے حضرت انسؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا کہ میری امت میں ایک شخص ہوگا جسے ابو حنیفہ کہا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر میری سنت کو زندہ فرمائے گا۔

اسی ابن کرام نے اپنی کتاب میں اس جوباری کے واسطہ سے یہ چلن والی روایت بھی نقل کی۔

ایک کہانی اس جوباری نے ابو البختری کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ سے یہ نقل کی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جو کھڑے کھڑے بالوں میں کنگھی کرے گا اس پر قرض مسلط کر دیا جائیگا۔

ذہبی لکھتے ہیں اس جوباری نے جس ابو البختری کا حوالہ دیا ہے۔ وہ تو اس سے بھی بڑا شیطان ہے۔

ابن حبان لکھتے ہیں۔ یہ جوباری دجالوں میں سے ایک دجال ہے۔ اس نے بڑے بڑے ائمہ کے نام سے کئی ہزار احادیث وضع کر کے لوگوں میں پھیلائیں۔ جو ان ائمہ کرام نے ہرگز بیان نہ کی تھیں۔

نسائی اور دار قطنی کہتے ہیں کذاب ہے۔ ذہبی لکھتے ہیں یہ جھوٹ میں ضرب المثل ہے۔ اس کا سب سے بڑا جھوٹ یہ روایت ہے :-

کہ کسی عالم کی مجلس میں حاضری، ایک ہزار جنازوں میں حاضری، ایک ہزار رکعت نماز پڑھنے، ایک ہزار مقبول حج کرنے اور ایک ہزار جہاد سے افضل ہے۔

اسی نے یہ روایت بھی وضع کی کہ سنت قرآن کے بارے میں فیصلہ کرتی ہے۔

بیہقی کہتے ہیں۔ اس جوباری نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے ایک ہزار مسائل نقل کئے ہیں۔ بیہقی یہ بھی لکھتے ہیں۔ کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ جوباری، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے احادیث وضع کرنے میں مشہور ہے۔ اس نے ایک ہزار سے زائد احادیث وضع کی ہیں۔ میں نے حاکم کو یہ کہتے سنا ہے کہ یہ شخص تو کذاب اور خبیث ہے۔ اس نے فضائل اعمال میں بہت سی احادیث وضع کیں۔ جن میں سے ایک روایت کا بیان کرنا بھی حلال نہیں۔

بیہقی کہتے ہیں میں نے حاکم سے یہ لطیفہ بھی سنا کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ حسن بصری نے

حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی روایت سنی ہے یا نہیں۔ اتفاق سے اس کا تذکرہ جوباری کے سامنے ہوا۔ اس نے فوراً بالسند ایک حدیث وضع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنا دیا۔ کہ حسن نے ابوہریرہؓ سے حدیث سنی ہے۔ (حالانکہ حسن بصری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئے) میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۶۔

اس سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ سیوطی نے ابن الجوزی کے رد میں اس جوباری کی روایت نقل کر کے روایتوں کے پجاریوں کو کتنا بڑا دھوکہ دیا ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے علما سیوطی کی کتابوں کو سینوں سے لگاتے ہیں اور کہتے ہیں ابن الجوزی بہت متشدد تھے۔ اب یہ فیصلہ کرنا قارئین کا کام ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟

کیا قیامت کے دن لوگ اپنی ماؤں کے ناموں سے پکارے جائینگے؟

عوام وخواص میں یہ مشہور ہے کہ قیامت کے دن لوگ اپنی ماؤں کے نام سے پکارے جائیں گے۔ یہ ایک ایسا تخیل ہے جس سے نہ عوام خالی ہیں اور نہ خواص، بلکہ یہ رام کہانی سُنی سنائی اور کہانیوں کی طرح ہے جسے ہمارے علماء و دانشور حضرات برسرِ منبر بیان کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ اسے باقاعدہ ایک روایت کی شکل دیدی گئی ہے۔ جو ان الفاظ میں پیش کی جاتی ہے۔

"قیامت کے روز لوگ اپنی ماؤں کے نام سے پکارے جائیں گے۔ تاکہ لوگوں پر پردہ ڈالا جا سکے" کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

ملا علی قاری نورالدین المتوفی ۱۰۱۴ھ نے اپنی موضوعات میں۔ حافظ ابو عبداللہ شمس الدین محمد بن ابی بکر المعروف با بن القیم المتوفی ۷۵۱ھ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

یہ روایت کہ لوگ ماؤں کے ناموں سے پکارے جائیں گے باطل ہے۔

پھر آگے ملا علی قاری لکھتے ہیں۔

محمد بن کعب کا قول تو یہ ہے کہ لوگ اماموں (یعنی امیروں) کے ناموں سے پکارے جائیں گے۔ ماؤں کے نام سے نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ماؤں کے ناموں سے پکارے جانے کی تین وجوہات ہیں۔

۱۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے چونکہ باپ نہیں۔ اس وجہ سے ماؤں کے ناموں سے پکارا جائیگا۔

۲۔ تاکہ حرام سے پیدا شدہ اولاد قیامت کے دن رسوا نہ ہو۔

۳۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے مرتبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ قاعدہ اپنایا جائے گا۔

یہ توجیہات بغوی نے "معالم التنزیل" میں پیش کر کے لکھا ہے کہ صحیح احادیث سے اس امر کی تردید

ہوتی ہے۔

بخاری نے اپنی صحیح میں سرخی قائم کی ہے۔"کہ لوگ قیامت کے دن اپنے باپوں کے نام سے پکارے جائیں گے"پھر امام بخاری نے یہ حدیث بیان کی کہ قیامت کے روز ہر غدار کے سامنے اس کی غداری کے مطابق جھنڈا گاڑا جائے گا۔جس پر لکھا ہوگا کہ یہ فلاں بن فلاں غدار ہے۔ابن القیم لکھتے ہیں اس موضوع پر اور بھی متعدد احادیث موجود ہیں۔موضوعات کبیر ص۱۰۵

بخاری نے جو حدیث بیان کی ہے یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے عبداللہ بن مطیع کے سامنے اُس وقت بیان کی تھی کہ جب وہ اہل مدینہ میں یزید کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کر رہا تھا۔اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ اس قسم کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔اور یزیدؒ کے خلاف تحریک چلانا چاہتے ہیں وہ سب غدار ہیں۔اور اس وقت روئے زمین پر علم وفضل اور سبقت اسلام میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہ تھا۔اور تمام لوگ انہی کے فیصلے کو قبول کرتے تھے۔

محمد بن کعب کا یہ قول کہ لوگ اماموں کے ناموں سے پکارے جائیں گے۔تو غالباً انہوں نے اس آیت

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ — ہم تمام لوگوں کو ان کے اماموں کے ساتھ بلائیں گے

بنی اسرائیل - ۱۷

کو پیش نظر رکھ کر یہ بات فرمائی ہے۔اس آیت میں امام سے مراد رہبری کرنے والے اور گمراہ کرنے والے افراد ہیں۔تو گویا یہ پکار دو قسم کی ہوگی۔ایک انفرادی اور ایک اجتماعی۔اس وقت زیر بحث مسئلہ انفرادی پکار کا ہے۔

جہاں تک اس توجیہ کا تعلق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ نہیں تھے۔اس لئے لوگوں کو ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا تو ہماری عرض یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کو کس کے نام سے پکارا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ آپ جو بھی اصول مرتب کریں گے اُس سے وہ خارج ہونگے۔اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو بھی مستثنیٰ سمجھا جائے گا۔

جہاں تک اس توجیہ کا تعلق ہے کہ حرام سے پیدا شدہ اولاد قیامت کے دن رسوا نہ ہو۔ تو اس قسم کی جتنی بھی اولاد ہوتی ہے۔ شریعت کی نظر میں وہ ہرگز مجرم نہیں۔ مجرم تو وہ مرد و عورت ہیں جن کی حرام کاری کے باعث یہ وجود میں آیا۔ کیا یہ دعوی کرکے مشکوک قسم کے لوگ اپنے شک پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں؟ اب یہ فیصلہ تو اللہ ہی کرے گا کہ ان کی اس خواہش کا احترام کیا جائے یا وہ دفتر کھول کر سامنے رکھ دیا جائے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کے پوشیدہ نگرانوں نے اُن کی یہ حرکات تحریر کی تھیں۔

اب صرف ایک وجہ باقی رہ جاتی ہے۔ یعنی حضرت حسنؓ و حسینؓ کے باعث یہ کام ہوگا۔ اس قسم کی کہانیاں اس لئے وضع کی گئیں کہ ان حضرات کو ماں کی جانب منسوب کرکے انہیں آلِ علی کے بجائے آلِ رسول کہا جا سکے۔ ہمیں اس امر پر کوئی خاص اعتراض نہیں، بشرطیکہ علی بن زینب، امامہ بنت زینب اور عبداللہ بن رقیہ کو بھی آلِ رسول مان لیا جائے۔ تو پھر تصفیہ کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے۔ ورنہ یہ ایک ایسی طویل بحث ہے جو خود ایک جداگانہ تصنیف کی خواہاں ہے۔ انشاءاللہ کسی اور مقام پر اس موضوع پر تبصرہ کیا جائے گا۔

علامہ عبدالرحمان بن علی بن محمد بن عمر الشیبانی الشافعی الاثری رقم طراز ہیں۔

یہ روایت کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز لوگوں کو اُن کی ماؤں کے ناموں سے پکارے گا۔ تاکہ اپنے بندوں پر پردہ ڈالا جا سکے۔ یہ روایت حافظ ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب الطبرانی المتوفی ۳۶۰ھ نے "الکبیر" میں حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً نقل کی ہے اس موضوع پر حضرت انسؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی روایات مروی ہیں۔ یہ سب روایات ضعیف ہیں جنہیں ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ اور بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ تم قیامت کے روز اپنے اور اپنے باپوں کے ناموں سے پکارے جاؤ گے۔ اس حدیث سے ان کہانیوں کا رد ہو رہا ہے۔

تمییز الطیب من الخبیث فی ما یدور علی السنة الناس من الحدیث ص۲۶

حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمان السخاوی فرماتے ہیں۔

یہ روایت کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز لوگوں کو ان کی ماؤں کے ناموں سے پکارے گا۔ تاکہ اپنے بندوں کے اعمال پر پردہ ڈال سکے۔ یہ روایت طبرانی نے "الکبیر" میں اسحاق بن بشر بن ابی حذیفہ کے ذریعہ

ابن عباسؓ سے مرفوعاً نقل کی ہے۔ اس موضوع پر ایک روایت حضرت انسؓ اور ایک روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے یہ سب ضعیف ہیں۔

ان سب کو ابن جوزی نے موضوعات میں داخل کیا ہے۔ اور اس کی تردید کے لئے وہ حدیث کافی ہے جو ابوداؤد نے اپنی "سنن" میں ایک عمدہ سند کے ساتھ حضرت ابوالدرداءؓ سے نقل کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم لوگ قیامت کے دن اپنے اور اپنے باپوں کے ناموں سے پکارے جاؤگے۔ لہٰذا اپنے نام اچھے رکھا کرو۔

بلکہ بخاری نے اپنی "صحیح" میں ابن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب تمام اولین و آخرین کو جمع کرے گا تو ہر غدار کے روبرو ایک جھنڈا گاڑا جائے گا۔ اور کہا جائے گا یہ فلاں بن فلاں غدار ہے۔ المقاصد الحسنہ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتہرہ علی الالسنہ ص ۱۲۴

علامہ ناصر الدین البانی رقم طراز ہیں۔

یہ روایت کہ لوگ قیامت کے روز اپنی ماؤں کے ناموں سے پکارے جائیں گے، یہ موضوع روایت ہے۔ اس روایت کو حافظ ابواحمد عبداللہ بن عدی الجرجانی نے اسحاق بن ابراہیم الطبری کے واسطہ سے حضرت انسؓ سے مرفوعاً روایت کر کے لکھا ہے۔

یہ روایت اس سند سے منکر ہے۔ اور اسحاق بن ابراہیم منکر الحدیث ہے۔

حافظ ابو حاتم محمد بن حبان المتوفی ۳۵۴ھ رقم طراز ہیں۔

اسحاق بن ابراہیم الطبری یہ اسحاق بن ابراہیم الطبری، ابن عیینہ اور فضیل بن عیاض سے روایات نقل کرتا ہے۔ یہ انتہائی منکر الحدیث ہے۔ ثقہ راویوں کی جانب موضوع کہانیاں منسوب کرتا ہے۔ اس کی روایت کا تو لکھنا تک بھی حلال نہیں بجز اس صورت کے کہ اس روایت پر اظہار حیرت اور اس کا رد کرنا مقصود ہو۔

حاکم کہتے ہیں یہ فضیل اور ابن عیینہ سے موضوع روایات نقل کرتا ہے۔

ابن الجوزی نے یہ روایت "الموضوعات" (ج ۳ ص ۲۴۸) میں ابن عدی کی سند سے نقل کر کے لکھا

ہے۔ یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ اسحاق منکر الحدیث ہے۔

ناصرالدین البانی آگے لکھتے ہیں۔ اس کا رد اُس حدیث سے ہوتا ہے جو ابو داؤد نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت ابوالدرداؓ سے نقل کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے لوگو اپنے نام اچھے رکھا کرو۔ کیونکہ قیامت کے دن تم اپنے اور اپنے باپوں کے ناموں سے پکارے جاؤ گے۔ اسی طرح صحیح بخاری کی یہ حدیث کہ جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا تو ہر غدار کے روبرو ایک جھنڈا گاڑا جائے گا۔ اور کہا جائے گا یہ فلاں بن فلاں غدار ہے۔ السلسلۃ الاحادیث الضعیفہ ج ۱ ص ۴۳

دارقطنی لکھتے ہیں کہ اسحاق بن ابراہیم الطبری منکر الحدیث ہے۔ کتاب الضعفاء والمتروکین ص ۶۲

ذہبی نے میزان میں اس پر بحث کرتے ہوئے اس روایت کو واہی اور باطل قرار دیا۔ تفصیل کیلئے دیکھئے میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۷۷

اس کہانی کے رد کے لئے اتنے حوالے بھی بہت کافی ہیں لیکن ان حضرات نے دو صحیح روایات کے حوالے بطور تردید پیش کئے ہیں جن میں سے ایک روایت صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری ج ۲ ص ۹۱۲

دوسری حدیث حضرت ابوالدرداؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔ دیکھئے سنن ابی داؤد۔ ج ۲ ص ۳۹۴ ابوالدرداؓ کی یہ حدیث سنن دارمی ج ۲ ص ۲۹۴ پر بھی موجود ہے۔

پھر ان احادیث کی تائید قرآن کی ایک آیت سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد ہے۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ الاحزاب۔ ۵

لوگوں کو اُن کے باپوں کے ذریعہ پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک منصفانہ فعل ہے۔

جب دنیا میں ہمیں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ لوگوں کو اُن کے باپوں کے ناموں سے پکارو۔ اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی فرمائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ منصفانہ بات ہے۔ تو اشارۃ النص سے یہ امر خود بخود واضح ہو گیا کہ کسی کو ماں کے نام سے پکارنا ایک غیر منصفانہ فعل ہے۔ اس لئے کہ اولاد باپ کی جانب منسوب ہوتی ہے ماں کی جانب نہیں۔ اور جو لوگ زبردستی اولاد علیؓ کو حضرت فاطمہؓ کی جانب منسوب کرنا چاہتے ہیں اس

قماش کے لوگ قرآن کی رد سے غیر منصف ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ذہن میں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی منصف نہیں ہو سکتا۔ وہ عادل ہے اور اس کی صفت عدل ہے۔ اور جس شئے کو وہ خود نا منصفانہ قرار دے وہ شئے تو سراسر ظلم ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب ظلم کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔

اَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ۝ یقیناً اللہ بندوں پر ظلم نہیں فرماتا

آل عمران - ۱۸۲

توجو لوگ یہ سمجھتے یا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ماؤں کے ناموں سے پکارے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مخفی الفاظ میں ظالم قرار دے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کہانی خالص تبرا ہے۔ جس میں حضور کی صاحبزادیاں، ازواج مطہرات، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی داخل ہو جاتی ہے۔ اعوذ باللہ من شرہا و شر ما فیہا۔

کیا آدمؑ و حوا مشرک تھے؟

(ایک تفسیری روایت)

قارئین کرام حیران ہوں گے کہ امت مسلمہ کا آج تک عقیدہ یہ رہا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ کجا ان کی طرف شرک کی نسبت۔ وہ تو مبعوث ہی اس لئے کئے جاتے ہیں کہ دنیا سے کفر و شرک کو مٹائیں۔ کجا کہ وہ خود شرک میں مبتلا ہوں۔ لیکن قربان جائیے روایت پرستی کے......کیونکہ روایت میں جو کچھ بھی بیان کر دیا جائے اس پر ہمارا ایمان لانا فرض ہے۔ اور اگر اُس روایت کا تعلق صحاح ستہ سے ہو تو کیا کہنے۔ پھر تو کوئی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ان کی صحت پر ایمان لانا ایک لازمہ دین بن جاتا ہے۔ آیئے آپ بھی ایک روایت ملاحظہ کیجئے کہ کس حسن و خوبی کے ساتھ حضرت آدم و حوا کو مشرک بنایا گیا ہے۔

ترمذی میں حضرت سمرۃؓ بن جندب سے مروی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب حضرت حواؑ کو حمل ٹھہرا تو ابلیس نے اُن کا چکر لگایا۔ اور حوا کے یہاں کوئی لڑکا زندہ نہیں رہتا تھا۔ شیطان نے حوا سے کہا کہ آئندہ جو بچہ ہو اس کا نام حارث رکھنا۔ انہوں نے اس کا نام حارث رکھا تو وہ زندہ رہا۔ اور یہ نام شیطان نے حوا کو وحی کیا تھا۔ اور اسی نے نام رکھنے کا حکم دیا تھا۔

ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث غریب ہے۔ اسے عمر بن ابراہیم کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا۔ اور بعض راویوں نے اسے قول تابعی بیان کیا ہے۔ ترمذی ج ۲ ص ۱۵۶

یعنی امام ترمذی نے اس میں شک ظاہر کیا ہے کہ آیا یہ قول رسول ہے یا قول تابعی۔ لیکن قول رسول کی صورت میں اسے عمر بن ابراہیم کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا۔

حیرت یہ کہ حاکم نے اسے مستدرک میں نقل کر کے صحیح کہا ہے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں یہ صحیح تو کہاں سے

ہوتی۔اس کا منکر ہونا اظہر من الشمس ہے۔

جہاں تک اس روایت کی سند کا تعلق ہے۔اس پر تو ہم بعد میں غور کریں گے۔سب سے اول تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کیا واقعتاً حارث شیطان کا نام ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو اسلام میں اس نام کی کوئی گنجائش نہ ہونی چاہیے۔

لفظ حارث حرث کا اسم فاعل ہے۔اور حرث کے معنی کھیتی کے آتے ہیں۔ارشاد الٰہی ہے۔

وَمِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا۔ کھیتی اور چوپاؤں میں بھی حصہ ہے

الانعام۔۱۳۷

اس لحاظ سے حارث کاشت کار کو کہا جائے گا۔اب بے چارے کاشت کاروں کا کیا قصور ہے کہ انہیں شیطان بنا دیا گیا۔کہیں یہ انصار صحابہ پر تبرّا تو نہیں ہے۔کیونکہ وہ کاشت کار تھے۔

اگر فی الواقع یہ شیطان کا نام تھا تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسلام میں یہ نام ممنوع قرار پاتا۔حالانکہ متعدد صحابہ کا نام حارث ہے۔اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکانہ ناموں کو تبدیل فرما دیا کرتے تھے۔جب کہ اس نام کو قطعاً تبدیل نہیں فرمایا۔حتی کہ آپ کے خاندان بنی ہاشم میں آپ کے سب سے بڑے چچا کا نام حارث تھا۔جن کے صاحبزادے ابوعبید جنگ بدر میں شہید ہوئے۔ان حارث کے ایک بیٹے نوفل تھے۔ان نوفل کے بیٹے کا نام بھی حارث تھا۔یہ دونوں باپ بیٹے فتح مکہ کے بعد اسلام لائے۔ہم ذیل میں حافظ ابن حجر کی "تقریب" سے اُن صحابہ کے نام پیش کر رہے ہیں جن کے نام حارث تھے اور جن سے احادیث مروی ہیں:۔

۱۔ حارثؓ بن الحارث الاشعری الشامی صحابی ہیں۔

۲۔ حارثؓ بن حاطب بن عمرو بن عبید الانصاری۔صحابی ہیں۔

۳۔ حارثؓ بن حسان البکری۔صحابی ہیں۔

۴۔ حارثؓ بن حاطب بن حارث بن العمر الجمحی۔چھوٹے صحابی ہیں۔

۵۔ حارثؓ بن زیاد الساعدی۔صحابی ہیں۔

۶۔ حارثؓ بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب صحابی ہیں۔

۷۔ حارثؓ بن عمرو بن الحارث السہمی صحابی ہیں۔

۸۔حارثؓ بن عمرو الانصاری صحابی ہیں۔حضرت براءؓ بن عاذب کے چچا ہیں۔

۹۔حارثؓ بن ہشام بن المغیرہ۔صحابی ہیں۔ابوجہل کے بھائی ہیں۔

۱۰۔حارثؓ بن مالک بن قیس اللیثی صحابی ہیں۔

یہ دس صحابہ کے نام ہم نے تقریب سے پیش کئے ہیں۔تابعین اور تبع تابعین میں حارث نامی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں حتیٰ کہ حضرت علی کے شاگرد خاص کا نام حارث الاعور ہے۔ایک مشہور صوفی بزرگ حارث محاسبی ہیں جو امام احمد کے ہم عصر تھے اور ایک امام مالک کے شاگرد حارث بن مسکین ہیں جو نسائی کے استاد تھے۔اور سنن نسائی میں ان سے متعدد روایات مروی ہیں۔

یہ کیسا شیطان کا نام ہے کہ ہر شخص اس نام پر جان دے رہا ہے؟ اور پوری تاریخ اسلام میں اس پر نکیر کرنے والا نظر نہیں آتا۔کیا یہ کہانی وضع کرنے کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ حضرت آدم وحوا کو شرک ثابت کیا جائے۔یا اس کے پس پردہ کوئی اور بھی راز ہے؟ کہیں عبد مناف (یعنی ابوطالب) کے نام سے الزام دفع کرنا تو مقصود نہیں کہ دوسرے کو مورد الزام بنا دیا جائے؟

پھر اس روایت کے ابتدائی دو جملوں میں کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی۔کیونکہ ابتدائی جملہ یہ ہے کہ "جب حوا حاملہ ہوئیں" یہ جملہ یہ ثابت کر رہا ہے کہ یہ پہلے حمل کا واقعہ ہے۔اور دوسرا جملہ کہ حوا کا کوئی لڑکا زندہ نہیں رہتا تھا۔اس سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت حوا کے متعدد لڑکے مر چکے تھے۔یعنی بیان کرنے والے کو اپنے آگے پیچھے کی بھی خبر نہیں۔کیونکہ چرائی ہوئی بات کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔یہ کہانی کہاں سے چرائی گئی۔یہ تو ہم آگے پیش کریں گے لیکن اس سے قبل کچھ عمر بن ابراہیم راوی کا حال بھی سُن لیں۔

عمر بن ابراہیم ؒ اس کی کنیت ابوحفص العبدی ہے۔بصرہ کا باشندہ ہے۔ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں اس کی روایات پائی جاتی ہیں۔یہ قتادہ سے روایات نقل کرتا ہے۔اس سے عبدالصمد بن عبدالوارث اور شاذ بن فیاض وغیرہ نے روایات نقل کی ہیں۔

امام احمد کہتے ہیں ثقہ ہے۔بلکہ اس کے شاگرد عبدالصمد بن عبدالوارث کا قول یہ ہے کہ یہ بہت ثقہ ہے۔لیکن ابوحاتم کہتے ہیں یہ حجت نہیں۔ابن عدی کہتے ہیں یہ شخص قتادہ کے نام سے ایسی فرضی کہانیاں نقل

کرتا ہے جنہیں کوئی اور بیان نہیں کرتا۔

عبداللہ بن احمد کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد احمد بن حنبل سے اس کے بارے میں استفسار کیا۔ انہوں نے فرمایا یہ منکر روایات نقل کرتا ہے۔ اور پھر انہوں نے اس کی ایک روایت کو منکر قرار دیا۔ مذکورہ کہانی کو حاکم نے مستدرک میں نقل کر کے صحیح قرار دیا۔ لیکن ذہبی لکھتے ہیں یہ منکر ہے۔

میزان ج ۳ ص ۱۷۹

دراصل یہ کہانی قتادہ کی پیش کردہ نہیں۔ بلکہ اس کا موجد محمد بن سائب کلبی ہے۔ جس نے اپنی بدنام زمانہ تفسیر میں یہ کہانی نقل کی ہے۔ اس کی تفسیر آج تفسیر ابن عباس کے نام سے شائع ہوتی ہے۔ اس کلبی اور اس کی تفسیر کا حال حصہ اول میں گزر چکا ہے۔

اس کی تفسیر میں یہ کہانی دیکھ کر بعد کے مفسرین نے یہ کہانی اپنی اپنی تفاسیر میں نقل کی۔

دراصل یہ کہانی ایک آیت کی تفسیر کے تحت نقل کی گئی ہے۔ آیت حسب ذیل ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ج فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ٥ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ٥ الاعراف ۱۸۹-۱۹۰	وہ ذات ہے جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا۔ اور اس سے اس کی بیوی بنائی۔ تاکہ اس سے سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانپ لیا۔ اس کو ہلکا سا حمل ٹھہر گیا۔ پھر جب پیٹ بھاری ہو گیا تو دونوں نے اللہ سے جوان کا رب تھا دعا کی۔ اے اللہ اگر تو نے ہمیں نیک اولاد دی تو ہم شکر گزار ہوں گے۔ پھر جب ہم نے انہیں نیک بچہ دیا تو انہوں نے اس دیئے ہوئے بچے میں اللہ کا شریک ٹھہرایا۔ پس اللہ کی ذات اس شرک سے پاک ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

مفسر قرطبی نے کلبی سے یہ کہانی کچھ اس طرح نقل کی ہے۔ کہ ابلیس ایک انسان کی صورت میں حضرت حوار کے پاس آیا جب وہ پہلی بار حاملہ ہوئیں۔ اور کہنے لگا جانتی ہو تمہارے پیٹ میں کیا ہے؟ حضرت حوار نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم کیا ہے؟ شیطان کہنے لگا مجھے ڈر ہے کہ کہیں چوپایہ نہ ہو۔ حضرت حوار نے حضرت آدم سے اس کا ذکر کیا۔ اس طرح دونوں میاں بیوی فکر میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ دن بعد شیطان پھر آیا۔ اور کہنے لگا میں اللہ کا مقرب بندہ ہوں (یعنی غوث وقطب) بہت پہنچا ہوا بزرگ ہوں۔ میں اگر اللہ سے دعا کر دوں تو تو ایک انسان کے بچہ کو جنم دیگی۔ لیکن تو میرے نام پر اس کا نام رکھنا۔ حوار نے سوال کیا آپ کا نام کیا ہے۔ اس نے جواب دیا حارث۔ الغرض حوا نے اس بچہ کا نام عبدالحارث رکھدیا۔

قرطبی لکھتے ہیں اسی قسم کی کہانی ترمذی کی ایک ضعیف حدیث میں موجود ہے۔ اور اسرائیلیات میں ایسی بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں۔ اور نہ قلب ایسی روایات کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے کیونکہ آدم وحوا کو شیطان ایک بار دھوکہ دے چکا تھا۔ اور مؤمن ایک بھٹ سے دوبارہ ڈسا نہیں جا سکتا۔ تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۲۷۲ (شاید وہ پہلی بار پیر صاحب کی صورت میں نہ آیا ہوگا، اس لئے دوسری مرتبہ جبہ وقبہ اور تسبیح سے دھوکا کھا گئے ہوں گے)

یہ تو امام قرطبی کی رائے تھی۔ اور ان کی تفسیر کا محدود سے چند علمار مطالعہ کریں گے۔ لیکن ہمارے درس نظامی میں جو تفسیر باقاعدہ طلبار کو پڑھائی جاتی ہے۔ ذرا اس کا حال بھی دیکھ لیں۔

جلال الدین سیوطی اپنی مشہور تفسیر جلالین میں لکھتے ہیں۔

فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا (ولدا) صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ (اے شریکا) فِيْمَآ اٰتٰهُمَا (بتسمیته عبد الحارث ولا ینبغی ان یکون عبد الله - ولیس باشراک فی العبودیة لعصمة آدم - روی سمرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال	پھر ہم نے انہیں نیک (بیٹا) دیا۔ انہوں نے اس میں اللہ کا شریک بنالیا۔ کہ اس کا نام عبدالحارث رکھا۔ حالانکہ رکھنا عبداللہ چاہئے تھا۔ یہ عبادت میں شرک نہیں۔ کیونکہ آدم معصوم ہیں۔ سمرہ نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جب حوا حاملہ ہوئیں تو ابلیس نے ان

لما حملت حواء طاف لها ابليس
وكان لا يعيش لها ولد فقال سميه
عبد الحارث فانه يعيش فسمته
فعاش فكان ذلك من وحي الشيطان
وامره - رواه الحاكم وقال صحيح
والترمذي وقال حسن غريب -

کے پاس آنا جانا شروع کیا۔ اور حوا کے کوئی بیٹا
زندہ نہ رہتا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ اس بچہ کا نام
عبد الحارث رکھو۔ یہ زندہ رہے گا۔ انہوں
نے اس کا نام عبد الحارث رکھا۔ اور وہ زندہ
رہا۔ یہ حدیث حاکم نے روایت کی اور اسے صحیح
کہا ہے۔ اور ترمذی نے کہا ہے یہ حسن غریب ہے۔

جلالین مصری ص ۹۱

ایک طالب علم کو جب یہ عبارت سبقاً پڑھائی جائے گی۔ اور جب اس کے ذہن میں یہ بٹھایا جائے گا کہ شرک فی التسمیہ میں کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ آدم جو نبی تھے اور گناہوں سے معصوم تھے۔ عیاذاً باللہ ان روایات کی رو سے وہ بھی اس کے مرتکب ہوتے تھے۔ لہٰذا اب غلام رسول۔ غلام غوث۔ عبد النبی۔ عبد الرسول۔ سجاد حسین عابد علی اور پیر بخش وغیرہ قسم کے ناموں میں کوئی حرج نہیں سمجھنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ یہ نام اب دیو بندیوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اردو زبان میں اس آیت کی جتنی اعلیٰ اور عمدہ تفسیر علامہ مودودی صاحب مرحوم نے فرمائی ہے۔ وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ لکھتے ہیں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ — اسی نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا

الآیہ۔ الاعراف ۱۸۹

(ترجمہ) وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سے حمل رہ گیا۔ جسے لئے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ اپنے رب سے دعا کی۔ کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح وسالم بچہ دیدیا۔ تو وہ اُس کی بخشش وعنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ بہت بلند وبرتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

تشریح - یہاں مشرکین کی جاہلانہ گمراہیوں پر تنقید کی گئی ہے۔ تقریر کا مدعا یہ ہے کہ نوع انسانی کو ابتداءً وجود بخشنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ جس سے خود مشرکین کو بھی انکار نہیں۔ پھر ہر انسان کو وجود عطا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور اس بات کو بھی مشرکین جانتے ہیں۔ عورت کے رحم میں نطفہ کو ٹھہرانا پھر اس خفیف سے حمل کو پرورش کر کے ایک زندہ بچہ کی صورت دینا پھر اس بچہ کے اندر طرح طرح کی قوتیں اور قابلیتیں ودیعت کرنا۔ اور اسے صحیح و سالم بنا کر پیدا کرنا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اگر اللہ عورت کے پیٹ میں بندر یا سانپ یا کوئی اور عجیب الخلقت حیوان پیدا کر دے۔ یا بچے کو پیٹ ہی میں اندھا بہرا، لنگڑا لولا بنا دے۔ یا اس کی جسمانی و ذہنی اور نفسانی قوتوں میں کوئی نقص رکھ دے تو کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ کی اس ساخت کو بدل ڈالے۔ اس حقیقت سے مشرکین بھی اسی طرح آگاہ ہیں جس طرح موحدین۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زمانہ حمل میں ساری امیدیں اللہ ہی سے وابستہ ہوتی ہیں لیکن اس پر بھی جہالت و نادانی کے طغیان کا یہ حال ہے کہ جب امید بر آتی ہے۔ اور چاند سا بچہ نصیب ہو جاتا ہے تو شکریہ کے لئے نذریں اور نیازیں کسی دیوی، اوتار اور کسی حضرت کے نام پر چڑھائی جاتی ہیں۔ اور بچے کو ایسے نام دیئے جاتے ہیں کہ گویا وہ خدا کے سوا کسی اور کی عنایت کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً حسین بخش، پیر بخش، نبی بخش، عبدالرسول، عبدالعزیٰ اور عبد شمس وغیرہ۔

اس تقریر کے سمجھنے میں ایک بڑی غلط فہمی واقع ہوئی ہے۔ جسے ضعیف روایات نے اور زیادہ تقویت پہنچا دی۔ چونکہ آغاز میں نوع انسانی کی پیدائش ایک جان سے ہونے کا ذکر آیا ہے۔ جس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور پھر فوراً ہی ایک مرد و عورت کا ذکر شروع ہو گیا ہے جنہوں نے پہلے تو اللہ سے صحیح و سالم بچے کی پیدائش کے لئے دعا کی۔ اور جب بچہ پیدا ہو گیا۔ تو اللہ کی بخشش میں دوسروں کو شریک ٹھہرا لیا۔ اسی لئے لوگوں نے یہ سمجھا کہ شرک کرنے والے میاں بیوی حضرت آدم و حوا علیہما السلام ہی ہوں گے۔ اس غلط فہمی پر روایات کا ایک خول چڑھ گیا۔ اور ایک پورا قصہ تصنیف کر دیا گیا کہ حضرت حوا کے بچے پیدا ہو ہو کر مر جاتے تھے۔ آخر کار ایک بچہ کی پیدائش کے موقعہ پر شیطان نے ان کو بہکا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس کا نام عبدالحارث (بندۂ شیطان) رکھ دیں۔ غضب یہ ہے کہ ان روایات میں سے بعض کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی پہنچا دی گئی۔ لیکن درحقیقت یہ تمام روایات غلط ہیں۔ اور قرآن کی عبارات بھی ان کی تائید نہیں کرتیں۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ نوع انسانی کا پہلا جوڑا جس سے آفرینش کی ابتداء ہوئی اس

کا خالق بھی اللہ ہی تھا۔کوئی دوسرا اس کارِ تخلیق میں شریک نہ تھا۔اور پھر ہر مرد و عورت کے ملاپ سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے۔اس کا خالق بھی اللہ ہی ہے جس کا اقرار تم سب لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔ چنانچہ اسی اقرار کی بدولت تم امید و بیم کی حالت میں جب دعا مانگتے ہو تو اللہ ہی سے مانگتے ہو۔لیکن بعد میں جب امیدیں پوری ہو جاتی ہیں تو تمہیں شرک کی سوجھتی ہے۔اس تقریر میں کسی خاص مرد اور خاص عورت کا ذکر نہیں ہے۔بلکہ مشرکین میں سے ہر مرد اور ہر عورت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

اس مقام پر ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے۔ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی مذمت کی ہے۔وہ عرب کے مشرکین تھے۔اور ان کا قصور یہ تھا کہ وہ صحیح وسالم اولاد پیدا ہونے کے لئے اللہ ہی سے دعا مانگتے تھے۔مگر جب بچہ پیدا ہو جاتا تھا تو اللہ کے اس عطیہ میں دوسروں کو شکریہ کا حصہ دار ٹھہرا لیتے تھے۔

بلاشبہ یہ حالت بھی نہایت بری تھی۔لیکن اب جو شرک ہم توحید کے مدعیوں میں پا رہے ہیں۔وہ اس سے بھی بدتر ہے۔یہ ظالم تو اولاد بھی غیروں سے مانگتے ہیں۔حمل کے زمانہ میں منتیں بھی غیروں کے نام ہی کی مانتے ہیں۔اور بچہ پیدا ہونے کے بعد نیاز بھی ان ہی کے آستانوں پر چڑھاتے ہیں۔اس پر بھی زمانۂ جاہلیت کے عرب مشرک تھے۔اور یہ موحد ہیں۔اُن کے لئے جہنم واجب تھی۔اور اِن کے لئے نجات کی گارنٹی ہے۔اُن کی گمراہیوں پر [illegible] کی زبانیں تیز ہیں۔مگر اِن کی گمراہیوں پر کوئی تنقید کر بیٹھے تو مذہبی درباروں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔اسی حالت کا ماتم حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں کیا ہے ؎

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر	جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر	کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں	پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں	اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ جا جا کے نذریں چڑھائیں	شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے	نہ اسلام بگڑے، نہ ایمان جائے

تفہیم القرآن ج ۲ ص ۱۰۶

جنّت کا سنگترہ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں جب علیؓ نے عمرو بن عبدود کو قتل کیا۔ تو جبرائیل جنت کا ایک سنگترہ لے کر آئے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتا ہے، علیؓ کو بلا کر یہ سنگترہ دے دو۔ حضورؐ نے وہ سنگترہ حضرت علیؓ کو دیا۔ لیکن وہ سنگترہ علیؓ کے ہاتھ میں آتے ہی پھٹ گیا۔ اس سنگترہ میں ریشم کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔ جس پر زرد رنگ سے یہ لکھا ہوا تھا۔ طالب کی جانب سے علیؓ کو مبارک ہو (میزان)

اگر جنت کے میووں کا یہی حال ہے کہ کسی میں سے حور نکل رہی ہے اور کسی میں سے تحریر تو اہل جنت بھوکے مر جائیں گے اور بھوک کی شدت میں بیچاری حور بھی کیا لطف دے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شے کا طالب نہیں ہوتا۔ کیونکہ طلب اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی شے اپنے پاس نہ ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہرگز طالب نہیں بن سکتا۔ وہ تو تمام مخلوق کا مطلوب ہے پھر ہمیں یہ بھی حیرت ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کیلئے ابن عباسؓ کس کے ساتھ اور کب آئے۔ کیونکہ تاریخ مسلمہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ اپنے والد اور والدہ کے ساتھ ہجرت کر کے فتح مکہ کے بعد مدینہ آئے تھے۔ وہ جنگ خندق میں عمرو بن عبدود کے قتل کا تماشہ دیکھنے کیسے پہنچ گئے۔ اور اگر کسی اور سے یہ کہانی سنی تھی۔ تو کم از کم اس کا نام بھی بیان کر دیتے۔

نیز جنگ خندق میں عمرو بن عبدود کو حضرت زبیرؓ نے قتل کیا تھا حضرت علیؓ نے نہیں ہمیں اس روایت میں یہ بھی تعجب ہے کہ اس روایت میں اللہ تعالیٰ کو غالب قرار دیا گیا۔ جب کہ ہمارے سیاقی بزرگ اپنے خطبوں میں بجائے اسد اللہ الغالب پڑھتے۔ اور بنی بویہ رافضیوں کو خوش کرنے کیلئے آج تک اہلسنت بھی اسے نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ بنو بویہ کی آمد سے قبل صرف تین خلفاء کا خطبہ میں ذکر ہوتا تھا۔

اس روایت کا راوی وہی احمد الذارع الکذاب ہے۔ جس کا حال سابقہ سطور میں پیش کیا گیا ہے۔ اور وہ اس کہانی کو صدقہ بن تمیم سے نقل کر رہا ہے اور اس کا حال پہلے بھی پیش کیا جا چکا۔ ہار صدقہ بن تمیم نے یہ کہانی سلمۃ بن شبیب کی جانب یہ روایت منسوب کی ہے۔ حالانکہ یہ ان پر اتہام ہے۔ ہاں اس کا ایک اور راوی عبدالرزاق بن ہمام ہے اس کا بھی تفصیلی حال ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

اگر ہم دو راویوں پر ہر روایت کے ساتھ بار بار تذکرہ کریں تو بے شک ہمارے لئے تو کوئی خاص دشواری نہ ہو گی۔ لیکن ایک تو صفحات بلاوجہ گھیرتے رہیں گے اور کتابت کی ضخامت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لئے مناسب یہ محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ذمہ داریاں ہمارے قارئین بھی برداشت کریں۔

حضرت اُمِّ حبیبہؓ سے نکاح

کیا حضرت ابوسفیانؓ کی درخواست

پر کیا گیا تھا؟

مؤرخین کے نزدیک یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین ام حبیبہؓ سے اُس وقت نکاح فرمایا جب ام المومنینؓ حبشہ میں تشریف فرما تھیں۔ اور یہ نکاح غائبانہ ہوا۔ نکاح کے بعد ام المومنینؓ کو مدینہ روانہ کیا گیا۔ اس طرح بنوامیہ کی یہ معزز خاتون زوجیت رسول میں آئیں۔

اس رشتہ سے حضرت ابوسفیانؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سُسر اور امیر معاویہؓ آپ کے سالے ہوئے اور اس ناتے سے خال المسلمین یعنی امت مسلمہ کے ماموں قرار پائے۔ اگرچہ سبائیت زدہ افراد اس رشتہ سے تو انکار نہ کر سکے، لیکن بے کار مباش، کچھ نہ کچھ کیا کر کے بقول انہوں نے ان باپ بیٹوں کی شان گرانے کے لئے ایک کہانی وضع کر ڈالی۔ جو اتفاق سے امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں نقل کر دی۔ اور روایتوں کے پجاری اسے لے دوڑے۔ اور تاریخ کے مقابلہ میں اسے پیش کر کے مسلمہ تاریخ کو باطل قرار دیدیا۔ اور امیر جماعت المسلمین جناب مسعود احمد نے تو اپنی تاریخ الاسلام والمسلمین میں کچھ اس قسم کا تاثر پیش کیا، گویا انہوں نے تاریخ و حدیث کا تقابل بیان کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ حالانکہ اُن سے پہلے بہت بڑے بڑے محدثین مثلاً امام نووی، قاضی عیاض اور حافظ ابن کثیر اور علامہ ابن حزم کے روبرو بھی یہ روایت موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس مقام پر تاریخ کے حق میں فیصلہ دیا۔ اگرچہ ہماری تاریخ کو سبائیوں نے پہلے ہی سے اتنا مسخ کر دیا تھا کہ اُس میں حقیقت کا وجود آٹے میں نمک کے برابر رہ گیا تھا لیکن موجودہ دور کے محققین نے اُس پر بھی نمک پاشی شروع کر دی۔ ایک محقق نے تو صحابہ پر تبرا بازی کا نام تاریخ رکھ دیا۔

امیر جماعت المسلمین نے اپنی کتاب تاریخ الاسلام والمسلمینؒ میں مسلم کے حوالہ سے حضرت اُم حبیبہؓ

کا نکاح فتح مکہ کے بعد قرار دیا۔ کاش وہ مسلم کی اس روایت پر امام نووی کا تبصرہ بھی پڑھ لیتے۔
ہم سطور ذیل میں اولاً مسلم کی روایت اور بعد میں امام نووی کا تبصرہ قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے۔ پھر حافظ ابن کثیر کی بحث پیش کی جائے گی جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ آیئے پہلے روایت ملاحظہ ہو۔

ابوزمیل ناقل ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مسلمان نہ تو حضرت ابوسفیانؓ کی طرف دیکھتے، اور نہ ان کے ساتھ بیٹھتے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ کہ اے اللہ کے نبی مجھے تین چیزیں عطا فرمادیں۔ آپ نے وعدہ فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا میرے پاس عرب کی حسین و جمیل عورت حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیانؓ موجود ہے۔ میں اس کا نکاح آپ سے کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا اچھا ٹھیک ہے۔ انہوں نے عرض کیا حضرت معاویہؓ کو اپنے سامنے کاتب مقرر کر لیجیے۔ آپ نے اسے بھی قبول فرمایا۔ حضرت ابوسفیانؓ نے عرض کیا مجھے کسی جگہ کا امیر بنا دیجیے۔ تاکہ میں کفار سے اسی طرح جنگ کروں جس طرح مسلمانوں سے کرتا رہا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی منظور فرمالیا۔

ابوزمیل راوی کا بیان ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی سوال کیا جاتا تو آپ اسے پورا فرماتے۔ تو اگر ابوسفیانؓ یہ سوالات نہ کرتے تو آپ انہیں ہرگز یہ چیزیں عطا نہ فرماتے۔ مسلم ج ۲ ص ۳۰۴

اس روایت کے سلسلہ میں ہماری چند معروضات ہیں۔ پہلے آپ انہیں ذہن نشین فرمالیں۔
۱۔ اگر حضرت ابوسفیانؓ یہ امارت طلب کرتے تو میرا دعوی یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز بھی انہیں کوئی عہدہ نہ دیتے۔ کیونکہ ایک شخص نے جب آپ سے امارت طلب کی تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا۔

انا واللہ لا نولی علی ھذا العمل احدا سالہ ولا احدا احرص علیہ	اللہ کی قسم ہم اس کام کا والی اس شخص کو ہرگز نہیں بناتے جو اس کا سوال کرے۔ یا اس کام کا حریص ہو۔
مسلم ج ۲ ص ۱۲۰۔ بخاری	

تو اگر ابوسفیانؓ امارت طلب کرتے تو ہرگز انہیں کوئی عہدہ نہ دیا جاتا۔ اب جو انہیں عہدہ دیا گیا تو اس

کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے کوئی عہدہ طلب نہیں کیا تھا۔ بلکہ بلا طلب عطا کیا گیا۔ جس طرح عتابؓ بن اسید اموی اور ابوسفیانؓ کے صاحبزادے یزیدؓ کو بلا طلب امارت دی گئی۔

۲۔ اس کہانی کا یہ جملہ تو نہایت حیران کن ہے کہ میرے پاس عرب کی حسین و جمیل عورت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیانؓ موجود ہے۔ جملہ تو اس طرح ہونا چاہئے تھا کہ میری بیٹی ام حبیبہؓ عرب کی حسین و جمیل عورت ہے۔

۳۔ ابوسفیانؓ فرمارہے ہیں کہ میں ام حبیبہؓ کا نکاح آپ سے کررہا ہوں۔ اگر باپ ہونے کی حیثیت سے یہ بات کہہ رہے ہیں تو ام حبیبہؓ کنواری لڑکی نہ تھیں۔ بلکہ ایک بیوہ خاتون تھیں۔ اور بیوہ اپنے نفس کی اپنے آپ مالک ہوتی ہے۔ ارشاد رسول ہے۔

الایم احق بنفسها من ولیها۔ بیوہ اپنے نفس کی اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے۔

۴۔ یہ واقعہ آیا مدینہ کا ہے یا مکہ کا اگر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ وقوعہ فتح مکہ کے بعد مکہ میں پیش آیا تو حضرت ام حبیبہؓ مہاجرہ تھیں۔ اور اس روایت کی رو سے وہ اس وقت کسی کے نکاح میں نہ تھیں تو وہ مکہ کیا لینے گئی تھیں ؟ اور اگر یہ وقوعہ مدینہ میں پیش آیا۔ تو ابوسفیانؓ مدینہ آکر مقیم نہیں ہوئے۔

۵۔ یہ بات بھی واضح نہیں ہورہی ہے کہ وہ کون سے مسلمان تھے جو ابوسفیانؓ کو دیکھنا اور ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ کرتے تھے۔ وہاں سبائی مؤمن کہاں سے آگئے تھے۔ اس لئے کہ یہ حرکت اہل مکہ تو کر نہ سکتے تھے۔ ایک روز قبل تک وہ ان کے سردار تھے۔ اور اگر کہتے ہو کہ مدینہ اور دیگر مقامات کے مسلمان مراد ہیں تو اول تو ابوسفیانؓ مدینہ جاکر آباد نہیں ہوئے۔ اور اگر ہوتے بھی تو اُن کی عزت افزائی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بہت کافی تھا۔

من دخل فی بیت ابی سفیٰن فهو امن — جو شخص ابوسفیانؓ کے گھر میں داخل ہوگا وہ مامون ہے۔

اس ارشاد کو سننے کے بعد کسی مسلمان کے قلب میں ان کی توہین کا تصور بھی پیدا نہ ہوسکتا تھا۔ وہ عرب تھے جو زبان و دل کے یکساں تھے۔ وہاں علی نسیم کے لوگ آباد نہ تھے۔

۶۔ رہا امیر معاویہؓ کا مسئلہ تو وہ صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لا چکے تھے۔ اور اب مہاجرین میں داخل تھے۔ انہیں باپ کی سفارش کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے جو فتور واقع ہو رہے ہیں۔ یا تو اس روایت کی سند میں کوئی تقیہ باز موجود ہے۔ جو یہ ڈنک مار رہا ہے۔ یا پھر صوفی قسم کا کوئی مغفل انسان ہے جسے اپنے آگے پیچھے کی بھی خبر نہیں۔

اب آیئے دیکھیں کہ امام نووی صحیح مسلم کی شرح میں اس روایت پر کیا تبصرہ کرتے ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں۔

اعلم ۔خوب جان لو۔ (بلکہ اسے روایتوں کے پجاریوں خوب اچھی طرح سوچ لو اور ذہن نشین کر لو) کہ یہ حدیث مسلم کی اُن مشہور احادیث میں سے ہے جس پر متعدد اعتراضات کئے گئے ہیں۔

اعتراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ ۸ھ میں فتح مکہ کے روز اسلام لائے۔ یہ ایک ایسا مشہور معاملہ ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام حبیبہؓ سے جو نکاح فرمایا۔ وہ فتح مکہ سے ایک طویل عرصہ قبل فرمایا تھا۔

ابوعبیدہ ،خلیفہ بن خیاط، ابن عبدالبر اور جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ نکاح ۶ھ میں فرمایا۔ ہاں ایک قول ۷ھ کا ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔ (یہ ذہن میں رہے کہ امام نووی نے کسی مورخ کا حوالہ پیش نہیں کیا جو اسے صرف تاریخی بات کہہ کر رد کیا جا سکے)

محدث قاضی عیاض فرماتے ہیں اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ نکاح کس نے پڑھایا؟ ایک قول کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ، ایک قول کے لحاظ سے حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص اور اور ایک قول کے لحاظ سے نجاشی نے پڑھایا کیونکہ وہ حبشہ کا امیر اور بادشاہ تھا۔

قاضی عیاض شارح مسلم فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کی اس روایت میں جو یہ بات آئی ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ نے اُن کا نکاح پڑھایا تو یہ انتہا سے زیادہ غریب ہے۔ اور یہ امر تو بہت مشہور ہے کہ ابوسفیانؓ حالت کفر میں مدینہ گئے اور ام حبیبہؓ نے انہیں آپ کے بستر پر نہ بیٹھنے دیا۔

پھر آگے امام نووی لکھتے ہیں۔

امام ابن حزم فرماتے ہیں۔ یہ حدیث بعض راویوں کا وہم معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ امت کا اس معاملہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام حبیبہؓ سے فتح مکہ سے قبل نکاح فرمایا۔ اور اُس وقت ان کے والد کافر تھے۔

علامہ ابن حزم کا ایک قول یہ نقل کیا جاتا ہے کہ یہ روایت موضوع ہے۔ اور یہ آفت عکرمۃ بن عمار راوی کی ڈھائی ہوئی ہے۔ جس نے ابوزمیل سے یہ کہانی نقل کی ہے۔

(علامہ ابن حزم ظاہری کے لقب سے مشہور ہیں یعنی ظاہر حدیث پر چلنے والے۔ اسی لئے یہ اہل حدیث کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ حیرت تو جناب مسعود احمد پر ہے کہ انہوں نے روایت پرستی میں اپنے امام کی بات کو بھی نظر انداز کر دیا)

علامہ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ ابن حزم پر اعتراض کیا گیا ہے۔ کہ یہ ان کی جسارت ہے کہ بڑے بڑے راویوں۔ (یعنی اکابرین) میں کیڑے نکالتے ہیں۔ اور ان کے خلاف زبان چلاتے ہیں۔ ہم ائمہ حدیث میں سے کوئی ایسا شخص نہیں پاتے۔ جس نے عکرمۃ بن عمار پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہو۔ ابن معین وغیرہ نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ وہ تو انتہائی مستجاب الدعوات تھے۔

ابن الصلاح مزید فرماتے ہیں کہ ابن حزم کو جو یہ وہم ہو رہا ہے کہ ام المومنین کا نکاح تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اور یہ روایت اس کی نفی کر رہی ہے۔ لہٰذا ان دونوں امور میں تضاد ہے تو یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ نے آپ سے تجدید نکاح کی درخواست کی ہو۔ تاکہ ان کی طبیعت خوش ہو جائے۔ کیونکہ انہیں ان کے سردار ہونے کے باعث مکہ میں ایک مقام حاصل تھا۔ اور ان کی رضا کے بغیر نکاح کرنا ان کی توہین تھی۔ اُن کا گمان تھا کہ اس قسم کی صورت میں اسلام میں تجدید نکاح ہو سکتی ہے۔

اسے کہتے ہیں زبردستی کی وکالت۔ علماء کی زبان میں اسے تاویل کہا جاتا ہے۔ ہماری نظر میں اسی کا نام مرض روایت پرستی ہے۔ حافظ ابن الصلاحؒ ڈوبتے کی مانند ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں کہ کس طرح اس روایت کو بچایا جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ انہوں نے دو کشتیوں میں پاؤں رکھ چھوڑے ہیں۔ اول تو وہ حبشہ میں نکاح کے قائل ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اس روایت کا پیچھا چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں)

امام نووی فرماتے ہیں۔حدیث میں یہ کہیں نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدید نکاح فرمایا ہو۔یا حضرت ابوسفیانؓ نے اس کی درخواست کی ہو۔مسلم ج ۲ ص ۳۰۴

گویا امام نووی اور حافظ ابوعمرو ابن الصلاح جیسے محدثین کو یہ تو تسلیم ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں۔کیونکہ یہ خلاف واقعہ ہے۔لیکن ابن الصلاح اس روایت کو بچانے کے لئے تنکوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ابن الصلاح کو چاہئے تھا کہ ایک بار اور نکاح پڑھوا دیتے۔تاکہ ام حبیبہؓ کی والدہ حضرت ہندؓ کی طبیعت بھی خوش ہو جاتی۔اور پھر ہر گھر والے کی طبیعت خوش کرنے کے لئے ایک ایک نکاح پڑھواتے رہتے۔

اس کے برعکس ابن حزم نے صاف صاف یہ دعویٰ کیا کہ یہ سارا فساد عکرمۃ بن عمار نے پیدا کیا ہے۔امام نووی کو یہ تو تسلیم ہے کہ یہاں فساد پھیلایا گیا ہے۔لیکن عکرمہ جیسے اکابر کی شان میں یہ گستاخی ان کی بھی برداشت سے باہر ہے۔یعنی اس امر پر تو سب کا اتفاق ہے کہ ناک ٹیڑھی ہے۔لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ ٹیڑھی کیسے ہوئی۔اور کب ہوئی؟

جہاں تک ہم اس کی سند پر غور کرتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر چند امور نظر آتے ہیں۔

۱۔صحابہ میں سے یہ واقعہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علاوہ کسی اور سے مروی نہیں۔

۲۔ابن عباسؓ کے مشہور شاگرد۔مثلاً مجاہد۔عطا۔کریب۔طاؤس اور عکرمہ وغیرہ میں سے کوئی اسے روایت نہیں کرتا۔ان سے یہ روایت صرف ایک شخص نقل کر رہا ہے جس کا نام سماک بن الولید ہے۔اور جس کی کنیت ابوزمیل ہے۔

۳۔اس ابوزمیل سے عکرمۃ بن عمار کے علاوہ کوئی یہ واقعہ نقل نہیں کرتا۔

۴۔عکرمہ سے نضر بن محمد الیمامی کے علاوہ اسے کوئی روایت نہیں کرتا۔

۵۔اتفاق سے یہ تینوں یمامہ کے باشندہ ہیں۔گویا یہ کہانی یمامہ میں سینہ بسینہ باطنی راز کے طور پر چلتی رہی۔اور ابن عباسؓ نے اپنی زندگی جن جن مقامات پر گزاری۔وہاں کے لوگ تو بے چارے اس خبر سے محروم ہی رہے۔اتفاق سے یہ کہانی امام مسلم کے عراقی استادوں کے سامنے ظاہر ہو گئی۔اور انہوں نے امام مسلم سے بیان کر دی۔اور انہوں نے یہ راز فاش کر دیا۔

۶۔ اگر یہ روایت کوئی خاص مقام رکھتی تو اِسے بھی اُسی طرح شہرت حاصل ہوتی۔ جس طرح حبشہ میں حضرت ام حبیبہؓ کے نکاح کو حاصل ہوئی۔ ڈھائی سو سال تک یہ روایت ایک مخفی راز رہی۔ اس مردے میں اُس وقت جان پڑی جب غلطی سے امام مسلم نے اسے اپنی کتاب میں پیش کیا لیکن اس کہانی کی بدولت اُن کی کتاب تنقید کا نشانہ بن گئی۔

آیئے۔ دیکھیں کہ ان تینوں راویوں کے بارے میں محدثین کرام کیا فرماتے ہیں۔

ابوزمیل ۔ اس کا نام سماک بن الولید الحنفی الیمامی ہے۔ ہم نے اس کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لئے رجال کی متعدد کتابیں چھانیں لیکن ابن ابی حاتم کے علاوہ کسی نے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

ابن ابی حاتم لکھتے ہیں یہ شخص ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ سے احادیث روایت کرتا ہے۔ اس سے شعبہ، مسعر اور عکرمۃ بن عمار نے روایات لی ہیں۔ احمد بن حنبل اور یحیٰ بن معین کہتے ہیں ابوزمیل ثقہ ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں اس میں کوئی برائی نہیں سچا ہے۔ ابوزرعہ کہتے ہیں ثقہ ہے۔ اصل میں یہ یمامہ کا باشندہ تھا لیکن کوفہ میں مقیم تھا۔

الجرح والتعدیل ج ۴ ص۲۸۰

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں اس میں کوئی برائی نہیں۔ تقریب ص۱۳۷

یہ جملہ کہ "سچا" ہے۔ "اُس میں کوئی برائی نہیں" اس راوی کے لئے بولے جاتے ہیں جس پر جرح کرنے کی کوئی وجہ موجود نہ ہو۔ اور زیادہ قابل اطمینان بھی نہ ہو۔ تو یہ جملے استعمال کیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ کام چلاؤ انسان ہے۔ ایسے راوی کی روایت حجت نہیں ہوتی۔ لیکن بطور شہادت پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی روایت اس کے خلاف آجائے تو یہ ساقط الاعتبار ہو جائے گی۔

نضر بن محمد الیمامی ۔ ہم نے اس کا حال بھی بہت تلاش کیا لیکن حافظ ذھبی کے علاوہ کسی نے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ حافظ ذھبی نے صرف اتنی بات پر اکتفا کی کہ عکرمۃ بن عمار سے احادیث روایت کرتا ہے۔ یمامی ہے۔ صرف عجلی نے اسے ثقہ کہا ہے۔

لیکن اگر واقعتاً یہ ثقہ تھا تو حافظ ذھبی کو میزان میں اس کا تذکرہ ہی نہ کرنا چاہئے تھا۔ کیونکہ میزان میں ان راویوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ جن کو ضعیف کہا گیا ہو۔ گویا یہ سب کے نزدیک تو ثقہ نہیں۔ ابن ابی

حاتم نے اس کا ذکر کر کے سکوت اختیار کیا۔ اور اس کے سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں دیا جس کے باعث اس کی جانب سے ایک غیر اطمینانی کی صورت پیدا ہو گئی۔ لیکن الجرح والتعدیل میں اس کا ذکر کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ ضعیف ہے

عکرمۃ بن عمار الیمامی :- یہ وہ حضرت ہیں جن کی وکالت امام نووی اور ابن الصلاح نے کی ہے۔ یہی وہ بزرگ ہیں جن کی شان میں ابن حزم نے گستاخی کی ہے۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔ اس کی کنیت ابو عمار العجلی ہے۔ یمامہ کا باشندہ ہے۔ ہرماس بن زیاد، طاؤس، سالم، عطا اور یحیٰی بن ابی کثیر سے روایات نقل کرتا ہے۔ اس سے یحیٰی بن سعید القطان، عبدالرحمان بن مہدی، ابوالولید اور ایک بڑے گروہ نے روایات لی ہیں۔

ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ یہ امی تھا لیکن احادیث یاد رکھتا تھا۔ یحیٰی بن معین کہتے ہیں ثقہ ہے۔ عاصم بن علی کا بیان ہے کہ یہ مستجاب الدعوات ہے۔

ابو حاتم رازی کا قول ہے کہ اگرچہ یہ سچا ہے لیکن اسے وہم ہوتا ہے۔

یحیٰی بن سعید القطان کی رائے یہ ہے کہ عکرمہ یحیٰی بن ابی کثیر سے جو روایات نقل کرتا ہے۔ ضعیف ہوتی ہیں۔ احمد بن حنبل کا قول ہے کہ یہ حدیث میں ضعیف ہے۔ ہاں ایاس بن سلمہ سے اس نے جو روایات نقل کی ہیں وہ صحیح ہیں۔

حاکم لکھتے ہیں مسلم نے بطور شہادت اس کی متعدد روایات لی ہیں۔ بخاری کہتے ہیں اس کے پاس روایات لکھی ہوئی نہیں تھیں۔ لہٰذا یحیٰی بن ابی کثیر سے جتنی روایات نقل کرتا ہے وہ مضطرب ہوتی ہیں۔ احمد کہتے ہیں اس نے یحیٰی سے جتنی روایات نقل کی ہیں سب ضعیف ہیں۔

سلیمان بن حرب کا بیان ہے کہ عکرمۃ بن عمار یمامہ سے ہمارے ہاں بصرہ آیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک روز چھت پر چڑھا قدریہ سے بحث کر رہا تھا۔ حالانکہ بصرہ قدریہ کا گڑھ تھا۔

اس کے بعد حافظ ذہبی نے ابن عدی کے حوالہ سے دس روایات نقل کیں۔ جن پر ابن عدی کو اعتراض تھا۔ اور آخر میں فرمایا۔

. امام مسلم نے اپنی "صحیح" میں اس کی ایک ایسی روایت نقل کی ہے جو قطعاً منکر ہے۔ اور وہ روایت

ابوسفیانؓ کے تین مطالبات والی ہے۔ اور اس عکرمہ نے تین اور ایسی احادیث نقل کی ہیں جو منکر ہیں۔ میزان ج ۳ ص ۹۳۔

ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ یحیٰ بن سعید القطان کا قول ہے کہ عکرمہ یحیٰ بن ابی کثیر سے جتنی احادیث نقل کرتا ہے۔ سب ضعیف ہوتی ہیں۔ ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ مجھے عبداللہ بن احمد نے احمد کا یہ قول لکھ کر بھیجا ہے کہ عکرمہ کی صرف وہ روایات درست ہوتی ہیں جو یہ ایاس بن سلمہ سے نقل کرتا ہے۔ بقیہ روایات مضطرب ہوتی ہیں۔ میرے والد ابوحاتم فرماتے ہیں۔ عکرمہ اپنی ذات کے لحاظ سے تو سچا ہے لیکن اسے وہم ہوتا ہے۔ غلطیاں بہت کرتا ہے۔ اور بعض روایات میں راوی بھی چھوڑ دیتا ہے۔ الجرح والتعدیل ج ۷ ص ۱۰۔

حافظ ابن حجر تقریب میں لکھتے ہیں۔

عکرمہ سچا ہے۔ غلطیاں کرتا ہے۔ یحیٰ بن ابی کثیر سے جو روایات نقل کرتا ہے۔ اس میں اضطراب ہوتا ہے۔ اس کے پاس لکھی ہوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ۱۶۰ھ کے قریب اس کا انتقال ہوا۔

حافظ ابن الصلاح علامہ ابن حزم سے اس لئے ناراض تھے کہ ابن حزم نے بے محابا یہ بات کہدی تھی کہ یہ داستاں اسی عکرمہ نے وضع کی ہے۔ اکابر کی شان میں اتنی بڑی گستاخی حافظ ابن الصلاح کو تو کہاں برداشت ہوئی شارح مسلم امام نووی کو بھی برداشت نہ ہوئی۔ کیونکہ انہیں خطرہ یہ ہوا کہ عکرمہ کا شمار مستجاب الدعوات افراد میں ہے۔ اگر اس نے بددعا دیدی تو کیا ہوگا۔

یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس کا قول صحیح ہے۔ اور کس کا غلط؟ لیکن حافظ ذہبی اور ابن ابی حاتم کی بحث پڑھنے کے بعد ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پانی یہیں مر رہا ہے۔ اب اگر گڑھا نظر نہیں آرہا تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ذہبی نے تو برملا اس روایت کو منکر لکھ دیا۔ نووی، قاضی عیاض، اور ابن الصلاح کے نزدیک یہ روایت درست نہیں۔ اس کی ناک ٹیڑھی ہے۔ جماعت المسلمین کے صدر کو چاہئے تھا کہ پہلے اس روایت کی ناک سیدھی کر دیتے۔ بعد میں اس کے ذریعہ تاریخ مسلمہ کا رد کرتے۔ حالانکہ محدثین کا یہ اصول ہے کہ ہر وہ روایت جو تاریخ مسلمہ کے خلاف ہو موضوع ہوتی ہے۔

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ دور حاضرہ میں جو شخص بھی حدیث پر کچھ لکھتا یا بولتا اور درس دیتا ہے۔

وہ حدیث سے متعلقہ فنون الرجال، الجرح والتعدیل، العلل، اصول الروایہ اور اصول الدرایہ وغیرہ سے کیوں شپرّ کی طرح آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی عقل کو بھی بالائے طاق اٹھا کر رکھ دیتا ہے۔ آخر کب تک ہم ان تبرائی کہانیوں کو اپنے سینوں سے لگائے رہیں گے۔ اور اس طرح لوگوں کو بھی تبرائی بناتے رہیں گے۔

کسی روایت کا صحیحین میں پایا جانا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ روایت ہر حال میں صحیح ہے۔ اگرچہ اغلب گمان صحت ہی کا ہوتا ہے۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

وقد نظر ائمۃ ھذا الفن فی	اس فن کے اماموں نے ان دونوں کتابوں پر
کتابیھما ووافقوھما علی صحۃ	غور کیا۔ اور اکثر مواقع پر ان دونوں اماموں
ما صحاہ الا مواضع یسیرۃ نحو	کی موافقت کی کہ یہ روایات صحیح ہیں۔ لیکن کچھ
عشرین حدیثا غالبھا فی مسلم	روایات تقریباً بیس روایات پر تنقید کی۔ ان
انتقدھا علیھما طائفۃ من	میں سے اکثر مسلم میں ہیں۔ حفاظ حدیث کی ایک
الحفاظ۔ منہاج السنہ ج ۴ ص ۵۸	بڑی جماعت نے ان پر تنقید کی ہے۔

اب آیئے اور دیکھئے کہ حافظ ابوالفدا عماد بن اسمٰعیل بن عمر۔ المعروف بابن کثیر دمشقی المتوفی ۷۷۴ھ اس مشکل سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

امام ابوبکر احمد بن حسین بن علی بن عبداللہ البیہقی المتوفی ۴۵۸ھ اپنی سند صحیح و متصل کے ساتھ عروہ سے نقل کرتے ہیں۔ اور انہوں نے حضرت ام حبیبہ رضی سے نقل کیا ہے کہ وہ عبیداللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں۔ اس کے ساتھ ہجرت کرکے نجاشی کے یہاں گئی تھیں۔ وہاں عبیداللہ کا انتقال ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا نکاح حبشہ میں ہوا۔ اور نجاشی نے یہ نکاح پڑھایا۔ اور چار ہزار درہم مہر دیا۔ اور مجھے شرجیل بن حسنہ کے ساتھ مدینہ بھیج دیا۔ اور اپنے پاس سے سامان بھی دیا۔ کیونکہ حضور نے میرے لئے کوئی سامان نہیں بھیجا تھا۔

جناب مسعود صاحب نے حدیث و تاریخ کا تقابل پیش کرکے تاریخ کا رد کیا ہے۔ یہ بیہقی کی حدیث حاضر ہے جسے حافظ ابن کثیر صحیح کہہ رہے ہیں۔ غالباً ڈاکٹر صاحب نے مسلم کی روایت دیکھنے کے بعد کسی اور طرف دیکھنے کی زحمت ہی نہیں فرمائی۔

پھر بیہقی نے ابن لہیعہ کی سند سے عروہ سے یہ نقل کیا ہے کہ عبیداللہ حبشہ جاکر نصرانی ہوگیا تھا۔اور اسی حال میں اس کی موت واقع ہوئی۔اس کی موت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے لئے پیغام بھیجا۔اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان نے آپ کا نکاح پڑھایا۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ عروہ کا یہ قول کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کا نکاح پڑھایا۔یہ قول غریب ہے۔اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس نکاح سے قبل ہی مکہ واپس چلے گئے۔پھر ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔اور ان کے ساتھ اُن کی زوجۂ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔جن کا انتقال مدینہ میں ۲ھ میں ہوا۔

صحیح بات وہ ہے جو یونس بن بکیر نے ابن اسحاق سے نقل کی ہے کہ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنا ولی حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید العاص کو متعین کیا تھا۔

ابن کثیر لکھتے ہیں قبولیت عقد کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وکیل شاہ حبش اصحمۃ النجاشی کو بنایا تھا۔جیسا کہ ابن اسحاق نے ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین الباقر سے نقل کیا ہے۔کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ ضمری کو یہ پیغام دے کر نجاشی کے پاس بھیجا تھا۔اس نے آپ کا نکاح ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے کیا۔اور چار سو دینار مہر ادا کیا۔

زبیر بن بکار نے بالسند حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ میں سرزمین حبشہ میں تھی۔اور مجھے اس بات کی کوئی اطلاع نہ تھی کہ اچانک میرے پاس نجاشی کی باندی بطور قاصد آئی۔اس کا نام ابرہہ تھا۔یہ نجاشی کے کپڑوں وغیرہ کی نگراں تھی۔اس نے مجھ سے اجازت طلب کی۔میں نے اسے اجازت دی۔اس نے مجھ سے کہا کہ بادشاہ کا پیغام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تحریر کیا ہے کہ میں آپ کا نکاح تم سے پڑھ دوں میں نے یہ سن کر خوش ہو کر کہا۔اللہ تجھ پر خیر نازل فرمائے۔

اس باندی نے یہ بھی کہا کہ بادشاہ نے کہلوایا ہے کہ تم اپنا وکیل متعین کر دو۔میں نے خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس آدمی بھیجا۔اور انہیں اپنا وکیل بنایا۔

اس وقت میں بالیاں اور چاندی کے دو کنگن پہنے تھی۔اور میرے پاؤں کی تمام انگلیوں میں چاندی کے چھلے پڑے ہوتے تھے۔میں نے اس خوشی میں وہ تمام زیور اتار کر ابرہہ کو دیدیا۔

جب شام ہوئی تو نجاشی نے جعفرؓ بن ابی طالب اور تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ دربار میں حاضر ہو جائیں۔
جب یہ سب حاضر ہو گئے تو نجاشی نے خطبہ دیا۔ اور کہا۔

الحمد للّٰہ الملک القدوس المومن العزیز الجبار، واشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمداً عبدہ ورسولہ وانہ الذی بشر بہ عیسی ابن مریم۔

امابعد۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم بھیجا تھا کہ میں آپ کا نکاح ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان سے کر دوں۔ میں نے آپ کے اس حکم پر عمل کیا۔ اور چار سو دینار مہر متعین کیا۔
اس کے بعد نجاشی نے دینار لوگوں کے سامنے رکھ دیئے۔ پھر خالدؓ بن سعید بن العاص کھڑے ہوئے۔ اور انہوں نے خطبہ دیا۔

الحمد للّٰہ احمدہ واستغفرہ، واشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ، ارسلہ بالہدی ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔

امابعد۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جس خواہش کا اظہار فرمایا ہے۔ میں نے اسے قبول کیا۔ اور آپ کا نکاح ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان سے کیا۔ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برکت عطا فرمائے۔
اس کے بعد نجاشی نے وہ دینار خالدؓ بن سعید کے حوالہ کر دیئے۔ خالدؓ نے ان پر قبضہ حاصل کیا۔ اس کے بعد لوگوں نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ نجاشی نے کہا بیٹھو۔ کیونکہ انبیاء کی سنت یہ ہے کہ جب وہ نکاح کرتے ہیں تو کھانا ضرور کھلاتے ہیں۔ پھر اُس نے کھانا منگوایا۔ جو سب نے کھایا۔ اس کے بعد سب متفرق ہو گئے۔
حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں غالباً یہ وہ وقت تھا جب عمروؓ بن العاص نے عمروؓ بن امیہ کو نجاشی کے دربار سے نکلتے دیکھا تھا۔ کیونکہ عمروؓ بن العاص حبشہ جنگ خندق کے بعد پہنچے تھے۔ اور عمروؓ بن امیہ، ام حبیبہؓ کے سلسلے میں گئے تھے۔

امام بیہقی نے ذکر کیا ہے کہ حافظ ابو عبداللہ محمد بن اسحاق بن محمد بن یحیی المعروف محدث ابن مندہ المتوفی ۳۹۵ھ کا قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت ام حبیبہؓ کے ساتھ ۶ھ میں ہوا۔ اور حضرت ام سلمہؓ کے ساتھ آپ کا نکاح ۴ھ میں ہوا تھا۔

ابن کثیر لکھتے ہیں یہی قول خلیفہ بن خیاط، ابو عبید اللہ معمر بن مثنیٰ اور ابن البرقی کا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ یہ نکاح ۷ھ میں ہوا۔ بیہقی کہتے ہیں زیادہ مناسب یہی سن معلوم ہوتا ہے۔

ابن کثیر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ حضرت ام سلمہؓ سے آپ کا نکاح ۴ھ کے آخر میں ہوا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ام حبیبہؓ کا نکاح ام سلمہؓ سے قبل ہوا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نکاح بعد میں ہوا ہو۔ لیکن اغلب گمان یہ ہے کہ جنگ خندق کے بعد یہ نکاح ہوا ہے۔ کیونکہ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ عمروؓ بن العاص نے نجاشی کے پاس سے عمروؓ بن امیہ ضمری کو نکلتے دیکھا تھا۔ اور عمروؓ بن امیہ اسی نکاح کے سلسلہ میں نجاشی کے پاس گئے تھے۔

یہ تمام تفصیلات پیش کرنے کے بعد حافظ ابن کثیر صحیح مسلم کی روایت پر بحث کرتے ہیں۔

ابن اثیر نے بعض لوگوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ نکاح فتح مکہ کے بعد ہوا۔ اور انہوں نے بطور دلیل وہ حدیث پیش کی جو مسلم میں مروی ہے۔ (جو اوپر ذکر کی جا چکی) لیکن یہ ایک ایسی حدیث ہے۔ جس کے باعث امام مسلم پر سخت اعتراضات کئے گئے ہیں۔ کیونکہ ابوسفیانؓ جب تجدید معاہدہ کے لئے مدینہ آئے تھے۔ تو اپنی بیٹی ام حبیبہؓ کے پاس بھی پہنچے تھے۔ ام حبیبہؓ نے انہیں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر لپیٹ دیا۔ ابوسفیانؓ نے کہا یہ بستر میری وجہ سے پلٹا گیا ہے۔ کیا یہ بستر میرے لائق نہیں۔ یا میں اس بستر کے لائق نہیں؟ ام حبیبہؓ نے فرمایا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے۔ اور تو ایک مشرک ہے۔ یہ سُن کر ابوسفیانؓ بولے۔ اے میری بیٹی اللہ کی قسم تجھے میرے مرنے کے بعد بہت تکلیف پہنچے گی۔

ابن حزم کہتے ہیں یہ حدیث موضوع ہے۔ اسے عکرمہ بن عمار نے وضع کیا ہے۔ لیکن اُن کے اس قول کا کوئی اور حامی نہیں (یعنی عکرمہ پر حرف گیری کا ورنہ روایت کو کوئی بھی قبول نہ کرتا)

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ابوسفیانؓ کی خواہش یہ تھی کہ دوبارہ نکاح پڑھا جائے۔ کیونکہ یہ ان کی اجازت کے بغیر ہوا تھا۔ جو اُن کی عزت و شرافت کے خلاف تھا۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اُن کا خیال تھا کہ اُن کے اسلام لانے سے بیٹی کا نکاح فسخ ہو گیا ہے۔

ہمارے علماء غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اس قسم کی مہملات کا سہارا لیتے ہیں۔

یہ سب ضعیف اقوال ہیں۔ بہترین بات یہ ہے کہ جب ابوسفیانؓ نے آپ کے مرتبہ کو دیکھا تو اپنی دوسری بیٹی عزہ کا نکاح آپ سے کرنا چاہا اور اس کام کے لئے ام حبیبہؓ کو اپنا وکیل بنایا۔ جیسا کہ صحیحین میں موجود ہے۔ راوی کو وہم ہو گیا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھا کہ ابوسفیانؓ ام حبیبہؓ سے نکاح کرانا چاہتے ہیں۔

ابوعبیدہ قاسم بن سلام کا قول ہے کہ ام حبیبہؓ کی وفات ۴۴ھ میں ہوئی۔ لیکن ابوبکر بن ابی خیثمہ کہتے ہیں کہ ان کی وفات امیر معاویہؓ سے ایک سال قبل ہوئی۔ البدایہ والنہایہ ج ۴ صفحہ ۱۴۳ ۔ صفحہ ۱۴۵

امام ابن کثیر نے گویا یہ تو تسلیم کر لیا کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ اور عکرمہ وہم کا شکار ہو گیا ہے لیکن بقول ان کے یہ وہم ام حبیبہؓ کے نکاح کے سلسلہ میں ہوا لیکن اس کہانی میں بقیہ جو امور پائے جاتے ہیں۔ ان پر کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ صحیح بات وہی ہے جو امام احمد نے فرمائی کہ عکرمہ کی صرف وہ روایات صحیح ہوتی ہیں جو وہ ایاس سے نقل کریں۔ باقی سب غلط ہوتی ہیں۔ اور یہ روایت عکرمہ نے سماک سے نقل نہیں کی۔ لہذا خود ساختہ ہے۔ بلکہ یہ خالص سبائی تبرا ہے۔

اب رہی وہ روایت کہ جس کا حوالہ حافظ ابن کثیر نے دیا ہے کہ ام حبیبہؓ نے اپنی بہن عزہ کے لئے پیغام نکاح دیا تھا۔ تو وہ بخاری وغیرہ میں حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ سے ان الفاظ میں مروی ہے۔

کہ ام حبیبہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میری بہن یعنی ابوسفیانؓ کی بیٹی موجود ہے۔ آپ اس سے نکاح کر لیجئے۔ آپ نے فرمایا کیا تو یہ پسند کرے گی؟ انہوں نے عرض کیا ہاں میں اس میں مخل نہ ہوں گی۔ بلکہ یہ پسند کروں گی کہ اس خیر میں میری بہن بھی شریک ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ میرے لئے حلال نہیں۔ ام حبیبہؓ کہتی ہیں میں نے عرض کیا۔ اللہ کی قسم ہم تو باہم یہ گفتگو کر رہی تھیں کہ آپ درہؓ بنت ابی سلمہ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ابوسلمہؓ کی بیٹی سے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا اگر وہ میرے گھر میں میری کفالت میں بھی نہ ہوتی۔ تب بھی وہ میرے لئے حلال نہ تھی۔ کیونکہ وہ تو میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔ اس لئے کہ ثوبیہ نے مجھے اور ابوسلمہ دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ آئندہ مجھ پر اپنی بیٹیاں اور بہنیں پیش نہ کیا کرو۔ بخاری ج ۲ صفحہ ۷۶۶ مسلم ج ۱ صفحہ ۴۶۹۔

بہتر محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ معتظر گجراتی کی ایک نظم جو حضرت ام حبیبہؓ کے سلسلہ میں ہے قارئین

کے سامنے پیش کی جائے۔ تاکہ ان دقیق بحثوں کے بعد کچھ ذائقہ بھی تبدیل ہو جائے۔

ام المومنین ام حبیبہؓ ــــــ مضطر گجراتی

عرب کے نامور سردار ابوسفیانؓ کی بیٹی
امیرِ شام کی خواہر، گرامی شان کی بیٹی

رہِ اسلام میں ہجرت کی سختی جھیلنے والی
فقط حق کیلئے کرب و بلا سے کھیلنے والی

مقدر ہو چکا تھا جس کا ام المومنین ہونا
بالفاظِ دگر، ہمرازِ ختم المرسلین ہونا

بشارت ہاتفِ غیبی سے جس نے یہ پائی
کتاب اللہ کی رو سے جو اہلِ بیت کہلائی

نکاحِ پاک میں جس کے ولی تھے شاہِ نجاشی
فلک سے جس پہ کی فردوس کی حوروں نے گلپاشی

جسے قرآن نے اعزازِ ام المومنیں بخشا
جسے اللہ نے عزت عطا کی، فہمِ دیں بخشا

نہ چھوڑا جیتے جی دامانِ تسلیم و رضا جس سے
بڑی عزت سے پیش آتے تھے فخر الانبیا جس سے

رسول اللہ نے جس پر یہ لطفِ خاص فرمایا
ابوسفیانؓ کے گھر کو بھی دارالامن ٹھہرایا

وہ ام المؤمنین اصحاب کرتے تھے ادب جس کا
ملائک آج بھی در چومتے ہیں روز و شب جس کا

نبی کی ازداجِ مکرم جس سے راضی تھیں
دعائیں جس کی ملت کے شریک حال و ماضی تھیں

سلام اس پاک ام المؤمنین کے فرق دامن پر
خدائی رحمتیں سایہ کناں ہیں جن کے مدفن پر

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا؟

یہ بات عرصہ دراز سے مشہور چلی آرہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا۔ اور اس کا آپ پر اثر بھی ہوا۔ ہم بھی بچپن سے لے کر آج تک یہی تصور کرتے آئے تھے۔ کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے یہ روایت منقول ہے۔

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا۔ حتیٰ کہ اس جادو کے اثر سے آپ یہ سمجھتے تھے۔ کہ میں ازواج مطہرات کے پاس گیا ہوں، حالانکہ آپ ان کے پاس نہیں گئے ہوتے۔ سفیان بن عینیہ راوی کا بیان ہے یہ جادو کی بڑی سخت قسم ہوتی ہے۔ (کہ مرد کی بندش کر دی جاتی ہے)

ام المؤمنین فرماتی ہیں کہ آپ ایک رات نیند سے جاگے، تو فرمایا اے عائشہؓ اللہ تعالیٰ نے مجھے بتا دیا ہے جو کچھ میں نے اس سے پوچھا تھا۔ میرے پاس دو شخص آئے۔ ایک میرے سر کے قریب بیٹھا۔ اور دوسرا میرے قدموں کے قریب۔ جو شخص میرے سرہانے بیٹھا تھا۔ اُس نے دوسرے سے سوال کیا۔ اس آدمی کو کیا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا اس پر جادو کیا گیا ہے؟ سرہانے والے نے سوال کیا کس نے جادو کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا لبید بن اعصم نے جو بنو زریق قبیلہ کا ایک فرد تھا، یہ قبیلہ یہودیوں کا حلیف تھا اور لبید منافق تھا۔

سرہانے والے نے سوال کیا یہ جادو کس چیز پر کیا گیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کنگھی اور بالوں پر۔ پہلے نے سوال کیا کہ وہ کہاں دفن کیا گیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا نر کھجور کے چھلکے میں رکھ کر ذی اروان کے کنوئیں میں پتھر کے نیچے دبا دیا گیا ہے۔

چنانچہ آپ وہاں تشریف لے گئے، اور اسے نکلوایا۔ اور فرمایا یہی وہ کنواں ہے جو مجھے خواب میں دکھایا گیا تھا۔ اس کا پانی سرخ ہو گیا تھا، گویا مہندی کا دھوون ہو، اور اس کے کنارے کھجور کے درخت ایسے محسوس ہوتے تھے۔ گویا شیاطین کے سر ہیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے لبید بن اعصم کو بدنام کیوں نہ کیا؟ آپ نے جواباً فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا عطا فرمائی۔ اور مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ میں لوگوں میں کسی کی ذات کے سلسلہ میں شر پھیلاؤں۔

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ مختلف افعال میں یہ تصور کرتے کہ میں نے یہ کام کر لیا ہے۔ حالانکہ آپ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔

ایک روایت میں ام المومنین فرماتی ہیں جب ایک رات میری باری آئی تو آپ نے خوب دعا کی جس کے بعد آپ نے یہ خواب دیکھا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے وہ چیز نکلوائی جس سے معلوم ہوا کہ یہ جادو کنگھی اور بالوں پر کیا گیا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے وہ چیزیں نہیں نکلوائیں، اور ایک روایت میں ہے کہ انہیں نکلوا کر دوبارہ دفن کرا دیں۔ اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ کی یہ کیفیت کافی دن تک رہی۔ بخاری ج ۲ صـ ۸۵۷۔ صـ ۸۵۸ صـ ۸۹۵ مسلم ج ۲ صـ ۲۲۱۔

یہ تو وہ روایات ہیں جو بخاری و مسلم اور دیگر کتب احادیث میں پائی جاتی ہیں لیکن بعد کے محدثین مثلاً بغوی حاکم وغیرہ اور تعویذ گنڈے کرنے والے ملاؤں نے اس پر مزید یہ حاشیہ آرائی کی کہ معوذتین اسی وقت اور اسی کام کیلئے نازل ہوئیں۔ کنگھی کے ساتھ جو بال لگے ہوئے تھے اس میں گرہیں پڑی ہوتی تھیں، آپ ان گرہوں پر معوذتین پڑھ کر دم کرتے جاتے تھے اور گرہیں کھلتی جاتی تھیں۔ غالباً ان لوگوں کو یہ گرہیں لگانے کا تجربہ ہوگا۔ ورنہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ یہ دونوں سورتیں مکہ معظمہ میں ابتداء نبوت میں نازل ہوئیں۔ اور یہ قصہ مدینہ میں ۷ھ میں پیش آیا حتیٰ کہ آج تک قرآن مجید میں ان سورتوں کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ سورۃ الناس مکیۃ، سورۃ الفلق مکیۃ، اور بخاری و مسلم وغیرہ میں نہ اس وقت معوذتین کے نزول کا ذکر ہے۔ نہ ان کے پڑھنے کا اور نہ گرہیں کھلنے کا۔ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ معوذتین جادو کے دفعیہ کے لئے نازل ہوئی ہیں۔ پھر تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی پریشانی کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ تو پہلے سے نازل شدہ موجود تھیں۔ ایسی صورت میں ہونا تو یہ چاہیے۔ کہ ہر شخص ان سورتوں کو پڑھ کر جادو کا توڑ کر سکے۔ لیکن آج تک کوئی ان سورتوں کو پڑھ کر جادو کا توڑ نہ کر سکا۔

غالباً اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ ہر چیز کا اثر اس وقت ہوتا ہے جب اس کا عمل کر لیا جائے تو رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہئے تھا۔ کہ امت کو وہ عمل بھی بتاتے۔ اور جب آپ نے وہ عمل نہیں بتایا تو آپ نے امت کو اس فلاح سے کیوں محروم رکھا؟ اور کس لئے اس سلسلہ میں اخفا سے کام لیا؟ یہ سب طریقے دشمنان اسلام نے وضع کر کے انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا۔ بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ چیزیں نکلوائی نہیں گئیں۔ جب کسی چیز کا نکلوانا ہی ثابت نہیں تو آگے کی کہانی کیسے ثابت ہوگی۔

ہماری اس سلسلہ میں جہاں تک معلومات ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر کوئی تعویذ یا جادو دفن کیا جاتا ہے تو اس کا توڑ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ چیز نکلوائی نہ جائے۔ تمام تعویذ گنڈے کرنے والے اور جادوگروں کا اس پر اتفاق ہے۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ واقعہ فتح خیبر کے بعد محرم ۷ھ میں پیش آیا۔ اور بخاری کے حاشیہ پر محدث احمد علی سہارنپوری لکھتے ہیں کہ آپ پر اس کا اثر ایک سال تک رہا۔

اس سے قبل کہ ہم اس مسئلہ کے سلسلہ میں اپنی معروضات پیش کریں۔ ہم امام ابوبکر جصاص الرازی الحنفی کا قول پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن عوام چونکہ اُن کی حیثیت سے باخبر نہیں۔ اس لئے سب سے پہلے ہم ان کی ذات کا تعارف کرانا چاہتے ہیں۔

مولینا عبد الرشید نعمانی جو جامعہ بنوری نیوٹاؤن میں ادارۂ تصنیف و تالیف کے ذمہ دار افراد میں سے ہیں۔ امام ابوبکر جصاص پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ابوبکر جصاص امام ابوبکر احمد بن علی الجصاص مشہور اکابر حنفیہ میں سے ہیں۔ بہت بڑے محدث اور امام تھے۔ فن حدیث میں اُن کو امام ابوالحسن کرخی، ابوالعباس اصم، حافظ عبدالباقی بن قانع اور ابوعمر غلام ثعلب سے تلمذ حاصل ہے۔ ۳۰۵ھ میں پیدا ہوتے۔ طلب حدیث میں مختلف ممالک کا سفر کیا۔ ۳۲۵ھ میں بغداد آئے۔ اور امام کرخی سے فقہ و حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اسی سلسلہ میں اہواز گئے۔ اور وہاں سے دوبارہ بغداد آئے۔ یہاں آکر امام کرخی کے مشورے سے محدث حاکم نیشاپوری (مصنف المستدرک) کے ساتھ اس فن کی تکمیل کے لئے نیشاپور تک گئے۔ یہ ابھی نیشاپور ہی میں تھے کہ امام کرخی کا انتقال ہوگیا۔ نیشاپور سے ۳۴۴ھ میں بغداد کو واپسی ہوئی۔ اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

بغداد میں اُن کی درس گاہ تمام عالم اسلام کا مرجع تھی۔ نہایت زاہد و پاک باز تھے۔ بارگاہِ خلافت سے بارہا انہیں عہدۂ قضا پیش کیا گیا۔ لیکن انہوں نے کبھی قبول نہیں فرمایا۔ امام صیمری لکھتے ہیں۔

بغداد میں ابوبکر رازی کے درس کا سلسلہ قائم ہوا۔ اور علمی رحلت (سفر) کی انتہا اُن پر ہوئی۔ یہ زہد و ورع اور احتیاط میں متقدمین کے طرز پر تھے۔

خطیب بغدادیؒ شافعی جو امام ابوحنیفہ اور ان کے ماننے والوں سے انتہائی تعصب رکھتے تھے' ان کے بارے میں یہ الفاظ لکھتے ہیں

یہ اپنے وقت میں احناف کے امام تھے۔ اور زہد میں مشہور تھے۔

حافظ عبدالقادر قرشی نے "الجواہر المضیئۃ" میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

احمد بن علی الرازی امام ہیں۔ بڑی شان کے مالک ہیں۔

ان کے حلقۂ درس سے بڑے بڑے اکابر پیدا ہوئے جن میں امام ابوبکر محمد بن موسیٰ خوارزمی، امام ابوجعفر محمد بن احمد نسفی، امام ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ مہدی فقیہ جرجانی استاد امام قدوری۔ امام احمد بن محمد بن عمر المعروف بابن السلمہ، امام ابوالحسین محمد بن احمد زعفرانی اور امام ابوالحسین محمد بن احمد طیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امام جصاص کی متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ جن میں سے عرصہ ہوا کہ "احکام القرآن" جو اپنے موضوع پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔ طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ اور شرح مختصر الطحاوی کا عکسی فوٹو حضرت علامہ ابوالوفا افغانی صدر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ کی خدمت میں میری نظر سے گزرا ہے۔ امام ممدوح کی تمام تصنیفات آپ کے محدث اور حافظ حدیث ہونے پر شاہد عدل ہیں۔ علامہ اسمٰعیل شہید دہلوی نے "تنویر العینین" میں ان کو مجتہدین میں شمار کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں حسن بن رشیق کے ترجمہ میں ان کا سن وفات ۳۷۰ھ تحریر کیا ہے۔

ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۲۵

ایوب خاں کے دور میں پروفیسر خورشید احمد نے جو جماعت اسلامی کے ایک اہم رکن ہیں۔ ایک ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے نام سے ناظم آباد کراچی میں قائم کیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے "احکام القرآن" کا ترجمہ شروع کروایا۔ جلد اول مکمل ہو چکی تھی۔ جلد ثانی کا ترجمہ جاری تھا تو انہوں نے یہ کہہ کر کام بند کر دیا کہ یہ کام جماعت کے مزاج کے

مطابق نہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اُس ترجمہ کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔

آمدم برسر مطلب۔ امام ابوبکر جصاص رازی سحر کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
لوگ اس قسم کے جادو کے شعبدہ بازوں کی تصدیق کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ جو ان کی تصدیق کرتا ہے۔ وہ نبوت کے مقام کو سمجھتا ہی نہیں۔ اور اس سے بعید نہیں کہ وہ انبیاء کے معجزات کو بھی اسی نوع سے قرار دیدے۔ بلکہ خود انبیاء کو بھی جادوگر تصور کرے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ۝	جادوگر کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وہ کہیں بھی آجائے۔

اور لوگوں نے تو جادوگر کی کارستانیوں سے اسے بھی جائز قرار دیدیا ہے جو اس سے بھی زیادہ ہولناک اور شرمناک بات ہے۔ یعنی ان لوگوں کا خیال ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا۔ اور جادو نے آپ پر اثر بھی کیا تھا۔ حتیٰ کہ آپ نے فرمایا تھا (یا کہا جاتا ہے) کہ مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ میں کوئی بات کہہ رہا ہوں اور کر رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے نہ کہا ہوتا ہے اور نہ کیا ہوتا ہے۔
کہا جاتا ہے کہ ایک یہودی نے آپ پر کھجور کے چھلکے کے اندر کنگھی اور بالوں میں جادو کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ آپ کے پاس جبریل آئے۔ اور انہوں نے آپ کو اطلاع دی کہ فلاں عورت (مرد) نے کھجور کے چھلکے میں جادو کر دیا ہے۔ اور وہ کنوئیں کے اندر پتھر کے نیچے دبا ہوا ہے۔ تو آپ نے اس کو نکلوایا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اثر دور ہوگیا۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے کفار کے دعویٰ کو جھٹلاتے ہوئے جو وہ آپ کے بارے میں کہتے تھے۔ یہ فرمایا تھا۔

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝	اور ظالموں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تم تو ایسے آدمی کے پیچھے لگ گئے جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔

دراصل اس طرح کی حدیثیں ملحدوں کی وضع کردہ ہیں جو رذیلوں اور اوباشوں کو اہمیت دیتے اور بتدریج لوگوں کو اس بات کے لئے تیار کرنے کے واسطے گھڑی گئی ہیں تاکہ انبیاء کے معجزات کو باطل کیا جائے۔ اور

اُن میں شبہ ڈالا جائے۔ اور اس کا قائل کیا جائے کہ انبیاء کے معجزات اور جادوگروں کی شعبدہ کاریوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور سب کی سب ایک ہی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس قسم کی روایات بیان کرنے والوں پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ انبیاء کی تصدیق بھی کرتے ہیں، اُن کے معجزات کو ثابت بھی کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ اس کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ جادو بھی یہ کچھ کر سکتا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ　　　جادوگر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ کہیں بھی آجائے۔

تو یہ لوگ اسے سچا سمجھ رہے ہیں جسے اللہ نے جھٹلادیا ہے اور جس کے دعوے اور کاریگری کے باطل ہونے کی خبر دی ہے۔ احکام القرآن ج ۱ ص ۵۵

خط کشیدہ الفاظ پر ایک بار نظر ڈالئے کہ امام ابوبکر جصاص رازی اس قسم کی روایات کو وضعی قرار دے رہے ہیں۔ اور وہ بھی ملحدوں کی، نیز اوباشوں کی بات کو اہمیت دینے کی ایک کوشش فرما رہے ہیں۔

حجۃ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازی ایک بڑے امام ہیں۔ اتنے سخت الفاظ وہی استعمال فرما سکتے ہیں۔ ہم تو اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ امام موصوف بخاری و مسلم کی روایت سحر کے بارے میں یہ سب کچھ فرما رہے ہیں۔ اور بخاری و مسلم کی روایات اور ان کے راویوں کے لئے اتنے سخت الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ کیونکہ ایک جانب یہ محدثین کرام اور ان کے راویوں کی شخصیات ہیں۔ اور دوسری جانب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب ہمیں کس کی عزت پیاری ہے۔ اور ہمیں کس کی عزت کو داغ دار کرنا ہے؛ وہ کونسی شخصیت ہے جس پر ایمان لانا جس کی تصدیق کرنا اور جس سے محبت کرنا شرط ایمان ہے ؛ ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و توقیر عین ایمان ہے۔ جس کے بغیر ایمان کا وجود باقی نہیں رہتا جب کہ ان راویوں پر ایمان لانا نہ ہمارے لئے لازم ہے اور نہ ان کی تصدیق ہم پر واجب ہے۔ اس سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ:۔

۱۔ موجودہ علماء جو صحیحین کی روایتوں پر آنکھیں بند کرکے ایمان لاتے ہیں۔ اور قطعاً سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تو متقدمین احناف کا ہرگز یہ اصول نہ تھا۔ یہ اصول تو اُس وقت اپنایا گیا جب کم علمی کے باعث ہماری

سوچنے کی صلاحیتیں مفقود ہوگئیں۔ اور اکابر پرستی کو اپنا دین و ایمان تصور کر لیا گیا جس کے نتیجے میں موضوع و منکر روایات بھی صحیح قرار پانے لگیں۔

۲۔ ہم کتب رجال میں متعدد ایسے راویوں کے حالات دیکھتے اور پڑھتے ہیں کہ وہ روایات وضع کر کے انہیں ثقہ راویوں کی جانب منسوب کر دیتے۔ متعدد رواۃ نے امام مالک اور ہشام بن عروہ وغیرہ کے نام سے روایات وضع کر کے پھیلائی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی اسی قسم کی ایک روایت ہو۔

۳۔ احناف کا طریقہ ہے کہ جب کوئی روایت قرآن کے خلاف واقع ہوتی ہے تو یا تو اس کی تاویل کرتے ہیں یا اسے رد کر دیتے ہیں۔ امام ابوبکر جصاص کے نزدیک یہ روایت خلاف قرآن ہے۔ اسی لئے وہ اتنے سخت الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔

۴۔ محققین مثلاً ابن القیم وغیرہ اصول درایت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر روایت میں کوئی ایسا وقوعہ بیان کیا جا رہا ہو کہ اگر وہ پیش آتا تو اسے بہت سے لوگ نقل کرتے۔ لیکن اُس وقوعہ کو ایک فرد کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا مثلاً حضرت علی کے لئے سورج کا لوٹنا تو یہ اس روایت کے موضوع ہونے کی دلیل ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہونا اور ایک سال تک اس کا اثر قائم رہنا۔ اور جو کام نہیں کیا ہے اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ کر چکا ہوں ایک ایسا واقعہ ہے جس کے سینکڑوں افراد ناقل ہوتے لیکن ایک ام المومنین حضرت عائشہؓ کے علاوہ اسے کوئی روایت نہیں کرتا پھر ام المؤمنین سے عروہ کے علاوہ کوئی ناقل نہیں۔ اور عروہ سے ہشام کے علاوہ اسے کوئی بیان نہیں کرتا۔ گویا ۷ھ سے جب یہ وقوعہ پیش آیا ۱۴۰ھ تک ہر زمانہ میں ایک ایک شخص کے علاوہ کسی دوسرے کو اس کی خبر نہیں ہوئی۔ گویا یہ بھی علم باطن تھا جس کا مخفی رکھنا ضروریات میں داخل تھا۔

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں مصر کے تمام جادوگروں کو جمع کیا گیا۔ اور انہوں نے جادو کے زور سے لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ بنایا۔ جو لوگوں کے تخیل کے مطابق دوڑ رہے تھے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کے معجزہ کے سامنے سب جادو ختم ہو گئے۔ اور حضرت موسیٰؑ پر کوئی جادو اثر نہ کر سکا۔ اور ارشاد ہوا۔

اِنَّ اللّٰہَ سَیُبۡطِلُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا   یقیناً اللہ اس سحر کو باطل کر دے گا۔ یقیناً اللہ

يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ مفسدین کے عمل کی اصلاح نہیں کرتا۔

یونس - ۸۱

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے معاملہ میں مفسد اور جادوگر کامیاب ہوتا ہے۔ کہیں یہ روایت کسی یہودی کی کرم فرمائی کا نتیجہ تو نہیں۔؟ جو حضرت موسیٰؑ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دینا چاہتا ہو ایسی صورت میں اگر ہم اس کہانی کو تسلیم کر لیتے ہیں تو اس سے یہودیوں کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى۔ جادوگر کامیاب نہیں ہو سکتا خواہ کہیں بھی آجائے۔

طٰہٰ - ۶۹

گویا یہ کہہ کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کوئی جادوگر نبی کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب کہ یہ کہانی یہ ثابت کر رہی ہے کہ لبید بن اعصم یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کامیاب ہوا۔ اور نبوت کچھ بھی نہ کر سکی۔ عیاذاً باللہ۔

۵۔ یہ روایت ہشام کے علاوہ کوئی بیان نہیں کرتا۔ اور ہشام کا ۱۳۲ھ میں دماغ جواب دے گیا تھا بلکہ حافظ عقیلی تو لکھتے ہیں۔ قد خرف فی اٰخر عمرہ۔ آخر عمر میں سٹھیا گئے تھے۔ تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ روایت سٹھیانے سے پہلے کی ہے

۶۔ ہشام کے مشہور شاگردوں میں سے امام مالک یہ روایت نقل نہیں کرتے۔ بلکہ کوئی بھی اہل مدینہ یہ روایت نقل نہیں کرتا۔ ہشام سے جتنے بھی راوی ہیں سب عراقی ہیں اور اتفاق سے عراق پہنچنے کے چند روز بعد ہشام کا دماغ سٹھیا گیا تھا۔

۷۔ ہمارے نزدیک یہ روایت مضطرب ہے۔ کیونکہ اس روایت میں زبردست اختلاف ہے۔ ایک راوی ہشام سے یہ نقل کرتا ہے کہ وہ کنگھی وغیرہ نکالی گئی۔ اور دوسرا نقل کرتا ہے کہ ام المؤمنین نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے اسے کیوں نہیں نکالا؟ یعنی وہ کیوں نکالی نہیں گئی۔ ایک راوی ام المؤمنین کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ آپ نے لبید کو بدنام کیوں نہیں کیا؟ یعنی اس روایت میں سوال کی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اچانک خواب بیان کیا۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ رات کو آپ نے خوب دعا کی تو یہ خواب دیکھا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ کو مغالطہ ازواج کے پاس جانے کے سلسلہ میں ہوتا تھا جب کہ دیگر راویوں کا بیان ہے کہ یہ مغالطہ ہر کام میں ہوتا تھا۔ اور یہ سب متضاد امور ہشام سے مروی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کا دماغ سٹھیانے کے لئے اتنے ہی ثبوت کافی ہیں۔

۸۔ ہمارے شارحین حدیث لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیاوی معاملات بھول جاتے تھے۔ دینی امور میں یہ بھول نہیں ہوتی تھی۔ لیکن شارحین کا یہ قول بلا دلیل ہے۔ حدیث میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ بھول دینی معاملات میں نہیں ہوتی تھی۔ فرض کیجئے ایک غیر مسلم یہ اعتراض کرتا ہے کہ آپ نے جادو کی حالت میں متعدد امور خلاف منشاء الٰہی انجام دیتے ہوں گے۔ کیونکہ ان روایات سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کے ذہن پر جادو کا اثر ہوا۔ پھر یہ دینی اور غیر دینی کی تفریق کیسے ممکن ہوگی۔

۹۔ ایک معترض یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ جب آپ کے ذہن پر جادو کا اثر ہوا تو اس ایک سال کے دوران جو وحی نازل ہوتی رہی۔ اس میں بھی تو مغالطہ کا احتمال ہے۔ اور علی الخصوص وحی غیر متلو میں۔

۱۰۔ ایک سال کی مدت بہت طویل ہوتی ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اُس وقت نو ازواج تھیں۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ بقیہ ازواج سے اس سلسلہ میں کوئی روایت مروی نہیں۔ کیا دیگر ازواج کے یہاں جاکر جادو کا اثر ختم ہوجاتا تھا؟ کیا ایک سال تک آپ نے حضرت عائشہؓ کے علاوہ کسی اور کے پاس وقت نہیں گزارا۔؟

۱۱۔ کیا ایک سال تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر ہی میں مقیم رہے۔ جب کہ کوئی صحابی اس واقعہ کو نقل نہیں کرتا۔ کیا یہ بھول اور مغالطہ دوسرے لوگوں کے سامنے نہیں ہوتا تھا۔

۱۲۔ نبی پر جادو اثر کرسکتا ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ اعتقادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور تمام علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اعتقاد کی بنیاد خبر واحد پر قطعاً نہیں رکھی جاسکتی۔ کیونکہ اس میں ظن متواتر کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا — یقیناً ظن حق کے معاملہ میں کچھ کام نہیں آتا

النجم - ۲۸

مولینا حفظ الرحمان سیوہاروی اپنی قصص القرآن میں سحر کے متعلق لکھتے ہیں :۔

اس کے متعلق جمہور علماء اہل سنت کی یہ رائے ہے کہ سحر واقعی ایک حقیقت ہے۔ اور مضرت رساں اثرات رکھتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ اور مصلحت کاملہ کے پیش نظر اس میں اسی طرح مضر اثرات رکھ دیئے ہیں جس طرح زہر میں یا دوسری نقصان رساں ادویہ میں یہ نہیں ہے کہ سحر قدرت الٰہی سے بے نیاز ہو کر العیاذ باللہ خود مؤثر بالذات ہے۔ کیونکہ یہ عقیدہ تو کفر خالص ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ، ابوجصاص صاحب احکام القرآن ابواسحٰق اسفرائنی شافعی۔ علامہ ابن حزم ظاہری اور معتزلہ کہتے ہیں کہ سحر کی حقیقت شعبدۂ نظر بندی اور فریب خیال کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ ایک باطل اور بے حقیقت شئے ہے۔ قصص القرآن ج ۱ ص ۲۲۴

اس کے بعد مولینا حفظ الرحمان نے اس کے ثبوت کے لئے چند عبارتیں پیش فرمائیں۔

لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ جو حضرات سحر کی کوئی حقیقت نہیں مانتے، جیسے امام ابوحنیفہ یا علامہ ابن حزم وغیرہ ان کے نزدیک تو یہ روایات باطل قرار پائیں۔ کیونکہ جو لوگ سحر کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ حضور کے سلسلہ میں اس امر کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ اور حیرت تو احناف پر ہے کہ اپنے حنفی ہونے کا دعویٰ کرتے اور ابوحنیفہ کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ فیا للعجب۔

اللہ تعالیٰ محمد یوسف بجلی والا مرحوم ناظم اعلیٰ سنی کونسل کو فردوس بریں میں جگہ عطا فرمائے جنہوں نے ہمیں اس روایت کی تحقیق کی جانب متوجہ کیا۔ ہم اس مسئلہ میں ان کے احسان مند ہیں۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

حضرت فاطمہؓ کس طرح وجود میں آئیں

اس موضوع پر کذابین نے جو روایات وضع کی ہیں۔ وہ تین صحابہ کی جانب منسوب ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ پھر یہ مختلف سندات سے مروی ہیں ہم سطور ذیل میں علامہ ابن الجوزی کی کتاب "الموضوعات" سے اس کہانی کا مختصر سا حال پیش کر رہے ہیں۔

پہلی روایت اس موضوع پر حضرت عمرؓ کی جانب منسوب کی جاتی ہے۔ جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب خدیجہؓ سے میرا بچہ مرا تو اللہ تعالیٰ نے میرے پاس وحی بھیجی کہ تم خدیجہؓ کے پاس نہ جانا اور میں خدیجہؓ کا عاشق تھا۔ لہٰذا میں نے اللہ سے سوال کیا کہ ہم دونوں کو ملنے کی اجازت دی جائے۔ تو اچانک جبرائیلؑ آئے اور یہ رمضان کی چوبیسویں شب تھی۔ ان کے ہاتھ میں جنّت کی کھجوروں سے بھرا ہوا ایک طباق تھا۔ جبرائیلؑ نے مجھ سے کہا اے محمد اولاً یہ کھجوریں کھاؤ۔ اس کے بعد رات کو خدیجہؓ کے پاس جانا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ جس کے باعث خدیجہؓ کو فاطمہؓ کا حمل ٹھہرا۔ اب میں جب بھی فاطمہؓ کو چاٹتا ہوں تو مجھے اُن تازہ کھجوروں کی خوشبو آتی ہے۔

ایک روایت میں مزید یہ ہے کہ اسی سے قیامت تک میری اولاد چلے گی۔ اس روایت کی دو سندات ہیں۔ لیکن آخر میں جاکر دونوں عمرو بن زیاد الثوبانی پر ایک ہو جاتی ہیں۔

ابن جوزی لکھتے ہیں۔

عمرو بن زیاد الثوبانی یہ کذاب ہے۔ دار قطنی کہتے ہیں احادیث وضع کیا کرتا تھا۔

ابن عدی کا قول ہے کہ یہ باطل حدیثیں روایت کرتا ہے اور دراصل یہ روایتیں دوسرے کذابین سے چوری کی ہوئی ہیں۔ الموضوعات ج ۱ ص۴۱۳

سیوطی لکھتے ہیں ذہبی نے میزان میں اس روایت کا واضع اس عمرو بن زیاد الثوبانی کو قرار دیا ہے۔ یہ کہانی ابوصالح مؤذن نے اپنی "مناقب فاطمہ رضؓ" میں نقل کی ہے۔ اللالی المصنوعہ فی احادیث الموضوعہ ج ۱ ص۳۹۲

ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ ابن عدی کہتے ہیں۔ یہ عمرو بن زیاد لوگوں کی حدیثیں چوری کرکے دوسروں کی جانب منسوب کرتا اور باطل روایات نقل کرتا ہے اور یہ روایت باطل ہے اور عمرو وضع حدیث کے ساتھ متہم ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں یہ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔

ابن جوزی، ابن عدی اور ذہبی لکھتے ہیں اس روایت کے جھوٹ ہونے کے لیے اتنی دلیل کافی ہے کہ حضرت فاطمہ رضؓ نبوت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں۔ میزان ج ۳ ص۲۶۱

اس موضوع پر ایک کہانی حسن بن عبید اللہ الابزاری نے خلفاء عباسیہ کی سند یعنی مامون ہارون، مہدی، منصور، محمد، علی کے واسطہ سے ابن عباس رضؓ سے نقل کی ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاطمہ رضؓ کا اکثر پیار لیتے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کیا یا نبی اللہ آپ فاطمہ رضؓ کا اکثر پیار لیتے ہیں۔؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب مجھے معراج ہوئی اور میں جنّت میں داخل ہوا تو مجھے جنّت کے تمام پھل کھلائے گئے جس سے میری پشت میں نطفہ تیار ہوا اور خدیجہ رضؓ کو فاطمہ رضؓ کا حمل ٹھہرا۔ جب مجھے ان پھلوں کے کھانے کا شوق پیدا ہوتا ہے تو میں فاطمہ رضؓ کے پیار لیتا ہوں جس سے مجھے ان پھلوں کا مزا آجاتا ہے جو میں نے کھائے

تھے۔ موضوعات ج ۱ ص ۴۱۱

الابزاری ابن جوزی کہتے ہیں اس کا راوی الابزاری ہے جو کذاب ہے۔ احادیث وضع کیا کرتا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معراج ہوئی تو حضرت فاطمہ رض کی عمر سترہ سال تھی۔

ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ حسن بن عبید اللہ الابزاری کذاب ہے۔ اس کے پاس تو نام کو بھی حیا نہ تھی اور اس کا نام حسن نہیں حسین ہے۔ میزان ج ۱ ص ۵۰۲

اب روایت عائشہ بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ اس کی چار سندات ہیں۔ لیکن دو روایتیں تو تقریباً ہم شکل ہیں۔ لیکن بقیہ دو میں کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔

پہلی روایت کی کچھ شکل و صورت اس طرح ہے کہ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیا بات ہے کہ جب آپ فاطمہ رض کا پیار لیتے ہیں تو اپنی زبان ان کے منہ میں اس طرح داخل کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ آپ شہد چاٹ رہے ہوں؟ آپ نے فرمایا۔ اے عائشہ رض سنو جب مجھے آسمانوں پر لے جایا گیا تو جبرائیل ع مجھے جنت میں لے گئے اور ایک سیب کھانے کو دیا۔ (یعنی جنت میں صرف ایک سیب ملا اور دنیا میں کھجوروں کا طباق بھر کر آگیا) جو میں نے کھایا۔ جس سے میری پشت میں نطفہ پیدا ہوا۔ جب میں آسمان سے نیچے اترا تو خدیجہ رض کے پاس گیا۔ جس سے فاطمہ رض کا حمل واقع ہوا۔ جب میں جنت کا مشتاق ہوتا ہوں تو فاطمہ رض کو پیار کر لیتا ہوں۔ موضوعات ج ۱ ص ۴۱۱ ، اللآلی المصنوعہ ج ۱ ص ۵۹۳ میزان ج ۱ ص ۸۱

احمد بن الاجم ابن جوزی لکھتے ہیں کہ اس کا راوی احمد بن الاجم ہے جسے اہل نقل نے کذاب کہا ہے۔

ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ فاطمہ رض تو نبوت سے قبل پیدا ہوئیں اور یہ احمد بن الاجم کذاب ہے۔ میزان ج ۱ ص ۸۱۔

شکل دوم حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ یہ کیا بات ہے کہ جب فاطمہؓ آتی ہیں تو آپ ان کا پیار لیتے ہیں اور اپنی پوری زبان ان کے مُنہ میں داخل کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ آپ شہد چاٹنا چاہ رہے ہوں؟ آپ نے فرمایا ہاں اے عائشہ جب مجھے آسمانوں کی جانب لے جایا گیا تو جبرائیلؑ مجھے جنّت میں لے گئے اور کھانے کے لیے ایک سیب دیا۔ جس سے پشت میں نطفہ قائم ہوا۔ میں جب نیچے اُترا تو خدیجہؓ کے پاس گیا جس سے فاطمہؓ پیدا ہوئیں۔ اس لحاظ سے فاطمہؓ انسانی حور ہیں۔

ابن الجوزی لکھتے ہیں اس کا راوی محمد بن الخلیل ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں۔ یہ حدیث وضع کیا کرتا تھا۔ اس کا ذکر کرنا بھی حلال نہیں۔ موضوعات ج ۱ صـ۴۱۴ اللآلی المصنوعہ ج ۱ صـ۳۹۳

محمد بن الخلیل یہ محمد بن الخلیل کون ذات شریف ہیں، جنہوں نے اتنا بڑا جھوٹ بولا ہے ذہبی لکھتے ہیں یہ روایت خطیب نے تاریخ میں نقل کی ہے، اور یہ موضوع ہے میزان ج ۳ صـ۵۴

سیوطی لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے کہ یہ محمد بن خلیل انتہائی ذلیل انسان تھا۔ ورنہ فاطمہؓ تو نبوت سے ایک مدت قبل پیدا ہوئیں۔ کیونکہ یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ نماز معراج میں فرض ہوئی اور حضرت خدیجہؓ فرضیت نماز سے قبل انتقال کر چکی تھیں۔ اللآلی المصنوعہ ج ۱ صـ۳۹۳

شکل سوم حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ جب بھی فاطمہؓ آتی ہیں۔ تو آپ اپنی زبان ان کے مُنہ میں داخل کر دیتے ہیں گویا شہد چاٹ رہے ہوں۔ یہ کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا جبریلؑ روح الامین جنّت کے پھلوں میں سے میرے پاس ایک پھل لے کر آئے جو میں نے کھایا اور خدیجہؓ کے پاس گیا جس سے فاطمہؓ پیدا ہوئیں۔ اب جب مجھے جنّت کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے تو میں فاطمہؓ کا پیار لیتا ہوں کیونکہ وہ انسانی حور ہیں۔

ابن جوزی کہتے ہیں اس کا راوی غلام خلیل ہے جو کذاب ہے۔ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ موضوعات ج ۱ صـ۴۱۴۔ اللآلی ج ۱ صـ۳۹۳

صوفی غلام خلیل

ذہبی لکھتے ہیں یہ بغداد کے زاہد تھے۔ مشہور کذاب ہیں۔ ان کا نام احمد بن محمد بن غالب الباہلی ہے۔ میزان ج ۳ ص ۳۳۶

ذہبی جلد اول میں لکھتے ہیں کہ ان کا شمار بغداد کے بڑے زاہدوں میں ہوتا تھا۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ ابو عبد اللہ النہاوندی نے ان سے سوال کیا کہ یہ لوگوں کو رلانے والی احادیث تم نے کہاں سے سنیں۔ اس پر ان صاحب نے فرمایا ہم نے لوگوں کے دل نرم کرنے کے لیے خود وضع کی ہیں۔

امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ مجھے تو یہ ڈر پیدا ہوتا ہے کہ یہ بغداد کا دجال نہ ہو۔ دارقطنی کہتے ہیں متروک ہے۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ ۲۷۵ھ میں اس کا انتقال ہوا اور ایک تابوت میں اس کا جنازہ بصرہ لے جایا گیا۔ اس کے مریدین نے اس کی قبر پر ایک قبہ بنایا۔ اس کے زہد کا یہ حال تھا کہ اس نے تمام زندگی لوبیا کھا کر گزار دی۔

ابو جعفر الشعیری کا بیان ہے کہ ایک بار اس غلام خلیل نے ایک روایت بیان کی۔ جسے اس نے بکر بن عیسٰی کی جانب منسوب کیا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ بکر بن عیسٰی وہ شخص ہے جس سے احمد بن حنبل نے روایت کی ہے۔ لیکن اس بکر کا زمانہ تو بہت پہلے کا ہے۔ تمہاری اس سے ملاقات کیسے ممکن ہے؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر میں نے اسے کریدنے کے لیے خود ہی کہا کہ یہ کوئی دوسرا شخص ہوگا۔ وہ خاموش رہا۔ لیکن جب میں اگلے روز اس کے پاس گیا تو کہنے لگا میں رات غور کرتا رہا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں نے بصرہ میں بکر بن عیسٰی نامی جن افراد سے روایات سنی ہیں۔ ان کی کل تعداد ساٹھ ہے۔ ج ۱ ص ۱۴۲

ہمیں اس پر حیرت ہے کہ یہ زہاد کا طبقہ کثرت عبادت میں منہمک رہتا اور کھانے پینے میں حد سے زیادہ محتاط تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام پر جھوٹ بولنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ کیا یہ بھی کوئی عبادت تھی؟ افسوس کہ ہمیں آج تک ایسا کوئی صوفی اور زاہد نظر نہیں آیا جو جھوٹ کی اس عبادت سے پاک ہو۔

شکلِ چہارم حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاطمہؓ کے گلے کا اکثر پیار لیتے۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ میں آپ کو وہ حرکت کرتے دیکھتی ہوں جو آپ نہ کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا اے حمیراء اللہ عزوجل جب مجھے آسمان پر لے گیا تو اس نے جبریلؑ کو حکم دیا، وہ مجھے جنت میں لے گئے اور ایک درخت کے سامنے لیجا کر کھڑا کر دیا۔ اتنا خوشبو دار درخت اور اتنا مزے دار پھل میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، جبریلؑ مجھے چھیل کر دے رہے تھے اور میں کھا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس درخت کے ذریعے میرے صلب میں نطفہ پیدا فرمایا۔ جب میں دنیا میں واپس آیا تو اس سے فاطمہؓ کا حمل ٹھیرا۔ جب مجھے اس درخت کے سونگھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے تو میں فاطمہؓ کا گلہ سونگھتا ہوں تو مجھے وہ خوشبو محسوس ہوتی ہے اور درحقیقت بات یہ ہے کہ فاطمہؓ دنیا کی عورتوں میں سے نہیں ہے اور اسے اور عورتوں کی طرح دنیاوی عوارض پیش آتے ہیں (یعنی حیض ونفاس)

ابوقتادہ ابن جوزی لکھتے ہیں اس کا راوی ابوقتادہ ہے۔ اس میں غفلت کا مادہ بہت پایا جاتا تھا۔ لہٰذا یار لوگ اس سے روایت میں اضافہ کراتے رہتے (یعنی یہ بھی کوئی صوفی تھا) یحییٰ بن معین کہتے ہیں ابوقتادہ کچھ نہیں۔ نسائی کہتے ہیں متروک الحدیث ہے۔ بخاری کہتے ہیں لوگوں نے اس کی روایات ترک کر دی ہیں۔ موضوعات ج ۱ ص۴۱۲

ابن جوزی لکھتے ہیں اس روایت کے اختلافات کو دیکھو اور اس پر بھی غور کرو کہ حضرت عائشہؓ یہ صورت حال اسی وقت دیکھ سکتی ہیں جب کہ وہ حضور کی زوجیت میں آچکی ہوں اور فاطمہؓ کی عمر اس وقت بائیس (۲۲) سال تھی۔ اور ایک جوان عورت سے اس قسم کی حرکت خاوند کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا، اور باپ کے لیے تو یہ قطعاً جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان خبیثوں کو سمجھ دے کہ وہ کس قسم کی رسواکن کہانیاں نقل کرتے ہیں۔

ان روایات کے موضوع ہونے میں کسی مبتدی کو بھی شک نہیں ہو سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانیاں بیان کرنے والے تاریخ سے قطعاً جاہل ہیں بلکہ صوفیاء کی پہچان اسی سے ہوتی رہی ہے کیونکہ فاطمہؓ نبوت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں۔

ان روایات میں معراج کے ذکر سے ان لوگوں کی جہالت کھل کر سامنے آگئی۔ کیونکہ معراج ہجرت مدینہ سے ایک سال قبل اور حضرت خدیجہ رضؓ کی وفات کے بعد ہوئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعد الہجرت مدینہ میں دس سال مقیم رہے۔ اس لحاظ سے جب آپ کی وفات ہوئی تو فاطمہ رضؓ کی عمر دس سال چند ماہ ہوئی تو پھر حسن و حسین کہاں سے آگئے۔ حالانکہ جب معراج ہوئی تو فاطمہ رضؓ کی عمر سترہ سال تھی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ان جہالتوں سے پاک ہے۔

ابن الجوزی آگے لکھتے ہیں مجھے حیرت تو دارقطنی پر ہے کہ انہوں نے یہ روایت ابن غیلان پھر ابوبکر الشافعی کی سند سے نقل کی اور نہ اس پر کوئی کلام کیا اور نہ اس کا موضوع ہونا بیان کیا۔ حالانکہ اس قسم کی روایتیں جرح و تعدیل کی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں تاکہ ان کے راویوں کا حال بیان کر کے اس کا رد کرسکیں۔ موضوعات ج ۱ ص۴۱۳۔

اس روایت میں حضرت عائشہ رضؓ کو ان کے لقب حمیرا سے خطاب کیا گیا ہے ملا علی قاری لکھتے ہیں۔

حافظ مزی فرماتے ہیں ہر وہ روایت جس میں یا حمیرا ہو وہ موضوع ہوگی موضوعات کبیر ص۱۴۳۔

ابن حبان کہتے ہیں اس کا راوی عبداللہ بن واقد یعنی ابوقتادہ متروک ہے۔ سیوطی کہتے ہیں ذہبی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ اللآلی ج ۱ ص۳۰۴۔

ذہبی لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن واقد کی کنیت ابوقتادہ ہے۔ یہ حرّان کا باشندہ ہے۔ ۲۱۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ بخاری کہتے ہیں اس کے بارے میں محدثین نے سکوت اختیار کیا ہے اور بخاری کا ایک قول یہ ہے کہ ضعیف ہے۔ محدثین نے اسے ترک کر دیا ہے۔ (الضعفاء الصغیر ص۶۹) ابوزرعہ، ابوحاتم اور دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ یحییٰ ابن معین کہتے ہیں یہ کچھ نہیں۔ یحییٰ بن بکیر کا بیان ہے کہ یہ صوف کا لباس پہنتا تھا (یعنی صوفی تھا) امام لیث نے اس کے پاس ستر (۷۰) دینار بھیجے تھے جو اس نے واپس کر دیئے۔ ابن حبان لکھتے ہیں، اس کا شمار

بصرہ کے عابدین و زاہدین میں ہوتا ہے۔ لیکن حدیث یاد نہ رکھ سکتا تھا جس کے باعث اس کی روایات میں منکرات پائی جاتی ہیں۔ اس کی حدیث حجت نہیں رتمام صوفیاء اور تمام اولیاء کی یہ صفت خاصہ ہے۔

ذہبی کہتے ہیں یہ حدیث موضوع ہے اور محدثین اس سے روایت نہیں کرتے۔ یہ ابوقتادہ تو ایک آفت ہے۔ میزان ج ۲ ص۵۱۸۔

نسائی لکھتے ہیں یہ ابوقتادہ الحرانی، عبداللہ بن واقد متروک الحدیث ہے۔ الضعفاء الصغیر ص۶۴ دارقطنیؒ نے اسے متروک قرار دیا ہے۔ الضعفاء والمتروکین ص۱۱۲

محبت نبویؐ کے نمونے

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے گہرا تعلق اور عشق تھا۔ ایک مرتبہ آپ کو پتہ چلا کہ بصرہ میں ایک شخص ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ آپ نے وہاں کے گورنر کو خط لکھا کہ تم اسے فوراً عزت و اکرام کے ساتھ یہاں روانہ کر دو۔ چنانچہ اسے عزت و تکریم کے ساتھ لایا گیا۔ آپ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ اور خلعت سے نوازا۔ ابن خلدون ج ۲ ص۸۳۵۔

اس حب رسول کی بناء پر آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹے ہوئے ناخن، ایک کپڑا اور اور موئے مبارک سنبھال کر حفاظت کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ جن کے متعلق آپ نے اپنی وصیت کی کہ انہیں میری ناک، کان اور آنکھوں میں رکھ کر مجھے دفنایا جائے۔ کامل ابن اثیر ج ۴ ص۲۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی تعلق کی وجہ سے آپ کی بہت سی اداؤں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کی جھلک پائی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوالدرداء فرمایا کرتے تھے۔

کہ میں نے نماز پڑھنے میں کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے مشابہ نہیں پایا جتنے امیر معاویہؓ آپ سے مشابہ تھے۔ مجمع الزوائد ج ۹ ص۳۷۔

ایک عجیب افسانہ

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق)

بیان کیا جاتا ہے :-

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے جو حضرت زیدؓ بن حارثہ کے نکاح میں تھیں، خود شادی فرمانا چاہتے تھے وغیرہ۔

حضرت زیدؓ حضورؐ کے منہ بولے بیٹے تھے (متبنیٰ) اس لیے اس ڈر سے کہ لوگ طعن و تشنیع کریں گے۔ جب زیدؓ نے زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو آپ زیدؓ کو دلی منشاء کے خلاف بظاہر طلاق دینے سے منع کرتے رہے اور مشورہ دیتے رہے کہ زینبؓ کو طلاق نہ دیں۔ بلکہ اپنے پاس ہی رکھیں۔ لیکن جب زیدؓ نے طلاق دے دی تو آپؐ یہ کہہ کر کہ زینبؓ سے میرا نکاح حق تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر کر دیا ہے، لہٰذا آپ بغیر نکاح، بغیر مہر، بغیر اطلاع اور بغیر اجازت حضرت زینبؓ کے پاس شب عروس منانے کے لیے تشریف لے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کی ناکام شادی

حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا ناکام شادی کا تذکرہ ہماری تاریخ کا ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے اور معاندین اسلام نے اس واقعہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی کے لیے کثرت سے اور بُری طرح استعمال کیا ہے۔ معاندین اسلام نے جو کچھ بھی کیا' وہ تو معاندین تھے اور اپنے بغض و عناد کے باعث انہوں نے اس واقعہ پر خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا ہے' چنانچہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے جو بغض و عناد تھا' وہ اسے اس واقعہ کے پردے میں پیش کرتے رہے مگر ہمیں شکایت خود اپنے مورخین' مفسرین اور محدثین سے ہے۔ جنہوں نے اس قسم کی داستانیں نقل کر کے دشمنان اسلام کے لیے مواد فراہم کیا۔

طبری وغیرہ نے اس قسم کی روایات بیان کی ہیں کہ بے حیائی بھی اپنا مُنہ دامن میں چھپا لے۔ لہٰذا بہتر یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس موضوع پر کچھ کھل کر روشنی ڈالی جائے' تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق' عادات اور کیریکٹر پر دشمنوں کو الزام تراشی اور نکتہ چینی کا جو موقعہ ہاتھ آیا ہے۔ اس کا اصل سرچشمہ کہاں ہے۔

بہرحال عیسائی مورخین اور مستشرقین نے اس واقعہ کو نہایت آب و تاب سے بیان کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص اور نکتہ چینی کے لیئے یہ افسانہ نہایت کارآمد ثابت ہوا۔

سب سے اوّل تو آپ قرآن کریم کی یہ آیات ملاحظہ فرمائیں۔ جن کی تفسیر و تشریح میں ہمارے مورخین' مفسرین اور محدثین نے طبع آزمائی کے جوہر دکھائے ہیں۔ سورۃ احزاب میں ارشاد ہے۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ	اور یاد کرو (اے نبی) جب تم اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام فرمایا' اور تم نے بھی انعام کیا تھا' کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو اور اللہ سے ڈرو۔ اور تم اس بات کو چھپا

تَخْشٰهُ ط فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَهَا لِکَیْ لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ط وَکَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ہ مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ط سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ط وَکَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ہ

الاحزاب

۳۷ - ۳۸

رہے ہو جو تمہارے دل میں ہے جسے اللہ خود ہی ظاہر کر دے گا اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے زیادہ ڈرو جب زیدؓ نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی (اور اسے طلاق دے ہی دی) تو ہم نے اس سے تمہارا نکاح کر دیا۔ تاکہ اہل ایمان پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو، جب وہ (منہ بولے بیٹے) اپنی حاجت پوری کر لیں۔ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ نبی پر کوئی تنگی نہیں ہے اس معاملہ میں جو اللہ نے اس کیلئے ٹھہرا دیا ہے اللہ کی سنت (طریقہ) یہی رہی ہے ان لوگوں میں بھی جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اور امر الٰہی مقرر کردہ اندازے کے مطابق ہو کر رہتا ہے۔

آیت کا ترجمہ ملاحظہ کرنے کے بعد تفسیر ابن کثیر کا بیان ملاحظہ فرمائیے جو ہمارے یہاں مستند اور دیگر تفاسیر کے مقابلہ میں صحیح مانی جاتی ہے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

حافظ ابن کثیر کا بیان

اللہ تعالیٰ بیان فرما رہا ہے کہ اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارثہ کو ہر طرح سمجھایا۔ زیدؓ پر اللہ تعالیٰ کا انعام تھا کہ اسلام اور اتباع رسول کی توفیق عطا فرمائی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ان پر احسان تھا کہ انہیں غلامی سے آزاد کیا۔ زیدؓ بہت بڑی شان کے مالک تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی پیارے تھے۔ یہاں تک کہ تمام صحابہ انہیں حِبُّ الرسول (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب) کہا کرتے

تھے۔ ان کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو حِب ابن حِب (محبوب کا بیٹا محبوب) کہا کرتے تھے۔

حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ جس لشکر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زیدؓ کو بھیجتے، اس لشکر کا امیر انہی کو بناتے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ضرور اپنا خلیفہ بناتے (مسند احمد)

بزّار میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنی پھوپھی امیمہ بنت عبد المطلب کی بیٹی زینبؓ بنت جحش اسدیہ سے کر دیا تھا۔ دس دینار اور سات درہم مہر دیا تھا۔ ایک ڈوپٹہ، ایک چادر ایک کرتا، پچاس مُد اناج اور دس مُد کھجوریں دی تھیں۔ ایک سال سے کچھ اوپر تک یہ گھر بسا رہا لیکن پھر ناچاقی شروع ہوگئی۔ حضرت زیدؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر شکایت کی تو آپ انہیں سمجھانے لگے کہ گھر نہ توڑو، اللہ سے ڈرو۔

ابن ابی حاتم اور ابن جریر طبری نے اس مقام پر بہت سے غیر صحیح آثار نقل کیے ہیں جن کا نقل کرنا بھی ہم نامناسب سمجھ کر ترک کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک بھی ثابت اور صحیح نہیں۔

مسند احمد میں ایک روایت حضرت انسؓ سے ہے۔ لیکن اس میں بھی بڑی غرابت ہے۔ اسی لیے ہم نے اس کا بھی ذکر نہیں کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ یہ آیت حضرت زینبؓ بنت جحش اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کے بارے میں اتری ہے۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دے دی تھی کہ زینبؓ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ یہی بات تھی جسے آپ نے ظاہر نہیں کیا اور زیدؓ کو سمجھایا کہ وہ اپنی بیوی کو الگ نہ کریں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر اللہ کی وحی اور کتاب اللہ میں سے ایک آیت بھی چھپانے والے ہوتے تو اس آیت کو چھپا لیتے۔

وَطَرٌ کے معنی حاجت کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب زیدؓ ان سے سیر ہو گئے اور سمجھانے بجھانے کے باوجود میل ملاپ قائم نہیں رہ سکا بلکہ طلاق واقع ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے زینبؓ کو اپنے نبی کے نکاح میں دے دیا۔ اس لیے ولی کی، ایجاب و قبول کی، مہر اور گواہوں کی ضرورت نہیں رہی۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت زینبؓ کی عدت پوری ہو چکی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ بن حارثہ سے فرمایا جاؤ اور زینبؓ کو میرا پیغام نکاح دو۔ حضرت زیدؓ گئے تو وہ آٹا گوندھ رہی تھیں حضرت زیدؓ پر ان کی عظمت اس قدر چھائی کہ سامنے ہو کر بات نہ کر سکے۔ منہ پھیر کر بیٹھ گئے اور ذکر کیا۔ حضرت زینبؓ نے فرمایا ٹھہرو میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کر لوں۔ یہ ادھر کھڑی ہو کر نماز میں مشغول ہوئیں اُدھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اُتری جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ہم نے زینبؓ کا نکاح آپ سے کر دیا۔ چنانچہ اسی وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر بے اطلاع چلے گئے۔ پھر ولیمہ کی دعوت میں آپ نے ہم سب کو گوشت روٹی کھلائی۔ لوگ کھا پی کر چلے گئے۔ مگر چند اشخاص وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ الخ۔ تفسیر ابن کثیر پارہ ۲۲ صلا

حافظ ابن کثیر نے جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اپنے نزدیک صحیح اور مستند روایات بیان فرمائی ہیں اور ابن جریر طبری وغیرہ کی باقی خرافات کو بیان کرنا بھی گوارہ نہیں فرمایا۔ یہی حال حافظ ابن حجر عسقلانی کا ہے۔ وہ بھی اسی قسم کی تفصیلات نقل فرمانے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں۔

اور بہت سی روایتیں ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور اکثر مفسرین نے انہیں نقل کر دیا ہے۔ یہ روایتیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر توجہ کی جائے۔ فتح الباری تفسیر سورۃ احزاب۔

طبری کی لغویات

طبری وغیرہ نے کس قسم کی روایتیں بیان کی ہیں۔ ان کا اندازہ لگانے کے لیے دل پر جبر کر کے ہم صرف ایک روایت نقل کرتے ہیں۔

طبری کی تاریخ اور تفسیر میں ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زیدؓ سے ملنے ان کے گھر گئے۔ زیدؓ موجود نہ تھے۔ حضرت زینبؓ اس وقت کپڑے تبدیل کر رہی تھیں۔ اسی حال میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پر نظر پڑ گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ان کی صورت کھپ گئی جس کی وجہ سے وہ زیدؓ کے دل سے اُتر گئیں۔ اس کے بعد زیدؓ نے آکر عرض کیا یا رسول اللہ اگر زینبؓ آپ کو پسند آگئی ہوں تو میں انہیں طلاق دے دوں الخ تفسیر ابن جریر طبری پارہ ۲۲ صلا

نقل کفر کفر نباشد اسی قسم کی لچر روایتیں ہیں جو مستشرقین کا مایۂ استناد ہیں۔ مورخ طبری نے تاریخ میں یہ روایت واقدی کے حوالہ سے نقل کی جو مشہور کذاب اور دروغ گو ہے اور جس کا مقصد اسی قسم کی بیہودہ روایتوں سے مسلم معاشرہ کو عیش پرستیوں میں مبتلا کرنا اور تباہ کرنا تھا لیکن اس مقام پر ہم یہ تصوّر کرتے ہیں کہ یہ جھوٹ واقدی کا ہو یا نہ ہو لیکن طبری نے یقینی طور پر جھوٹ بولا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی تفسیر میں اس واقعہ کو یونس بن عبد الاعلیٰ کی جانب منسوب کیا ہے جو سب کے نزدیک ثقہ ہیں اور یونس نے یہ واقعہ ابن وہب کی جانب منسوب کیا ہے۔ ان کی ثقاہت پر بھی کسی کو شک نہیں۔ آخری راوی ابن زید ہے جو یہ واقعہ بیان کر رہا ہے۔

ابن زید سے مراد عبد الرحمان زید بن اسلم ہے جس نے یہ بکواس بیان کی ہے۔ امام مالک کا ہم عصر ہے۔ اوپر کے راوی غائب ہیں۔ اس طرح یہ روایت منقطع ہے؟

عبد الرحمٰن بن زید | یہ مدنی کہلاتا ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں اس کی روایات پائی جاتی ہیں۔

یہ تین بھائی ہیں۔ عبدالرحمٰن، عبداللہ اور اسامہ۔

ابویعلی موصلی کا بیان ہے کہ میں نے امام یحییٰ بن معین کو یہ فرماتے سنا کہ زید بن اسلم کے تینوں بیٹے کچھ نہیں ہیں۔ عثمان دارمی نے یحییٰ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عبدالرحمان ضعیف ہے۔

بخاری کا بیان ہے کہ عبدالرحمان کو علی بن المدینی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

امام احمد فرماتے ہیں۔ ان تینوں بھائیوں میں عبداللہ معتبر ہے۔ باقی دونوں بھائی ضعیف ہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ ایک شخص نے اس عبدالرحمان سے سوال کیا کہ کیا تم نے اپنے والد سے یہ روایت بھی سنی تھی کہ حضرت نوحؑ کی کشتی نے بیت اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی؟ کہنے لگا کہ ہاں۔

چونکہ وہ حضرات سنجیدہ لوگ تھے اس لیے اس کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ لیکن اگر ہمارا دور ہوتا تو محفل قہقہہ زار بن جاتی۔

امام شافعی کا یہ بھی بیان ہے کہ امام مالک کے سامنے ایک روایت پیش کی گئی۔ امام مالک نے دریافت کیا یہ روایت کس نے بیان کی؟ اس نے جواب دیا کہ عبدالرحمان نے۔ امام مالک نے فرمایا۔ وہ تو اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت نوحؑ سے بھی روایت نقل کر دے گا۔ میزان ج ۲ ص ۵۶۴۔

اس طرح سے یہ روایت یا تو عبدالرحمان کا جھوٹ ہے۔ ورنہ ان کا واضح خود طبری ہے کیونکہ طبری تو اس کہانی کو تفسیر میں کسی اور کی جانب منسوب کرتا ہے۔ اور تاریخ میں کسی اور کی جانب۔

حافظ ابن کثیر نے اوپر جو کچھ تحریر کیا ہے۔ وہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ حسب ذیل اور خط کشیدہ عبارت پر غور فرمائیں۔

۱۔ ایک سال اور کچھ اوپر تک یہ گھر بسا۔ لیکن پھر ناچاقی شروع ہو گئی۔

حضرت زینبؓ کو طلاق اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نکاح مورخین و مفسرین اور محدثین کی تصریحات کے مطابق ۵ھ میں ہوا ہے۔ حافظ ابن کثیر کے بیان کے مطابق حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کا نکاح ۳ھ میں ہونا چاہیئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے دی تھی کہ زینبؓ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ یہی بات تھی جسے آپ نے ظاہر نہیں کیا۔ (چھپایا) اور زیدؓ کو سمجھایا کہ وہ اپنی بیوی کو الگ نہ کریں۔

۳۔ تمام مفسرین اس امر پر متفق ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم تھی کہ زینبؓ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ یا یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ زینبؓ سے خود نکاح فرمالیں۔ لیکن دوسری جانب زیدؓ کو یہ سمجھا رہے تھے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ قرآن کریم میں یہ جو فرمایا گیا ہے

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ — اور آپ اپنے دل میں کچھ چھپا رہے تھے اور اللہ اسے ظاہر کرنے والا تھا۔

الاحزاب ۳۷

کا مطلب یہی ہے کہ جو بات تھی اسے تو آپ اپنے دل میں چھپا رہے تھے۔ مگر اللہ اس بات کو ظاہر کرنے پر تلا ہوا تھا اور یہ بھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زینبؓ سے خود نکاح فرمانا چاہتے تھے۔ حالانکہ حضرت زینبؓ نے آپؐ کے ارشاد پر اپنی مرضی کے خلاف زیدؓ سے شادی کرنا منظور کیا تھا۔

حضرت زینبؓ قریشی خاندان کی بلند پایہ عورت تھیں اور حضرت زیدؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ سہی مگر بہر صورت آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرت زیدؓ سے جب اُن کا نباہ نہ ہوا اور زیدؓ نے انہیں طلاق دے دی تو آپ نے حضرت زینبؓ کی اشک شوئی کے لیے ان سے خود نکاح کر لینا چاہا۔ مگر وہ اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی تھیں اور منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنا عربوں میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا آپ ڈرتے تھے کہ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ حالانکہ ایک نبی کو لوگوں سے نہیں بلکہ اللہ سے ڈرنا چاہیئے تھا۔

یہ تمام مفسرین کا بیان ہے۔ حافظ ابن کثیر اس میں منفرد نہیں۔ بلکہ ہم نے ان کا حوالہ صرف

اس لیے پیش کیا ہے کہ ان کی تفسیر صحیح ترین تفسیر سمجھی جاتی ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے جو روایات بیان فرمائی ہیں اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دو الزامات عائد ہوتے ہیں۔

اوّل یہ کہ آپ نے تو بہ توبہ العیاذ باللہ منافقت کا ثبوت دیا کہ آپ کے دل میں تو کچھ تھا۔ اور زبان پر کچھ تھا۔ گویا اس طرح آپ نے سبائیوں کی زبان میں تقیہ سے کام لے کر ان کے لیے ایک بہت عمدہ دلیل فراہم کر دی۔

دوئم:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیاذاً باللہ، خاکم بدہن اللہ تعالیٰ سے نہیں بلکہ لوگوں سے ڈرتے تھے۔ یہ دونوں الزام بہت بڑے ہیں بلکہ مفسرین نے اس صورت میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر مخفی تبرا کیا ہے۔

سوم:۔ حضرت زینبؓ سے آپ کا نکاح محض وحی پر مبنی تھا اور دنیا میں جس طرح اور نکاح ہوتے ہیں۔ یہ نکاح اس طرح پر نہیں ہوا۔ بلکہ بغیر ولی، بغیر مہر، بغیر ایجاب و قبول اور بغیر گواہوں کے عمل میں آیا۔ اس دعوے کا بودا پن ظاہر ہے۔ اس طرح تو ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا یا مجھے الہام یا کشف ہوا کہ میرا نکاح فلاں سے کر دیا گیا۔ کیا ایسے نکاح کو نکاح کہا جائے گا۔ رہا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم نے نکاح کیا یہ اسی قسم کا جملہ ہے جیسا کہ یہ فرمانا کہ ہم نے پیدا کیا۔ اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ہر شخص کو بغیر سلسلۂ تناسل کے ذریعہ پیدا کیا۔

چہارم:۔ آپ نے حضرت زیدؓ کو شادی کا پیغام دے کر حضرت زینبؓ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے ابھی منظوری بھی نہ دی تھی بلکہ وہ استخارہ کرنے کے لیے کھڑی ہوئیں اور نماز کی نیت باندھی۔ اُدھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہو گئی کہ ہم نے آپ کا نکاح زینبؓ سے کر دیا اور آپ بلا اطلاع اور بلا اجازت حضرت زینبؓ کے پاس چلے گئے۔ یہ کس قدر بے ہودہ دعویٰ ہے کہ آپؐ نے زینب کے جواب کا انتظار بھی نہیں فرمایا۔ یہ تو انتہائی بے صبری اور بیتابی کا اظہار ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کہاں ممکن ہوتا۔ اس کی تو کسی شریف اور سنجیدہ انسان سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ

حقیقت واقعہ کو سمجھنے کے لیے چند امور ذہن نشین کر لیجیے۔ کیونکہ جب تک پورا پس منظر سامنے نہ ہوگا بات کی تہ تک پہنچنا دشوار ہے
ان میں سب سے پہلے حضرت زیدؓ بن حارثہ کے حالات زندگی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ سات آٹھ سال کے کم عمر بچہ تھے جب ان کو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے خرید کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا تھا۔ یہ اسلام سے بہت قبل کا واقعہ ہے۔

عرب کے کچھ لوگوں نے حضرت زیدؓ کے قبیلہ پر حملہ کیا اور وہ انہیں گرفتار کر کے مکہ لائے تھے اور فروخت کرنا چاہا تھا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت زیدؓ کو خرید لیا۔ اسد الغابہ میں ہے۔

حضرت خدیجہؓ نے حضرت زیدؓ کو مکہ میں خرید کر نبوت سے قبل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر آٹھ سال تھی اور کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بطحا کے مقام پر فروخت ہوتے دیکھا آپ نے حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مال سے خرید کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا۔ آپ نے انہیں آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا۔

ایک عرصہ بعد حارثہ جو حضرت زیدؓ کے والد تھے اور ان کے چچا شراحیل یہ معلوم ہونے کے بعد کہ زیدؓ مکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبد اللہ کے پاس ہیں انہیں چھڑانے کے لیے مکہ معظمہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اے عبد المطلب کے بیٹے۔ اے ہاشم کے بیٹے۔ اے اپنی قوم کے سردار کے بیٹے ہم آپ کے پاس اپنے بیٹے کے سلسلہ میں آئے ہیں۔ ہمارا بیٹا آپ کے پاس ہے۔ آپ ہم پر احسان کیجیے اور اس کا فدیہ قبول کر کے ہم پر احسان فرمائیے۔ آپ نے سوال کیا ۔ وہ کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا زیدؓ۔ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے علاوہ اور کچھ کیوں نہیں؟ انہوں نے عرض کیا اور کیا؟ آپ نے فرمایا۔ زیدؓ کو بلا لو اور اسے اختیار دے دو اگر وہ تمہارے ساتھ جانا پسند کرے تو وہ تمہارا ہے اور اگر وہ میرے پاس رہنا پسند کرے تو اللہ کی قسم میں اس شخص کے بدلہ میں جو مجھے پسند کرے کسی چیز کو پسند نہیں کر سکتا ان دونوں

نے کہا آپ نے تو ہمیں انصاف سے زیادہ دے دیا اور بڑا احسان فرمایا۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو بلایا اور ان سے پوچھا تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟ زیدؓ نے کہا ہاں یہ میرے والد ہیں۔ اور یہ میرے چچا ہیں

آپ نے ارشاد فرمایا تو تم مجھے بھی خوب پہچانتے ہو اور میرے ساتھ رہ کر دیکھ چکے ہو۔ لہٰذا یا تو مجھے اختیار کر لو۔ یا ان دونوں کو اختیار کر لو زیدؓ نے جواب دیا۔ میں آپ کے مقابلہ میں ان دونوں کو پسند نہیں کرتا۔ آپ میرے لیے باپ اور چچا کی جگہ ہیں۔ باپ اور چچا نے کہا۔ اے زیدؓ تیرا خانہ خراب ہو تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دے رہا ہے اور اپنے باپ اور گھر والوں پر انہیں ترجیح دے رہا ہے زیدؓ نے کہا ہاں میں نے ان کی وہ باتیں دیکھی ہیں کہ میں ان پر کسی اور شخص کو ترجیح نہیں دے سکتا۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کی یہ بات دیکھی تو انہیں لے کر مسجد حرام میں گئے اور حطیم میں کھڑے ہو کر اعلان فرمایا۔

"جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ گواہ رہیں کہ زیدؓ میرا بیٹا ہے۔ وہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا۔"

جب زیدؓ کے والد اور چچا نے یہ دیکھا تو ان کا دل خوش ہو گیا۔ اسد الغابہ ج ۲ صـ ۲۳۴

بعینہ یہ تمام امور حافظ ابن حجر نے "اصابہ" میں بھی بیان کیے ہیں۔ لیکن آخر میں اتنا اضافہ ہے۔

"چنانچہ اس کے بعد زیدؓ بن حارثہ کو زیدؓ بن محمد پکارا جانے لگا۔ حتیٰ کہ اللہ اسلام لے آیا۔ (اور یہ امر ممنوع ہو گیا) اصابہ ج ۱ صـ ۵۴۵۔

اس کے علاوہ حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" تفسیر سورہ احزاب میں نقل کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ متبنیٰ بنا لیا۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو آپ نے ان کی شادی حضرت زینبؓ سے کرنی چاہی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ ان کی ماں اُمیمہ بنت عبد المطلب تھیں لیکن چونکہ وہ غلام رہ چکے تھے۔ لہٰذا حضرت زینبؓ کو یہ نسبت گوارا نہ تھی۔ لیکن بالآخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل ارشاد کے لیے راضی ہو گئیں۔ فتح الباری تفسیر سورۃ احزاب بحوالہ ابن ابی حاتم۔

اس کے بعد "اصابہ" میں ہے۔

ابن الکلبی نے اپنے باپ کلبی سے نقل کیا ہے اور وہ ابو صالح کے واسطہ سے ابن عباسؓ سے نقل کرتا ہے کہ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو اپنا بیٹا بنا لیا تو ان کی شادی زینبؓ بنت جحش سے کر دی گئی۔ وہ آپ کی پھوپھی امیمہ بنت عبد المطلب کی بیٹی تھیں۔ اس سے قبل آپ اپنی باندی ام ایمنؓ سے ان کا نکاح کر چکے تھے۔ چنانچہ ام ایمنؓ سے ان کے بیٹے اسامہؓ پیدا ہو چکے تھے۔ پھر جب زیدؓ نے زینبؓ کو طلاق دے دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کا نکاح ام کلثومؓ بنت عقبہ سے کر دیا۔ ام کلثومؓ کی ماں اروی بنت کریز تھیں اور اروی کی ماں بیضاءؓ بنت عبد المطلب تھیں۔ چنانچہ ام کلثومؓ سے حضرت زیدؓ کے یہاں۔ زیدؓ بن زید اور رقیہ پیدا ہوئیں۔ پھر زیدؓ نے اُم کلثومؓ کو بھی طلاق دے دی اور درہؓ بنت ابی لہب بن عبد المطلب سے نکاح کر لیا۔ پھر ان کو بھی طلاق دے دی اور ہندؓ بنت العوام سے نکاح کر لیا جو حضرت زبیرؓ بن العوام کی بہن تھیں۔ ابن عمرؓ نے کہا ہے کہ ہم ان کو زیدؓ بن حارثہ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ زیدؓ بن محمدؐ کہہ کر پکارتے تھے۔ حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

اُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ۔ الاحزاب ۵   لوگوں کو ان کے باپوں کے ناموں سے پکارو

(اصابہ ج ۱ صفحہ ۵۴۹)

حضرت زینبؓ کے ساتھ حضرت زیدؓ کی ازدواجی زندگی کیسی گزری۔ اس کے متعلق روایات یں بیان کیا گیا ہے کہ جب شام ہوئی تو زیدؓ اپنے بستر کی جانب چلے گئے۔ زینبؓ کا بیان ہے کہ زیدؓ میرے ساتھ کچھ بھی نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے محفوظ رکھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور ئے مانع نہ تھی۔ چنانچہ وہ مجھ پر قدرت نہ پا سکے۔

یہ ابوعصمہ نوح بن ابی مریم کی روایت ہے جو انہوں نے خاص حضرت زینبؓ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے یہ بات فرمائی۔ اگرچہ یہ روایت قابلِ اعتماد نہیں۔ لیکن کم ازکم اس روایت سے ایک نئے انداز فکر سے سوچنے کا موقعہ ضرور دستیاب ہوتا ہے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ جب زیدؓ نے قریب جانا چاہا تو حضرت زینبؓ کو یہ بات بہت گراں خاطر گزری۔ زیدؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ زینبؓ مجھے اپنی زبان سے سخت اذیت دیتی ہے اور ایسا کہتی اور ایسا کہتی ہے۔ یا رسول اللہ میں اسے طلاق دینا چاہتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا۔

اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو، اور اللہ سے ڈرو (آخر آیت تک) اور زیدؓ نے انہیں طلاق دے دی تب یہ آیت نازل ہوئی اور یاد کرو اے نبی جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے۔ جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور تم نے بھی انعام کیا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ تم لوگوں سے ڈرتے ہو (آخر آیت تک) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۱ صہ ۱۸۹۔

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ امام قرطبی فرمارہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے فرمایا۔

اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو، اور اللہ سے ڈرو (آخر آیت تک) اور تم وہ چیز چھپا رہے ہو جو تمہارے دل میں ہے اور اللہ اسے ظاہر کر دے گا اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو۔ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ یعنی آخر آیت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے اور مخاطب حضرت زیدؓ ہیں۔

ایسا ہرگز نہیں جیسا کہ عام طور پر تفاسیر میں لکھا جاتا ہے کہ اس آیت کے ابتدائی جملوں میں حضرت زیدؓ سے خطاب ہے اور آخر جملہ میں اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قصوروار ٹھہرا رہا ہے کہ "تم لوگوں سے ڈرتے ہو" عیاذاً باللہ۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ کی امارت غزوۂ موتہ اور ان کی وفات کے متعلق بیان ہوا ہے۔ کہ

انہوں نے لشکر تیار کیا اور جرف کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ سپاہی تین ہزار تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ بن حارثہ کو امیر بنایا۔۔۔۔ وہ لشکر لے کر جمادی الاولیٰ ۸ھ میں روانہ ہوئے حیات ید العرب ج ۳ ص ۱۷۵۔

اور "اصابہ" میں ہے۔

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غزوہ موتہ میں فوج کا سپہ سالار بنایا اور اسی میں وہ شہید ہو گئے اور اس وقت ان کی عمر پچپن سال تھی۔ اصابہ ج ۱ ص ۵۴۶۔

حضرت اُم کلثومؓ بنت عقبہ حضرت زیدؓ کی دوسری بیوی حضرت ام کلثومؓ کے حالات میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

ابن اسحاق نے مغازی میں بیان کیا ہے کہ مجھ سے زہری اور عبد اللہ بن ابی بکر بن حزم نے بیان کیا کہ ام کلثومؓ بنت عقبہؓ نے حدیبیہ کے سال (۶ھ) ہجرت کی تو ان کے دونوں بھائی عمارہ اور فلاں انہیں طلب کرنے کے لیے آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اور وہ ہجرت سے پہلے بغیر شوہر کے تھیں (یعنی کنواری، بیوہ یا مطلقہ) تو جب وہ مدینہ منورہ آگئیں تو ان سے زیدؓ نے شادی کر لی۔ اصابہ ج ۴ ص ۴۶۷۔

"اسد الغابہ" میں حضرت ام کلثومؓ کے حالات میں ہے۔

ام کلثومؓ بنت عقبہ نے حدیبیہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہجرت کی تو ان کے دونوں بھائی ولیدؓ اور فلاں یعنی عقبہؓ کے بیٹے ان کو طلب کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے انہیں واپس دینے سے انکار کر دیا۔ اور جب وہ مدینہ منورہ آگئیں تو ان سے زیدؓ بن حارثہ نے شادی کر لی۔ پھر وہ موتہ کی جنگ میں شہید ہو کر ان سے بچھڑ گئے تو حضرت زبیر بن العوام نے اُن سے شادی کر لی۔

حضرت زینبؓ اب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے متعلق بھی سنتے چلیے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینبؓ بنت جحش اسدیہ سے نکاح فرمایا۔ زینبؓ کا نکاح ابو احمد بن جحش نے کرایا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار سو درہم مہر دیا۔ اور وہ آپ سے پہلے زیدؓ بن حارثہ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام کے پاس تھیں۔ انھی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی تھیں۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا
(الاحزاب - ۳۷)

جب زیدؓ نے ان سے اپنی حاجت پوری کرلی۔ تو ہم نے ان سے آپ کا نکاح کر دیا۔

نیز اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ حضرت زینبؓ موہوبات میں سے تھیں۔ اسی ابن ہشام کی روایت ہے۔

میمونہؓ بنت الحارث کی شادی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عباسؓ نے کرائی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو مہر میں چار سو درہم بھی حضرت عباسؓ ہی نے ادا کیے اور کہا جاتا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ہی وہ خاتون تھیں، جنہوں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ جس خاتون نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کیا تھا۔ وہ حضرت زینبؓ بنت جحش تھیں۔ نیز کہا جاتا ہے کہ وہ ام شریک تھیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ بنو سامہ کی کوئی اور خاتون تھیں۔ سیرت ابن ہشام ص ۱۸۱ وتفسیر ابن کثیر۔

نیز اسد الغابہ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح فرمایا تو ان کی عمر ۳۵ سال تھی اور ۲۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ تو اس وقت ان کی عمر پچاس سال تھی اور عمر بن عثمان جحبی نے نقل کیا ہے کہ وہ ترپن سال کی تھیں (اسد الغابہ۔ ذکر زینبؓ)

"حیات سید العرب" میں ہے۔

حضرت زینبؓ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا اور وہ اس وقت پینتیس سال کی تھیں اور ۲۰ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا اور اس وقت وہ ترپن سال کی تھیں اور عمرؓ بن الخطاب نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ (حیات سید العرب ج ۴ ص ۲۴۴)۔

حضرت ام ایمن رضؓ "اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ" میں حضرت ام ایمنؓ کے تفصیلی حالات و کوائف بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

عبید حبشی کے بعد حضرت ام ایمنؓ سے حضرت زیدؓ بن حارثہ نے شادی کر لی۔ اسد الغابہ ج ا صـ ۵۶۷۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ "صحیح مسلم" اور "ابن ماجہ" وغیرہ میں ہے کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کے لڑکے اسامہؓ کے متعلق لوگ شک کیا کرتے تھے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ حضرت زیدؓ اور اسامہؓ لیٹے ہوئے تھے۔ یہ دونوں حضرات چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ وہاں سے ایک قیافہ شناس گزرا، اس نے دونوں حضرات کے قدموں کو دیکھ کر کہا۔ یہ دونوں قدم ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں (کیونکہ لوگ قیافہ شناس کی بات پر بہت اعتماد کرتے تھے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور اپنی اس خوشی کا اظہار حضرت عائشہؓ سے بھی فرمایا (مسلم۔ باب العمد بالحاق القائف الولد)

نتائج تصریحات

۱۔ حضرت زیدؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور متبنٰی تھے۔ متبنّٰی بنا لینے کے بعد جب حضرت زیدؓ سنِ بلوغ کو پہنچے تو آپ نے ان کا نکاح حضرت زینبؓ سے کر دیا۔ (اصابہ)

۲۔ جو اس نسبت سے خوش نہ تھیں لیکن ارشادِ رسول کے باعث راضی ہو گئیں۔

۳۔ حضرت زینب کے بطن سے حضرت زیدؓ کے یہاں کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔

۴۔ حضرت زینبؓ کا نکاح ان کے بھائی ابو احمدؓ بن جحش نے کرایا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار سو درہم مہر ادا فرمایا۔

۵۔ حضرت زینبؓ ان خواتین میں داخل تھیں جنہوں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کیا تھا۔

۶۔ جنگِ موتہ میں حضرت زیدؓ شہید ہوئے تو ان کی عمر پچپن سال تھی اور اس وقت حضرت زینبؓ کی عمر اڑتیس سال تھی۔ لہٰذا حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کی یہ شادی عین نبوت کے سال یا ایک

دو سال پیچھے ہونی چاہئے۔ کیونکہ حضرت زینبؓ سے شادی سے قبل حضرت زیدؓ کی حضرت ام ایمنؓ سے بھی شادی ہو چکی تھی۔ جن سے ان کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ پیدا ہو چکے تھے۔

جہاں تک حضرت زیدؓ کا تعلق ہے۔ وہ نبوت سے قبل ہی سن بلوغ کو پہنچ چکے تھے اس لحاظ سے شادی کے وقت حضرت زینبؓ کی عمر سولہ سترہ سال ہونی چاہیئے۔ لہٰذا حضرت زیدؓ کے سن بلوغ کو پہنچتے ہی یہ نکاح ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ۵ھ میں حضرت زیدؓ پچپن سال کے تھے تو ۱ھ نبوت میں وہ چونتیس سال کے ہوتے اور ۵ھ میں حضرت زینبؓ پینتیس سال کی تھی تو ۱ھ نبوت میں ان کی عمر سترہ سال ہو گی۔ اور یہی شادی کی عمر ہے جب کہ حضرت زیدؓ اُن سے انیس بیس سال قبل بالغ ہو گئے تھے۔ اس وقت تک حضرت زینبؓ پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔

۷۔ حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ سے جنسی تعلقات قائم نہ کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ حضرت زیدؓ کی اپنی کمزوری ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت زینبؓ ہی میں کوئی ایسا نقص ہو کہ مرد ان سے جنسی تمتع حاصل نہ کر سکیں۔ چنانچہ فقہاء نے عورتوں میں کچھ ایسے عیوب گنتے ہیں مثلاً شرمگاہ میں ہڈی ہونا۔ یا شرمگاہ میں گوشت پیدا ہو جانا وغیرہ۔ اس کے لیے باب خیار الفسخ دیکھئے بظاہر دوسری بات ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت اُم ایمنؓ کے بطن سے حضرت زیدؓ کے بیٹے حضرت اسامہؓ پیدا ہو چکے تھے اور حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کے بعد حضرت ام کلثومؓ بنت عقبہ کے بطن سے زیدؓ بن زید ایک لڑکا اور رقیہؓ نامی ایک لڑکی پیدا ہو چکی تھی۔ جس سے اس امکان کی نفی ہو گئی کہ نقص حضرت زیدؓ میں تھا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ نقص حضرت زینبؓ ہی میں تھا۔ آج کل اس قسم کے نقائص کا علاج آپریشن وغیرہ سے ہو سکتا ہے لیکن اُس زمانہ میں یہ بات ممکن نہ تھی اس کے ساتھ ساتھ اس عہد میں یہ بھی ممکن نہ تھا کہ یہ پتہ چلایا جا سکے کہ نقص عورت میں ہے یا مرد میں۔ اس لیئے عین قرین قیاس ہے کہ حضرت زینبؓ اپنی جگہ قصوروار حضرت زیدؓ کو سمجھتی ہوں اور حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو قصوروار سمجھتے ہوں۔

پہلے ایک روایت میں گزر چکا ہے کہ حضرت زینبؓ نے حضرت زیدؓ کا قریب آنا پسند نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت زیدؓ اسی سبب سے کبھی ان کے قریب نہ گئے ہوں اور یہی اصل سبب ہو جسے حضرت زیدؓ چھپا رہے ہوں۔

۸۔ حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کے بعد حضرت ام کلثومؓ بنت عقبہ سے نکاح فرمایا۔ جن سے ایک صاحبزادے زیدؓ اور ایک صاحبزادی رقیہؓ پیدا ہوئیں۔ پھر انہوں نے ام کلثومؓ کو بھی طلاق دے دی اور حضرت درّہؓ بنت ابی لہب بن عبدالمطلب (جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چچا زاد بہن تھی) سے شادی کرلی۔ پھر اسے بھی طلاق دے دی اور ہندؓ بنت العوام سے شادی کرلی یعنی حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کے بعد یکے بعد دیگرے انہوں نے تین نکاح کیے اور ام کلثومؓ ان کے پاس کافی عرصہ تک رہیں۔ چنانچہ ان کے بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتی اور جمادی الاول ۸ھ میں زیدؓ شہید ہوگئے۔ اور تمام مراحل سے گزرنے کے لیے سات آٹھ سال تو ہونے چاہئیں۔ لہٰذا حضرت زینبؓ کو انہوں نے ۵ھ سے قبل ہی طلاق دے دی ہوگی۔ ورنہ دو ڈھائی سال کے عرصہ میں یہ سب باتیں ممکن نہیں۔

آپ یہ پڑھ چکے ہیں کہ لوگوں میں عام طور پر اس قسم کی چہ مگوئیاں ہوتی تھیں کہ حضرت اسامہؓ حضرت زیدؓ کے بیٹے نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک قیافہ شناس نے جب دونوں کے پاؤں دیکھ کر یہ کہا کہ ان دونوں پاؤں کا ایک دوسرے سے تعلق ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس سے ان شبہات کی تردید ہوگئی جو لوگوں کے دلوں میں حضرت زیدؓ اور حضرت ام ایمنؓ کے متعلق پائے جاتے تھے۔

حضرت ام ایمنؓ نہایت پاکباز اور دیندار عورت تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلائی ہوتی تھیں۔ ان کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے۔ کہ جو شخص کسی جنتی عورت سے شادی کرنا چاہے۔ وہ ام ایمنؓ سے شادی کرلے۔ غالباً اسی فضیلت کی بنا پر حضرت زیدؓ نے ان سے شادی کی ہوگی۔ اسد الغابہ ج ۵ ص ۵۶۷۔

ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد ظاہر ہے کہ لوگوں کے ان شکوک و شبہات کی وجہ غالباً یہ تھی

کہ حضرت زینبؓ سے کوئی اولاد نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت زیدؓ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ اولاد پیدا کر سکیں۔ ام ایمنؓ کے بطن سے جو ایک لڑکا اسامہؓ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ بھی خبر نہیں کس کا ہو گا وہ حضرت زیدؓ کا نہیں ہو سکتا۔ اُم ایمنؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باندی تھیں جو آپ کو ترکہ میں اپنے والد سے ملی تھیں۔ لہٰذا ان کو متہم کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

دوسری طرف یہ بھی واقعہ تھا کہ حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ سے جنسی تعلقات قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ عورتیں حضرت زینبؓ سے اولاد نہ ہونے پر سوالات کرتی ہوں گی جیسا کہ نسوانی فطرت ہے اور وہ بتاتی ہوں گی کہ زیدؓ ناکارہ ہیں۔ اس عہد میں یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ ڈاکٹری معائنہ کے ذریعہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ نقص مرد میں ہے یا عورت میں۔ زیدؓ کا غلام ہونا اور زینبؓ کا قریشی خاندان ہونا اس کا بہت بڑا ثبوت تھا کہ اگر نقص ہے تو زیدؓ ہی میں ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نزلہ بر عضو ضعیف می ریزد۔ تو یہ جرم کچھ کم نہیں تھا کہ حضرت زیدؓ غلام رہ چکے تھے اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کے ساتھ گزارا نہ کر سکے اور طلاق دینے پر مجبور ہو گئے۔

علاوہ ازیں حضرت زینبؓ تیز مزاج بھی تھیں اور فطرتاً ہر وہ عورت جس کے اولاد نہ ہو سکے چڑچڑی اور تیز مزاج ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ سے نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ حضرت ام سلمہؓ کا قول ملتا ہے کہ زینبؓ کی زبان میں تیزی تھی۔ اور وہ عائشہؓ سے جھگڑتی رہتی تھیں۔ صحیح بخاری کتاب الہبہ۔ صحیح مسلم باب فضل عائشہؓ۔

حضرت زیدؓ نے جب انہیں طلاق دینے کا ارادہ کیا تو جو اصل بنائے طلاق تھی۔ یعنی زینبؓ میں نسوانی نقص ہونا اور اس کے باعث لوگوں کی جانب سے حضرت زیدؓ پر طعن وطنز، اس امر کو حضرت زیدؓ ظاہر نہ کر سکے۔ کیونکہ انہیں خود بھی یہ احساس تھا کہ بہر صورت وہ غلام ہیں، اور زینبؓ بہر حال اعلیٰ خاندان کی قریشی خاتون ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ وہ حضرت زیدؓ سے شادی کرنے پر رضامند بھی نہ تھیں۔ اس لیے ایسی باتیں منہ سے نکالنا مناسب نہ ہو گا۔ زینبؓ کے تمام خاندان کو ناگوار گزرے گا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کبیدگی کا بھی سبب بنے گا۔ لہٰذا انہوں

نے یہی ظاہر فرمایا کہ وہ زبان اور لہجہ کی تیز ہیں اور ہر وقت جھگڑتی رہتی ہیں۔ اس لیے میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔

آیت کی صحیح تفسیر : اس تمام صورت حال کو سامنے رکھتے تو واضح ہو جائے گا کہ

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ	اور تو اسے اپنے دل میں چھپا رہا تھا حالانکہ اللہ اسے
وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللَّهُ أَحَقُّ	ظاہر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور تو لوگوں سے ڈر
أَنْ تَخْشَاهُ ؕ الاحزاب ۳۷	رہا تھا اور اللہ اس کے زیادہ لائق تھا کہ اس سے ڈرا جاتے

اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول نقل کیا جا رہا ہے جو آپ نے حضرت زیدؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس طرح حضرت زیدؓ اس کے مخاطب ہیں۔ جیسا کہ اس آیت کے ابتدائی جملہ میں متکلم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور مخاطب حضرت زیدؓ ہیں۔

سلسلۂ بیان شروع سے اسی طرح چلا آرہا ہے۔ اب آیات پر دوبارہ غور کر لیجئے۔ ترجمہ پیش نظر رہے۔

> "یاد کرو (اے نبی) جب تم اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور تم نے بھی اس پر احسان کیا تھا یہ کہہ رہے تھے۔"

اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو، (طلاق نہ دو) اور اللہ سے ڈرو (طلاق دینا اللہ کو بھی پسند نہیں، یہ تو ابغض المباحات ہے) تم اس بات کو چھپا رہے ہو جو تمہارے دل میں ہے (یعنی یہ بات کہ نقص زینبؓ ہی میں ہے اور لوگ الٹا مجھے مطعون کر رہے ہیں حالانکہ اللہ اسے خود ہی ظاہر کر دے گا (کیونکہ زینبؓ کو اگر طلاق دے دی گئی تو لامحالہ تم بھی دوسری شادی کرو گے اور زینبؓ کی شادی بھی کہیں ہو گی اور بات کھل جائے گی کہ نقص کس میں ہے) اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو (کہ کھل کر بات نہیں کرتے) حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اسی سے ڈرو (اس لیے کہ اصل بات ظاہر نہ کرنے میں اندیشہ یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھیں گے کہ غیر کفو میں نکاح ہونے کی وجہ سے نباہ نہ ہو

سکا۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ بلکہ ناکامی کی وجہ کچھ اور ہے)

یہ تمام کلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور شروع سے آخر تک اس کے مخاطب حضرت زیدؓ ہیں۔ پھر اللہ نے اس بات کو یوں ظاہر کر دیا کہ اس کے بعد حضرت زیدؓ نے حضرت امِ کلثومؓ بنت عقبہ سے شادی کر لی۔ اور ان سے دو بچے پیدا ہوئے، ایک زید بن زیدؓ اور دوسری رقیہ بن زیدؓ۔ اور حضرت زینبؓ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمالیا اور آپ سے بھی زینبؓ کی کوئی اولاد نہ ہوسکی اور یہ بات واضح ہوگئی کہ اولاد پیدا نہ ہونے میں حضرت زینبؓ ہی کا کوئی نقص تھا نہ کہ حضرت زیدؓ ہیں۔

آپ غور فرمائیں کہ آیات کس قدر واضح اور صاف ہیں۔ محض متکلّم اور مخاطب بدل دینے سے ہمارے مورخین، مفسرین اور محدثین نے کس قدر ظلم فرمایا ہے۔ جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تصوّر قائم ہوتا ہے کہ معاذ اللہ آپ حضرت زیدؓ کے ساتھ چال چل رہے تھے کہ دل سے تو چاہتے تھے کہ زیدؓ زینبؓ کو طلاق دیدیں اور میں ان سے نکاح کر لوں۔ مگر بظاہر یہ زور دے رہے تھے کہ تم زینبؓ کو طلاق نہ دو، اسے اپنے پاس ہی رکھو، یعنی دل میں کچھ اور زبان پر کچھ، شریعت کی زبان میں اس کو منافقت اور سبائیوں کی زبان میں اسے تقیہ کہا جاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس تفسیر کے پیچھے کسی سبائی کا ذہن کارفرما ہو۔

نیز یہ کہ آپ چاہتے تھے کہ زینبؓ سے نکاح کر لیں۔ لیکن لوگوں سے ڈرتے تھے کہ بیٹے کی بیوی سے شادی کر لینے پر لوگ کیا کہیں گے اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کو تنبیہ فرمانی پڑی کہ اللہ تعالےٰ سے ڈرنے کے بجائے آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ اگر آپ ایسا ہی ڈرتے ہیں تو لائیے ہم خود ہی آپ کا نکاح زینبؓ سے کر دیتے ہیں۔

حالانکہ اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود تصریح فرما دی ہے۔ کہ انبیاء کرام اللہ کے علاوہ اور کسی سے نہیں ڈرتے۔

چنانچہ ارشاد ہے کہ :۔

اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا ۔ الاحزاب ۳۹ ۔

جو لوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں۔ وہ اللہ ہی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے

ذرا آیت کریمہ میں اس زورِ بیان پر غور فرمایئے۔

" جو لوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں۔ وہ اللہ ہی سے ڈرتے ہیں "

انہی الفاظ سے بات پوری ہو گئی ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ انبیاء کرام صرف اللہ سے ڈرتے ہیں۔ لیکن صرف انھی الفاظ پر اکتفا نہیں فرمایا جا رہا بلکہ آگے مزید زور دے کر اس بات کو ثابت کیا جا رہا ہے۔

وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ
الاحزاب ۳۹ ۔

اور وہ اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے

اس کے بعد پھر اسی مسئلہ کو مزید ثابت کرنے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی اللہ کے علاوہ کسی اور سے ڈرے اور اللہ کو اس کی خبر نہ ہو۔ وہ حساب و کتاب رکھنے میں کافی ہے۔ اس کے پاس ہر ایک کے اعمال کا حساب موجود ہے۔

وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا ۔ الاحزاب ۳۹

اور اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

تو کیا اللہ تعالیٰ پہلی آیت میں یہ فرما کر " اے محمد تم تو لوگوں سے ڈرتے ہو اور اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو، لیکن معاذ اللہ تم ایسا نہیں کر رہے ہو، بلکہ تم پر لوگوں کا خوف طاری ہے۔"

پھر آخر آیت میں یہ بتا کر کہ

" جو لوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں۔ یعنی پہنچانے والے ہوتے ہیں، وہ تو صرف اللہ ہی سے ڈرا کرتے اور کسی انسان سے نہیں ڈرتے۔"

گویا بقول ان مفسرین یہ بتانا چاہتا ہے کہ اے محمد تم میں انبیاء کی صفات موجود نہیں ہیں۔

کیونکہ تم لوگوں سے ڈرتے ہو۔ معاذ اللہ، تم نبی ہونے کے اہل نہیں ہو۔ اس لیے تم نبی نہیں ہو؟

ظاہر ہے کہ ان دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جاتے تو اس صغری اور کبری کا نتیجہ تو یہی نکلتا ہے

ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالی کو خوب معلوم تھا کہ آگے چل کر لوگ اس آیت میں معنوی تحریف کریں گے اور

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ الاحزاب ۳۷۔ اور تو لوگوں سے ڈر رہا تھا۔ حالاں کہ اللہ اس کے زیادہ لائق تھا کہ اس سے ڈرا جاتے۔

کا مصداق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنانے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے ان کی اس غلط تفسیر کی جڑ کاٹنے کے لیے اللہ تعالی نے ساتھ ہی یہ آیت رکھ دی ہے کہ اے کم عقلو، اور کوتاہ اندیش ملاؤ تم یہ کیسی تفسیر کر رہے ہو کہ دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہو کہ ہمارا رسول لوگوں سے ڈرا کرتا تھا۔ اللہ سے نہیں ڈرتا تھا۔ یہ سراسر غلط ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صریح بہتان ہے۔ کیونکہ جو لوگ اللہ کے پیغامات پہنچانے پر مامور ہوتے اور مقام نبوت پر فائز ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرا کرتے۔

اے کوتاہ اندیش لوگو۔ یاد رکھو کہ اللہ کے حضور تمہیں اس کی جواب دہی کرنی ہو گی کہ تم نے ایسی غلط تفسیر کر کے ہمارے نبی کے دامن عصمت کو کیوں داغدار کیا تھا۔ اللہ کے یہاں تمہارے یہ سب کرتوت تمہارے اعمال ناموں میں محفوظ ہیں اور وہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

غرض یہ کہ صحیح مفہوم کو نظر انداز کر کے غلط روایات کی بنیاد پر تفسیر کرنے سے مستشرقین اور مغربی مصنفین کو طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں کرنے کا موقع دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مطعون کیا اور آپ پر پھبتیاں کسی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ حالانکہ آیات میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ شروع سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ جس کے مخاطب حضرت زیدؓ بن حارثہ ہیں۔ اور یہ جملے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام کا حصہ ہیں اور مخاطب وہی زیدؓ بن حارثہ ہیں۔

حضرت زینبؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ عربوں میں پردے کا رواج

نہ تھا۔ اسلام آجانے کے بعد بھی اٹھارہ سال تک مسلمانوں پر پردے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ خود حضرت زینبؓ کے ولیمہ میں ۵ھ میں پردے کا حکم نازل ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزار بار حضرت زینبؓ کو دیکھا تھا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت زیدؓ کا حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح نبوت کے سال۔ یا ایک سال قبل یا بعد ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عین نبوت کے سال حضرت زینبؓ کی عمر سترہ سال ہوتی ہے اور یہی شادی کا وقت ہوتا ہے۔

حضرت زینبؓ سے شادی کب ہوئی حضرت زینبؓ سے حضرت زیدؓ کی شادی ۱ نبوی میں ہوئی۔ ۱ نبوت میں حضرت زینبؓ سترہ سال کی تھیں اور حضرت زیدؓ پینتیس سال کے تھے۔ حضرت زینبؓ سے قبل آپ کا نکاح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ایمنؓ سے کر دیا تھا۔ جن سے اسامہؓ بن زید پیدا ہوئے تھے۔ جب حضرت زیدؓ کا حضرت زینبؓ سے نباہ نہ ہو سکا تو حضرت زیدؓ نے سال دو سال میں انھیں طلاق دے دی۔ کیونکہ انہیں طلاق دینے کے بعد حضرت زیدؓ نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں اور کی ہیں۔ اور پہلی بیوی ام کلثوم بنت عقبہ سے ان کے دو بچے بھی پیدا ہوئے۔ ایک زیدؓ بن زید اور دوسری رقیہ بنت زیدؓ۔ ان تمام مراحل کے لیے ہمارے نزدیک سات آٹھ سال ضرور ہونے چاہئیں۔ اور چار پانچ سال تک حضرت زینبؓ بیوگی کی زندگی گزارتی رہیں۔ ان سے کسی کی شادی نہ ہو سکی۔ کیونکہ وہ مزاج اور زبان کی تیز تھیں۔ اور لاولد تھیں۔ حضرت زیدؓ کے ساتھ تیرہ چودہ سال میں بھی ان کے کوئی اولاد نہ ہو سکی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ حضرت زینبؓ میں کوئی نسوانی نقص بھی موجود تھا۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ کچھ لوگ حضرت زیدؓ میں اس باعث نقص نکالتے ہوں گے تو کچھ لوگ حضرت زینبؓ میں نقص نکالتے ہوں گے اور عین ممکن ہے کہ حضرت زیدؓ نے اپنے خاص اہم راز دار دوستوں میں اس کا اظہار بھی کیا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم تھی۔ چنانچہ آپ فرما رہے تھے کہ جو اصل بات ہے اسے چھپا رہے ہو۔ تو کچھ اور لوگوں کو بھی یہ بات معلوم ہو جانا بعید از امکان نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی بہن کو پناہ دینے کے لیے جسے کوئی قبول نہیں کر رہا

تھا اور جس نے محض آپ کی تعمیلِ ارشاد میں اپنی مرضی کے خلاف حضرت زیدؓ سے شادی کی تھی ۵ھ میں
اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ اس میں کوئی بھی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ باقی سب کہانیاں جو ہمارے
راویوں نے گھڑ گھڑ کر پیش کی ہیں، ان میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔ نقلی طور پر بھی وہ سب موضوع ہیں۔
اور عقلی طور پر بھی ناقابلِ اعتبار ہیں۔

ان تفصیلات سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ حافظ ابن حجر اور حافظ ابن کثیر کا یہ فرمانا کہ

ایک سال اور کچھ اوپر تک یہ گھر بسا لیکن پھر ناچاقی شروع ہو گئی۔ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ "اصابہ"
اور "اسد الغابہ" نیز "فتح الباری" کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت زینبؓ سے حضرت
زیدؓ کی شادی ان کو متبنیٰ بنانے کے بعد ہو گئی تھی اور حضرت زیدؓ کو متبنیٰ اسلام سے بہت پہلے بنایا گیا تھا
غالباً اس وقت تک حضرت زینبؓ پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اسی لیے متبنیٰ بنا لینے کے فوراً بعد یہ شادی ممکن
نہیں ہے۔ لیکن بہر حال ہجرت سے قبل نبوت کے سال یا ایک آدھ سال پہلے یا ایک آدھ سال بعد میں یہ
شادی ہوئی ہوگی۔ اگر ایک سال اور کچھ اوپر وہ حضرت زیدؓ کے نکاح میں رہیں۔ اور ۵ھ میں ان کو طلاق
اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نکاح بیان کیا جا رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کی پہلی شادی
تینتیس سال کی عمر میں ہوئی ہے۔

نیز یہ بات بھی مغالطہ سے خالی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ

بغیر مہر اور بغیر گواہوں کے نکاح

نے حضرت زینبؓ کو اپنے نبی کے نکاح میں دے دیا
اس لیے ولی کی، مہر کی، گواہوں کی اور ایجاب و قبول کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت زینبؓ کنواری نہ
تھیں۔ بلکہ مطلقہ عورت تھیں۔ شادی شدہ عورت کے لیے گو امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک ولی کی
ضرورت ہوتی ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک ولی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اس واقعہ سے امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف
کی تائید ہوتی ہے رہ گیا ایجاب و قبول تو خود حافظ ابن حجر اور علامہ ابن کثیر کی رائے کے مطابق نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو پیغام دے کر بھیجا ہے۔ اور حضرت زینبؓ نے انکار نہیں فرمایا۔ بلکہ
استخارہ کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی ہیں۔ یعنی اللہ سے پوچھ رہی ہیں کہ اس کی رضا کیا ہے۔ اگر اس

کی مرضی اس نکاح کی ہوتی تو زینبؓ کو بھی منظور رہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوتی تو اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ زینبؓ کو بھی منظور نہیں۔ اِدھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی بتادی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ کے پاس تشریف لے گئے تو آپ نے لامحالہ انہیں یہ بتایا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے بروحی نازل فرمائی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رضا معلوم ہوگئی اور تم جس چیز کے لیے استخارہ کر رہی تھیں وہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ظاہر کر دیا ہے۔ لہٰذا ایجاب وقبول دونوں پائے جا رہے ہیں تو یہ دعویٰ کہ یہ نکاح ایجاب وقبول کے بغیر ہوا ہے۔ باطل ہے۔ یہ بات ہم اس روایت کو تسلیم کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ اس روایت کے مطابق بھی ایجاب وقبول پایا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہم اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی۔

اس کے بعد دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ یہ نکاح بغیر مہر کے عمل میں آگیا تھا۔ حالانکہ نکاح کے وقت مہر کا ذکر ضروری نہیں۔ البتہ مہر واجب ضرور ہوتا ہے حتیٰ کہ اگر نکاح کے وقت یہ شرط کرلی جائے کہ شوہر کسی قسم کا مہر نہیں دے گا تو امام مالکؒ کے نزدیک نکاح نہیں ہوتا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد اور اکثر فقہا کے نزدیک نکاح صحیح ہوگا۔ لیکن مہر مثل لازم آئے گا۔ یعنی جو اس خاندان کی عورتوں کا مہر ہو۔ اس کے مساوی شوہر کو مہر ادا کرنا ہوگا۔

قرآن کریم نے ہر نکاح کے لیے مہر لازم کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص طور پر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ آپ کے لیے صرف وہ ازواج حلال ہیں جن کا آپ نے مہر ادا کیا ہو۔ ارشاد ہے

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ	اے نبی ہم نے آپ کے لیے آپ کی وہ بیویاں
اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ ط الاحزاب - ۵۰	حلال کی ہیں جن کا مہر آپ نے ادا کیا ہے۔

ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کریں اور مہر ادا نہ کریں۔ اگر کسی روایت میں مہر کا ذکر نہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مہر کا وجود ہی نہ ہو، جب کہ مہر کی واضح روایت موجود ہے۔

اس لیے سیرت ابن ہشام کی دو روایت پڑھ لیجیے۔ جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت زینبؓ

کا نکاح ان کے بھائی ابو احمدؓ بن جحش نے کیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار سو درہم مہر ادا فرمایا تھا۔ اگر اس روایت کی سند میں کوئی اشکال بھی ہو، تب بھی یہ قرآن کی واضح آیات اور اصول شرعیہ کے عین مطابق ہے اور وہ روایات جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کوئی مہر ادا نہیں کیا گیا۔ وہ خلاف قرآن ہونے کے باعث قطعاً ناقابل قبول ہیں۔ قرآن کریم کے ان الفاظ زَوَّجْنٰکَھَا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نکاح خود فرما دیا تھا اور زمین پر کوئی نکاح نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہم نے اس نکاح کا فیصلہ کر دیا اور جو رکاوٹ اس میں تھی کہ زینبؓ آپ کی بہو لگتی تھیں۔ وہ رکاوٹ ہم نے دور کر دی۔

گواہوں کے بغیر نکاح

اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ نکاح گواہوں کے بغیر ہوا ہے۔ یہ بھی سپید جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ جب حضرت زینبؓ کے بھائی ابو احمدؓ بن جحش نے نکاح کیا تھا تو کیا بغیر شاہدوں کے کر دیا تھا؟ حالانکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی اور اس میں زَوَّجْنٰکَھَا فرمایا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وحی کو لوگوں تک پہنچایا۔ پڑھوایا اور لکھوایا ہوگا۔ جیسا کہ آپ کی عادت تھی تو جن لوگوں کے سامنے آپ نے اس وحی کی تلاوت فرمائی تھی۔ جن لوگوں سے اس وحی کو پڑھوایا تھا اور جن لوگوں سے اس وحی کو لکھوایا تھا۔ کیا وہ سارے کے سارے اس نکاح کے گواہ نہیں تھے۔ یقیناً وہ سب کے سب اس نکاح کے گواہ تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اس نکاح کے گواہ نہیں تھے اور یہ نکاح گواہوں کے بغیر ہوا ہے قطعاً غلط ہے۔ نیز امام مالکؒ کے نزدیک گواہ شرط نکاح نہیں۔ بلکہ اعلان شرط نکاح ہے اور قرآن کریم کے الفاظ بھی بڑی حد تک اس کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے۔

اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ المائدہ۔ ۵	جب تم انہیں ان کے مہر دو۔ بشرطیکہ تم اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے ہو شہوت رانی کرنے والے اور خفیہ یارانے گانٹھنے والے نہ ہو۔

نیز سورۂ النساء میں کنیزوں سے نکاح کر لینے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ : النساء ۲۵

اور دستور کے مطابق ان کا مہر ادا کرو۔ وہ پاکدامن ہوں، شہوت رانی کرنے والی اور خفیہ یارانے گانٹھنے والی نہ ہوں۔

ان دونوں آیات میں مردوں اور عورتوں دونوں کو خفیہ طور پر یارانے گانٹھنے اور جنسی تعلق قائم کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ جو کچھ ہو وہ دستور کے مطابق علانیہ طرفین کی رضامندی سے ہونا چاہیے۔ اس سے اعلان ہی کی تائید ہو رہی ہے۔ لیکن چونکہ ہر موقع اور ہر وقت اعلان ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے حنفیہ اور عام فقہاء نے ضرورۃً دو گواہوں کو اس اعلان کا قائم مقام قرار دیدیا ہے اور اس حقیقت کو دیگر آیات سے مستنبط کیا ہے تو در اصل ضروری تو اعلان ہی ہے اور دو گواہ اس کے قائم مقام ہیں اور یہاں اعلان پایا جا رہا ہے جو دو گواہوں سے بھی زیادہ ہے۔ نیز صحیحین کی حدیث میں مذکور ہے کہ آپ نے حضرت زینبؓ کا ولیمہ بھی کیا ہے اور اس ولیمہ میں لوگوں کو روٹی اور گوشت کھلایا ہے تو کیا یہ ولیمہ اعلان نکاح کے بغیر ہی ہو گیا تھا؟

کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زینبؓ کے پاس بغیر اطلاع چلے گئے تھے؟

اس کے بعد روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وحی نازل ہونے کے بعد اسی وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجازت اور اطلاع کے بغیر حضرت زینبؓ کے ہاں چلے گئے تھے۔ یہ بات بھی مغالطے سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ حضرت زینبؓ کا نکاح ان کی اجازت سے ان کے بھائی ابو احمدؓ بن جحش نے کیا تھا۔ اس نکاح کا اعلان ہو چکا تھا کہ حضرت زینب آپ کی زوجہ مطہرہ بن چکی تھیں۔ حضرت زینبؓ کو بھی معلوم تھا اور عام مسلمانوں کو بھی۔ اس کے بعد شوہر کو اپنی بیوی کے پاس جانے کے لیے کسی قسم کی اجازت درکار نہیں ہوتی۔ کون سا شوہر اپنی بیوی کے پاس اجازت لے کر یا اعلان کر کے جاتا ہے؟

الغرض اس روایت میں جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ وہ سب اس مفروضہ پر مبنی ہیں کہ آپ پر وحی الٰہی نازل ہوئی اور آپ اس وحی کا اعلان کیے بغیر چپ چپاتے فوراً حضرت زینبؓ کے پاس

سمجھے گئے۔ یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ لہٰذا تمام دعوے غلط ہیں۔ یا یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ رسمی محفل نکاح مرتب کیے بغیر اور قاضی، رجسٹرار، خطبہ، وکیل اور ولی کی موجودہ رسومات کے بغیر نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ اور بزعم مفسرین یہاں کوئی چیز نہیں پائی گئی۔ حالانکہ یہ رسوم کسی کے نزدیک بھی ضروری نہیں اور اگر ضروری بھی ہوں تو سب چیزیں موجود ہیں

ان روایات پر اب تک جو تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے۔

سب سے اول یہ دعویٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ حضرت زیدؓ زینبؓ کو طلاق دے دیں گے۔ اور وہ میرے نکاح میں آئیں گی اس لیے آپ نے یہ راز تو اپنے دل میں چھپایا اور ظاہر حضرت زیدؓ کو یہ نصیحت فرماتے رہے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ کھلی ہوئی منافقت تھی جو اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی درجہ میں متوقع نہیں ہے۔ یہ دعوےٰ اس مفروضہ پر مبنی ہے۔

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ — اور تو اپنے دل میں چھپا رہا تھا۔ حالانکہ اللہ اسے
وَتَخْشَى النَّاسَ ۔ الاحزاب ۳۷ — ظاہر کرنے والا تھا اور تو لوگوں سے ڈر رہا تھا۔

یں حق تعالیٰ کو متکلم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب تسلیم کیا جائے۔ حالانکہ یہ سیاق کلام کے خلاف ہے۔ شروع سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم متکلم اور زیدؓ مخاطب چلے آرہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ سیاق کلام کو تبدیل کر کے ان آیات میں حق تعالیٰ کو متکلم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان آیات کا مخاطب مانا جائے۔

حضرت زیدؓ بحیثیت قاصد: مسند احمد کی روایت میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا پیغام دے کر حضرت زیدؓ بن حارثہ کو حضرت زینبؓ کے پاس بھیجا۔ یہ ایک عجیب دعویٰ ہے جسے عقل قطعاً تسلیم نہیں کرتی۔ صحابہ میں بے شمار ایسے لوگ موجود تھے مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ وغیرہ۔ یہ سب حضرات اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے تھے۔ ان حضرات کو چھوڑ کر آپ زیدؓ کا انتخاب فرمائیں جو زینب کو طلاق دے چکے تھے۔ جن سے ان کی کبھی نہیں بنی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بیٹے

کی جگہ تھے۔ یہ قطعاً عقل کے خلاف ہے۔ نکاح کا پیغام کسی بزرگ خاندان یا متقدر شخص کے ہاتھ بھیجا جاتا ہے۔ ماتحتوں اور بیٹوں کے ذریعہ نہیں بھیجا جاتا۔ خصوصاً ایسوں کے ہاتھ جن سے مرسل ایہا کی ہمیشہ سے ان بن چلی آتی ہو۔

حضرت زینبؓ کا استخارہ : اس کے بعد روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت زینبؓ نے فرمایا۔

"میں اللہ سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔ ٹھہرو میں اللہ سے استخارہ کر لوں اور وہ کھڑی ہو کر نماز پڑھنے لگیں الخ

"حضرت زیدؓ پیغام لے کر حضرت زینبؓ کے پاس گئے تو وہ آٹا گوندھ رہی تھیں"

سوال یہ ہے کہ یہ کس قسم کا استخارہ ہے۔ عام طور پر روایات کے ذریعہ استخارہ کا مسنون طریقہ جو ہم تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے کہ جب آدمی سونے لگے تو دو رکعت نماز پڑھے اور استخارہ کی مخصوص دعا پڑھے اور قبلہ رُخ ہو کر سو جائے اگر ایک روز میں دل مطمئن نہ ہو تو مسلسل سات روز تک ایسا ہی کرے۔ اس طرح آدمی کا دل ایک طرف مائل ہو جاتا ہے اور تردد رفع ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ استخارہ جو حضرت زینبؓ کرنے کے لیے کھڑی ہوئیں اور نماز کی نیت باندھ لی۔ یہ وہ مسنون استخارہ تو قطعاً نہیں تھا۔ بلکہ کوئی ایسا ہی استخارہ تھا جیسا کہ شیعوں میں رائج ہے کہ نماز کی نیت باندھی اور جاگتے ہوئے کوئی اتفاقیہ امر ظاہر ہو گیا اور فیصلہ کر لیا گیا کہ یہ کام کرنا چاہیئے کہ نہیں۔ یہ فال کھولنے اور لچھر قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے جو قطعاً حرام ہے۔

بہر حال یہ روایات اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے جیسا کہ اس مضمون کی بہت سی روایات کو حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر نے رد فرما دیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ یہی حال ان حضرات کی بیان کردہ ان روایات کا بھی ہے

صحیح بات یہی ہے کہ ان آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ کو نصیحت فرما رہے ہیں کہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، اللہ سے ڈرو۔ جو اصل بات ہے اسے کیوں چھپاتے ہو۔ اللہ اسے

خود ظاہر کر دے گا۔ لوگوں سے کیوں ڈرتے ہو۔ اللہ کا خوف کرو اور جو اصل بات ہے، اسے صاف صاف کہو۔ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر جو اعتراضات واقع ہوئے تھے۔ وہ سب رفع ہو گئے۔ فللّٰہ الحمد علی ذالك

وضاحت

مندرجہ بالا مقالہ پر چند گوشوں سے اعتراضات وارد کئے گئے ہیں۔ ہر مسئلے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ دراصل واقعہ کا ایک رخ یہ بھی ہے جو اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالہ میں زیادہ تر ان روایات کا سہارا لیا گیا ہے۔ جنہیں عام طور پر ہمارے محدثین نے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ یہ مقالہ جناب محمد عمر تھانوی کا ہے میں نے اسے قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کر دیا تھا۔ لیکن سہواً مقالہ نگار کا نام مقالے کے اوپر درج ہونے سے رہ گیا جس کی وجہ سے عام تاثر یہ لیا گیا کہ یہ میری ہی (مؤلف) رائے ہے جبکہ میں خود اس مقالے سے کلی طور پر متفق نہیں ہوں۔ دراصل مقالہ نگار کا نام نہ لکھنے کی وجہ سے یہ ساری غلط فہمی پیدا ہوئی۔

واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت زینبؓ ایک اعلیٰ خاندان (بنی ہاشم) سے تعلق رکھتی تھیں جبکہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کی حیثیت ایک آزاد کردہ غلام کی تھی چنانچہ حضرت زینبؓ حضرت زیدؓ کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکیں اور نوبت طلاق تک پہنچی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ کی دل جوئی کی خاطر ان سے نکاح کر لیا۔ یہ وہ امور ہیں جن پر اتفاق رائے ہے اور باقی روایات "زیب داستان" کے لئے ہیں۔

(مؤلف)

حدیث کساء

(روایاتِ اہلِ بیت)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورۃ احزاب کے ایک کامل رکوع میں ازواجِ مطہرات کو خطاب کیا اور ان کے درجات و مراتب بیان کیے اور ان سے کچھ وعدے فرمائے۔ اس ضمن میں یہ بھی فرمایا۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ	یقیناً اللہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اے اہلِ بیت تم
الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ	سے ناپاکی دور کر دے اور تمہیں پورے طور
تَطْهِيْرًا ۝ الاحزاب ۳۳	پر پاک کر دے۔

آئیے اس آیت کی تفسیر علامہ مودودی صاحب کے الفاظ میں مطالعہ کیجیے :۔

" جس سیاق و سباق میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں اہل البیت سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں۔ کیونکہ خطاب کا آغاز ہی یَانِسَاءَ النَّبِیِّ کے الفاظ سے کیا گیا ہے اور ماقبل و مابعد کی پوری تقریر میں وہی مخاطب ہیں۔

علاوہ بریں اہل البیت کا لفظ عربی زبان میں ٹھیک انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جن میں ہم گھر والے کا لفظ بولتے ہیں اور اس کے مفہوم میں آدمی کی بیوی اور اس کے بچے دونوں شامل ہیں (بشرطیکہ وہ گھر میں رہتے ہوں اور انہوں نے جداگانہ گھر نہ بسایا ہو) بیوی کو مستثنیٰ کر کے " اہلِ خانہ " کا لفظ کوئی نہیں بولتا۔ خود قرآن مجید میں بھی اس مقام کے سوا دو مزید مقامات پر یہ لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ اس کے مفہوم میں بیوی شامل بلکہ مقدم ہے (بلکہ صرف بیوی مراد ہے یا اس کے ساتھ اس کا خاوند)

سورۃ ھود میں جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتے ہیں تو ان کی اہلیہ اسے

سن کر تعجب کا اظہار کرتی ہیں کہ بھلا اس بڑھاپے میں ہمارے یہاں بچّہ کیسے ہوگا۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں۔

اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ ۔ ھود ۳	کیا تم اللہ کے امر پر تعجب کرتی ہو، اے گھر والو تم پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔

سورۃ قصص میں حضرت موسیٰؑ ایک شیر خوار بچے کی حیثیت سے فرعون کے گھر میں پہنچے ہیں اور فرعون کی بیوی کو کسی ایسی انّا کی تلاش ہوتی ہے، جس کا بچہ دودھ پی لے تو حضرت موسیٰؑ کی بہن جاکر کہتی ہیں :۔

ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰٓی اَھْلِ بَیْتٍ یَّکْفُلُوْنَہٗ لَکُمْ ؛ القصص ۱۲	کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کا پتا بتا دوں جو تمہارے لیے اس بچہ کی پرورش کا ذمہ لیں۔

پس محاورہ اور قرآن کے استعمالات اور خود اس آیت کا سیاق و سباق ہر چیز اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں آپ کی ازواج مطہرات بھی (یہ بھی عمداً لگایا گیا ہے۔ اس کا عقدہ آگے کھلے گا) داخل ہیں اور آپ کی اولاد بھی۔

بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت کا اصل خطاب ازواج سے ہے اور اولاد مفہوم لفظ کے اعتبار سے اس میں شامل ہے۔ اسی بنا پر ابنِ عباسؓ (صحابی)، عروہ (تابعی المتوفی ۹۴ھ) اور عکرمہ (تابعی المتوفی ۱۰۵ھ) کہتے ہیں کہ اس آیت میں اہل بیت سے مراد ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (تفہیم القرآن ج ۴ صد ۹۲)۔

مودودی صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے تو تمام اہلِ سنت اس امر کے مدعی ہیں کہ یہ آیات کریمہ ازواج مطہرات کے بارے میں نازل ہوئیں، اور وہی ان آیات میں مراد ہیں۔ لیکن مفسر کلبی رافضی اور اس کے سبائی بھائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ آیات پنج تن کے بارے میں نازل ہوئیں۔ اسی لیے ان حضرات کے ساتھ پنج تن پاک کا لفظ لگایا جاتا ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ۔

اہلِ سنت حضرات نے ان ہر دو امور کو تسلیم کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں تو بے شک اہلِ بیت سے ازواج مطہرات مراد ہیں۔ یہ تو قرآنی اہلِ بیت ہیں لیکن یہ بیچارے صرف قرآن تک محدود ہیں۔

اور دوسرا اہلِ بیت وہ ہیں جو کبھی اور دیگر رافضیوں کے تراشیدہ ہیں یہ لوگ روایاتی اہل بیت اور مصنوعی اہلِ بیت ہیں اور چونکہ ہم روایت پرست واقع ہوتے ہیں لہذا قرآن کو ایک عرصہ دراز قبل ہی لپیٹ کر رکھ چکے ہیں بلکہ ہم نے اسے طاقوں کی زینت بنا دیا ہے۔ لہٰذا یہ مصنوعی اہلِ بیت اہلِ سنت کے دماغوں پر اس بری طرح مسلط ہوتے کہ اصل اہل بیت پس پردہ چلے گئے اور وہ کتب تفاسیر میں صرف اس آیت تک محدود ہو کر رہ گئے اور اس سے باہر کی دنیا میں کوئی اصل اہل بیت سے واقف تک بھی نہیں۔ بلکہ ہمارے علماء کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کھینچ تان کر اس آیت کا مصداق بھی ان پنج تن ہی کو بنا دیا جائے۔

علامہ مودودی آگے لکھتے ہیں:۔

"لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ اہل بیت کا لفظ صرف ازواج کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس میں کوئی دوسرا داخل نہیں ہو سکتا تو یہ بات بھی غلط ہوگی۔ صرف یہی نہیں کہ گھر والوں کے لفظ میں آدمی کے سب اہل و عیال شامل ہوتے ہیں۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرمائی ہے کہ وہ بھی شامل ہیں۔

ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا تم اس شخص کے متعلق پوچھتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین لوگوں میں سے تھا اور جس کی بیوی حضور کی وہ بیٹی تھی جو آپؐ کو سب سے بڑھ کر محبوب تھی۔

اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا کہ حضور نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ حسنؓ اور حسینؓ رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان پر ایک کپڑا ڈال دیا اور دعا فرمائی۔ اے اللہ یہ میرے

اہل بیت ہیں ان سے گندگی دور کر اور انہیں پاک کر۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ میں نے عرض کیا میں بھی تو آپ کے اہلِ بیت میں سے ہوں (یعنی مجھے بھی اس کپڑے میں داخل کر کے میرے حق میں دعا فرمائیے) حضور نے فرمایا تم الگ رہو۔ تم تو خیر ہی ہو۔

اس سے ملتے جلتے مضمون کی بکثرت احادیث مسلم، ترمذی، احمد، ابن جریر، حاکم اور بیہقی وغیرہ محدثین نے ابوسعید خدریؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت واثلہؓ بن الاسقع اور بعض دوسرے صحابہ سے نقل کی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کے دونوں صاحبزادوں کو اپنا اہل البیت قرار دیا۔ لہٰذا ان لوگوں کا خیال غلط ہے جو ان حضرات کو اس سے خارج ٹھہراتے ہیں۔" تفہیم القرآن ج ۴ صـ ۹۳

تقریباً یہی کچھ ہمارے تمام مفسرین اور شارحین حدیث لکھتے آئے ہیں۔ ان حضرات نے روایات کے سہارے ان چاروں کو اہل بیت میں داخل کر کے اللہ تعالیٰ کو یہ درس دینے کی کوشش کی ہے کہ اہل بیت میں تو عیال بھی داخل ہوتی ہے۔ آپ نے بلاوجہ ازواج کے سلسلہ میں یہ لفظ بول کر جو اس لفظ کو مخصوص فرمایا ہے۔ یہ درست نہیں آپ سے کہیں غلطی اور بھول تو نہیں ہوگئی۔ اگر واقعتاً آپ کو بدا ہو گیا ہے تو ہم یاد دہانی کرائے دیتے ہیں۔ چونکہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں عربی زبان پر زیادہ عبور رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے عیاذاً باللہ غلطی ہوتی ہے جس کا سدباب ضروری ہے' اسی لیے ہم نے کچھ داستانیں تیار کی ہیں۔

ہم بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اہل بیت میں اہل وعیال بھی داخل ہوتے ہیں لیکن وہ اہل وعیال جو گھر میں رہتے ہوں اور جو گھر میں نہ رہتے ہوں اور جنہوں نے اپنا گھر جداگانہ بسا لیا ہو وہ ہرگز بھی اس میں داخل نہیں ہوتے اور بیٹی تو ہوتی بھی غیر کے گھر کی ہے اور لڑکی کی شادی کے بعد کوئی بھی اسے باپ کے گھر والوں میں داخل نہیں کرتا۔ بلکہ دنیا یہی کہتی ہے کہ صاحب اب تو وہ اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔

جب تک حضرت فاطمہؓ کا نکاح نہیں ہوا تھا اس وقت تک وہ بے شک اہل بیت نبی میں داخل تھیں۔ لیکن جب نکاح ہو گیا تو اب وہ اہل بیت علیؓ میں شامل ہوئیں۔ جس طرح حضرت رقیہؓ حضرت ام کلثومؓ اہلِ بیت عثمان ہوئیں اور جس طرح حضرت زینبؓ اہل بیت ابی العاص ہوئیں۔ اور جب بقول علامہ مودودی صاحب اہل وعیال بھی اہل بیت میں داخل ہوتے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تین صاجزادیوں سے ایسا کون سا جرم سرزد ہوا تھا جو انہیں اہل بیت میں داخل نہیں کیا گیا اگر مودودی صاحب ایسا کرتے تو ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہوتیں۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ علامہ مودودی صاحب نے یہ بات اولاد علی ہونے کے باعث کہی ہے۔ یہ بات تو ہم اس وقت کہتے جب کہ وہ اس معاملہ میں تن تنہا ہوتے۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ روایت پرستی کا شکار ہو کر انہوں نے ان چاروں کو اہل بیت میں شامل کیا ہے کیونکہ روایات ان چاروں کے سلسلہ میں آتی ہیں۔

یہ آیات ۵ھ میں نازل ہوئیں جیسا کہ علامہ مودودی صاحب نے سورۃ احزاب کی ابتداء میں تحریر کیا ہے۔ اس وقت آپ کی صاجزادی حضرتؓ ام کلثومؓ حیات تھیں اور حضرت رقیہؓ کے صاجزادے حضرت عبد اللہؓ موجود تھے۔ آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نواسے اور اس بیٹی سے کونسا بغض تھا جو آپ نے انہیں چادر میں داخل نہیں کیا۔ اور ان کے لیے دعا نہیں کی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چادر ہی چھوٹی پڑ گئی ہو۔ اس کی توجیہہ اگر کسی سبائیت زدہ مولوی کے علم میں ہو تو ہمیں ضرور مطلع فرمائیں۔

۲ھ میں جنگِ بدر میں آپ کے بڑے داماد ابوالعاصؓ قید ہو کر آئے۔ جب انہیں رہا کیا گیا تو آپؐ نے اُن سے وعدہ لیا کہ مکہ جا کر میری بیٹی اور بچوں کو میرے پاس بھیج دینا۔ انہوں نے جاتے ہی حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیا۔ اس وقت حضرت زینبؓ کے ایک صاجزادے علیؓ نامی اور ایک صاجزادی امامہؓ تھیں۔ یہ وہ امامہؓ ہیں جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کاندھوں پر بٹھا کر نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ۲ھ سے ۸ھ تک حضرت زینبؓ مع بچوں کے والد کے پاس رہیں۔

اس طرح ان دونوں بچوں کی تربیت نانا نے کی۔

اب ذرا ٹھنڈے دل سے ہمارے سنی علماء اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ ۵ ھ میں جب آیت تطہیر نازل ہوئی۔ اس وقت حضرت زینبؓ مع بچوں کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یعنی باپ کے گھر موجود تھیں۔ ایسا کونسا باپ ہو گا جس کی کئی بیٹیاں ہوں اور متعدد بیٹیوں کے اولاد ہو۔ لیکن وہ صرف ایک بیٹی اور اس کی اولاد کو سینہ سے لگائے اور اس کے لیے دعائے خیر کرے۔ لیکن دوسری بیٹی جو گھر بیٹھی ہوتی ہے اسے اور اس کی اولاد کو اپنی تمام رحمتوں سے دور کر دے۔ ایسی حرکت تو کوئی ظالم بھی نہ کرے گا۔ بلکہ ایک ظالم باپ بھی یہ سوچ کر کہ اس بیٹی کا کوئی سہارا نہیں اس کا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے گا۔ لیکن ہمارا ملاّں شیعی روایات سے اتنا متاثر ہے کہ اسے یہ پہاڑ بھی نظر نہیں آتا کہ وہ اس روایت کو مان کر گویا یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمت اللعالمین تھے تو وہ رحمۃ اللعالمین دوسروں کے لیے ہوں گے اپنی بیٹیوں اور ان کی اولاد کے لیے تو وہ سراپا ظالم تھے۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ۔

میں تو اس شخص کو مسلمان بھی ماننے کے لیے تیار نہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب اس ظلم کی نسبت کرے۔ ممکن ہے کہ ان حضرات کا ذہن ادھر متوجہ نہ ہوا ہو۔ اگر ایسا ہے تو آپ توجہ کر کے دیکھ لیں کہ یہ روایتیں کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دیگر صاحبزادیوں اور ان کی اولاد کے لیے کھلا تبرا نہیں ہیں ؟

بلکہ آگے بڑھ کر یہ بھی سوچئے کہ اگر واقعتاً نبی سے ایسی غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے بجائے اسکے کہ اپنے نبی کو متنبہ فرماتا۔ اسی طرح خاموشی اختیار فرمالی۔ جس طرح جبریل علیہ السلام غلطی سے حضور کے پاس وحی لاتے رہے۔ اور اللہ تعالیٰ خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ اعوذ باللہ من ہذا الشر العظیم۔

یہ ان روایتوں کا منطقی نتیجہ ہے کہ جو ہمیں نظر آ رہا ہے اور اللہ کرے تمام اہل سنت

حضرات کو نظر آجائے۔ ہمارے نزدیک یہ چادر والی کہانی ایک زہر کی پڑیا ہے جو سبائیوں نے پھانکنے کے لیے سنیوں کے ہاتھ میں تھما دی ہے اور یہ چینی سمجھ کر اس کی پھنکیاں مار رہے ہیں۔ حالانکہ اس روایت کے راوی فرشتے بھی ہوتے تو تقاضائے عقل یہ تھا کہ اس روایت کو قبول نہ کیا جاتا۔ کیونکہ جہاں یہ خلاف قرآن ہے۔ وہاں اس سے آپؐ کی ذات اقدس پر حرف آرہا ہے بلکہ یہ روایت ایک ایسا مخفی اور جامع تبرا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی تین صاحبزادیاں اور نواسے سب شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولوی حبیب احمد صاحب کیرانوی مرحوم مصنف اظہارِ حق کو جنہوں نے اردو زبان میں سب سے اوّل اس روایت کی تنقید پر قلم اٹھایا۔ ان کی یہ تنقید رسالہ النجم میں شائع ہوئی۔ جو مولینا عبدالحلیم شرر کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلتا تھا اور اس تنقید کی مدح مولوی عبدالشکور لکھنوی مرحوم نے فرمائی۔ ان کے اس مضمون کا خلاصہ مولوی سراج الحق دیوبندی مچھلی شہری نے ایک رسالہ کی صورت میں اعظم گڑھ سے شائع کیا۔ لیکن زبان کے لحاظ سے ذرا زبان کچھ دقیق تھی اور بعض مقامات پر کچھ تشنگی پائی جاتی تھی۔ اس لیے ہم اسے اپنے الفاظ میں معمولی اضافہ کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ روایت ام سلمہؓ : حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تھے کہ یہ آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ الآیۃ نازل ہوئی، آپ نے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو بلایا اور انہیں ایک چادر میں لے کر دعا کی کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں تو ان سے پلیدی دور فرما اور انہیں پاک فرما دے۔ ام سلمہؓ کہتی ہیں میں دہلیز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا میں اہل بیت میں نہیں ہوں؟ فرمایا تم خیر کی طرف ہو، تم ازواج نبی میں ہو۔ ابن جریر ج۱۰ ص۵۔

اس روایت کی سند یہ ہے۔ ام سلمہؓ، ابوسعید، عطیہ، فضیل بن مرزوق، حسن بن عطیہ، ابوکریب۔

مولوی رحمت اللہ کیرانوی لکھتے ہیں۔ یہ روایت اس سند کے ساتھ موضوع ہے۔ اس کا وضع کرنے والا محمد بن سائب کلبی ہے۔

محمد بن السائب کلبی : امام احمد فرماتے ہیں یہ رافضی سبائی تھا۔ اہل علم نے اسے کذاب کہا ہے۔ یہ کہا کرتا تھا کہ جبرئیلؑ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لائے تو آپ گھر پر موجود نہ تھے۔ وہ حضرت علیؓ پر اتار کر چلے گئے (معاذ اللہ) اس کو اس کا شاگرد عطیہ ابو سعید کہا کرتا ہے۔ حالانکہ خود کلبی نے اپنی یہ کنیت نہیں رکھی تھی۔ ہم نے اس کا تفصیلی حال پہلے حصہ میں پیش کیا ہے۔ اور اس حصہ میں بھی ایک اور جگہ پیش کر چکے ہیں۔

عطیہ العوفی : اس کے متعلق امام احمد کہتے ہیں یہ ضعیف الحدیث ہے۔ مجھے خبر ملی ہے کہ عطیہ کلبی کے پاس آمد و رفت رکھتا تھا اور اس سے تفسیر پوچھتا تھا اور اس کی کنیت ابو سعید رکھتا تھا۔ مجھ سے ابو احمد زبیری نے بیان کیا ہے کہ میں نے خود کلبی کو یہ کہتے سنا ہے کہ عطیہ نے میری کنیت اپنی طرف سے ابو سعید رکھ دی ہے۔

ابن حبان کہتے ہیں کہ عطیہ کا ایک استاد حدیث ابو سعید تھا۔ جب اس کا انتقال ہو گیا تو عطیہ کلبی کے پاس جانے لگا تو جب کلبی کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو عطیہ اسے یاد کر لیتا اور اس روایت کو بیان کرتا۔ جب کوئی اُس سے سوال کرتا کہ تم سے یہ روایت کس نے بیان کی۔ جواب دیتا ابو سعید نے اور اس کا مقصود لوگوں کو یہ دھوکہ دینا ہوتا ہے کہ اس ابو سعید سے مراد ابو سعید خدریؓ صحابی ہیں۔ حالانکہ وہ کلبی کذاب مراد لیا کرتا تھا۔

گویا اس روایت کے دو راوی کذاب اور ناقابل اعتبار ہیں اور دونوں رافضی ہیں۔ بلکہ بقول امام احمد ہر وہ روایت جو عن عطیۃ عن ابی سعید کے ذریعہ مروی ہو۔ یقیناً موضوع ہو گی اور وہاں ابو سعید خدری صحابی ہرگز مراد نہ ہوں گے۔ بلکہ کلبی کذاب رافضی مراد ہو گا۔

جناب مولوی رحمت اللہ کیرانوی صاحب نے ان دو راویوں پر جرح کر کے روایت کو موضوع قرار دے دیا۔ حالانکہ عطیہ سے یہ کہانی نقل کرنے والا فضیل بن مرزوق ہے

کچھ تھوڑا سا حال اس کا بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

فضیل بن مرزوق: یہ بھی کوفہ کا باشندہ ہے۔ تشیع میں مشہور ہے۔ ابو عبداللہ الحاکم کہتے ہیں کہ امام مسلم پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس سباتی بچہ سے روایت لی ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں اس کی روایت بہت منکر ہوتی ہے۔ یہ عطیہ سے موضوع روایات نقل کرتا ہے۔ میزان ج ۳ ص ۳۶۲

اتفاق سے اس فضیل سے یہ کہانی نقل کرنے والا حسن بن عطیہ بھی ضعیف ہے۔

آگے جناب کیرانوی لکھتے ہیں۔ اس روایت کے ذریعہ یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیاذاً باللہ قرآن کو نہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ قرآن کی ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اے ازواج نبی ہم نے تمہیں یہ احکام مذکورہ اس لیے دیئے ہیں کہ تم اس پر عمل کر کے پاک رہو تو اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان چہار تن کو بلا کر فرماتے کہ تم بھی میرے گھر والے ہو۔ تم کو بھی ان امور پر عمل کر کے پاک ہونا چاہیئے۔ بجائے اس نصیحت کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ ان کو پاک کر دے کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب ہوتا کہ ہم نے تو پاک ہونے کا طریقہ بتلا دیا ہے۔ اگر یہ لوگ اس پر عمل کریں گے تو یہ بھی پاک ہو جائیں گے۔ پس بجائے اس کے کہ تم ہم سے درخواست کرو۔ براہ راست انہیں ان اصولوں پر کاربند ہونے کا حکم دو۔ لیکن اگر یہ چکر چلایا جاتا تو پنج تن پاک کا فارمولا کیسے وجود میں آتا۔

۲۔ سند محمد بن مثنیٰ، بکر بن یحییٰ بن ریان عنزی، مندل، اعمش، عطیہ، ابو سعید، ام سلمہ۔

آیت تطہیر پانچ مذکورہ اشخاص کے بارے میں نازل ہوئی۔ یعنی پنج تن۔ ابن جریر ج ۲۲ ص ۵

مندل راوی جائز الحدیث ہے مگر شیعہ ہے۔ (عجلی) واہی حدیث ہے (جوزجانی) ثقہ نہیں ہے۔ منکر روایات بیان کرتا ہے (ساجی) مرسل روایات مرفوع حدیث کہہ کر پیش کرتا ہے اور مرفوع میں خرابی حافظہ کی بنا پر دوسری سند جوڑ دیتا ہے۔ اس لیے ترک کیے جانے کا مستحق ہے (ابن حبان)

جناب کیرانوی کی رائے ہے کہ اس مندل کو سوء حفظ کی کوئی شکایت نہ تھی۔ یہ سب تشیع کے کرشمے

تھے۔ واللہ اعلم۔

ہمارے نزدیک یہ کوئی نئی روایت نہیں۔ بلکہ صرف نیچے کے راوی تبدیل ہو گئے ہیں۔ اوپر کے راوی وہی عطیہ اور کلبی کذاب رافضی ہیں۔ ہاں مندل نے اس روایت میں یہ فرق ضرور پیدا کر دیا ہے کہ چادر والا قصہ حذف کر کے روایت کو مختصر کر دیا۔ جس سے دوسروں کو دھوکہ دینا آسان ہو گیا۔

۳۔ سند۔ ابوکدینہ، وکیع، عبدالحمید بن بہرام، شہر بن حوشب، فضیل بن مرزوق، عطیہ، ابوسعید۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں۔ جب آیت تطہیر نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں افراد کو بلوایا اور ان پر خیبر کا کمبل ڈال دیا، اور فرمایا۔ اے اللہ یہ لوگ میرے اہل بیت ہیں، ان سے پلیدی دور کر اور انہیں پاک کر۔ تو ام سلمہؓ بولیں کیا میں ان میں نہیں ہوں؟ فرمایا تم خیر کی طرف ہو۔ ابن جریر ج ۱۰ ص ۵۔

شہر بن حوشب : اس کی کنیت بھی ابوسعید ہے۔ یہ حدیث میں قوی نہیں ہے۔ اس کی حدیث کو حجت نہ سمجھا جاتے اور نہ اسے دین تصور کیا جائے۔ (ابن عدی) ابن منصور نے شہر کے ساتھ حج کیا۔ اس نے دوران حج ابن منصور کا تھیلا چرا لیا اور یہ کوئی نیا واقعہ نہ تھا۔ یہ حرکت تو وہ اکثر کرتا رہا ہے) (یحیٰی قطان) اس کی روایت پر اعتبار نہ کیا جائے (جوزجانی)

گویا اس روایت کی سند میں ایک چور اور تین رافضی اور کذاب موجود ہیں۔ یعنی عطیہ، ابوسعید اور فضیل بن مرزوق جو پہلی روایتوں میں بھی موجود تھے اس لحاظ سے یہ کوئی نئی روایت نہیں۔

میرے نزدیک اس روایت کی سند میں ایک نہایت خطرناک گڑبڑ گھٹالا ہے۔ وہ یہ کہ شہر بن حوشب نے یہ روایت فضیل سے نقل کی ہے۔ گویا فضیل اس روایت میں شہر کا استاد ہے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ شاگرد صاحب یعنی شہر ۱۱۲ھ میں انتقال کرتے ہیں اور استاد جی

یعنی فضیل سنہ ۱۹۰ میں۔ یعنی استاد شاگرد کے مرنے کے اڑتالیس سال بعد مرتا ہے۔ جب کہ معاملہ برعکس ہونا چاہیئے تھا۔ شہر تو عطیہ سے بھی پہلے ہے جو فضیل کا استاد ہے۔ بلکہ شہر نے ام سلمہؓ سے خود احادیث سنی ہیں۔ اسے درمیان میں ان تین راویوں کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارا ذہن تو یہ کہتا ہے کہ یہ سند بعد میں کسی نے وضع کر کے شہر کی جانب منسوب کر دی۔ تاکہ اس روایت کے لیے ایک نئی سند مہیا ہو جائے۔

شہر سے اسے نقل کرنے والا عبد الحمید بن بہرام ہے جو ثقہ ہے۔ عبد الحمید سے نقل کرنے والے وکیع ہیں۔ ان کی ثقاہت میں کسی کو شبہ نہیں۔ وکیع سے نقل کرنے والا ابو کریب ہے اور ابو کریب سے ابن جریر نقل کر رہے ہیں۔ اب یہ حرکت ان دونوں میں سے کسی ایک کی ہے۔ بہرصورت روایت اور سند دونوں موضوع ہیں۔

۴۔ سند۔ ابو کریب، مصعب بن المقدام۔ سعید بن زربی، محمد بن سیرین، ابو ہریرہ، ام سلمہ۔

ام سلمہؓ فرماتی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر تشریف فرما تھے کہ فاطمہؓ ایک سینی میں کچھ رکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئیں اور آپ کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے سوال کیا تمہارے شوہر اور دونوں لڑکے کہاں ہیں؟ انہوں نے عرض کیا گھر پر ہیں۔ آپ نے فرمایا انھیں بلاؤ تو انہوں نے آ کر علیؓ سے کہا کہ آپ کو اور لڑکوں کو حضرت نے بلایا ہے۔ جب حضور نے ان کو آتے دیکھا تو بستر سے ایک کملی اٹھا کر اسے بچھایا اور ان سب کو اس پر بٹھایا۔ پھر اس کے چاروں کونے بائیں ہاتھ سے اکٹھے کیے داہنے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ کی طرف اشارہ کیا اور کہا یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے پلیدی دور کر دیجیئے اور انہیں پاک کر دیجیئے۔ ابن جریر ج ۸ ص ۶۔

سعید بن زربی۔ یہ سند اور یہ متن سعید بن زربی راوی کا اختراع ہے۔ سعید بن زربی کے یہاں عجیب عجیب منکرات ہیں (ابو حاتم) یہ صاحب عجائب ہے (مسلم) یہ ثقہ راویوں کے نام سے موضوع احادیث روایت کرتا ہے (ابن حبان)

مولوی سراج الحق مچھلی شہری فرماتے ہیں۔ ان حضرات کا گٹھڑی بنا کر بائیں ہاتھ سے پکڑنا

واقعی ایک عجیب اور منکر شئے ہے اور اپنے داہنے ہاتھ سے اللہ کی طرف اشارہ کرنا (نہ کہ آسمان کی طرف) یہ اس سے بھی عجیب تر ہے۔

۵۔ سند۔ ابوکریب، خالدبن مخلد، موسیٰ بن یعقوب، ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص، عبداللہ بن وہب بن زمعہ۔ ام سلمہؓ۔

ام سلمہؓ فرماتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ کو جمع کیا اور پھر انہیں اپنے کپڑوں میں داخل کیا پھر اللہ سے فریاد کی اور فرمایا یہ میرے اہل بیت ہیں۔ ام سلمہؓ بولیں یا رسول اللہ مجھے بھی ان کپڑوں میں داخل فرمالیجئے۔ فرمایا ہاں تم میرے اہل بیت میں ہو۔ ابن جریر ج ۲ ص ۶۔

خالدبن مخلد یہ روایت اور یہ سند خالدبن مخلد کی اختراع ہے۔ خالد منکرالحدیث ہے تشیع میں انتہا کو پہنچا ہوا تھا (ابن سعد) علانیہ سب وشتم کیا کرتا تھا۔ چنانچہ کسی نے پوچھا کیا مناقب صحابہ کی بھی حدیثیں تمہارے پاس ہیں۔ کہنے لگا برائیوں کی پوچھو (جوزجانی) گویا اس روایت میں خالدبن مخلد جیسا دشمن صحابہ موجود ہے (اور موسیٰ بن یعقوب بھی منکرالحدیث ہے)

اسے سوءِ اتفاق کہیئے یا حسنِ اتفاق کہ یہ خالدبن مخلد بخاری اور مسلم کا راوی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مولوی رحمت اللہ کیرانوی مرحوم اس پر جرح کررہے ہیں۔ جواب ایک ناقابلِ معافی جرم بن چکا ہے۔ اس لحاظ سے تو انہیں منکر حدیث کہنا چاہیئے

سطور بالا میں جو پانچ روایات پیش کی گئیں۔ دراصل یہ پانچ سندات ہیں۔ ورنہ روایت تو ایک ہی ہے یعنی حضرت ام سلمہؓ کی۔ لیکن ہر ایک کا نقشہ ہی جداگانہ ہے ان میں دو دو آیتیں بھی ایسی نہیں جو بلحاظ واقعہ ایک ہوں۔ ہر ایک کی جداگانہ صورت ہے۔ ہم تو یہ رام کہانیاں پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ آیت تطہیر کا مصداق بننے کے لیے کسی عمل وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف چادر اوڑھ لینا کافی ہے۔

۶۔ احمدبن محمد طوسی۔ عبدالرحمان بن صالح، محمد بن سلیمان اصبہانی، یحییٰ بن عبید مکی، عطاء

عمر بن ابی سلمہ ۔

عمرؓ بن ابی سلمہ فرماتے ہیں کہ آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ یعنی آیت تطہیر ام سلمہؓ کے گھر اتری۔ آپ نے فاطمہؓ اور حسینؓ کو بلا کر اپنے سامنے اور علیؓ کو بلا کر پیچھے بٹھا لیا۔ پھر ان سب کو اپنے سمیت چادر میں چھپا لیا اور فرمایا۔ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں، انہیں پاک کر دیجئے۔ ام سلمہؓ نے عرض کیا، اے اللہ کے نبی ان کے ساتھ میں بھی آ جاؤں۔ فرمایا تم اپنی جگہ ٹھہری رہو۔ تم بہتر حالت میں ہو۔ ترمذی ج ۲ صـ۱۷۵ ۔ صـ۲۴۳ ۔

ترمذی نے اسے غریب کہا ہے۔ غالباً یہ غرابت محمد بن سلیمان اصبہانی

محمد بن سلیمان اصبہانی کی جانب سے ہے۔ ائمہ رجال نے اس کا حال بیان کیا ہے کہ اس کی حدیث کو حجت نہیں بنایا جا سکتا (ابو حاتم) یہ مضطرب الحدیث ہے۔ اس کے پاس جتنی حدیثیں ہیں سب میں اس نے غلطیاں کی ہیں (ابن عدی) ضعیف ہے (نسائی) اس روایت میں اصبہانی نے دانستہ یا غیر دانستہ غلطی کی ہے۔

اس روایت کو علامہ مودودی صاحب نے حضرت عائشہؓ کی جانب منسوب کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت آگے آئے گی۔

۷۔ ابن حمید، عبد اللہ بن عبد القدوس، اعمش، حکیم بن سعد۔

ہم نے حضرت ام سلمہؓ کے یہاں حضرت علیؓ کا تذکرہ کیا۔ وہ بولیں انھی کے بارے میں تو یہ آیت اتری ہے۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ آخر تک۔ حضور میرے گھر تشریف لائے اور فرمایا کسی کو میرے پاس نہ آنے دینا۔ علیؓ آئے تو میں روک نہ سکی۔ فاطمہؓ آئیں تو انہیں ان کے والد کے پاس جانے سے نہ روک سکی۔ پھر حسنؓ آئے تو میں ان کو بھی نہ روک سکی۔ پھر حسینؓ آئے تو میں انہیں بھی نہ روک سکی۔ تو یہ سب کے سب حضور کے پاس ایک بستر پر اکھٹے ہو گئے۔ حضور نے ان کو کمبل اڑھایا جسے خود اوڑھے ہوئے تھے۔ پھر دعا کی کہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔ ان سے پلیدی دور کر، اور انہیں پاک کر دیجئے۔ تو جب یہ لوگ اس بچھونے پر اکھٹے ہو گئے، تب یہ آیت اتری۔

ام سلمہ کہتی ہیں اور میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اور میں۔ بخدا مجھے چین نہ ملے گا تو حضور نے فرمایا تم خیر کی طرف ہو۔ ابن جریر ج ۱ص ۷۔

مقصد یہ ہے کہ اگرچہ ازواج مطہرات خیر پر ہیں لیکن ان کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ آیت ان چاروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہم تو یہ تصور کرتے ہیں کہ اس قسم کی روایات وضع کرنے والے خالص فریب کار ہیں اور ان روایات پر ایمان لانے والے خود فریبی کے مرض میں مبتلا ہیں اس لیے کہ یہ آیت پوری نہیں بلکہ ایک بڑی آیت کا آخری ٹکڑا ہے۔

آیت اس طرح ہے۔

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ؕ (الاحزاب ۳۳)

اور اے نبی کی بیویو اپنے گھروں میں جم کر بیٹھو اور زمانۂ جاہلیت کی طرح اتراتی نہ پھرو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، کیونکہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ اے اہل بیت تم سے ناپاکی دور کر دے اور تمہیں مکمل طور پر پاک کر دے۔

ان فریب کاروں نے آیت کے دو ٹکڑے کر کے ازواج مطہرات سے اس کا تعلق ختم کر دیا۔ اور ہمارے روایت پرست ملا کو یہ تک نظر نہ آیا کہ یہ مکمل آیت نہیں۔ بلکہ آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ ہمارا سنی ملا اس ٹکڑے کو پوری آیت تصور کرتا ہے۔ ان حضرات کا اگر قرآن سے کچھ بھی تعلق ہوتا تو یہ بات ان کے سمجھ میں آتی اور اگر انہوں نے احادیث صحیحہ کا مطالعہ کیا ہوتا تو انہیں معلوم ہوتا کہ یہ پورا رکوع ایک ساتھ نازل ہوا ہے۔ اسی لیے سبائیوں کا دعویٰ ہے کہ یہاں سے ابوبکر و عمر نے دو سو آیات نکال دیں

جناب کیرانوی لکھتے ہیں اس روایت کی یہ شکل عبد اللہ بن عبد القدوس
عبداللہ بن عبدالقدوس کی اختراع ہے۔ یہ عبداللہ لاشئ ہے۔ خبیث رافضی ہے (یحیٰی بن معین)

ضعیف الحدیث رافضی المذہب ہے۔ (ابو داؤد) یہ ثقہ نہیں ہے (نسائی) اکثر غریب حدیثیں بیان کرتا ہے (ابن حبان) یہ اکثر فضائل اہلِ بیت کی روایات بیان کرتا ہے (ابن عدی) یہ خشبی شیعہ تھا (ابو عمر) یہ مزدکی تھا۔ کسی قابل نہ تھا۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہ پاگل تھا۔ لڑکے اس کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے۔

مولانا کیرانوی لکھتے ہیں یہ موضوع روایت مولوی عاشق الٰہی صاحب خلیفہ مولینا رشید احمد گنگوہی نے اپنی حمائل کے حاشیہ میں درج کی ہے۔ یہ ہے اہل علم کی غفلت۔

ہمارے نزدیک اس سند میں ایک اور بھی خطرناک ہستی موجود ہے اور وہ ہے ابن حمید۔

محمد بن حمید الرازی : یہ مشہور مؤرخ ہے، ابن جریر کا استاد ہے اور یعقوب قمی کا شاگرد ہے۔ یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ یہ بہت منکرات بیان کرتا ہے ابو زرعہ رازی کہتے ہیں کذاب ہے۔ فضلک الرازی کا بیان ہے کہ میرے پاس اس کی پچاس ہزار روایات لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن میں ان میں سے کسی کا بیان کرنا بھی حلال نہیں سمجھتا۔ صالح جزرہ کہتے ہیں یہ جھوٹ بولنے میں بہت جری تھا۔ ہم تو اسے ہر بات میں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ بلکہ میں نے جھوٹ بولنے میں اس سے زیادہ ماہر کوئی نہیں دیکھا۔ ابن خراش کہتے ہیں اللہ کی قسم وہ تو جھوٹ بولتا ہے۔

فضلک الرازی کا بیان ہے کہ میں ایک بار اس کے پاس گیا۔ یہ مصنوعی روایات کی مصنوعی سندات تیار کر رہا تھا۔ میزان ج ۳ ص ۵۳۰۔

روایت واثلہ رض ۸ - عبد الاعلی بن واصل۔ فضل بن وکین، عبد السلام بن حرب، کلثوم محاربی، ابو عمار۔

ابو عمار کہتے ہیں کہ میں حضرت واثلہ رض بن الاسقع کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ لوگوں نے حضرت علی رض کا ذکر کیا اور انہیں سب و شتم کیا۔ جب میں اٹھ کر جانے لگا تو واثلہ رض نے کہا بیٹھو۔ میں تم کو اس کا واقعہ بتاؤں جنہیں یہ سب لوگ سب و شتم کر گئے ہیں۔ میں حضور کے پاس تھا کہ آپؐ کے پاس حضرت علی رض، حضرت فاطمہ رض، حضرت حسن رض اور حسین رض آئے۔ تو آپ نے ان پر کمبل ڈال دیا۔ پھر دعا کی۔

اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔ اے اللہ ان سے پلیدی دور کر اور انہیں پاک کر۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اور میں۔ فرمایا ہاں تم کو بھی۔ واثلہؓ کہتے ہیں بخدا مجھے سب سے زیادہ اسی کا سہارا ہے۔ ابن جریر ج ۱۰ صہ۔

فضل بن وکین راوی شیعہ ہے۔ مگر اس روایت کو وضع کرنے والا غالباً کلثوم محاربی ہے۔

ہمیں بہت خوشی ہے کہ راوی نے حضرت واثلہؓ کو اہل بیت میں داخل کر کے پنج تن کے بجائے شش تن تیار کرائے۔ نہ معلوم ابن جریر طبری نے کس طرح اپنے سینہ پر پتھر رکھ کر یہ روایت بیان کی ہو گی۔

اس کے ایک راوی عبدالسلام بن حرب کو نعیثمہ اور ابن سعد نے ضعیف کہا ہے۔

اس کا ایک راوی عبدالاعلی بن واصل مجہول ہے۔

۹۔ عبدالکریم بن ابی عمیر، ولید بن مسلم، ابوعمرو، ابوعمار، واثلہؓ۔

حضرت واثلہؓ کہتے ہیں کہ میں علیؓ کو ڈھونڈھتا ہوا ان کے گھر گیا۔ تو فاطمہؓ نے کہا کہ حضورؐ کو بلانے گئے ہیں۔ اتنے میں علیؓ آئے اور حضورؐ آ کر ان کے گھر چلے گئے میں بھی چلا گیا، حضور فرش پر بیٹھ گئے۔ فاطمہؓ کو داہنے، علیؓ کو بائیں اور حسنینؓ کو سامنے بٹھایا اور ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ لیا اور کہا اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ۔ یا اللہ یہ میرے اہل ہیں۔ اے اللہ میرے اہل زیادہ مستحق ہیں۔ میں نے گھر کے کونے سے کہا۔ یا رسول اللہ کیا میں بھی آپ کے اہل سے ہوں؟ فرمایا ہاں تم میرے اہل میں ہو۔ واثلہؓ کہتے ہیں یہی میرا سب سے بڑا سہارا ہے۔ ابن جریر ج ۱۰ صہ۔

دونوں روایات واثلہؓ سے مروی ہیں۔ پہلی روایت میں سب حضورؐ کے گھر جمع ہوئے اور اس روایت کی رو سے حضرت علیؓ حضورؐ کو اپنے گھر بلا کر لے گئے۔ پہلی روایت میں آیت کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ اس میں آیت بھی بیان کی گئی۔

ہر دو روایات میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ یہ میرے اہل ہیں۔ یعنی اے اللہ آپ کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ ازواج اہل ہوتی ہیں۔ اہل تو یہ ہیں (معاذا باللہ)

ابوعمرو: اس کا ایک راوی ابوعمرو متہم ہے۔ اس کا نام عبدالرحمٰن بن یزید بن تمیم ہے یہ منکرالحدیث ہے (بخاری) متروک الحدیث ہے۔ لوگوں نے اس کی روایت لینی چھوڑ دی (ابو داؤد۔ نسائی۔ دارقطنی) ضعیف الحدیث ہے (ابو حاتم) کمزور ہے (احمد) کذاب ہے (ولید بن مسلم) الضعفاء والمتروکین للدارقطنی ص۱۱۸ - میزان الاعتدال ج ۲ ص۵۹۸ - تقریب ص۵۰۲ - الجرح والتعدیل ج ۲ ص۳ -

اس کا ایک اور راوی عبدالکریم بن ابی عمیر مجہول ہے (ذہبی) عبدالکریم نے یہ روایت ولید بن مسلم سے نقل کی ہے اور یہ روایت منکر ہے۔ میزان ج ۲ ص۶۴۴ -

۱۰- محمد بن بکر، حماد بن سلمہ، علی بن زید بن جدعان - انس بن مالکؓ -

روایت انسؓ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چھ ماہ تک نماز کو جاتے وقت برابر سیدہ فاطمہؓ کے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے فرماتے۔ اے اہل بیت نماز کو چلو۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم سے ناپاکی دور کر دے۔ ابن جریر ج ۱۰ ص۵ -

ترمذی ج ۲ ص۱۷۱ پر ہے کہ یہ اعلان صبح کی نماز کے وقت ہوا کرتا تھا

ابن جدعان: اس میں علی بن زید بن جدعان رافضی ہے (عجلی) شیعہ ہے۔ اس کی حدیث لکھی تو جا سکتی ہے مگر یہ قوی نہیں۔ واہی الحدیث ہے۔ ضعیف ہے۔ اعتدال سے ہٹا ہوا ہے، شیعہ ہے اس کی حدیث کو حجت نہ سمجھا جائے (جوزجانی) یہ قوی نہیں۔ اس کی حدیث لکھ تو لی جائے مگر اس کی روایت کو سند نہیں بنایا جا سکتا۔ شیعہ ہے (ابوحاتم) یہ حدیث میں تبدیلیاں کرتا تھا (حماد بن زید) اسے شیعیت میں غلو تھا (ابن عدی) اسے وہم ہوتا تھا۔ بہت خطا کرتا تھا اس لیے ترک کا مستحق ہے (ابن حبان)

۱۱- ابن وکیع - ابونعیم - یونس بن ابی اسحاق، ابو داؤد، ابوالحمراء - انسؓ -

اس کا مضمون وہی ہے جو پہلی روایت کا ہے۔ مگر اس میں سات ماہ کی مدت ہے۔ ابو داؤد النخعی کا نام نیضع بن الحارث ہے۔ یہ ضعیف ہے۔ بعض نے اسے کذاب کہا ہے۔

اس سے روایت نہ لینے پر اجماع ہے (ابن عبد اللہ) یہ ثقہ راویوں کے نام سے موضوع احادیث روایت کرتا ہے (ابن حبان) غال رافضی ہے (عقیلی) یہ کوفہ کے غالی لوگوں میں سے ہے (ابن عدی)

یونس بن ابی اسحاق ضعیف ہے (یحیٰی بن سعید القطان، احمد بن حنبل) ابو نعیم کا نام فضل بن دکین ہے شیعہ ہے۔ ابن وکیع سے مراد سفیان بن وکیع ہیں۔ ان پر سخت اعتراضات ہیں حتیٰ کہ ابو زرعہ نے انہیں کذاب کہا ہے۔

۱۲۔ عبد الاعلیٰ بن واصل۔ فضل بن دکین۔ ابو داؤد۔ ابو الحمراء۔ انس رض۔

اس سند سے بھی وہی مضمون مروی ہے۔ لیکن فضل بن دکین شیعہ ہے اور ابو داؤد الاعمی رافضی اور کذاب ہے اور عبد الاعلیٰ بن واصل مجہول ہے۔

ابن نمیر، محمد بن بشر۔ زکریا۔ مصعب بن ابی شیبہ۔ صفیہ بنت شیبہ۔ عائشہ

روایت عائشہ رض ۱۳ ۔ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں۔ حضور ایک صبح کو سیاہ دھاری دار کمبل اوڑھ کر نکلے تو حسن رض آگئے تو آپ نے انہیں کمبل میں لے لیا۔ اتنے میں حسین رض آگئے۔ آپ نے انہیں بھی کمبل میں داخل کر لیا۔ پھر فاطمہ رض آئیں۔ آپ نے انہیں کمبل میں داخل کر لیا۔ پھر علی رض آئے تو انہیں بھی کمبل میں داخل کر لیا پھر یہ آیت تلاوت کی۔ مسلم ج ۲ ص ۲۸۳ ابن جریر ج ۱۰ ص ۹۔

مصعب : کا حال یہ ہے کہ یہ منکر احادیث روایت کرتا ہے (احمد) یہ قوی نہیں لوگ اسے اچھا نہیں سمجھتے (ابو حاتم) منکر الحدیث ہے (نسائی) قوی نہیں (دارقطنی)

اس مضمون کی روایت عموماً حضرت ام سلمہ رض سے مروی ہے۔ مگر اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصعب نے یا کسی اور نے سند بدل کر اسے حضرت عائشہ رض کی جانب منسوب کر دیا ہے۔

ہم نے جب مزید آگے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مصعب سے یہ روایت نقل کرنے والا زکریا بن ابی زائدہ مدلس ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے درمیان سے کوئی ضعیف راوی گرا دیا ہو اور محمد بن بشر کا ہمیں کوئی تفصیلی حال معلوم نہیں ہو سکا۔ اور نہ ابن ابی حاتم کے علاوہ کسی نے اس کا تذکرہ کیا۔ جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ غیر معروف ہے۔

۱۴۔ موسیٰ بن عبدالرحمان۔ یحییٰ بن ابراہیم بن سوید، ہلال بن مقلاص۔ زبید۔ شہر بن حوشب
ام سلمہؓ۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں۔ حضور میرے پاس تھے اور یہ چاروں حضرات بھی۔ تو میں نے ان کے لیے حلوا پکایا۔ ان سب نے کھایا اور سو گئے۔ حضور نے ان سب کو چادر اوڑھادی پھر فرمایا اے اللہ یہ میرے اہلبیت ہیں۔ ان سے پلیدی دور کر اور انہیں پاک کر۔ ابن جریر ج۲۰ صـ۵۔

اس کے تین راوی موسیٰ بن عبدالرحمان، یحییٰ بن ابراہیم اور ہلال بن مقلاص مجہول ہیں۔ زبید شیعہ ہے۔

شہر بن حوشب: اس کا حال ۳ میں گزر چکا۔ ہم نے وہاں یہ لکھا تھا کہ شہر خود ام سلمہؓ سے روایت نقل کرتا ہے تو پھر اسے یہاں تین واسطوں کی کیا ضرورت پیش آئی اور پھر ایک ایسے شخص کا واسطہ جو اس سے نصف صدی بعد مرا ہو۔ اس سند سے وہ عقدہ کھل گیا۔

کاش طبری صاحب ہمیں یہ بتا دیتے کہ یہ حلوا کس شئے سے تیار کیا گیا تھا۔ اس میں کوئی خواب آور دوا تو شامل نہیں کی گئی تھی۔

۱۵۔ محمد بن مثنیٰ۔ ابوبکر حنفی۔ بکیر بن مسمار۔ عامر بن سعد۔ سعد۔

روایت سعدؓ: حضرت سعدؓ فرماتے ہیں جس وقت یہ آیت اتری اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ تو آپ نے علیؓ و حسنینؓ، اور فاطمہ رضی اللہ عنہم کو اپنے ملبوس میں داخل کر کے فرمایا اے رب یہی میرے اہل بیت اور اہل ہیں۔ ابن جریر ج ۱۰ صـ۶۔

مقام حیرت ہے کہ ہم نے آج تک نہ سنا اور نہ دیکھا کہ کسی شخص نے اپنے کپڑوں میں چار آدمیوں کو داخل کر لیا۔ اگر ایسی صورت پیش آجاتی تو یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوتا۔

اس روایت کا یہ جملہ کہ یہی میرے اہل بیت ہیں یعنی یہ تو ایک ڈھکوسلہ ہے کہ ازواج کو زبردستی اہل بیت بنا دیا گیا۔ ان چار کے علاوہ کوئی اہل بیت نہیں۔ نہ بیویاں، نہ بیٹیاں اور

ذان کی اولادیں۔ دیگر اعزا و اقارب کا کیا سوال۔ بقول مودودی صاحب طبری ایک محقق اور مجتہد شخص ہے۔ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہوگا چھان پھٹک کے لکھا ہوگا۔ یہ اسی چھان پھٹک کا نتیجہ ہے کہ قرآن کے مدمقابل ابن جریر مصنوعی قسم کے اہل بیت تیار کرنے اور آپ کی دوسری صاحبزادیوں کا صاف پتہ کاٹنے میں مصروف ہے اور پھر بھی ان کو سنی محققین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اہلِ سنت کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہے۔ کاش علماء سنت کچھ عقل سے کام لیں۔

علماء کی اس قسم کی تاویلات اور وہ بھی بلا تحقیق کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں کہ مورخ طبری اور ہے اور مفسر طبری اور۔ تو جناب طبرستان تو ایک بہت بڑے علاقہ کا نام ہے وہاں تو آج تک کروڑہا افراد پیدا ہو کر مر چکے ہوں گے۔ ان میں سے ہر شخص طبری کہلائے گا۔ لہٰذا بحث لفظ طبری کی نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اس تاریخ اور تفسیر کا مصنف کون ہے جو طبری کے نام سے موسوم ہے اس مصنف کا نام محمد بن جریر بن یزید طبری ہے۔ جو ۲۲۴ھ میں پیدا ہوا اور ۳۱۰ھ میں جس کا انتقال ہوا۔ تفسیری روایات میں اسے ابن جریر کے نام سے یاد کرتے ہیں اور تاریخ میں طبری کے نام سے۔ اتفاق سے ہمارے علماء اس کی تفسیر پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن جب تاریخ کی کوئی ایسی روایت ان کے سامنے آتی ہے جو ان کے اصول اور مزاج کے خلاف ہوتی ہے تو کہتے ہیں طبری دو ہیں۔ لیکن آج تک ہمیں کسی صاحب نے اس دوسرے کا کوئی اتا پتا نہیں بتایا۔ تاکہ ہم اسے تلاش کرتے کہ وہ کون تھا اور کہاں بستا تھا؟ یہ باتیں اس لیے کی جاتی ہیں کہ ہمارے علماء نے طبری کو سنی مان لیا ہے۔

اس روایت کے راوی بکیر بن مسمار کے بارے میں بخاری کہتے ہیں اس پر نظر ہے۔ بخاری یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ متہم ہو۔ یعنی اس پر وضع حدیث کا الزام ہو۔

اس کا ایک اور راوی ابوبکر الحنفی ہے۔ اس کا نام عبداللہ بن ابی سبرہ ہے جو مشہور کذاب ہے وضاع اور رافضی ہے۔ اس نے متعدد احادیث وضع کی ہیں۔

محمد بن عمار۔ اسماعیل بن ابان۔ صباح بن یحییٰ مزنی۔ سدی۔ ابو الدیلم۔ علی بن حسین۔

روایت علی بن حسین ۱۶:

علی بن الحسین یعنی زین العابدین نے ایک شامی شخص سے کہا۔ کیا تم نے سورۃ احزاب میں آیت انما یرید اللہ نہیں پڑھی ؟ تو اس نے عرض کیا۔ تو کیا وہ آپ ہی ہیں ؟ بولے ہاں۔ ابن جریر ج ۱ ص ۶۔

سدّی اس کا راوی اسمٰعیل بن عبدالرحمان بن ابی کریمۃ السدّی ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں حجت نہیں۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے ضعیف ہے۔ ذہبی کہتے ہیں اس پر تشیع کا الزام ہے۔ لیث کا قول ہے کہ کوفہ میں دو کذاب ہیں۔ سدّی اور کلبی۔ حسین بن واقد کہتے ہیں میں نے اس سدّی کو ابوبکرؓ و عمرؓ کو گالیاں دیتے سنا ہے۔

اس سند میں ایک راوی ابو الدیلم مجہول ہے اور صباح بن یحییٰ متہم ہے۔ اس کا ایک اور راوی اسمٰعیل بن ابان الغنوی ہے۔

اسمٰعیل بن ابان - یحییٰ بن معین کہتے ہیں کذاب ہے۔ امام احمد کہتے ہیں یہ موضوع روایات بیان کرتا ہے۔ بخاری کہتے ہیں۔ لوگوں نے اس کی روایت ترک کر دی ہے۔ مسلم اور نسائی کہتے ہیں متروک ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں اس نے سفیان کے نام سے متعدد احادیث وضع کیں۔

یہ تمام روایات نقل کرنے کے بعد محمد بن جریر طبری نے سبئیوں کی پشت پر پیار کا ہاتھ پھیرنے کے لیے عکرمہ تابعی مفسر کا قول نقل کیا ہے کہ عکرمہ بازاروں میں ندا کرتے پھرتے تھے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس سے مراد صرف ازواج مطہرات ہیں اور جو اس سے انکار کرے میں اس سے مباہلہ کے لیے تیار ہوں۔ اتفاق سے یہی بات حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی فرمائی ہے۔ لیکن انہوں نے تو یہ بات اہل مدینہ اور اہل مکہ وغیرہ کے سامنے فرمائی ہو گی۔ ان کو کیا معلوم کہ کوفہ کی ٹکسالوں میں کیا کیا مال تیار ہو رہا ہے۔

اہل کوفہ ابن عباسؓ اور عکرمہ کی باتیں کہاں سننے والے تھے۔ انہوں نے اپنے اس مصنوعی مال کا اتنا زبردست پروپیگنڈہ کیا کہ ہماری تفاسیر میں سے کوئی کتاب بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی۔ بعد میں آنے والوں نے قوت مقابلہ نہ پانے ہوتے شترمرغ کی طرح آنکھیں بند کرلیں۔ اور

تیسری نسل نے اس پر اکابر پرستی کا لیبل بھی لگا دیا۔

ہماری عقل سے یہ بات باہر ہے کہ جو بچے ۳ھ اور ۴ھ میں پیدا ہوئے وہ ۵ھ میں تنہا دوڑتے آ رہے ہیں۔ ہم حصہ اوّل میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت حسنؓ ۸ھ میں اور حضرت حسینؓ ۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے ۵ھ میں ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ ان روایات کی حیثیت صرف ایک ہوائی گپ کی تھی۔ لیکن روایت پرستی نے اسے عقیدے کی صورت دیدی۔ حالانکہ عقیدہ بجز قرآن اور خبر متواتر کے ثابت نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ احناف نے اپنے وہ تمام اصول چھوڑ دیے ہیں، جو مدارس میں ہمیں اصول فقہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ گویا درسی باتیں اور ہیں اور عملی باتیں اور۔ اللہم انی اعوذ بک من النفاق۔

بسلسلہ معاویہؓ ویزیدؒ

آغازِ سُخن

از:۔ عامر عثمانی مرحوم۔ مدیرِ تجلّی۔ دیوبند

ہم نے مئی ۵۸ء کے تجلّی میں "تجلّی کی ڈاک" کے تحت "حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ" کا عنوان دے کر کچھ ایسی معروضات پیش کی تھیں، جو عوام میں مقبول وشائع خیالات ومعتقدات سے میل نہیں کھاتیں۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ بہت سے لوگوں نے ہمیں برا بھلا کہا، ناراض ہوئے، صلواتیں سنائیں۔ موصول شدہ خطوط میں اگر کوئی سنجیدہ بات لائقِ توجہ ہوتی تو ہم علمی تنقیح اور جواب دہی میں ذرا تامل نہ کرتے لیکن سوائے سبّ وغصے اور تلخ کلامی کے ان میں کچھ بھی نہیں، ہمارے لیے صلواتیں اور ملامتیں کچھ نئی چیز نہیں رہ گئیں۔ جماعتِ اسلامی کے موقف کی حمایت اور بدعات کی تردید کے سلسلہ میں ہم نے سبھی کچھ سہہ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہنے والوں کو معاف فرمائے اور ہمیں ہماری نیّت کے مطابق اجر دے۔

سچ یہ ہے کہ یزید ومعاویہؓ کے سلسلہ میں عوام کے خیالات غصہ سے زیادہ نرمی اور تاؤ سے زیادہ حلم کے متقاضی ہیں۔ وہ بیچارے نہ معتد بہ علم رکھتے ہیں نہ گہری بصیرت۔ جس ماحول میں انہوں نے آنکھیں کھولیں، پلے، بڑھے، وہاں یزید کی شخصیت ایک ابلیس مجسم کی حیثیت میں متعارف تھی۔ شیعہ پروپیگنڈے سے متاثر حضرات کا یہ عالم تھا کہ آنکھیں بند کرکے یزید کے فسق وفجور پر ایمان رکھتے تھے۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ آدمی اگر پہلے سے کوئی عقیدہ دل میں لیے بیٹھا ہو یا کوئی خاص میلان ورجحان رکھتا ہو تو اس کے دل ودماغ کو وہی دلائل وشواہد زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ جو

اس کے عقیدہ و میلان کی تائید میں ہوں اور ان دلائل و شواہد کو وہ نظر انداز کر دیتا ہے۔
یا ان کی تاویل کر لیتے ہیں۔ جو اس کے عقیدہ و میلان کی تردید کر رہے ہوں یہی تمام مسائل
میں ہوتا ہے اور یہی یزید و معاویہ کے مسئلہ میں بھی ہوتا رہا۔ آج سے نہیں صدیوں
پہلے سے حضرت معاویہؓ کے غالی مخالفین کا پروپیگنڈہ اور کذب و افترا نہ صرف کم علم عوام
بلکہ پڑھے لکھے خواص کو متاثر کرتا چلا آ رہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ابتداء میں جن
لوگوں نے دَورِ خلافت اور اس کی بعد کی تاریخیں لکھیں وہ حضرت علیؓ کے نام پر بغض معاویہ
کے شکار تھے اور حضرت معاویہ کو مطعون و مبغوض ٹھہرانے کا سب سے بہتر راستہ انہیں
یہ نظر آیا کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے جس بیٹے کو خلافت کے لیے نامزد کر دیا تھا اسے جی بھر
کے مطعون و مردود اور فاسق و فاجر دکھلا دیں، اس کا قدرتی اور لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ حضرت
معاویہؓ کی دیانت، دین داری اور حق پرستی خود بخود مجروح بلکہ مذبوح ہو کر رہ جائے گی۔
چنانچہ وہ اپنی اس نفلی چال میں خوب کامیاب ہوئے اور ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ اچھے خاصے
پڑھے لکھے اہلِ سنت امیر معاویہؓ کے بارے میں سخت ناگفتہ بہ خیالات کے اسیر ہیں اور
حضرت حسین رضؓ کی مظلومیت کا پس منظر انہیں اس قدر ورغلا گیا ہے کہ ایک عظیم صحابی رضؓ کی صحابیت
بھی ان کی نظر میں کوئی وزنی شے باقی نہیں رہ گئی۔ حالانکہ اگر وہ حضرت حسین رضؓ کی مظلومیت
کو جذبات کی بجائے بصیرت و تدبیر کی عینک سے دیکھتے اور رطب و یابس سے بھری ہوئی
تاریخوں کے عوض محفوظ و مضبوط روایات پر تکیہ کرتے تو بالیقین ان پر واضح ہوتا کہ امیر معاویہؓ
ایک جلیل القدر صحابی ہونے کے علاوہ دورِ اوّل کے ان ممتاز ترین مدبرین میں سے ہیں
جن پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، جیسے معاملہ فہم، مردم شناس اور بے لاگ مدبر نے آخر عمر تک
بھروسہ کیا اور جن پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، جیسے عظیم صحابی نے مکمل اعتماد کا قولاً و
عملاً اظہار فرمایا۔ وہی تنہا گورنر ہیں کہ جب حضرت عثمان رضؓ کے خلاف فتنہ و شر کی آگ
تمام بلادِ اسلامیہ میں سلگائی جا رہی تھی، ان کے زیرِ نگیں شام میں کوئی فاسد تحریک نہیں

اٹھی اور جب مصر، کوفے اور بصرے سے باغی مدینے پہنچے تو شام کا ایک فرد بھی ان میں شامل نہیں تھا۔ ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اگر حضرت عثمانؓ حضرت معاویہؓ کے انتہائی مدبرانہ مشورے کو قبول فرما لیتے تو واقعات یوں نہ پیش آتے ہیں جس طرح پیش آئے۔

یزید سے ہمیں براہِ راست کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارا احساس تو حضرت معاویہؓ کی حرمت و آبرو کے تعلق سے تڑپ اٹھتا ہے۔ اور حضرت معاویہؓ کی حرمت و آبرو بھی ہمیں اس لیے مطلوب و محبوب نہیں ہے کہ وہ اموی تھے بلکہ اس لیے مطلوب و محبوب ہے کہ وہ صحابی تھے، کاتب وحی تھے۔ رسول اللہؐ نے ان کے تفقہ کو سراہا ہے۔ ان کے والد ابوسفیانؓ کی فتح مکہ کے موقعہ پر رسول اللہؐ نے اتنی بڑی پاسداری کی ہے کہ تاریخ اس کی نظیر نہیں لا سکتی ان کی عزت ہمارے اس عقیدے کی عزت ہے جو جملہ صحابہؓ کے بارے میں ہم رکھتے ہیں بلکہ یوں کہیے جملہ اہل سنت رکھتے ہیں۔

البتہ یزید کی جو منقبت ہے اور عظیم تعریف بخاری کی حدیث میں آتی ہے۔ اس کے باعث ہم نہ تو خود اس پر لعن طعن کر سکتے ہیں نہ ان لوگوں کو اس کا مشورہ دے سکتے ہیں۔ جو بخاری کی عظمت اور مقام سے واقف ہیں۔ بخاری وہ کتاب ہے کہ اسناد کی عمدگی اور مضبوطی کے پہلو سے تمام امت اسے قرآن کے بعد سب سے صحیح اور مستند کتاب مانتی ہے۔ اس میں جو روایت آ جائے اس کے خلاف روایات کے ہزار دفتر بھی نامعقول ہیں، جب تک کہ یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ بخاری کی سند کمزور اور مخالف روایات کی اسناد مضبوط ہیں۔ یزید و معاویہؓ کے بارے میں جو کتب تاریخ ماخذ اور اساس کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی روایات، کا بخاری کے مقابلہ میں مضبوط ہونا تو کجا وہ تو اہلِ علم کے نزدیک اس قابل بھی نہیں کہ روایاتِ محدثین کی کسی بھی صف میں انہیں جگہ دی جائے پھر یہ کون صاحبِ ایمان و دیانت آسانی سے مان لے گا کہ بخاری میں تو اللہ کے سچے اور برگزیدہ رسول فداہ امی و ابی حضرت امیر معاویہؓ اور یزید کے جنتی ہونے کی خبر دیں اور غلامانِ رسولؐ کے لیے یہ جائز ہو کہ ضعیف و موضوع روایات کے سہارے اور کذب و

افترا پر مشتمل پروپیگنڈے سے مغلوب و متاثر ہو کر یزید کی شیطنت کا ڈھنڈورا پیٹیں، اسے جہنمی قرار دیں۔ اور کبھی ڈھکے چھپے، کبھی کھلم کھلا حضرت معاویہؓ پر چھینٹے اڑائیں، ان کی دینداری کو مجروح کریں، انہیں دشمنِ رسول باور کرائیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اول جیش من امتی یغزون البحر

قد اوجبوا۔

میری امت کے اس پہلے گروہ نے اپنے لیے جنت واجب کر لی جس نے بحری جنگ لڑی۔

تاریخ ناقابل تردید طور پر شاہد ہے کہ اسلام میں سب سے پہلی بحری جنگ حضرت معاویہؓ نے لڑی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، بحری جنگ لڑنے کی اجازت نہیں دیتے تھے حتیٰ کہ اس کی اجازت طلبی پر انہوں نے حضرت معاویہ کو سخت جواب بھی دیا جس کے بعد انہیں اصرار کی جرأت نہ ہو سکی، اس کے بعد حضرت عثمانؓ کا دور آیا تو انہوں نے اجازت دے دی اور حضرت معاویہؓ نے بحر روم کے مشہور جزیرے قبرص پر حملہ کر کے فتح حاصل کی۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودے پر ہماری جانیں قربان۔ وہ مسلمان ہی کب ہو سکتا ہے جو قولِ رسولؐ پر کامل بھروسہ نہ کرے۔ ذرا دیکھیے اسی حدیث میں ایک ایسی پیشین گوئی بھی ہے کہ جو پوری ہو چکی۔ اس حدیث کی راویہ حضرت امِ حرام رضی اللہ عنہا ہیں۔ وہ فرماتی ہیں۔

قلت یا رسول اللہ انا فیھم

قال انت فیھم

میں نے پوچھا یا رسول اللہ کیا ہم بھی اس میں (پہلے بحری لشکر میں) ہوں گے۔ حضورؐ نے فرمایا، ہاں تم بھی اس میں ہو گی اور تاریخ گواہ ہے کہ قبرص پر حملہ کرنے والے لشکر میں امِ حرامؓ بنت ملحان اور ان کے شوہر عبادہ بن صامتؓ شامل تھے۔ پھر ساحل قبرص پر انہ نے

کے بعد ان کا گھوڑا بدکا جس سے گر پڑیں اور مر گئیں، ان کے اسی طرح مرنے کی پیشین گوئی بھی کتب احادیث میں موجود ہیں۔

اب آگے چلیئے۔ یہی ام حرام رض کہتی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا:۔

اوّل جیش من امتی یغزون مدینہ
قیصر مغفور لہم نقلت
انا فیہم یا رسول اللہ
قال لا۔

میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو شہر قیصر (مملکت روم پر) حملہ کرے گا اس کی مغفرت مقدر ہو چکی ہے۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ کیا ہم بھی اس میں ہوں گے۔ حضور نے جواب دیا نہیں۔

اور تاریخ شاہد ہے کہ قسطنطنیہ پر حملہ آور ہونے والی پہلی مسلمان فوج وہی ہے جو یزید کی سرکردگی میں مصروف جہاد ہوئی تھی۔ اس میں ابن عمرؓ ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ ابوایوب انصاری اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ شریک تھے۔ جب استاذ المکرم حضرت مولانا حسین احمد مدنی طاب اللہ ثراہ کے درس بخاری میں یہ حدیث ہمارے سامنے آئی تو حقیقت میں ہم بھی انہی لوگوں میں تھے جو یزید کو ایک مجسم شیطان کی حیثیت سے جانتے تھے۔ لیکن اس وقت ہم کانپ اٹھے، لرز گئے نعوذ باللہ من ذالک جس شخص کے جنتی ہونے کی سردار دوجہاں صادق و مصدوق محبوب سبحانی خاتم النبیین الف الف مرۃ علیہ الصلوٰۃ والسلام خبر دیں۔ اسے ہم ملعون و مردود سمجھیں، حالانکہ ہماری آنکھوں نے اس کا کوئی فسق و فجور نہ دیکھا ہو، ہم نے توتوبہ کی اور اسی دن سے کتب تاریخ پر سراہ راست نظر ڈالنے کا تہیہ کیا۔ چنانچہ قدماء کی جتنی بھی کتابیں ہمیں میسر آسکیں۔ ان میں یزید و معاویہ کے حالات پڑھے، جو عبارت سمجھ میں نہ آئی، استادوں سے سمجھی جتنی روایتوں

کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی تھی ان کے راویوں کی تحقیق کے لیے اسماء الرجال کی کتابیں چھانیں حال یہ کھلا کہ حضرت معاویہؓ پر حرف لانے والی روایات کے راویوں کا تو ایک بھی سلسلہ سند ایسا نہیں ہے جس میں کوئی شیعی یا متروک یا مجہول راوی شامل نہ ہو اور یزید کو ملعون باور کرانے والی روایات میں ایک بھی سلسلہ سند ایسا نہیں ہے جو فن روایت کے معیار پر کھرا اتر سکے، زیادہ تر تو ایسے راوی ان اسناد میں ملتے ہیں جنہیں اسماء الرجال کی کتابوں میں کذاب، مفتری، وضاع مدلس وغیرہ بتایا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن روایات سے حضرت معاویہؓ کی ایمانداری اور یزید کی اعتراض سے بالاتر علمی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے بعض تو سند کے پہلو سے بخاری و مسلم کی ٹکر کی ہیں۔ بعض ان سے ہلکی ہیں۔ مگر مردود و متروک نہیں اور کم سے کم متقابل روایات کی اسناد سے بمراتب اعلیٰ ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہماری یہ خلش بھی دور ہوگئی کہ یزید کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی کیوں بتایا۔ اس زمانے میں ہم مضمون نہیں لکھتے تھے۔ نہ تجلی نکالتے تھے۔ پھر بھی فل اسکیپ کے تقریباً چالیس صفحوں کا ایک مضمون لکھا اور صاف کیا ہوا مسودہ یاد نہیں کس رسالے میں بھیجا، وہ شائع نہیں کیا گیا۔ اصل مسودہ اب بھی شاید پرانی چیزوں میں کہیں پڑا ہو۔

مسلمان بیچاروں کی غلط فہمیاں جہل و نادانی کی کن گھاٹیوں تک ٹھوکریں کھانے جا رہی ہیں۔ اس کا اندازہ اس عبارت سے کیجئے جو ایک دوست نے خط میں نقل کر کے بھیجی ہے اور جو حیدر آباد کے ایک پرچے کی تازہ اشاعت میں چھپی ہے۔

" یزید ایک چیچک رو اور نہایت ہی بدشکل نوجوان تھا جس کو حکومت کے کاموں کے بجائے کتوں، بندروں، عورتوں، شراب اور گانے سے بے حد دلچسپی تھی۔ یزید نے چونکہ امیر معاویہ رضؓ کے دورِ امارت میں آنکھ کھولی تھی۔ شہزادگی کی زندگی بسر کی تھی اس لیے جوان ہوتے ہی وہ عشرت پسندی کا شکار ہوگیا، وہ ہر وقت شراب کے نشے میں بدمست

رہتا ہے۔ اس کی کوئی مجلس شراب و کباب کے ذکر خیر سے خالی نہ ہوتی تھی۔

انتہا یہ کہ حرمین شریفین میں بھی شراب ساتھ رہتی تھی۔ نشہ میں آیاتِ قرآنی کے استخفاف سے بھی باز نہ رہتا تھا۔ زمانہ حج میں شراب پینے سے باز نہ رہتا تھا۔ سوتیلی ماؤں اور بہوؤں اور بھتیجیوں تک سے نکاح جائز سمجھتا تھا یزید کی انتہائی معصیت شعاری کا یہ عالم تھا کہ اس نے (نعوذ باللہ) ام المومنین حضرت عائشہؓ تک کو نکاح کا پیغام بھجوایا۔ نماز روزے سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ لہو و لعب میں ہر وقت مصروف رہتا تھا۔"

یہ ایک ایسے رسالے کے مضمون کی عبارت ہے جو اہلِ سنت ہونے کا مدعی ہے اور حدیث پر ایمان رکھتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس عبارت میں جو کچھ کہا گیا وہ اس حسن نیت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یزید کو جتنا مردود ثابت کریں گے حضرت حسینؓ کی مظلومیت و عظمت اتنی ہی فزوں ہو گی۔ اور لکھنے والے کو یقین ہو گا کہ وہ سچ ہی لکھ رہا ہے۔ لیکن اس کو کیا کہیئے کہ جس حسنِ نیت اور یقین کی بنیاد جہالت، کند ذہنی اور بے خبری پر ہو اس سے سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں نکل سکتا۔ عالمگیرؒ پر ظلم و شقاوت کے جو الزامات بعض متعصب مورخین نے لگائے ہیں وہ شاید کذب و افترا کا ایسا گھناؤنا پلندہ نہ ہوں۔ جتنا یزید پر لگائے ہوئے الزامات کا یہ پلندہ ہے۔ اسے چھوڑیے کہ یہ صد فیصد من گھڑت باتیں کہاں سے آئیں اور اچھے خاصے سمجھداروں کی عقل پر پتھر کیسے پڑے، اسے دیکھئے کہ یزید کو ایسا ہی بدکار اور لعین مان لینے کے بعد اُن حضرت معاویہ رضؓ کی دیانتداری، حق پسندی شرافت اور عظمت صحابیت کا کیا حشر ہوتا ہے۔ جنہوں نے یزید کو خلیفہ نامزد کیا تھا۔ اور ان بے شمار صحابہ رضؓ کی حق کوشی کس درجہ میں لائق اعتبار رہ جاتی ہے۔ جنہوں نے اس نامزدگی کو خلاف شرع نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ جب یزید خلیفہ ہو گیا تو اس کی بیعت کی اور ان عالی مقام صحابہ رضؓ کے ہوش و حواس کہاں تک سالم نظر آتے ہیں جنہوں نے یزید کی

سرکردگی میں جہاد کیا۔ یزید کی امامت میں نمازیں پڑھیں، یزید کے ہدیئے اور وظیفے قبول کیے۔

سوچیے ایک حضرت حسین رضؓ کی مظلومیت و حق پسندی میں چار چاند لگانے کے لیے بھولے لوگ کس مقدس گروہ کی حرمت و ناموس کے بخیئے ادھیڑ رہے ہیں۔ آپ سنجیدگی سے غور کریں گے تو محض ایک ہی جواب ملے گا کہ یہ مکروہ عمل صرف ان لوگوں کا ہو سکتا ہے جو تنہا علی کرم اللہ وجہٗ اور خاندانِ ہاشمی ہی کو عظمت و تقدس کے تمام اختیارات عطا کر کے باقی صحابہ رضؓ سے ان کی عظمتیں چھین لینا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے طرح طرح کے پرفریب حربے استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے مشن میں کامیابی اس لیے ہوئی کہ عوام جاہل تھے۔ اور خواص کے اکثر افراد واقعات کربلا کے پیدا کردہ جذبات کی طوفانی رو میں قوت نقد و نظر کھو بیٹھے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ جب جذبات کے بادل گھر آتے ہیں تو عقل و علم اور فکر و نظر کے نجوم چھپ جاتے ہیں۔ حالانکہ جذبات اگر غلبہ نہ پا لیتے تو یہ سمجھنے میں کسی بڑی ذہانت کی ضرورت نہ تھی کہ مظلومیت حسین رضؓ یزید کی ملعونیت اور حضرت معاویہؓ کی تخفیف پر منحصر نہیں ہے۔ وہ تو ایسے مظلوم تھے کہ یزید کو متہم کیے بغیر بھی انہیں مظلوم کہا جا سکتا تھا۔

بعض دوستوں نے لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضؓ والا جواب پڑھ کر کئی لوگ آپ سے بدظن ہو گئے ہیں اور تجلّی سے نفرت کرنے لگے ہیں ہم اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دے سکتے کہ جس بات کو ہم حق سمجھتے ہیں اس کے بیان کرنے میں ہمیں کسی کی بدظنی اور نفرت کی ثمہ برابر پروا نہیں ہے۔ ہاں متین علمی دلائل سے اگر ہم پر ہماری معروضات کی غلطی واضح کی جائے تو یقیناً ہم پوری توجہ دیں گے یا تو معترض کا رد کریں گے یا اپنا قصور مان لیں گے یہ کیا کہ فاسد ذرائع اور ناقص روایات اور بے بنیاد افواہوں اور سنی سنائی باتوں کے سہارے جن لوگوں نے غلط فہمیوں کو سینے سے

لگا رکھا ہے انہیں اس پر بھی غصہ آئے کہ ایک شخص علمی و عقلی دلائل سے ان غلط فہمیوں کا پردہ چاک کر رہا ہے۔ ہم نے تو صرف اجمال اور اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ذرا محمود احمد عباسی صاحب کا الحسین پر تبصرہ پڑھ کر دیکھئے جب حال کھلے گا کہ سچائی اور حقیقت کذب و دروغ اور خرافات و ہفوات کے کس فلک بوس انبار میں دبی پڑی ہے۔ خدا جانے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یزید کو گالیاں دے کر خواہ مخواہ اپنے سر ایسی ذمہ داری لیتے ہیں۔ جس کا کوئی حقیقی فائدہ متصور نہیں۔ اور خدا جانے ان اہلِ علم پر کیا افتاد پڑی ہے جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ خلافت یزید اور بیعت یزید کے معاملہ میں کتنے ہی ممتاز صحابہؓ کا بھی ایک نقطہ نظر ہے اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ گویا حضرت حسینؓ کے مقابلہ میں کسی بڑے سے بڑے صحابی حتیٰ کہ ام المومنین حضرت عائشہ تک کی رفعت و مرتبت کسی ادنیٰ رعایت و لحاظ کی مستحق نہیں ہے اللہ تعالیٰ حضرت حسینؓ اور حضرت معاویہؓ اور جملہ صحابہ اکرام پر رحمت فرمائے وہ سب اتنے اونچے، اتنے مقدس اور اتنے معظم تھے کہ ان میں سے کسی بھی ایک کو خائن و بدکار کہنے یا ثابت کرنے والا عذاب نار سے نہیں بچ سکتا۔ یزید کیسا تھا کیسا نہیں اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اگر ہم یہ نہ دیکھتے کہ حبِ حسینؓ اور بغض یزید کی آڑ لے کر قولِ رسولؐ کی تکذیب کی جارہی ہے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کے دامن حرمت کو داغدار دکھانا مقصود ہے۔ صحابہ سب کے سب بالفاظِ حدیث "نجوم" کی مانند ہیں۔ ان کے ناموس کی جائز حمایت میں بہ توفیق ایزدی ہم صلواتوں اور بدگمانیوں سے بھی کچھ زیادہ سہہ جانے کو اپنے لیے فلاح و نجات کا موجب سمجھتے ہیں۔ ہمارا اٹل عقیدہ ہے کہ صحابہ کی دینی عظمت کو نظر انداز کر کے دین و ایمان میں کچھ نہیں رہ جاتا۔ کاش سادہ دل عوام اور جذبات زدہ خواص اسے سمجھیں۔

یہاں ہمارے اس نقطے نظر کو نہ بھولنا چاہیئے جسے ہم پہلے کئی بار مختلف پیرایوں میں بیان کرتے آئے ہیں تاکہ "حمایت" کے لفظ سے غلط فہمی نہ ہو۔ ہمارے نزدیک

اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ضرورت پڑنے پر ایک شخص حضرت معاویہؓ یا حضرت علیؓ یا حضرت حسین رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے بھی سیاسی مسلک یا انتظامی صوابدید یا حاکمانہ اقدامات پر ان کی رفعت شان کا لحاظ رکھتے ہوئے اس پہلو سے گفتگو کرے کہ آیا وہ تدبیر و تدبر کے زاویۂ نظر سے مناسب و مفید تھے یا غیر مفید اور مرجوح۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی موقعہ پر کوئی ایسا اقدام کر گزرا ہو جو فکر و تدبر کی کسوٹی پر پوری طرح کھرا نہ اترے اور اس کے نتائج نفع سے زیادہ نقصان کے حامل رہے ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے دامن پر کبھی دانستہ یا نادانستہ معصیت کے چھینٹے پڑ گئے ہوں، کیونکہ وہ انبیاء کی طرح معصوم نہ تھے۔ ان کے گرد آسمانی نگہداشت کا وہ حصار نہ تھا۔ جو انبیاء کے گرد ہوا کرتا ہے۔ ان سے فکر و تدبر، اجتہاد و استنباط اور فیصلہ و اقدام میں غلطیاں بھی ہوسکتی تھیں۔ وہ فوری جذبے کی رو میں ایک دوسرے پر زیادتی بھی کر سکتے تھے۔

لیکن اگر کوئی شخص ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کرے گا جن سے یہ ظاہر ہو کہ وہ نفسانی خواہشات یا حرصِ مال و جاہ کے تحت دین کے واضح اصول احکام کو پامال کر گزرے تھے یا کھلم کھلا کبائر کے مرتکب ہو جاتے ہیں یا انہوں نے دین کو دنیاوی مفادات کا آلہ کار بنا لیا تھا یا وہ دیدہ و دانستہ فتنہ برپا کرنے والے تھے تو ہم اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ انہوں نے جب بھی جو قدم اٹھایا یہی سمجھتے ہوئے اٹھایا کہ یہ احکام شرعی کے خلاف نہیں ہے ان کی سیاست ملک و ملت کی بہی خواہی اور امت مسلمہ کی فلاح پر ہی مبنی رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض حالتوں میں قوتِ فکریہ سے چوک ہوگئی ہو یا اچانک پیش آجانے والے حالات نے ان کی تدابیر کی افادیت ختم کر دی ہو۔

یزید کو اگر ہم فاسق و فاجر مانتے ہیں تو لازماً یہ بھی ماننا ہوگا کہ حضرت معاویہؓ نے اسے خلافت کے لیے نامزد کر کے دیدہ و دانستہ ایک عظیم و کبیرہ گناہ کیا۔ اور یہ گناہ وقتی و ہنگامی نہیں تھا بلکہ وہ مرتے دم تک عزم کے ساتھ اس پر جمے رہے۔ یہ ایسی

مگر وہ دنیاداری ہے کہ صحابیت کی شان سے بالکل جوڑ نہیں کھاتی اور ایک معاویہ رضؓ کیا، ان تمام رفیع الشان صحابہ رضؓ کو پنا ؛ بخدا بے حمیت، بزدل، بےحس اور حمایت دین کے جذبے سے عاری ماننا پڑے گا۔ جنہوں نے ایک فاسق و فاجر کی نامزدگی پر کوئی واویلا نہیں کیا بلکہ اسے ایک ایسی شے جانا جس میں کوئی حرج نہیں تھا اور وقت آنے پر اس طرح بیعت کر گزرے جس طرح ایک مستحق خلیفہ کی جاتی ہے۔

اے لوگو! ہوش کے ناخن لو۔ حضرت سیدنا حسین کی سستی حمایت اور ظالموں کی بھگانہ نفرت کے چکر میں یہ نہیں سمجھ رہے ہو کہ ماتم حسین رضؓ کی نمائش اور فسق یزید کا پروپیگنڈہ دراصل ایک نقب ہے۔ عظمت صحابہ کی دیواریں جس کی راہ سے صحابہ رضؓ کا ناموس و آبرو لوٹنے اور لٹوانے کی مساعی صدیوں سے جاری ہیں۔ یزید اگر فرض کرو عاصی و گمراہ تھا اسے اپنی آگ میں جلنے دو۔ تم لعنتوں اور صلواتوں سے اس کی تواضع نہیں کرو گے تو دوزخ کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو جائے گی۔ اور حضرت معاویہ رضؓ نے اگر اسے خلیفہ بنا کر واقعی کوئی معصیت کی تھی تو ان سے اللہ نمٹ لے گا۔ ظاہر ہے کہ اللہ کو انصاف کرنے کے لیے تمہاری راہ نمائی کی احتیاج نہیں ہے۔ تم یزید و معاویہ رضؓ کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالتیں مت سجاؤ بلکہ اپنی گردنوں پر مسلط موجودہ حاکموں کو دیکھو کہ وہ کس بے تکلفی سے تمہاری ناکوں میں نکیلیں ڈالے گناہ و طغیان اور ہوا و ہوس کی دلدلوں میں ہنکائے لئے چلے جا رہے ہیں۔ تمہاری غیرت دینی اور حمیت حق اگر ایسی ہی ذکی الحس ہے کہ تیرہ سو برس پہلے کے ظالموں کو گالیاں دیے اور مظلوموں کے غم میں سینہ پیٹے بغیر تم کو چین نہیں آتا تو ان شیاطین کے بارے میں برف کیوں ہو گئے جو فسق و فجور کی سیاہی سے تمہارا منہ کالا کر رہے ہیں۔ جو گمراہی و ضلالت کی گھاٹیوں میں تمہیں غلاموں کی طرح ہنکارتے چلے جا رہے ہیں۔ مُردوں کے لیے تو محشر کیف اور زندوں کے لیے کچھ نہیں ماضی پر تو خورد بینی نظر اور حال کے لیے اتنا کور چشم کو سامنے کا پتھر بھی دکھائی نہیں

دیتا۔ حسین کے غم میں آنسو تو بہالوگے۔ ان کی پیروی میں سر نہیں کٹاؤ گے۔ اور سر کٹانا تو کجا اتنا بھی احساس نہیں کرو گے کہ جس مقصد کے لیے حسین نے جان دی تھی۔ وہ مقصد آج بھی تمہیں پکار رہا ہے۔ بہرے، بے حس، نادان، بہروپیے۔ کاش تم سوچتے کہ یزید بیچارہ آج کے ان ابوجہلوں، ابولہبوں اور ابن ابیوں کی کیا برابری کرے گا۔ جو علم و فن کے ہتھیاروں سے لیس تمہاری غیرت کو للکار رہے ہیں۔ تمہارے سینوں پر مونگ دل رہے ہیں۔

ہمت ہے تو ان کی للکار کا جواب دو۔ ان سے آنکھیں ملاؤ۔ مگر مچھ کے آنسوؤں سے ظلم و طغیان کے پہاڑ نہیں بہیں گے۔ اور یزید و معاویہ پر دانت کٹکٹانے سے شہدائے کربلا کا بدلہ نہیں چک جائے گا۔ اللہ تمہیں نیک توفیق دے اور عقلِ سلیم عطا فرمائے۔

تجلی۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء

عشق یزید کا ایک دلچسپ افسانہ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور یزید بن معاویہؓ کے مابین ذاتی اور خاندانی بغض و عداوت ثابت کرنے کے لیے جہاں ہزار ہا قسم کی کہانیاں وضع کی گئیں، وہاں اس ایک افسانہ کو بھی خاص فروغ حاصل ہوا ہے۔ بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے درمیان بغض و عداوت کی اصل وجہ یہی تھی اس واقعہ کی تفصیل "الامامۃ والسیاسۃ" میں بیان کی گئی ہے۔ یہاں سے اور کہانی نویسوں نے اسے نقل کر کے اس طرح مشہور کیا، گویا یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

یہ کہانی آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوئی اور افسانوں کے مجموعات میں علامہ احمد شبلی جیسوں نے اسے نقل کر کے سرزمین عرب کا ایک دلچسپ واقعہ بنا دیا ہے حالانکہ از اوّل تا آخر یہ افسانہ نہ صرف غلط بلکہ ایک صریح جھوٹ اور سراپا بہتان ہے۔

کہانی یہ ہے کہ امیر یزید اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں جب حج کے لیے گئے تو وہاں ایک پری چہرہ حسین دوشیزہ کو دیکھ کر عقل و ہوش کھو بیٹھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس پری چہرہ کا نام ارنیب بنت اسحاق ہے اور وہ اپنے ابن عم عبداللہ بن سلام کے نکاح میں ہیں جو ایک قریشی نوجوان تھے اور عراق کے والی تھے۔

یزید بن معاویہ اس عشق کے ہاتھوں ایسے از خود رفتہ ہوئے کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے باپ سے بھی کبیدہ خاطر ہو گئے کہ ہر طرح کی دلداری کے باوجود انہوں نے اپنے فرزند کو "ارنیب جیسی بے مثال عورت کی زوجیت سے محروم رکھا۔

حضرت امیر معاویہؓ کو جب اس صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے فرزند کے لیے ترکیبیں لڑانی شروع کیں۔ والی عراق عبداللہ بن سلام کو اپنے پاس دمشق بلایا اور نہایت تزک و احتشام

کے ساتھ ان کا استقبال کر کے اپنا مہمان بنایا۔

سیدنا ابوالدرداءؓ اور سیدنا ابوہریرہؓ بھی اس وقت دمشق میں موجود تھے۔ انہیں طلب فرما کر عبداللہ بن سلام کو اپنا داماد بنانے کے بارے میں مشورہ لیا۔ دونوں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ بلکہ امیر المومنین حضرت امیر معاویہؓ کے اشارے پر ان دونوں نے یہ بات عبداللہ بن سلام تک بھی پہنچا دی۔

ادھر امیر المومنین نے اپنی دختر سے فرمایا کہ ابوالدرداءؓ اور ابوہریرہؓ تمہارے پاس عبداللہ بن سلام کا پیغام لے کر آئیں گے تم کہنا اول ارنیب کو طلاق دے دیں۔ اس کے بعد میں نکاح پر تیار ہو سکتی ہوں۔

عبداللہ اس چال میں پھنس گئے اور اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ امیر معاویہؓ کی بیٹی نے کچھ دن ٹال مٹول کیا اور بالآخر نکاح سے انکار کر دیا۔

ارنیب کی جب عدت پوری ہوئی تو امیر معاویہؓ نے عبداللہ بن سلام کے پاس اپنے ولی عہد کا پیغام لے کر انھی سیدنا ابوالدرداءؓ کو بھیجا۔ اتفاق سے اس وقت حضرت حسینؓ بھی عراق میں موجود تھے۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے سوچا اوّل نواسہ رسول سے ملاقات کر لیں۔ دوران گفتگو حضرت ابوالدرداءؓ نے اپنے عراق آنے کی وجہ حضرت حسینؓ سے بیان کی۔

حضرت حسینؓ نے یہ سن کر فرمایا، میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آپ جیسے بزرگ کے ذریعہ اپنا پیغام بھیجوں۔ لہٰذا آپ میرا پیغام بھی پہنچا دیجیے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ارنیب نے کہا آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ ہی مشورہ دیجیے کہ میں ان میں سے کسے قبول کروں۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے جواب دیا کہ تم حسین بن علیؓ کو قبول کر لو۔ تاکہ ان ہونٹوں پر ہونٹ رکھ سکو جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چوما کرتے تھے۔ چنانچہ یہ نکاح ہو گیا۔

حضرت امیر معاویہؓ اس بات پر بہت خفا ہوتے کہ کیا کرنے بھیجا تھا اور کیا کر دیا۔ دونوں بزرگوں سے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ اور وظیفہ بند کر دیا۔ تاآنکہ حضرت ابوالدرداءؓ اور

حضرت ابوہریرہؓ بد دل ہو کر مدینہ چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔

اُدھر عبداللہ بن سلام حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے کس آفت میں پھنس گئے۔ تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بیوی الگ چھوٹی۔ امیرالمومنین کی دامادی کا جو خواب دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر الٹ ہو گئی۔ رنج و افسردگی کا اتنا غلبہ ہوا کہ بیمار پڑ گئے۔ کچھ عرصہ بعد خیال آیا کہ جواہرات کا ایک تھیلا اریب کے ساتھ چلا گیا۔ کم از کم اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

چنانچہ حضرت حسینؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ مال تمہارا ہے۔ اپنے آپ جا کر لے لو۔ پردہ کرا یا گیا اور دونوں اریب کے پاس ملول و غمزدہ بیٹھ گئے۔

اریب نے تھیلا نکال کر دے دیا اور روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ یہی حال عبداللہ کا تھا۔ حضرت حسینؓ نے فرمایا میں نے یہ سب کارروائی معاویہؓ کے مکر کے جواب میں کی تھی۔ جس کا تم شکار ہو گئے۔ میں اریب کو طلاق دیتا ہوں۔ میں نے یہ نکاح ہی اس لیے کیا تھا کہ تم دونوں کو پھر یکجا کر دوں۔

آل انڈیا ریڈیو سے جو جاہل شخص یہ داستان نشر کر رہا تھا وہ آل انڈیا ریڈیو کی نگاہ ہی میں نہیں بلکہ اپنے مخصوص گروہ اور اپنی پارٹی میں بڑا ہی معتبر ہو گا۔ جو قوم تک یہ معلومات بہم پہنچانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ نکاح و طلاق کے مسائل سے یہ شخص اتنا کورا تھا کہ اپنی دانست میں حضرت حسینؓ کی رفعت اور ان کی پاک دامنی ثابت کرنے کے لیے اتنا اور اضافہ کر دیا کہ میں نے اب تک اریب کو مثل اپنی بہن کے رکھا ہے۔ تم نکاح سے کچھ اور خیال نہ کرنا۔

یہ واقعہ حکیم علی احمد عباسی نے اپنی کتاب "امیر معاویہ کی سیاسی زندگی" میں نقل کر کے اس کا رد کیا ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مقدمہ مولوی احتشام الحق صاحب تھانوی نے لکھا تھا۔

حکیم علی احمد عباسی اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

۱۔ امیرالمومنین حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں عبداللہ بن سلام نام کا کوئی

عراق کا حاکم نہیں رہا ہے۔ نہ صرف عراق کا بلکہ کسی دوسری جگہ کے امراء میں بھی یہ نام نہیں ملتا۔

۲۔ عرب کی جو خواتین حسن و جمال میں مشہور تھیں۔ ان کے احوال محفوظ ہیں۔ لیکن ان میں ارینب بنت اسحاق نامی کسی خاتون کا تذکرہ کم از کم راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔

۳۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ عہدِ عثمانی میں دمشق کے قاضی تھے اور ۳۱ھ یا ۳۲ھ میں عہدِ عثمانی میں وفات پا گئے۔ اس وقت امیر معاویہؓ نہ امیر المومنین تھے اور نہ یزید کی ولی عہدی کا کوئی فیصلہ ہوا تھا اور ہوتا بھی آخر کیسے؟ یزید کی عمر اس وقت بمشکل ایک یا دو سال کی تھی۔ کیونکہ تحقیق کے مطابق اس کی پیدائش ۳۰ھ ہے۔

(اگرچہ ایک قول ۲۵ھ کا ہے۔ لیکن اس کے لحاظ سے بھی عمر چھ سات سال بنتی ہے اور ولی عہدی کا فیصلہ ۵۰ھ کے بعد ہوا تھا۔)

۴۔ کسی مطلقہ سے انسان اس لیے نکاح کرے کہ اسے طلاق دے کر زوج اوّل کے لیے حلال کرے۔ تو یہ شخص اللہ، رسول اور تمام فقہاء و ائمہ کے نزدیک ملعون ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ سیدنا حسینؓ جیسی ہستی سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہو اور پھر اس کی طرح رکھنے کا کیا مطلب ہے؟

اس جاہل شخص کو یہ بھی نہیں معلوم کہ نکاح کے لغوی معنی جماع کے ہیں۔ جب تک خلوت صحیحہ نہ ہو نکاح کی غایت پوری نہیں ہوتی۔ اگر یہ ناکح ثانی محض اپنی مرضی سے اور پہلے سے سوچے ہوئے کسی منصوبے کے بغیر طلاق دے دے۔ تب البتہ زوجہ اوّل کو اپنا پیغام بھیجنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا صریح حکم ہے۔

حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ۔ — جب تک دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے۔

البقرہ۔ ۲۳۰

امام ابن القیم رحمۃ اللہ نے "اغاثۃ اللہفان فی مکائد الشیطان" میں اس موضوع پر مبسوط تبصرہ فرمایا ہے اور متعدد ارشادات نبویہ کے علاوہ اکابر صحابہ و تابعین اور جمہور اہل علم کا مذہب یہی بتایا ہے۔ منجملہ ازاں یہ حدیث ہے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیا کہ آپ نے اس شخص پر لعنت کی ہے جو کسی مطلقہ بیوی کو اس کے لیے حلال کرے اور اس پر لعنت کی ہے جس کے لیے حلال کی گئی۔ مسند احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔

نسائی اور مسند احمد میں یہ روایت ان الفاظ میں مروی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں پر لعنت کی ہے (۱) جو عورت بدن گودے یا جس عورت کا بدن گودا جائے (۲) انسانی بال کسی کے بالوں میں ملا کر چوٹی بڑھانے والی عورت اور وہ عورت جس کی چوٹی بڑھائی گئی ہو (۳) وہ شخص جو دوسرے کی بیوی کو اس کے لیے حلال کرنے کی نیت سے ایک مطلقہ سے نکاح کرے اور وہ شخص جس کی مطلقہ کو اس کے لیے حلال کرنے کی غرض سے یہ نکاح کیا گیا ہو (۴) سود کھانے والا اور سود کھلانے والا۔

مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو" اغاثۃ اللہفان فی مکائد الشیطان" جس میں امام ابن القیم رحمۃ اللہ نے بہت شافی بحث کی ہے۔ اللہ اس شخص کا منہ کالا کرے۔ جس نے سیدنا حسینؓ، سیدنا ابوالدرداؓ۔ سیدنا ابوہریرہؓ اور سیدنا معاویہؓ جیسے آئمہ ہدی پر یہ مکروہ جھوٹ بولے ہیں۔ اور اللہ ان لوگوں کو ہدایت دے جو اس قسم کی رکیک اور بے سرو پا روایتیں نمک مرچ لگا کر بیان کرتے ہیں اور شیطان کا کھلونا بنے ہوتے ہیں۔

اس واقعہ کی تردید میں یہ تو حکیم علی احمد عباسی کے فرمودات تھے۔ مزید چند اور نقائص ہمارے ذہن میں بھی موجود ہیں جو ہم پیش کر دیتے ہیں۔

۱۔ روایت میں یہ کہیں نہیں پایا جاتا کہ عبداللہ بن سلام نے ارینب کو کتنی طلاقیں دی تھیں۔ بلکہ صرف زبردستی یہ فرض کر لیا گیا کہ تین طلاقیں دی تھیں، کیونکہ ایشیا میں اس کا رواج ہے۔ لیکن اسلام نے تین طلاقیں ایک ساتھ دینے سے منع کیا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ دور صحابہ میں مسلمانوں سے خلاف شرع حرکت سرزد ہو اور دیگر لوگ اس پر سکوت اختیار کریں۔

۲۔ اگر ایک طلاق دی جائے اور خاوند رجوع نہ کرے حتیٰ کہ عدت پوری ہو جائے تو یہ خاوند

بغیر حلالہ کے اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔

۳۔ اگر ارینب کو تین طلاقیں دی گئی تھیں، اور حضرت حسینؓ نے اسے بہن کی طرح رکھا تو ارینب ہرگز پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہو سکتی، لہٰذا اس نکاح سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

۴۔ حضرت حسینؓ کی بیویوں میں ارینب نام کی کوئی عورت نہیں پائی جاتی۔

۵۔ بقول راوی حضرت حسینؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کی مکاری کے جواب میں یہ مکاری کھیلی تھی یعنی عیاذاً باللہ دونوں مکار ہوئے۔

۶۔ اسلام میں اگر ایک شخص کسی عورت کو پیغام نکاح دیتا ہے تو تا وقتیکہ وہاں سے انکار نہ ہو جائے دوسرے کے لیے پیغام دینا جائز نہیں۔ جب حضرت امیر معاویہؓ نے یزید کا پیغام نکاح دیا تو حضرت حسینؓ کے لیے یہ پیغام دینا ہی جائز نہ تھا اور پھر اس کے لیے استعمال بھی حضرت ابوالدرداءؓ جیسے فقیہ صحابی کو کیا گیا۔ کیا وہ اتنا بھی علم نہ رکھتے تھے؟

۷۔ عبداللہ بن سلام نامی کوئی قریشی شخص نہ تھا، بلکہ کوئی عربی النسل تک نہ تھا۔ ہاں ایک یہودی عالم عبداللہ بن سلام نامی ضرور تھے، جو ہجرت مدینہ کے بعد اسلام لائے، لیکن وہ کسی جگہ کے عامل نہیں رہے

۸۔ ارینب کے باپ کا نام اسحاق بیان کیا گیا ہے۔ اسلام سے قبل عرب میں اس نام کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ نام اسلام کے بعد شروع ہوا۔ اسی لیے کسی صحابی کا نام اسحٰق نہیں پایا جاتا۔ یہ ارینب بنت اسحاق کہاں سے ٹپک پڑی؟

۹۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ امیر معاویہؓ نے یزید کا پیغام عبداللہ بن سلام کے پاس بھجوایا۔ ان کے پاس پیغام بھجوانے کا کیا مقصد؟ وہ تو پہلے خاوند تھے جنہوں نے طلاق دیدی تھی۔ وہ اس وقت کوئی ارینب کے ولی وارث نہ تھے۔

۱۰۔ روایت میں ہے کہ ابوالدرداءؓ اور ابوہریرہؓ نے مجبور ہو کر مدینہ کی اقامت اختیار کر لی، تو ابوالدرداءؓ کا وطن ہی مدینہ تھا۔ وہ تو حکومت کی جانب سے دمشق میں قیام پذیر تھے اور ابوہریرہؓ کبھی دمشق میں مقیم نہیں رہے۔

اس طرح اس کہانی کا کوئی سر پیر نہیں۔ یہ خالص ان صحابہ کرام پر تبرا کے لیے وضع کی گئی، اور اسے ایک لطیفہ کی صورت دے دی گئی۔

وطن کی محبت ایمان میں داخل ہے

آج کل "وطنیت کا فتنہ ایک بہت بڑا فتنہ بن چکا ہے بلکہ اس فتنہ نے قومیت کے فتنے کو جنم دیا ہے آج کے دور میں یہ دونوں فتنے بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کو نگلے جا رہے ہیں۔ ایک جانب تو یہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ اس فتنہ نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا ہے اور انہیں ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک زمانہ میں یہی لوگ اقبال کا یہ شعر برسر اسٹیج گا گا کر سنایا کرتے تھے کہ

ع گر ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

لیکن اب وہی حضرات اب یہ الاپنے پھر لگے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"وطن کی محبت ایمان میں داخل ہے"

ہم اس تفصیل میں ہرگز جانا نہیں چاہتے کہ اسلام میں وطن سے کیا مراد ہے اور کیا وطن کی محبت ایمان کا بھی جزو بن سکتی ہے یا یہ بھی ایک بت پرستی ہے۔ جس نے مسلمانوں میں "لات" "منات" کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ہم تو صرف اس روایت پر کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ملا علی قاری لکھتے ہیں۔

زرکشی کہتے ہیں کہ میں اس روایت سے واقف نہیں۔ سید معین الدین صفوی لکھتے ہیں یہ روایت ثابت نہیں۔ حافظ سخاوی فرماتے ہیں مجھے آج تک اس روایت کی سند کا پتہ نہیں چل سکا۔ یعنی یہ روایت ایک بازاری گپ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ ہے۔ موضوعات کبیر ص۱۶ ۔ المقاصد الحسنہ ص۱۸۳ تمیز الطیب من الخبیث فی عا یدور علی السنۃ الناس من الحدیث ص۶۸

لاسیف الاذوالفقار

ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں

یہ داستان کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ابورافعؓ فرماتے ہیں۔ جنگ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا حضرت علیؓ کے پاس تھا اور مشرکین کا طلحہ بن ابی طلحہ کے ہاتھ میں۔ حضرت علیؓ نے ان کے علم بردار کو قتل کر دیا۔ حتیٰ کہ نو افراد نے بالترتیب جھنڈا سنبھالا اور حضرت علیؓ ہر ایک کو قتل کرتے رہے اور مشرکین کے سرداروں کی ایک جماعت کو بھی قتل کیا۔ حضرت جبرئیل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔ آپ یہ مواسات کا عمل دیکھ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ میں اس سے ہوں اور یہ مجھ سے ہے۔ پھر ہمیں آسمان سے ایک چیخ سنائی دی۔ چیخنے والا کہہ رہا تھا۔

لافتی الا علی و لا سیف الا ذوالفقار	علی کے علاوہ کوئی جوان نہیں، اور ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں۔

ابن جوزی لکھتے ہیں۔ یہ روایت موضوع ہے، اس کا واضع عیسیٰ بن مہران ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں۔ یہ تو ایک آگ لگانے والا شیعہ ہے۔ موضوع احادیث روایت کرتا ہے۔ الموضوعات ج ۱ ص ۳۸۲۔ اللآلی المصنوعہ فی احادیث الموضوعہ ج ۱ ص ۳۶۴۔

اس سے قبل کہ ہم دیگر روایات اور محدثین کرام کی آراء پیش کریں۔ چند ہماری معروضات بھی ذہن میں رکھیے۔

۱۔ حضرت ابورافع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں۔ یہ پہلے حضرت عباسؓ کے غلام تھے۔ حضرت عباسؓ نے اسلام لانے کے بعد انہیں حضور کو بخش دیا تھا۔ یہ حضورؐ کی غلامی میں شمہ کے

بعد آئے۔ جو واقعہ ان کی جانب منسوب کیا جا رہا ہے، وہ شوال ۳ھ کا ہے۔

۲۔ جنگ احد میں علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو دیا گیا تھا۔ جو اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ شبلی کہتے ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو علم عنایت کیا۔ حضرت زبیرؓ رسالہ کے افسر مقرر ہوتے۔ حضرت حمزہؓ کو اس حصّہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھی۔ سیرت النبیؐ ج ۱ ص ۳۷۳۔

شبلی جنگ کا نقشہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قریش کا علم بردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا۔ کیوں مسلمانو تم میں کوئی ہے کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے۔ یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے۔ حضرت علیؓ نے صف سے نکل کر کہا میں ہوں۔ یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آرہی تھیں۔ علم ہاتھ میں لیا۔ اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا۔

حضرت حمزہؓ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی۔ ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا کہ میں ساقی حجاج کا بیٹا ہوں۔

اب عام جنگ شروع ہوگئی۔ حضرت حمزہؓ۔ حضرت علیؓ۔ اور حضرت ابو دجانہؓ فوجوں کے دل میں گھسے۔ سیرت النبیؐ ج ۱ ص ۳۷۵۔

علامہ شبلی کی مذکورہ عبارات کو پڑھیئے تو آپ پر یہ واضح ہوجائے گا کہ اسلام کا علم مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ میں تھا۔ اور ابتدائے جنگ میں کفار کی جانب سے دو علم بردار قتل ہوئے۔ ایک کو حضرت علیؓ نے قتل کیا اور ایک کو حضرت حمزہؓ نے۔ جنگ عامہ کے بعد جو علمبردار قتل ہوئے۔ ان کے قاتل کا کوئی علم نہیں۔

علامہ شبلی نے یہ تمام روداد طبری شیعہ سے نقل کی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کا علم تو حضرت مصعبؓ کے ہاتھ میں تھا۔ پھر حضرت علیؓ علم بردار کیسے بن گئے اور ابتداء میں کفار کی جانب سے دو علمبردار قتل ہوتے تھے یہ نو کی تعداد کہاں سے

آگئی اور جب یہ دونوں امور جھوٹ ہیں تو بقیہ کہانی کیسے درست ثابت ہو گی۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کو علم ملا۔ لیکن کب اور کس صورت حال میں۔ آئیے یہ صورتحال حکیم عبدالروف داناپوری کے قلم سے مطالعہ کیجئے۔ لکھتے ہیں

حضرت مصعب بن عمیر علم بردار تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انہوں نے قتال شدید کیا اور آخر وہیں شہید ہو گئے۔ عمرو بن قمیہ نے ان کو شہید کیا اور سمجھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کیا ہے۔ چنانچہ کفار میں جاکر اس نے یہی کہا۔ مصعب کے بعد لواء حضورؐ نے حضرت علیؓ کو دیا۔ اصح السیر ص۱۴۹۔

یہ یاد رہے کہ حضرت مصعبؓ کی شہادت کے بعد جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمانوں کو شکست شروع ہو گئی اور ستر صحابہ کرام نے جام شہادت نوش کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہوئے۔ کیا یہ سب ذوالفقار کی برکتیں تھیں ؟

اس مضمون کی ایک اور روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ کہ احد کے روز آسمان سے ایک نداء آئی "کہ ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں۔ اور علیؓ کے علاوہ کوئی جوان نہیں۔

ان عقل کے کوڈنوں کو یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ ہم یہ جھوٹ کس کی جانب منسوب کر رہے ہیں ؟ آیا یہ ہضم بھی ہو جائے گا کہ نہیں۔ تو قارئین کی اطلاع کے لیے عرض یہ ہے کہ ابن عباسؓ اس وقت پانچ چھ سال کے بچے تھے اور وہ اس وقت مکہ میں تھے۔ جس طرح ابو رافع مکہ میں تھے۔ یعنی فلسفہ یہ سامنے آیا کہ نداء احد کے میدان میں ہوتی لیکن شرکاء احد میں سے اسے کوئی نہ سن سکا۔ بلکہ مکہ میں رہتے ہوتے مکہ کے دو بچوں نے سن لی اور وہاں سے پر لگا کر ساتھی بھائیوں کے پاس پہنچ گئی۔

اور سبائیوں نے فقیروں کے مجاوروں کے کان میں پھونک دی۔ جو علم باطن کی ایک علامت بن گئی۔

ابن عباسؓ کی اس روایت کا راوی یحییٰ بن سلمۃ بن کہیل ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں اس کی روایت نہ لکھی جائے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں یہ کچھ نہیں۔ نسائی لکھتے ہیں یہ متروک الحدیث ہے۔ الموضوعات ج ا صہ ۳۸۲۔ اللالی ج ا صہ ۳۶۴۔

ابن جوزی لکھتے ہیں کہ ابن مردویہ نے عمار ابن اخت ابی سفیان کے ذریعہ ابوجعفر بن علی الباقر سے نقل کیا ہے کہ بدر کے روز آسمان سے ایک منادی نے جس کا نام رضوان تھا یہ ندا کی۔ ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں، اور علی کے علاوہ کوئی جوان نہیں۔

ابن جوزی لکھتے ہیں۔ دارقطنی کا قول ہے کہ اس کا راوی عمار متروک ہے۔ الموضوعات ج ا صہ ۳۸۲۔
سیوطی "اللآلی" میں لکھتے ہیں کہ یہ ابن الجوزی کی غلطی ہے۔ عمار ہرگز متروک نہیں۔ وہ تو ثقہ ہے، ثبت ہے حجت ہے مسلم کے رواۃ میں داخل ہے۔ اس کا شمار اولیاء وابدال میں ہوتا ہے۔ ابن جوزی نے ابن حبان کی اتباع میں اس پر جرح کی ہے۔ اللآلی المصنوعہ ج ا صہ ۳۶۵۔

بہر صورت ابن حبان رجال کے امام ہیں۔ سیوطی جیسے لاکھوں ان کے خوشہ چیں ہیں اور جب کہ دارقطنی اور ابن جوزی ان کے ہمنوا ہیں۔ تو لازمی امر ہے کہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہے۔

حافظ ذہبی ان کے مناقب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ابن حبان کا قول ہے کہ یہ ایسی روایات نقل کرتے ہیں جس سے بہت اختلاف ہوتا ہے اور روایت میں انہیں وہم پیدا ہوتا ہے اس لیے یہ اس لائق ہیں کہ ان کی روایت ترک کردی جائے۔

ابو حاتم کہتے ہیں ان کی روایت حجت نہیں۔ جوزجانی کہتے ہیں کہ عمار اور اس کا بھائی سیف دونوں قوی نہیں۔

بخاری کہتے ہیں عمار بن محمد مجہول ہے اور اس کی حدیث منکر ہے۔ میزان ج ۳ صہ ۱۶۸
اللہ بہتر جانتا ہے کہ سیوطی کو کس بات کی تکلیف ہو رہی ہے۔ عمار کو غیر ثقہ قرار دینے کی، یا روایت پرستی کے مرض میں روایت ہاتھ سے جاتے رہنے کی۔ یا ان کی رگ تشیع سے برداشت نہیں

کر رہی۔ تو جناب ہمیں یہ بھی قبول ہے کہ عمار بن محمد ایک فرشتہ ہے لیکن اس کے فرشتہ قرار پانے سے کیا یہ قول درست قرار پائے گا۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ اس میں ایک اور خطرناک ہستی موجود ہے۔ جس کی جانب سیوطی کا ذہن نہیں گیا۔ ورنہ اس کی بھی وکالت فرما لیتے۔ اس ہستی کا نام سعد بن طریف ہے۔

سعد بن طریف: الاسکاف الحنظلی الکوفی۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔ اس کی روایات ترمذی اور ابن ماجہ میں پائی جاتی ہیں۔ یہ عکرمہ اور ابووائل سے روایات نقل کرتا ہے۔

امام الرجال یحیٰ بن معین فرماتے ہیں۔ کسی کے لیے یہ حلال نہیں کہ اس سے حدیث روایت کرے۔ احمد اور ابوحاتم کہتے ہیں ضعیف الحدیث ہے۔ نسائی اور دارقطنی کا قول ہے متروک الحدیث ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں یہ فی البدیہ حدیث وضع کر لیا کرتا تھا۔ اس کی روایت ضعیف ہے۔ غالی قسم کا شیعہ ہے بخاری کہتے ہیں یہ محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہے۔ ذہبی لکھتے ہیں اس کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے میزان ج ۲ ص ۱۲۳۔ الضعفاء والمتروکین للدارقطنی ص ۱۰۔ الضعفاء الصغیر ص ۱۲۹۔ الجرح والتعدیل ج ۲ ص ۸۷۔ متروک ہے۔ وضاع ہے۔ تقریب ص ۱۱۸۔

اگر سعد بن طریف فرشتہ بھی ہوتا تب بھی یہ روایت درست نہ ہوتی۔ اس لیے جنگ بدر ۲ھ میں ہوئی اور امام باقر ۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ اوپر کے راوی کہاں غائب ہیں۔ شیعوں کا اس سلسلہ میں مسلک یہ ہے کہ جب کوئی بات امام کی جانب منسوب ہو جائے تو وہ وحی الہٰی ہے۔ اب اس پر ایمان لانا ضروری ہے، خواہ ان کی جانب منسوب کرنے والا ایسا کیوں نہ ہو کہ جس کے منہ میں کتے موتیں۔ لیکن سنیوں کا تو یہ مسلک نہیں۔ پھر سیوطی کو کس بات کی تکلیف پہنچ رہی ہے۔

ہم تو آگے بڑھ کر یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہیں کہ اگر اس کہانی کو بخاری و مسلم جیسی ہستیاں بھی نقل کرتیں تب بھی یہ جھوٹ کا پلندہ ہی کہلاتی۔ اس لیے کہ بدر کے روز ذوالفقار ایک کافر کے ہاتھ میں تھی اور اتفاق سے حضرت علیؓ کے ہاتھ میں اگر آئی بھی ہوگی تو ۳۵ھ میں خلیفہ بننے کے بعد آئی ہوگی اس سے قبل تو اس بات کا امکان بھی نہیں۔

علامہ نورالدین علی بن سلطان الہروی المعروف علامہ علی قاری حنفی اپنی موضوعات میں لکھتے ہیں۔

یہ روایت کہ ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علیؓ کے علاوہ کوئی جوان نہیں۔ اس روایت کی کوئی ایسی بنیاد نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ صرف حسن بن عرفۃ العبدیؒ نے ایک واہی قول ابوجعفر بن علی الباقر سے نقل کیا ہے اور وہی "الریاض النضرۃ" میں پایا جاتا ہے۔

ذوالفقار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کا نام ہے۔ اسے ذوالفقار اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ اس روایت کے باطل ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اگر ایسی ندا بدر کے روز (یا احد کے روز) آسمان سے آتی تو تمام صحابہ کرام اسے سنتے اور بڑے بڑے صحابہ اسے نقل کرتے۔

یہ تو اسی قسم کی داستان ہے جیسے یہ داستان ہے کہ بدر کے ارد گرد نقاروں کی آوازیں آتی رہتی ہیں جو فرشتے بجاتے رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ عقلاً اور نقلاً باطل ہے۔ لیکن تب بھی ابن مرزوق نے اسے نقل کر دیا اور ان کی دیکھا دیکھی ابن حجر عسقلانی بھی اپنی مواہب میں نقل کر گئے۔

ان بدبخت شیعوں کی بکواسات میں یہ جملے بھی ہیں۔

نادِ علیاً مظہر العجائب۔ تجدہ عوناً لک فی النوائب بنبوتک یا محمد بولایتک یا علی۔ الموضوعات الکبیر ص ۱۴۰ تمییز الطیب من الخبیث ص ۱۹۳۔

علی کو پکار جو مظہر العجائب ہیں۔ تو اپنی مصیبتوں میں انہیں مددگار پائے گا۔ اے محمد آپ کی نبوت کے واسطے۔ اے علی آپ کی ولایت کے واسطے۔

یہ وہ جملے ہیں جو بطور امام ضامن بھی باندھے جاتے ہیں اور پیر صاحبان انہیں بطور تعویذ لکھ کر بھی دیتے ہیں اور مختلف وظیفوں کی صورت میں انہیں پڑھا جاتا ہے۔ حالانکہ ارشاد الٰہی ہے۔

فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝ اللہ کے علاوہ کسی کو نہ پکارو۔

الجن۔ ۱۸

ان جملوں کے ذریعے ان سبائیوں نے حضرت علیؓ کو ایک الٰہ بنا کر پیش کیا اور اس طرح امت محمدیہ میں شرک کو پھیلانے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

اسی قسم کی ایک داستان یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ بدر کے کنوئیں میں کود گئے۔ کیونکہ اس میں جنات کا بسیرا تھا۔ اس ذوالفقار سے انہیں قتل کر کے زمین کے اندر ہی اندر سرزمین عراق پہنچ گئے اور وہاں کفار سے جنگ کر کے انہیں مسلمان کیا۔

گویا ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ نے جو عراق پر حملے کئے اور اس کو فتح کیا یہ دراصل ان کا ایک غلط اقدام تھا۔ یہاں کے تمام باشندے پہلے ہی سے پکے مومن بن چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے کفار کے بجائے مومنین کو قتل کیا۔ اسی لیے تو سبائیوں کا یہ عقیدہ ہے ؎

این عربدہ ز غصب خلافت علی نیست — زآلِ عمر کینہ قدیم است عجم را

حافظ محمد بن عبدالرحمان السخاوی المتوفی ۹۰۲ھ تحریر کرتے ہیں۔

یہ روایت کہ ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ایک تابعی کا قول ہے (یعنی باقر کا) جو حسن بن عرفہ نے اپنے مشہور رسالہ میں ایک واہی سند سے نقل کیا ہے۔ یعنی عمار بن محمد کے ذریعہ سعد بن طریف الحنظلی الکوفی سے۔ اور اس نے باقر سے کہ بدر کے روز آسمان سے یہ ندا آئی۔ اور محب الطبری نے "الریاض النضرہ" میں حضرت علیؓ کے مناقب میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا۔

ذوالفقار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور تلوار کا نام ہے جو جنگِ بدر کے مالِ غنیمت میں ہاتھ آئی تھی اور جسے آپ نے اپنے لیے مخصوص فرما لیا تھا۔ یہی وہ تلوار ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے موقع پر خواب میں دیکھا تھا کہ وہ درمیان سے ٹوٹ گئی ہے اور آپؐ نے اس کی تعبیر شکست سے لی تھی۔

اس پر تو اتفاق ہے کہ یہ بدر کے مال غنیمت میں ہاتھ آئی تھی۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ پہلے کس کی تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہب بن منبہ کی تلوار تھی۔ ایک قول ہے کہ منبہ بن الحجاج کی تھی۔ ایک قول ہے کہ بنیہ بن الحجاج کی تھی اور ایک قول یہ ہے کہ عاص بن منبہ بن الحجاج کی تھی۔

بلکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ حجاج بن علاط نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ میں دی تھی۔

یہ تلوار خلفاء عباسیہ کے پاس رہی۔ (یعنی زوال بنی امیہ کے بعد)

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ اس لوہے سے تیار کی گئی تھی جو کعبہ کے پاس مدفون تھا۔

مرزوق الصیقل نے خلفاء عباسیہ کے زمانہ میں اس پر دھار رکھی تھی۔ اس کا قبضہ اور حلقہ چاندی کا تھا اور درمیان میں بھی چاندی کا کام تھا۔

ابو العباس کہتے ہیں اسے ذو الفقار اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں چھوٹے چھوٹے حلقے تھے اور فقر اس سوراخ کو کہتے ہیں جس میں گہرائی ہو۔

امام اصمعی کا بیان ہے کہ میں خلیفہ ہارون الرشید کے پاس گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ کیا میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذو الفقار تلوار دکھاؤں۔ ہم نے عرض کیا ضرور۔ وہ ایک تلوار اندر سے لے کر آیا۔ میں نے اس سے خوبصورت کوئی تلوار نہیں دیکھی۔ جب وہ سیدھی کھڑی کی جاتی تھی تو اس میں کچھ نظر نہ آتا تھا اور جب وہ ٹیڑھی کی جاتی تو اس میں سات حلقے نظر آتے۔ وہ ایک یمانی تلوار تھی۔

ایک اور روایت میں اصمعی کا بیان ہے کہ میں نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ پھر اس کے حلقے گنے لیکن بعد میں ہم میں اختلاف ہو گیا کہ وہ حلقے کتنے تھے سترہ یا اٹھارہ۔ المقاصد الحسنۃ ص۴۶۶۔

ہم نے ابتداء میں دو اور روایتیں بھی پیش کی تھیں۔ جن میں سے ایک ابن عباسؓ کی جانب منسوب تھی۔ اور ایک ابو رافعؓ کی جانب۔ ابن عباسؓ والی روایت کی تفصیل اوپر گزر چکی۔ ابو رافع کی روایت کا بھی ہم تاریخی جائزہ پیش کر چکے ہیں۔ لیکن یہ امر باقی رہ گیا تھا کہ یہ کہانی کس نے وضع کر کے حضرت ابو رافعؓ کی جانب منسوب کی۔ اس ذات شریف کا نام ہے عیسیٰ بن مہران۔

اس کی کنیت ابو موسیٰ ہے۔ بغداد میں مقیم تھا۔ ذہبی لکھتے ہیں

عیسیٰ بن مہران : یہ تو جھوٹ کا ایک پہاڑ تھا۔

ابن عدی کہتے ہیں اس نے موضوع احادیث روایت کی ہیں۔ یہ تو آگ لگانے والا شیعہ ہے۔ یہ روایت اسی کی وضع کردہ ہے اسے ابن جریر طبری شیعہ کے علاوہ کسی نے ثقہ نہیں کہا۔ ج۳ ص۲۹۲

خطیب بغدادی لکھتے ہیں یہ تو بہت سرکش قسم کا رافضی شیطان تھا۔ اس نے ایک بار مجھے اپنی ایک لکھی ہوئی کتاب دی تھی۔ جس میں اس نے صحابہ کرام کو مطعون کیا تھا اور انہیں کافر قرار دیا تھا۔ اس کتاب کی موضوعات دیکھ کر میرے رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ اور میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۲۴۔

دارقطنی لکھتے ہیں۔ عیسی بن مہران ایک بدترین انسان تھا اور اس کا تو مذہب بھی بدتر تھا۔ اس سے ابن جریر طبری نے روایات لی ہیں۔ کتاب الضعفاء المتروکین ص ۱۲۷۔

یہ ہے اس کہانی کا حال جو ہمارے یہاں ہر شخص کی زبان پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ تلوار جنگ بدر میں ہاتھ آئی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے مخصوص فرمائی۔ اس کا حضرت علیؓ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اگر کوئی سبائی یہ کہے کہ یہ تلوار جنگِ احد کے روز حضرت علیؓ کو بخش دی گئی تھی۔ تو یہ بھی قطعاً غلط ہے۔ اس لیے کہ اس روز حضورؐ کے پاس ایک تلوار تھی جو آپ نے حضرت ابو دجانہؓ انصاری کو دی تھی، نہ کہ حضرت علیؓ کو۔ اور وہ بھی ذوالفقار نہیں دی گئی تھی۔ یہ ہمیشہ حضور کے پاس رہی۔ حتیٰ کہ یہ آپ کے متروکات میں شامل ہے اور بطور ترکہ ابوبکرؓ کے قبضہ میں رہی۔ پھر عمرؓ کے، پھر عثمانؓ کے۔ اس طرح سلسلہ بسلسلہ خلفاء کے پاس چلتی رہی، جو بعد میں خلفاء عباسیہ کے پاس پہنچی۔

شبلی لکھتے ہیں

کہ ذوالفقار بدر میں ہاتھ آئی تھی۔ سیرت النبیؐ ج ۲ ص ۱۹۱۔

ابن سعد نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے روز ایک تلوار ذوالفقار نامی اپنے لیے مخصوص فرمالی تھی۔ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۳۶۸۔

ایک اور مقام پر ابن سعد لکھتے ہیں یہ تلوار منبہ بن الحجاج السہمی کی تھی جو جنگِ بدر کے بعد آپ کو ملی۔ طبقات ج ۲ ص ۲۷۳۔

شیعہ مورخ ابن جریر طبری لکھتا ہے۔ آپ کی تلوار ذوالفقار نامی منبہ بن الحجاج کی تھی۔ جو

جنگِ بدر میں آپ کو حاصل ہوئی۔ تاریخ طبری ج ا صـ۱۰۵۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے مالِ غنیمت میں سے ذوالفقار نامی تلوار لی۔ ابن جریر طبری کا قول ہے کہ آپ نے ابوجہل کا اونٹ بھی اپنے لیے مخصوص فرمالیا تھا جس کی ناک میں چاندی کا چھلا پڑا تھا۔ البدایۃ والنہایہ ج ۳ صـ۳۰۳۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ذوالفقار حضرت علیؓ کی تلوار نہیں تھی۔ یہ تو ابوجہل کی تلوار تھی جو بدر کے مال غنیمت میں حضور کو حاصل ہوئی تھی۔ منہاج السنہ ج ۳ صـ۱۰۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام پر یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ ایرانیوں نے کس طرح پیٹ بھر کر جھوٹ بولا ہے اور ہمارے سنی بھائی کس طرح جھوٹ کی پھنکیاں مارتے رہے ہیں۔ یہ اس گڑھے میں اپنی اکابر پرستی اور روایت پرستی کے اندھے مرض کے باعث گرے ہیں۔ اللہم اہدنا الی سواء الصراط

اس تفصیل کے بعد چلتے چلتے اب علم باطن کی ایک بات سن لیجیے تاکہ جو بدمزگی پیدا ہوئی ہے وہ دور ہو جائے۔

راوی کہتا ہے امام رضا علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ ذوالفقار شمشیر کہاں سے آئی تھی۔ فرمایا جبرئیلؑ آسمان سے لائے تھے اور اس کا قبضہ چاندی کا تھا۔ الشافی ترجمہ اصول کافی ج ا صـ۲۶۷۔

اصول کافی کی رو سے آپؐ کا تمام ترکہ حضرت علیؓ کو ملا۔ پھر وراثۃً چلتا رہا لیکن جب حضرت حسینؓ کربلا جانے لگے تو یہ متروکات ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس رکھوا گئے۔ بعد میں زین العابدینؒ نے آ کر لے لیے۔ الشافی ج ا صـ۲۶۷۔

گویا اس طرح کربلا میں حضرت حسینؓ ذوالفقار سے محروم رہے اور ہمیں یہ مسرت ہوئی کہ ابوبکر رضؓ وراثت غصب کرنے کے الزام سے بری ہو گئے ان بے چاروں کو تو مفت میں بدنام کیا جا رہا ہے اور سب کچھ گھر میں چھپائے بیٹھے ہیں حتیٰ کہ حضرت آدم کا کرتہ بھی دبا بیٹھے۔ لیکن ان کا تہمد کہاں گیا؟ اس کا پتہ چلانا انتہائی ضروری ہے۔ شاید جناب غائب اس سلسلہ میں کچھ معلومات رکھتے ہوں؟۔

ہماری نظر میں بہتر یہ ہے کہ یہ جملہ اس طرح بولا جائے۔ لا فتیٰ الا معاویۃ ولا سیف الا سیف اللہ

امیر معاویہؓ کی یزید کو وصیّت

مورخ خضری لکھتے ہیں کہ جب امیر معاویہؓ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اپنے بیٹے یزید کو یہ وصیت لکھوا کر بھوائی :-

اے میرے بیٹے۔ میں نے تمہیں گھر بیٹھے ہی سب کچھ دے دیا (یعنی آنے جانے کی کوئی ضرورت نہیں پڑی) سارے معاملات تمہارے لیے درست کر دیے۔ دشمنوں کو تمہاری خاطر مغلوب کیا۔ اور سارے عرب کی گردنیں تمہارے آگے جھکا دیں۔ اور تمہارے لیے وہ کچھ اکٹھا کر دیا جو کسی نے نہ کیا ہو گا۔ اہل حجاز (مکہ و مدینہ و طائف) کا خیال کرنا۔ تمہارا نکاس وہیں سے ہے ان میں سے جو شخص تمہارے پاس آئے اس کی عزت کرنا۔ جو غائب ہو اس کو خوش رکھنے کی فکر کرنا اہل عراق پر توجہ رکھنا۔ اگر وہ تم سے روزانہ ایک عامل کو بدل دینے کی درخواست کریں تو ایسا کر ڈالنا۔ کیونکہ ایک عامل کا بدل دینا اس سے کہیں سہل ہے کہ ایک لاکھ تلواریں تمہارے خلاف بے نیام ہو جائیں۔

اہل شام پر نگاہ رکھنا۔ انہی کو اپنا ہمراز و دمساز بنانا۔ کسی دشمن کی طرف سے خطرہ ہو تو انہی سے مدد لینا۔ اور جب ان لوگوں پر (یعنی دشمنوں پر) قابو پا لو تو پھر اہل شام کو ان کے گھروں کو واپس کر دینا۔ کیونکہ یہ اپنے شہروں کے علاوہ کہیں اور رہیں گے تو ان کے اخلاق بدل جائیں گے۔

حکومت کے بارے میں تم سے اختلاف کرنے کا خطرہ مجھے کسی کی طرف سے نہیں۔ سوائے قریش کے چار آدمیوں کے۔ یعنی حسینؓ بن علیؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ۔ عبداللہ بن الزبیرؓ اور عبدالرحمان بن ابی بکرؓ۔

ابن عمرؓ تو ایسے شخص ہیں کہ عبادت نے انہیں نیم جان کر رکھا ہے اگر سوائے ان کے

اور کوئی شخص بیعت سے نہ رکا رہا تو وہ بیعت کر لیں گے۔

حسین بن علیؓ کم سواد شخص ہیں۔ اہل عراق ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک تمہارے خلاف کھڑا نہ کر دیں۔ اگر وہ خروج کریں اور تم ان پر قابو پالو تو معاف کر دینا۔ کیونکہ ان سے تمہارا قریبی رشتہ ہے۔ ان کا بڑا حق ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ عزیز ہیں۔

عبدالرحمان بن ابی بکرؓ ایسے شخص ہیں کہ جو اپنے ساتھیوں کو کرتے دیکھیں گے وہی کرنے لگیں گے، ان کے اندر ہمت نہیں۔ ان کی دلچسپی عورتوں میں اور کھیل تماشوں میں ہے۔

البتہ جو شخص تمہارے سامنے شیر کی طرح ڈٹے گا اور لومڑی کی طرح تم سے چالیں چلے گا، وہ عبداللہ بن الزبیر ہیں اگر وہ ایسا کریں اور تم ان پر قابو پالو تو ان کا ایک ایک عضو کاٹ ڈالنا اور جہاں تک ممکن ہو اپنی قوم کا خون بہانے سے گریز کرنا۔ محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ ج ۲ صفحہ ۱۲۲۔

ہم نے یہ وصیت حکیم علی احمد عباسی صاحب کی کتاب "امیر معاویہؓ کی سیاسی زندگی" سے نقل کی ہے اور انہوں نے اسے خضری بک مصری کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اس روایت پر جو بحث کی ہے اوّل ہم اسے پیش کریں گے۔ اگر اس میں کچھ اضافہ کی ضرورت سمجھیں گے تو وہ اضافہ ان کی بحث کے بعد تحریر کیا جائے گا۔ آیئے پہلے تو ہم یہ دیکھیں کہ حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر کیا بیماری تشخیص کی ہے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

خضری نے یہ وصیت نقل کی ہے۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے امیر المومنین معاویہ جیسے امام الصحابہ کی طرف وصیت کا یہ مضمون کس طرح منسوب کرنا قبول کر لیا۔ از اوّل تا آخر یہ وصیت نامہ مصنوعی ہے اور اس کا ایک لفظ بھی سیدنا معاویہؓ کی زبان سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ سب سے اہم چیز جے خضری جیسے شخص کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیے تھا۔ وہ سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکر کا ذکر ہے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ سیدنا عبدالرحمانؓ ۵۳ھ میں انتقال فرما چکے تھے۔ یعنی یہ وصیت لکھنے سے سات برس پہلے۔ تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے، کہ حضرت امیر المومنین ان کا تذکرہ کرتے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ولایت عہد کی بیعت کر لی تھی۔ جیسا کہ صحیح بخاری کے حوالہ سے ہم دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں اور وہیں اس بات کی وضاحت بھی ہو چکی ہے کہ خلافت کا جو تھوڑا سا خیال آپ کے دل میں اس وقت پیدا ہوا تھا۔ وہ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے ان کے دل سے نکال دیا تھا۔ سیدنا معاویہ جانتے تھے کہ انہوں نے سیدنا علیؓ سے بیعت نہیں کی تھی۔ لیکن ابن عمرؓ نے ان سے بیعت کر لی تھی۔ لہٰذا ابن عمرؓ سے اس کا خطرہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ جو عہد وہ علی رؤس الاشہاد مسجد نبوی میں کر چکے تھے اسے توڑ دیں گے۔ یہ نام بھی اس وصیت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جس شخص نے یہ وصیت نامہ وضع کیا ہے۔ اس کے دل میں سیدنا معاویہؓ کی عظمت نہ تھی۔ اور وہ انہیں ایک دنیا دار حکمران سمجھتا تھا۔ جو اپنے بیٹے کی محبت میں دنیا و آخرت سے بے خبر ہو چکے تھے۔ اس لیے اپنی ذہنیت کے مطابق اس نے یہ وصیت نامہ مرتب کر کے سیدنا معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی طرف منسوب کر دیا اور خضری جیسے لوگ اسے قبول کر بیٹھے۔

سبائیوں نے ولایت عہد کے مسئلہ کو جس طرح امیر المومنین حضرت امیر معاویہؓ کی ذاتی ہوس اور خاندانی خواہش کی نمود بنا دیا ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ مردود وصیت نامہ مرتب کر دیا گیا۔ اور یہ کرامت سیدنا معاویہؓ کی ہے کہ اس وصیت نامہ کے مفتری مصنف کو سیدنا عبدالرحمان کا نام لکھتے وقت یہ خیال نہ رہا کہ وہ اس وقت زندہ نہ تھے۔

غالباً یہ وصیت نامہ کسی سبائی کا مرتب کردہ ہے جو اس نے اہل عراق کو ایسا متحد الخیال اور طاقتور دکھایا ہے کہ ہر موقعہ پر وہ ایک لاکھ تلواریں سونت کر کھڑے ہو سکتے تھے۔ حالانکہ کسی اہم موقعہ پر سو دو سو تلواریں بھی نہیں سونتی گئیں۔ بلکہ جس کسی کو بھی ورغلا کر حکومت کے خلاف کھڑا کیا، اسے عین وقت پر بے یار و مددگار چھوڑ کر جا بیٹھے۔ ایسے مکار اور بزدل لوگوں کا رعب امیر المومنین معاویہؓ پر کیا ہو سکتا تھا۔ جو اپنی آنکھوں سے ان کے سب احوال دیکھے ہوئے تھے۔

اس وصیت نامہ میں سیدنا حسینؓ اور سیدنا ابن الزبیرؓ کے جو نام ٹانک دیے گئے ہیں۔ تو وہ بعد کے احوال دیکھ کر۔ ورنہ اس وقت ان دونوں سے کسی کو کوئی خطرہ نہ تھا۔

اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ امیر المومنین معاویہؓ نے عراق کے والیوں کو عراقیوں کے مطالبہ پر جلد از جلد بدلنے کی وصیت کی ہو۔ آپ کو کیا یہ معلوم نہ تھا کہ کس طرح یہ لوگ امیر المومنین سیدنا عثمانؓ کے زمانہ میں اپنے ہر والی کے خلاف محاذ قائم کر کے اس کی تبدیلی کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ اور انہیں کس قدر پریشان کیا کرتے تھے اور حضرت امیر المومنین کے مقابلہ میں ان کا رویہ کیسا متمردانہ ہوا کرتا تھا۔

امیر المومنین حضرت عثمانؓ نے رفع شر کے لیے ہمیشہ ان کی بات مانی۔ جس کے یہ ہولناک نتائج مرتب ہوتے کہ امت کا حال و مستقبل تاریک ہو گیا۔ ان کو تو ضرورت صرف حجاج بن یوسف جیسے والی کی تھی۔ جس نے ان کے سب کس بل نکال دیے۔ امیر المومنین معاویہؓ جیسے مدبر اور دور بیں امام ایسی لغو وصیت کر سکتے تھے جو پچیس برس کے ذاتی تجربہ کے خلاف تھی؟

لہٰذا یہ وصیت نامہ اپنے ایک ایک جزئیہ کے ساتھ بالکل وضعی ہے اور اس کے کسی ایک حرف کی نسبت بھی امیر المومنین معاویہؓ کی طرف درست نہیں۔

حکیم صاحب نے اس کہانی پر جو تبصرہ کیا ہے اس کے بعد مزید تبصرہ کی چنداں ضرورت تو نہ تھی لیکن چند گوشے ابھی مخفی رہ گئے ہیں۔ لہٰذا ان کا واضح کرنا انتہائی ضروری ہے۔

۱۔ یزید نے اس وصیت نامہ کے برعکس کوفہ کے گورنر حضرت نعمان بن بشیر صحابی کو ان کی نرم مزاجی کے باعث وہاں سے ہٹا کر عبید اللہ بن زیاد جیسے شخص کو کوفہ و بصرہ کا گورنر بنایا۔ جسے تا زندگی تبدیل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کا مقصد یہ ہوا کہ امیر معاویہؓ کی یہ وصیت کہ عراق کے والیوں کو ان کی منشاء کے مطابق تبدیل کرتے رہنا حرف بہ حرف غلط تھی۔ جسے بعد کے تجربات نے بھی غلط ثابت کر دیا۔

۲۔ عبد اللہ بن الزبیرؓ کی شجاعت سے تو کوئی ان کا دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمیں تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نظر نہیں آیا جس سے یہ ثابت ہو کہ واقعتاً وہ لومڑی کی طرح چالیں چلتے تھے۔ بلکہ ہم تو یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ان سے اگر چند سیاسی غلطیاں سرزد نہ ہوتیں تو تاریخ کے اوراق ہی کچھ اور ہوتے۔ انہوں نے دو سیاسی غلطیاں ایسی کیں جس کی وجہ سے نہ صرف ان کی خلافت ختم ہوئی بلکہ

ان کی زندگی بھی اس کی نذر ہو گئی۔

الف :۔ اگر وہ مروان اور بنو امیہ کو حجاز بدر نہ کرتے تو ان کے خلاف کوئی محاذ نہ کھڑا ہوتا۔

ب :۔ ابن الزبیرؓ نعمان بن بشیرؓ کے مشورے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے شام چلے جاتے اور اہل شام ان کی بیعت کر لیتے تو ان کی خلافت ایک متفقہ خلافت ہوتی اور وہ فتنہ جو ان کے خلاف اٹھا ہرگز نہ اٹھتا۔

ہاں سبائیوں کو ان سے یہ ناراضگی ضرور ہو گی کہ وہ حضرت حسینؓ کی طرح قطعی ناکام نہیں رہے بلکہ جب انہوں نے خلافت کا دعویٰ کیا تو شام کے کچھ حصہ کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ نے ان کی بیعت کی۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دور کے لوگ حضرت حسینؓ سے زیادہ ان پر جان دیتے تھے اور انہیں لوگوں کے دلوں میں جو مقام حاصل تھا وہ حضرت حسینؓ کو قطعاً حاصل نہ تھا۔ پھر ان کے ساتھی اہل حجاز تھے جن پر کبھی بے وفائی کا الزام نہ آیا۔ اور حضرت حسینؓ کو دعوت دینے والے عراقی غدار تھے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ابو مخنف رافضی اسی قسم کا وصیت نامہ تیار کر سکتا تھا۔ اس لیے اس ابلیس نے دل کا غبار کبھی امیر معاویہ پر نکالا، کبھی ابن الزبیرؓ اور کبھی عبدالرحمان بن ابی بکرؓ پر۔

۳۔ اس کہانی میں حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ پر یہ الزام قائم کیا گیا ہے کہ ان کی دلچسپی عورتوں اور کھیل تماشوں میں ہے حالانکہ ان کی تمام زندگی جہاد میں گزر گئی اور یہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان کا انتقال امیر معاویہؓ کی وفات سے سات سال قبل ہو چکا تھا۔ لیکن اگر بالفرض والمحال وہ حیات بھی ہوتے تو ۶۰ھ میں ان کی عمر کسی صورت میں اسی سال سے کم نہ ہوتی اور یہ عمر عورتوں سے دلچسپی کی ہرگز نہیں ہوتی۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ ابو بکرؓ کے بیٹے اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کے چہیتے بھائی ہیں۔ ان پر تبرا کیے بغیر کسی سبائی کا دل کیسے ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔ جب کہ ان کے یہاں کوئی نماز بھی اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک آل محمد کے دشمنوں پر تبرا نہ کیا جائے اور ان کے نزدیک ہر وہ شخص آلِ محمد کا دشمن ہے جو ابو بکرؓ و عمرؓ کی خلافت کو صحیح سمجھتا ہے اور سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا جو فیصلہ کیا گیا اسے قبول کرتا ہو۔ یہ سب سقیفائی لوگ ہیں اور یہ آل محمد کے دشمن ہیں۔

ان کے رئیس حضرت عمرؓ ہیں، جنہوں نے سب سے اوّل ابوبکرؓ کی بیعت کی۔ لہٰذا سب سے بڑے مجرم وہ ہیں۔ اسی لیے سبائیوں کا اصل مسلک یہ ہے کہ ذاکِ عمر کینہ قدیم است بجم را۔

۴: ابن عمر کا مسلک

رہا ابن عمرؓ کا مسئلہ تو بے شک وہ اس وقت تمام صحابہ میں سب سے بڑے عالم، سب سے افضل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے سب سے زیادہ فیض یافتہ تھے۔ ان کی موجودگی میں بلحاظ علم و فضل خلافت کسی اور کا حق ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ حتٰی کہ حضرت علیؓ کے دور میں جنگ صفین کے بعد حکمین پر جو فیصلہ چھوڑا گیا تو حضرت ابوموسیٰؓ کی رائے یہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ جب کہ حضرت عمروؓ بن العاص اپنے بیٹے عبداللہؓ کا نام لے رہے تھے۔

بے شک عبداللہ بن عمرؓو بن العاص کسی معاملہ میں بھی ابن عمرؓ سے کم نہ تھے۔ لیکن چونکہ کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس لیے یہ معاملہ یہیں ختم ہو گیا۔ اگر امیر معاویہؓ اپنے بیٹے کو ولی عہد نہ بناتے اور سبقت اسلام اور فضیلت پر اس مسئلہ کو چھوڑا جاتا تو ان دونوں حضرات کے ہوتے ہوئے خلافت نہ حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کا حق تھا اور نہ حضرت حسینؓ کا۔

لیکن عبداللہ بن عمرؓ کا نقطۂ نگاہ بالکل جداگانہ تھا۔ انہوں نے کبھی بھی اختلاف فی الامت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا اور جب بھی امت میں اختلاف پیدا ہوا تو انہوں نے دونوں طبقوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور بیعت سے انکار کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد اسی اختلاف کے پیش نظر نہ حضرت علیؓ کی بیعت کی اور نہ حضرت حسنؓ کی۔ لیکن جب امیر معاویہؓ پر اتفاق ہو گیا تو ان کی بیعت کر لی۔ اسی طرح جب یزید کی وفات کے بعد ابن الزبیرؓ اور آل مروان میں اختلاف ہوا تو انہوں نے کسی کی بیعت نہیں کی۔ لیکن جب ابن الزبیرؓ شہید ہو گئے اور عبدالملک پر سب کا اتفاق ہو گیا تو انہوں نے عبدالملک بن مروان کی بیعت کر لی۔ اس کا ذکر مؤطا امام مالک اور صحیح مسلم میں موجود ہے۔

چونکہ امت نے یزید کی ولیعہدی کو قبول کر لیا تھا اور تمام اہل مدینہ نے اس کی بیعت کر لی تھی۔ جن میں خاندان بنی ہاشم کے شیخ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی اس

کی بیعت کی۔ اگرچہ کچھ دیر کے لیے ان کے دل میں یہ خیال گزرا تھا کہ انہیں خلیفہ بنایا جائے۔ لیکن اس تخیل سے انہیں ان کی بڑی بہن ام المومنین حفصہؓ نے منع کر دیا۔ صحیح بخاری میں خود ان کی زبانی بہ تفصیل مروی ہے۔

ابن عمرؓ فرماتے ہیں میں حفصہؓ کے پاس گیا۔ ان کی زلفوں سے پانی ٹپک رہا تھا (غالباً نہا کر آئی ہوں گی) میں نے عرض کیا۔ آپ لوگوں کا حال دیکھ رہی ہیں کہ انہوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس معاملہ میں میرا کوئی حق ہی نہیں رکھا۔ ام المومنین حفصہؓ نے فرمایا۔ جاؤ لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہارے خاموش بیٹھ رہنے سے کہیں اختلاف پیدا نہ ہو جائے اور انہوں نے اس وقت تک ابن عمرؓ کو نہ چھوڑا جب تک وہ باہر نہ چلے گئے۔ بخاری ج ۲ ص ۵۸۹۔

بخاری کی اس حدیث سے وضاحت کے ساتھ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یزید کی ولیعہدی پر تمام امت کا اجماع ہو گیا تھا۔ اور مدینہ کے کسی فرد نے بھی اس سے اختلاف نہ کیا تھا اور تمام علماء کے نزدیک اجماع امت حجت شرعیہ ہے جس کا منکر فاسق کہلاتا ہے۔

اس وقت صرف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے دل میں اپنی خلافت کی تمنا پیدا ہوئی تھی جو ان کی بڑی بہن ام المومنین حفصہؓ نے ان کے ذہن سے نکال دی۔ تاکہ امت میں از سر نو انتشار پیدا نہ ہو۔

اس سے یہ بات بھی سامنے آگئی کہ ام المومنین حفصہؓ یزید کی ولی عہدی تک حیات تھیں اور اس ولیعہدی سے انہیں کوئی اختلاف نہ تھا اور چونکہ ام المومنین کا حجرہ مسجد سے ملحق تھا اور اجلاس میں حاضری کے لیے صرف ابن عمرؓ کی کمی رہ گئی تھی۔ لہٰذا اسی لیے فرمایا کہ لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور کہیں تمہاری تاخیر کے باعث امت میں اختلاف پیدا نہ ہو جائے۔

بعض وہ حضرات جن کی تمام سوچ یزید دشمنی تک محدود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ حکمین اذرح میں جمع تھے اور یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ خلافت کے لیے حضرت علیؓ کے علاوہ کس کا انتخاب کیا جائے۔ تو ام المومنین حفصہؓ نے اپنے بھائی کو شرکت پر مجبور کیا۔ لیکن یہ سوچ سراسر غلط ہے جس کی متعدد وجوہات ہیں۔

ا ۔ ام المومنین حفصہؓ اتنا طویل سفر کر کے مقام اذرح کس لیے تشریف لے گئی تھیں ؟

ب ۔ اس وقت کسی کی بیعت نہیں ہو رہی تھی جو کسی تفریق کا اندیشہ ہو ۔

ج ۔ ابن عمرؓ نہ خود حکم تھے اور نہ کسی حکم کے مشیر، ان کی غیر موجودگی سے کسی فیصلہ پر کیا اثر پڑ سکتا تھا ۔ وہ تو صرف فیصلہ سننے تشریف لے گئے تھے ۔

د ۔ اس وقت ابن عمرؓ کسی گروہ کے ساتھ نہ تھے اور نہ انہوں نے کسی کی بیعت کی تھی ۔

ھ ۔ یہ بات صرف اس لیے کہی گئی ہے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ ام المومنین حفصہؓ یزید کی ولیعہدی کے وقت حیات نہ تھیں ۔ اس لیے ان کا سن وفات ۴۵ھ بیان کیا جاتا ہے ۔ جب کہ یہ وقوعہ ثابت کر رہا ہے کہ ان کا انتقال ۵۲ھ کے بعد ہوا ہے ۔

و ۔ اس حدیث کے آخر الفاظ اس امر کی تردید کے لیے کافی ہیں کہ یہ اذرح کا واقعہ نہیں ہے ۔

فلما تفرق الناس خطب معاویۃ قال	جب لوگ متفرق ہو گئے تو امیر معاویہ نے خطبہ دیا
من کان یرید ان یتکلم فی ھذا الامر	اور کہا کہ جو شخص اس خلافت کے سلسلہ میں کچھ گفتگو
فلیطلع لنا قرنہ فلنحن احق بہ منہ ومن	کرنا چاہے وہ اپنا سر اٹھائے ہم اس سے اور اس کے
ابیہ	باپ سے بھی زیادہ اس خلافت کے حقدار ہیں ۔

حالانکہ مقام اذرح میں نہ امیر معاویہؓ موجود تھے، نہ انہوں نے کوئی خطبہ دیا تھا اور نہ وہاں کسی ولیعہدی کا مسئلہ درپیش تھا ۔ آگے ابن عمرؓ فرماتے ہیں ۔ کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں یہ کہوں کہ اس خلافت کا تجھ سے بھی زیادہ حقدار وہ ہے جس نے تجھ سے اور تیرے باپ سے اسلام کی خاطر جنگ کی ہے (یعنی ابن عمرؓ) لیکن مجھے اس بات کا ڈر پیدا ہوا کہ میرے اس قول سے جماعت میں تفرق پیدا نہ ہو جائے اور لوگ میری اس بات کا مقصد غلط نہ لے بیٹھیں اور لوگوں کا خون بہنا شروع ہو جائے ۔ لیکن پھر میں نے جنت کی نعمتوں کو یاد کر کے خاموشی اختیار کر لی ۔ بخاری ج ۲ ص ۵۹ ۔

گویا ابن عمرؓ کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ کسی صورت میں کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں جس سے امت میں اختلاف پیدا ہو اور لوگوں کا خون بہنا شروع ہو جائے ۔ خواہ اس کام کے لیے ان کی ذاتی

خواہشات کیوں نہ پامال ہو جائیں۔ اور خواہ اپنے سے کم تر درجہ کے شخص کی اتباع کیوں نہ کرنی پڑے اس سے بڑا جہاد کیا ہو گا۔ یہ تو صوفیاء کی اصطلاح میں جہاد اکبر تھا اور پھر اس کے باوجود ابن عمرؓ کو حجاج نے شہید کرا دیا۔ لیکن انہوں نے اپنی ذات سے کوئی اختلاف پیدا نہیں ہونے دیا۔ اس سے بڑی شہادت کونسی ہو سکتی ہے۔

الغرض انہوں نے نہ صرف یزید کی بیعت کی بلکہ ان تمام لوگوں کو غدار قرار دیا جنہوں نے یزید کی بیعت کر کے بیعت توڑ دی تھی۔ اب اُن کے بارے میں یہ وصیت کہ ابن عمرؓ سے خطرہ ہے کہ وہ تمہاری مخالفت کریں گے۔ یہ قطعاً ایک فریب ہے۔

ان فرضی وصیتوں کے نام سے سبائیوں نے امت کو جو فریب دیا ہے۔ اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید کی مخالفت سوائے حضرت حسینؓ کے کسی نے نہیں کی اور سبائیوں کو اس کے لیے جواز تلاش کرنا تھا۔ لہٰذا زبردستی عبد الرحمان بن ابی بکرؓ اور ابن عمرؓ جیسی ہستیوں کو بھی اس میں گھسیٹ لیا گیا۔ کیونکہ حضرت حسینؓ کے لیے اس مخالفت کی سوائے اس کے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنی خلافت کے خواہاں تھے۔ لیکن اگر ابن عمرؓ کی موجودگی میں یزید خلافت کا حق نہ رکھتا تھا تو حضرت حسینؓ بھی خلافت کا حق نہ رکھتے تھے۔ بلکہ سبقت اسلام اور لحاظ فضیلت ان کا نمبر تو پندرہ سولہ افراد کے بعد آتا تھا۔ بلکہ خاندان بنی ہاشم میں بھی ایسے متعدد افراد موجود تھے جو اپنے اسلام اور علم و فضل کے لحاظ سے حضرت حسینؓ سے کہیں زیادہ درجہ رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن جعفرؓ اور ربیعہؓ بن حارث بن عبد المطلب وغیرہ۔

لیکن چونکہ سبائیوں کے نزدیک حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے علاوہ سبھی غاصب تھے۔ لہٰذا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ نے حق کی خاطر جان دی تو ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ چونکہ خلافت آل علی ہونے کی وجہ سے ان کا حق تھا اور وہ یہ حق وصول کرنے عراق گئے تھے اور اسی حق کی وصولی کے لیے جان دی۔ یعنی حق خلافت۔ لہٰذا انہوں نے حق کے لیے جان دی۔ واہ رے سنی قربان جائیے تیری سادگی کے کہ تو کچھ بھی نہ سمجھا۔

۵۔ خضری نے وصیت کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ قطعاً صحیح نہیں ہیں۔ بلکہ ابتدائی الفاظ میں ترمیم کی گئی ہے۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ ترمیم کس نے کی۔ خضری نے وقوعہ کی صورت یہ نقل کی ہے کہ امیر معاویہ نے وصیت لکھوا کر ضحاک بن قیس اور مسلم بن عقبہ کے سپرد کی اور ان سے کہا کہ یہ وصیت یزید کو دے دینا۔ ہمارے نزدیک یہ الفاظ قطعاً درست نہیں۔ کیونکہ حافظ ابن کثیر نے ابن جریر کے حوالہ سے ابومخنف کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔

کہ معاویہؓ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اپنے بیٹے یزید کو بلایا اور اس سے کہا اے میرے بیٹے۔ پھر وہ وصیت مذکور ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ البدایۃ والنہایہ ج ۸ صـ۱۱۵۔

ان الفاظ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وصیت لکھوا کر کسی کے ہاتھ بھجوائی نہیں گئی تھی۔ بلکہ براہ راست یزید کو کی گئی تھی۔ لیکن روایتوں کے پجاریوں نے جب یہ دیکھا کہ یزید تو امیر معاویہؓ کی وفات کے وقت موجود نہ تھا۔ جس سے اس وصیت نامہ کا موضوع ہونا ثابت ہو رہا تھا اور یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ سب بکواس ابوالمخنف رافضی کی ہے اور چونکہ ہمارے سنی بھائی کسی روایت کو کبھی رد نہیں کرتے لہٰذا اس میں ترمیم کر کے اس پر ایمان لے آئے۔ حالانکہ یہی ابومخنف یہ بھی بیان کر رہا ہے۔

کہ جب معاویہؓ کی موت واقع ہوئی تو ضحاک بن قیسؓ منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا۔ اور معاویہؓ کا کفن ان کے ہاتھ میں تھا۔ خطبہ سے فراغت کے بعد نیچے اترے اور یزید کو اطلاع دینے کے لیے سوار روانہ کرائے۔ تاکہ یزید جلد از جلد دمشق آجائے۔ البدایۃ النہایہ ج ۸ صـ۱۴۳۔

یہ دونوں روایات متضاد ہیں اور دونوں روایتیں محمد بن جریر طبری شیعہ نے ابومخنف رافضی سے نقل کی ہیں اور ابومخنف نے یہ دونوں روایتیں عبدالملک بن نوفل سے نقل کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک جھوٹ ہے اور اس پر تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ امیر معاویہؓ کی وفات کے وقت یزید دمشق میں موجود نہ تھا۔ لہٰذا ابومخنف کی پہلی کہانی یعنی یہ وصیت نامہ بحضور معاویہؓ ہی وضع کیا گیا اور اس کا واضع ابومخنف ہے اور مبلغ طبری ہے۔

ابو مخنف : اس کا نام لوط بن یحیٰی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے داستان کربلا "مقتل حسین" کے نام سے وضع کر کے سبائیوں کے ہاتھوں میں تھمائی ہے۔ یہ ان کی سب سے متبرک کتاب ہے۔ اس کی داستانیں محرم میں تلاوت کی جاتی ہیں۔ مورخ ابن جریر نے اس کی داستانوں کو اپنی کتاب کی زینت بنایا ہے۔ یہ دونوں مودودی صاحب مرحوم کے بہت چہیتے مورخ ہیں بقول ان کے اگر ان کی روایات کو چھوڑ دیا گیا تو ہمارے پاس کیا بچے گا۔

حافظ ابن حجرؒ "لسان المیزان" اور حافظ ذہبی "میزان الاعتدال" میں لکھتے ہیں۔

یہ شخص مؤرخ ہے، مصنف ہے، اسے ابو حاتم وغیرہ نے متروک قرار دیا ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ یحیٰی بن معین کہتے ہیں یہ کچھ نہیں۔

ابن عدی کا بیان ہے کہ یہ تو ایک آگ پھیلانے والا شیعہ ہے اور شیعوں کا مورخ ہے۔ صعق بن زہیر اور جابر جعفی جیسے رافضیوں سے روایات نقل کرتا ہے۔ اس سے مورخ مدائنی اور عبدالرحمان بن مغراء وغیرہ نے روایات لی ہیں ۱۷۰ھ سے قبل اس کی وفات ہوئی۔ لسان المیزان ج ۴ صفحہ ۴۹۲، میزان الاعتدال ج ۳ صفحہ ۱۹۔

ابو عبید الآجری کا بیان ہے کہ میں نے ابو حاتم رازی سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے فرمایا کہ کیا اس جیسے شخص کے بارے میں بھی کسی سے کچھ پوچھا جاتا ہے؟ عقیلی نے اس کا ذکر کتاب الضعفاء میں کیا ہے۔ لسان المیزان ج ۴ صفحہ ۴۹۲۔

عبدالرحمان بن ابی حاتم کا بیان ہے کہ میرے والد ابو حاتم رازی فرماتے تھے۔ ابو مخنف متروک ہے۔ الجرح والتعدیل ج ۷ صفحہ ۱۸۲۔

قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس وصیت کی آگ کس نے لگائی ہے۔ ہمیں تو اس پر افسوس ہے کہ جسے شیعوں کا مورخ قرار دیا جا رہا ہے۔ اس سے خضری اور ابن کثیر جیسے لوگ روایات لے رہے ہیں اور خاص طور پر حافظ ابن کثیر ایک محدث ہونے کے ناطے یہ ضرور جانتے ہونگے کہ ابو مخنف کے بارے میں محدثین کا کیا فیصلہ ہے۔ لیکن پھر بھی تمام سنی آنکھیں بند کر کے شیعہ داستانیں نقل کرتے چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسی لغزشوں سے محفوظ رکھے۔

یا علی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی

کی تفسیر

موسیٰ جار اللہ ترکستانی کے قلم سے

جب آنحضورؐ سفر تبوک پر روانہ ہونے لگے تو حضرت علیؓ کو اہل وعیال کی نگرانی کے لیے جانشین بنا گئے، حضرت علیؓ نے عرض کیا میں نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ آپ کہیں تشریف لے جائیں اور میں آپ کے ساتھ نہ ہوں، حضور نے فرمایا۔ کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تم میرے حق میں ویسا ہی بنو جیسا کہ موسیٰؑ کے حق میں ہارونؑ تھے؟ بس یہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

مماثلت ہارون و علیؓ: شیعہ اور ان کے عقائد کی کتابیں کہتی ہیں کہ اس تمثیل میں جو عمومیت منزلت ہے وہ مساوات کی مقتضی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہارونؑ زندہ رہ جاتے تو ان پر جانشینی میں کوئی دوسرا سبقت نہ لے جا سکتا تھا۔

حدیث کی سند صحیح ہے اور عام لوگ (یعنی سنّی) اور شیعہ دونوں ہی اس پر متفق ہیں لیکن میں نے با کسی اور صاحب علم نے اس حدیث کے متن اور اس کے مفہوم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ حتیٰ کہ ان حضرات نے بھی ادھر توجہ نہ دی جو دونوں فرقوں کی کتابوں کی اچھی طرح چھان پھٹک کرتے رہے۔ جیسے امام ابن حزم، امام رازی، امام قرافی، امام رحمت اللہ ہندی (مصنف اظہار الحق) صاحب قول الفسیح فی تفقۃ عبد المسیح اور امام بقاعی مصنف اعلم التفسیر وغیرہ۔

رسالت معصومہ کی جب کوئی بات کرے تو اس کی بات کو محض سرسری اور بے سوچے سمجھے کہا جانے والا کلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خصوصاً اس وقت جب کہ بات کہنے کا موقعہ ایک ایسا تاریخی موقعہ ہو۔ جس کے افادی پہلو کو دانشور غنیمت سمجھے اور نبی اپنی تبلیغ اور وضاحت فرما رہا ہو، آنحضورؐ صاحب القرآن ہیں۔ تمام انبیاء سے زیادہ قوت فیصلہ رکھتے ہیں اور تمام دانشوروں سے

زیادہ متنقبل پر نظر رکھنے والے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں اعلم الصحابہ (تمام صحابہ میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے یعنی حضرت علیؓ) ایک شکوہ کر رہے ہوں اور اس کے جواب میں جو تبلیغی موقعہ مل رہا ہے، اسے ہاتھ سے جانے دیں، خصوصاً جب کہ مسئلہ بھی ایسا اہم ہو جس پر آپ کے بعد امت کی صلاح و فلاح منحصر ہو۔ یعنی مسئلہ خلافت۔

منزلت کا مفہوم اس لیے میں نے اپنے آپ سے ایک سوال کیا اور سوچا کہ آخر منزلہ ہارون من موسیٰؑ کا مطلب کیا ہے۔ میں نے قرآن اور تورات کی روشنی میں منزلت کے مختلف پہلوؤں پر غور و تحقیق شروع کر دی۔ آنحضورؐ نے اپنے ارشاد کی عمومیت سے خود ہی نبوت کو مستثنیٰ فرما دیا ہے۔ اس لیے میں نبوت کے سوا منزلت کے دوسرے پہلوؤں پر گفتگو کروں گا۔

(۱) وَقَالَ مُوسٰى لِاَخِيهِ هٰرُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ
الاعراف ۱۴۲

اور موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ میرے (کوہ طور پر جانے کے بعد) تم میری قوم میں میرے جانشین ہو (ان کی) اصلاح کرتے رہنا اور شریروں کے رستے نہ چلنا

یہ منزلت وہ خلافت ہے جو موسیٰؑ کی چند روزہ غیر موجودگی میں مختصر سی نیابت تھی۔ اور وہ بھی ایک جزئی قسم کے معاملے میں۔

(۲) وَلَمَّا رَجَعَ مُوسٰى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِنْ بَعْدِي۔ الاعراف ۔ ۱۵۰

اور جب موسیٰؑ اپنی قوم میں نہایت غصے اور افسوس کی حالت میں واپس آئے تو کہنے لگے کہ تم نے میرے بعد بہت ہی بداطواری کی۔ یہ وہ بے چینی ہے جو چند روزہ نیابت میں پیدا ہوئی حتیٰ کہ آپ نے الواح تورات کو الگ رکھ کر اپنے بھائی (ہارونؑ) کے سر کے بال پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔

ہارونی خلافت اور علیؓ کی خلافت : تین خلافتوں کے بعد امام علیؓ کی خلافت کو اس ہارونی خلافت

ان کا کوئی معاملہ ٹھیک نہیں بیٹھا۔ جیسے ہارونؑ کی چند روزہ خلافت
سے کیسی زبردست مشابہت ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ تورات
بنی اسرائیل کا معاملہ ٹھیک نہیں رہا۔ قرآن کریم نے اس کی تلافی کرتے ہوئے ہارونؑ کو
کے بیان کے مطابق یہ بچھڑا خود ہارونؑ نے ڈھالا تھا۔ اگرچہ منہ بولے فرزندانِ شیعہ نے علیؓ کے بارے میں ویسا ہی اتہام
اس اتہام سے بالکل بری قرار دیا ہے۔
لگایا ہے جو یہود نے ہارونؑ پر لگایا تھا۔

تورات سفر العدد (۱۸ : ۱) میں ہے اور اللہ نے ہارون سے کہا کہ مقدس

تورات کی تفصیل : کا بار گناہ تجھ پر اور تیرے فرزندوں اور تیرے آبائی خاندان پر ہوگا۔ اور
تمہارے کہانت کا بار گناہ بھی تجھ پر اور تیرے فرزندوں پر ہوگا۔" پھر (۱۸ : ۲۲) میں ہے اور
آئندہ بنی اسرائیل خیمہ[1] اجتماع کے پاس ہرگز نہ آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گناہ ان کے ذمے لگے اور
وہ مر جائیں۔ بلکہ بنی لاوی[1] خیمہ اجتماع کی خدمت کریں اور وہی ان کا بار گناہ اٹھائیں۔ تمہاری پشت
در پشت یہ ایک دائمی آئین ہو اور بنی اسرائیل کے درمیان ان کو کوئی میراث نہ ملے۔" اس سے پہلے
۱۸ : ۲۰ میں ہے اور خداوند نے ہارونؑ سے کہا کہ ان کے ملک میں تجھے کوئی میراث نہیں ملے گی
نہ ان کے درمیان تیرا کوئی حصہ ہوگا۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں تیرا حصہ اور تیری میراث میں ہوں۔
اس کے بعد سفر استثنا (۱۸ : ۱) میں بھی ہے کہ : لاوی کاہنوں[2] (یعنی لاوی کے قبیلے) کا
کوئی حصہ اور میراث اسرائیل کے ساتھ نہ ہو۔ (ایضاً : ۲) خداوند کی میراث ہے۔ (ایضاً : ۵) کیونکہ
خداوند تیرے خدا نے اس کو تیرے سب قبیلوں میں سے چن لیا ہے تاکہ وہ اور اس کی اولاد
ہمیشہ خداوند کے نام سے خدمت کے لیے حاضر رہیں۔"
یہ ہیں تورات کی واضح اور روشن نصوص کہ ہارونؑ اور ان کی تمام اولاد کے لیے اسرائیل کی

---

[1] لاوی بن یعقوب کی طرف نسبت ہے۔ [2] یہود کا عبادت خانہ
[3] پروہت۔

زمین میں کوئی حصّہ نہیں اور میراث کی تقسیم میں وہ حقدار کی حیثیت نہیں رکھتے۔ کسی کاہن اور کسی لاوی کا حکومت میں کوئی حصّہ نہیں ان کا کام بس خیمۂ اجتماع کی خدمت کرنا ہے۔

عجیب لطیف اور انوکھا اندازِ بیان یہ ہے کہ جس چیز کو لوگ محرومی سمجھتے ہیں اسے تورات نے موسیٰ کے اقارب کے لیے سب سے بڑا شرف بنا دیا ہے اور یوں فرما دیا کہ: بنی اسرائیل کی زمین میں تیری کوئی میراث نہیں اور ان کے درمیان میں تیرا حصّہ اور تیری میراث ہوں۔"

یعنی زمین سے محروم کر کے آسمان اور رب السموٰت تک پہنچا دیا۔ موسیٰؑ اور ہارونؑ اور ان کی اولاد کے لیے دنیا نہیں۔ ان کے لیے اللہ ہے اور آسمانی نعمتیں ہیں "میں ہوں تیرا حصّہ اور تیری میراث، بنی اسرائیل کے درمیان" گنتی (۱۸: ۲۰)

یہ وہ آسمانی، نبوی اور خداوندی عبادت ہے جس کی اعلیٰ بلاغت و معنویت نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہی حقیقت ہر رسول کے قول میں جھلک رہی ہے۔ ہر نبی نے اپنی قوم سے یہی کہا ہے۔

وَلَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (ہود: ۲۹)

میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا تو اجر صرف رب العالمین ہے۔

تورات مختلف اسفار کے متعدد ابواب میں بیان فرما دیا گیا ہے۔ موسیٰؑ نے خود اپنے آپ کو حکومت سے محروم رکھا اور ہارون کو مقدس خلعت دے کر ان تمام حقوق سے محروم کر دیا جن کے وہ حقدار ہو سکتے تھے۔ ہارونؑ اگر موسیٰؑ کے بعد زندہ رہتے تو ان کا کوئی حصّہ نہ ہوتا۔ یشوع (یوشع بن نون) موسیٰؑ کے بعد قائد ہوئے لیکن استخلاف (جانشین) بننے سے نہیں بلکہ اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہو گئے اور یوشع ہی کی خاطر ہارونؑ کو بھی علیحدہ رکھا۔ کیونکہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کو ان عارضی حقوق سے اللہ نے پہلے ہی محروم کر دیا تھا۔ یہ تمام باتیں تفصیل کے ساتھ تورات کی کتاب خروج کتاب عدد (گنتی) اور کتاب استثناء میں موجود ہیں۔

نسبی بنیاد پر کوئی حق نہیں۔ اب آنحضورؐ کے اس ارشاد پر غور کیجیے۔ جو آپ نے علیؓ

سے فرمایا تھا کہ کیا تم اس بات سے راضی نہیں کہ تم میرے لیے وہی ہو جو موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ تھے۔ اگر کوئی اسے حضورؐ کے معجزات میں شمار کرے تو بالکل بجا ہو گا۔ آپ اُمّی ہیں لیکن گفتگو ایسی فرما رہے ہیں جو پوری تورات پر عبور کامل رکھنے والا کر سکتا ہے۔ حضورؐ کا یہ ارشاد (کہ تم میرے لیے ایسے ہی ہو جیسے موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ تھے) ایک قطعی ثبوت ہے اس بات کا کہ حضورؐ کے اہل خاندان کا، علیؓ اور اہل بیت کی امت کے درمیان کوئی میراث نہیں اور ان میں سے کسی ایک کے لیے۔ خواہ وہ علیؓ اور ان کی اولاد ہو یا عباسؓ اور ان کی اولاد ہو۔ نسبی بنیاد پر کوئی حق نہیں اور اہل بیت کا کوئی حصہ نہیں۔ مگر یہ کوئی محرومی نہیں بلکہ ان کی اعلیٰ قدروں کی نشاندہی ہے اور ہر امت کے ہر نبی کی شریعت مقدسہ کا یہی پیغام ہے۔ ہر نبی اور ہر رسول جسے اللہ نے بھیجا یہی کہتا رہا کہ

ولا اسئلکم علیہ من اجران اجری الا علی رب العٰلمین۔ الشعراء - ۱۸۰ (میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا ہوں میرا اجر رب العالمین ہے)

صاحب تورات موسیٰؑ چالیس سال تک بیابان میں مارے پھرے مگر اس ارض مقدس میں داخل ہونے سے محروم رہے جو ان کے لیے لکھ دی گئی تھی۔ بس اس جگہ کو پہاڑ کی بلندیوں سے دیکھتے رہے۔ ساریکم دار الفاسقین: لیکن صاحب القرآن محمدؐ اپنی مستحکم فرماں روائی کی کرسی پر جمے رہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دہیں جمے ہوئے ہیں۔ اور اپنی رحلت سے پہلے وہی کیا جو موسیٰؑ[۴۱] نے اپنی وفات سے پہلے کیا۔ تورات کتاب استثناءؑ (۳۱ : ۷) میں ہے کہ پھر موسیٰؑ نے یشوع کو بلا کر سب اسرائیلیوں کے سامنے اس سے کہا کہ تو مضبوط ہو جا اور حوصلہ رکھ کیونکہ تو اس قوم کے ساتھ اس ملک میں جائے گا جس کو خداوند نے ان کے باپ دادا سے قسم کھا کر دینے کو کہا اور تو ان کو اس کا وارث بنائے گا۔ اور خداوند ہی تیرے آگے آگے چلے گا۔ وہ تیرے ساتھ رہے گا۔ وہ نہ تجھ سے دست بردار ہو گا نہ تجھے چھوڑے گا۔ سو تو خوف نہ کر اور بے دل نہ ہو۔

صاحب قرآن بھی آخری ایام حیات میں صاحب تورات ہی کے نقش قدم پر چلے۔ جب

صحابہ سے حجۃ الوداع کی تھکن اتر گئی تو حضورؐ نے صدیقؓ و فاروقؓ اور بعض دیگر صحابہ سے شام کی طرف لشکر بھیجنے کی تیاری کا مشورہ فرمایا۔ تیاری شروع کر دی اور تیس ہزار نفوس سے زیادہ کا لشکر تیار ہو گیا۔ جس میں اعیانِ صحابہؓ اور بڑے بڑے مہاجرین اور انصار شامل تھے اور اس کی قیادت اسامہؓ بن زیدؓ بن حارثہ کے سپرد کی اور فرمایا کہ: وہیں جاؤ جہاں تمہارا باپ شہید ہوا تھا۔ یعنی موتہ (شام کا بلند علاقہ) جہاں اسامہؓ کے والد زیدؓ بن حارثہ اور جعفرؓ بن ابی طالب ر اور عبداللہؓ بن رواحہ شہید ہوئے تھے۔

آنحضورؐ کے بعد صدیقؓ کا مقام: آغاز ربیع الاوّل میں حضورؐ کے مرض نے شدت اختیار کی اور آپ پلنگ سے لگ گئے۔ یہ ام المؤمنین میمونہؓ کا حجرہ تھا (جہاں سے بعد میں حضورؐ حجرۂ عائشہؓ میں ہمیشہ کے لیے تشریف لے گئے) حضورؐ نے صدیقؓ کو نماز پڑھانے کا بھی حکم دیا اور لشکرِ اسامہؓ کو روانہ کرنے کا بھی حکم فرمایا۔

شارع کی یہ حکیمانہ تدبیر اس لیے تھی کہ تمام سیاسی حکومتوں کی قوت کے مقابلے میں اس اسلامی قوت کو قائم کیا جائے جس کے نظام میں تمام افراد برابر ہیں۔

لشکر روانہ کرتے وقت حضورؐ نے یہ الفاظ فرمائے کہ: ڈٹے رہو۔ حوصلہ رکھو۔ کوئی خوف و دہشت نہ کرو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔" یعنی آنحضورؐ کے بعد امتِ محمدیہؐ میں صدیقؓ کا ویسا ہی مقام ہے جیسا یوشعؑ کا مقام امتِ موسیٰؑ میں رہا۔ موسیٰؑ کی زندگی میں بھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی صلی اللہ علیٰ محمد وعلیٰ صحبہ و علیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین۔

ہاشمی کا کوئی حق نہیں

بمنزلہ ہارون من موسیٰؑ والی حدیث صحیح ہے ثابت ہے شیعی بھی امامت بھی یکے بعد دیگرے اسے قبول کرتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا ہمارے ہاتھ میں یہ ایک قطعی تسلیم شدہ بات ہے۔

رسولِ معصوم نے اسے فرمایا۔ مگر اپنی خواہش سے نہیں۔ ان ھو الا وحی یوحی۔ اگر آنحضورؐ اسفار تورات کو نہیں جانتے تو وہ خدا تو جانتا تھا جس نے اسے موسیٰؑ پر نازل کیا۔ یہ ایسی بدیہی حقیقت اور قطعی واقعہ ہے جو ایمانیات کا جزو ہے۔

لہٰذا اہل بیت اور عشیرۂ نبویؐ اور کسی ہاشمی کے لیے امت کے درمیان کوئی حصہ اور کوئی میراث نہیں۔ نیز خلافت میں بھی عشیرۂ نبیؐ کے کسی فرد کا کوئی حق نہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ اہل بیت سے دنیا اور خلافت کو الگ رکھا ہے یہ ان کا ایک شرف ہے۔ جو نبوت اور نبوی گھرانے کو (الزام خود غرضی و خویش پروری سے) بری رکھنے کے لیے تھا۔ اللہ کی قدیم شریعت میں بھی ایسا ہی تھا۔ جو شرع اسلام میں بھی باقی رہا۔

عرب کے جس گھرانے کو بھی تاریخ اسلام میں کوئی حکومت ملی۔ اس پر اللہ کا یہ قول صادق آیا۔

فھل عسیتم ان تولیتم ان تفسدوا فی الارض و تقطعوا ارحامکم ہ اولٰئک الذین لعنھم اللہ فاصمّھم واعمٰی ابصارھم سورت محمد۔ ۲۲۔ ۲۳	(اے منافقو) تم سے عجیب نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ تو ملک میں خرابی کرنے لگو اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

یہ آیت گویا ایک قرآنی پیشین گوئی ہے جو اپنی انتہائی بُری شکل میں اموی و عباسی خاندانوں پر صادق آتی ہے [۱] جو ممنوعہ چراگاہ کے ارد گرد چکر لگائے گا وہ ممکن ہے کہ اس کے اندر پہنچ جائے

---

[۱] فاضل مصنف معلوم نہیں مخلصانہ جوش میں کیا کچھ کہہ گئے ہیں۔ یہ ایسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیبیہ میں حضورؐ نے خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کے لیے سب سے بیعت لی تھی۔ مگر جن لوگوں نے شہادت عثمانؓ کے بعد قصاصِ عثمانؓ نہیں لیا یا نہیں لینے دیا۔ ان پر یہ آیت صادق آتی ہے۔ فمن نکث فانما ینکث علی نفسہ علاوہ ازیں۔ اگر آیت ۲۲/۴۷ سب عرب گھرانوں پر صادق آتی ہے تو آیت استخلاف کس پر صادق آئے گی ؟

اس لیے اللہ نے خاندان نبوی سے بھی اپنی شرع میں خلافت سے دور ہی رکھا اور انبیاء نبی سے بھی ؟ اس لیے خلافت ان میں سے کسی کو نہیں ملی اور اس طرح اللہ نے ان کو بعید قسم کے شائبہ اتہام سے بری رکھا اور آپ کے ابناء کو (؟) اعزاز دینے کی غرض سے اپنے لیے چن لیا۔ دنیا میں ان کا حصہ اللہ اور اس کا عرش ہے۔

صدیق و فاروق کی فضیلت : صدیق اکبرؓ سب سے زیادہ سچے اور یاد رکھنے والے صحابی ہیں۔ ان سے ایک ارشاد نبوی یوں مروی ہے۔ اللہ نے اس بات سے ابا (انکار) فرما دیا ہے کہ اہل بیت کے لیے نبوت اور خلافت دونوں کو یکجا کر دے ایسی ہی روایت فاروق اعظمؓ سے بھی ہے اور امت اسے بھی یکے بعد دیگرے قبول کرتی چلی آئی۔ اگر شیعہ اسے قبول نہیں کرتے تو حدیث منزلت (انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ) کا مفہوم و معنی بھی تو یہی ہے اور علیؓ کو جو صحابہؓ نے مجلس شوریٰ میں داخل کیا اس سے اس کا کوئی تناقض نہیں۔ وراثت کی بناء پر استحقاق ہونا اور چیز ہے اور امت کا اپنی پسند سے کسی کو منتخب کرنا دوسری شئے ہے۔ ہر ایک اسی امت کا فرد ہے اور ہر فرد کے حقوق یکساں ہیں۔

حضورؐ نے ہاشمی فرد کو عہدہ نہیں دیا : حضورؐ نے اپنے عہد میں اپنے قرابت مندوں کو حکومت وولایت سے دور رکھا۔ اور کسی ایک ہاشمی کو بھی اپنی زندگی میں کہیں کا عامل (سرکاری عہدیدار) نہیں بنایا[1] آپ کے چچا عباسؓ نے عہدہ طلب کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ :۔

---

[1] صرف یہی نہیں بلکہ ام المومنین بننے کا شرف بھی کسی ہاشمی عورت کو نہیں نصیب ہوا۔ امہات مومنین میں اموی، مخزومی اسدی، مصطلقی، ہلالی، مازنی، ہوازنی، نضیری، عدوی، تیمی، لوی، عزومی، قبطی، سارے قبائل کی ازواج مطہرات ہیں لیکن ہاشمی خاتون ایک بھی نہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ بھی ہے اور وہ یہ ہے: اوّلون السابقون صرف تین ہاشمی ہیں، علیؓ، جعفرؓ، اور حمزہؓ لیکن اموی نو یا گیارہ ہیں جنہوں نے ایمان لانے میں سبقت حاصل کی۔

اے چچا اپنی جان (یا عزت) کو محفوظ رکھنا اس حکومت سے کہیں بہتر ہے جسے تم نہ سنبھال سکو۔ آنحضورؐ اور صدیقؓ و فاروقؓ کے عہدیداروں میں کوئی ہاشمی فرزند نہ تھا[1]۔ کیونکہ قرابت نے ولایتِ حکومت سے باز رکھا۔ آنحضورؐ عامل بنانے میں صرف یہ ملحوظ رکھتے کہ وہ اس کا اہل ہو اور طلبِ حکومت سے بے نیاز ہو۔ عموماً بنی امیہ کے بڑوں کو عامل بنانے میں مقدم رکھتے اور اس میں جہاں تقاضائے عدل تھا وہاں یہ مقصد بھی تھا کہ کنبہ نوازی کے ادنیٰ الزام سے کوسوں دور رہیں اور نبوی گھرانہ پاک صاف رہے۔

نبی کا بھی اس کی رسالتؐ کی وجہ سے کوئی حصّہ نہ تھا۔

قل ما سألتکم من اجر فھو لکم ان اجری الا علی اللہ۔ — اے نبیؐ آپ کہہ دیجئے میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر صرف اللہ کے ذمے ہے۔

اور اللہ نے آنحضورؐ کے خاندان اور کاشانۂ نبوت کے ہر گوشے کو ہر طرح کے شائبے سے پاک و محفوظ کر دیا۔ اس لیے قضا و قدر نے اہل بیت اور نسلِ نبیؐ کو خلافت، مالی وراثت اور درہم و دینار سے دور رکھا اور آپؐ کی قدر و منزلت کے مطابق شرع کا حکم بھی آیا۔ اس مطابقت میں تمام سیاسی مصلحتیں مضمر تھیں۔ یعنی اس وقت کی رعایت ملحوظ تھی۔ جس پر حکومت اسلامی کو قائم ہونا تھا۔ یوں سمجھئے کہ آغازِ اسلام میں حکومتی قوت قریش تھے اور قریش اپنی اجتماعی جبلت کی وجہ سے اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ نبوت اور خلافت دونوں ہاشمی گھرانوں میں یکجا ہو جائیں اور ہاشمی گھرانہ فخر و بلندی

---

[1] صدیقؓ و فاروقؓ نے اپنی اولاد اور رشتہ داروں کو عہدوں سے دور رکھا۔ عثمانؓ نے دو ایک اموی کو عہدہ دیا۔ علیؓ نے بہت سے ہاشمیوں کو عہدے دیے بلکہ اپنے فرزند حسن کو آخری وقت میں اپنے مصلّے پر کھڑا کر دیا اور معاویہؓ نے اپنے فرزند یزید کو نامزد کر دیا۔ پھر یہ ایک خاندانی رسم ہو گئی نامزدگی اگر بربنائے اہلیت ہو تو (Selection) ہے اور یہ موجودہ (Election) سے بہتر ہے گویا نامزدگی حضرت علیؓ نے اپنے بیٹے حسن کو اپنا جانشین بنا کر ابتدا کی۔

میں آسمان تک چلا جاتا۔

فاروق اعظمؓ نے ابن عباسؓ سے کہا تھا کہ تم اہل خاندانِ نبوت سے تعلق رکھتے ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قوم نے تمھیں آگے جانے سے باز رکھا؟ ابن عباسؓ بولے بخدا میں نہیں سمجھ سکا مگر ہم اندر سے ان کے خیر خواہ اور خوش گمان ہی رہے۔ فاروقؓ نے فرمایا کہ قریش کو یہ بات پسند نہ تھی کہ نبوت اور خلافت تمہارے لیے یکجا ہو جائے اور تم لوگ فخر و غرور سے ناز کرتے ہوئے آسمان میں چلے جاؤ۔ شاید تم کہو کہ صدیقؓ نے تم لوگوں کو پیچھے رکھا۔ ایسا نہیں اور نہ یہ ان کا مقصد تھا۔ دراصل ان کے سامنے جو نازک مرحلہ تھا اس میں انھوں نے نہایت تدبیر و احتیاط سے کام لیا۔ اگر میرے بارے میں ان کی رائے نہ ہوتی تو تم ہی لوگوں میں اس کا بڑا حصہ چھوڑ جاتے۔ لیکن اگر ایسا کرتے تو تمہاری قوم تمہیں خوش آمدید نہ کہتی۔ تمھیں وہ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے بیل اپنے قصائی کو دیکھتا ہے

سیاست کا یہ وہ پہلو ہے جسے علیؓ بھی سمجھتے تھے اور تمام دوسرے لوگ بھی جانتے تھے ہر ایک کو یہی توقع تھی کہ خلافت اگر ایک مخصوص گھرانے کی میراث نہ بنی تو عرب کے مختلف قبائل اور مختلف گھرانوں میں گردش کرتی رہے گی اور اگر ایک بار بھی ہاشمی گھرانے میں گئی تو قیامت تک وہاں سے باہر نہ نکل سکے گی۔ اگر بنی قصی علم برداری اور آب رسانی اور دربانی کے معزز عہدوں کے علاوہ خلافت کا عہدہ بھی قبضے میں لے لیں تو دوسرے قریشیوں کے لیے کیا رہ جائے گا۔ یہ حکمت ہر قریشی جانتا تھا۔

شرع اسلام مطلق مساوات کی پیامبر ہے۔ اس لیے اس نے اس سیاسی پہلو کی پوری رعایت کو ملحوظ رکھا۔ اور ہاشمی گھرانے کے موروثی حق کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ اب اس کے لیے اتنا ہی حق باقی رہ گیا جتنا موقع ملنے پر امامت کے کسی دوسرے فرد کا ہو سکتا ہے۔ الوشیعہ از صـ۱۱۴ تا صـ۱۲۴۔

اس حدیث پر یہ بحث موسیٰ جار اللہ ترکستانی کی تھی۔

امام نووی رحمۃ اللہ المتوفی ۶۷۶ھ اس حدیث کی شرح میں قاضی عیاض کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس مسئلہ میں تمام روافض، شیعوں کے تمام فرقوں، اور امامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس حدیث

کی رو سے خلافت حضرت علیؓ کا حق تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وصیت فرمائی تھی۔ اسی سبب سے تمام روافض کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ (عیاذاً باللہ) کافر تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے حضرت علیؓ پر دوسرے کو مقدم کیا۔ بلکہ بعض رافضی تو اس کے دعویدار ہیں کہ علیؓ نے چونکہ اپنا حق طلب نہیں کیا۔ اس لیے وہ بھی کافر ہوئے۔

"قاضی عیاض المتوفی ۵۴۴ھ آگے لکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ فاسد اور خلافِ عقل کوئی مذہب ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ اس مذہب کی رو سے تمام امت کافر قرار پاتی ہے اور پوری شریعت اور دین اسلام کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے یہ امر قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علیؓ سب سے افضل ہیں اور نہ غزوۂ تبوک میں خلیفہ بنانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں اس لیے کہ حضرت ہارونؑ سے تشبیہ دی گئی ہے اور وہ حضرت موسیٰؑ کے بعد یقیناً خلیفہ نہیں ہوئے۔ بلکہ حضرت موسیٰ کی حیات میں انتقال فرما گئے تھے۔ حتیٰ کہ ایک قول تو یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ کا حضرت موسیٰ سے چالیس سال قبل انتقال ہوا ہے۔ جیسا کہ تمام مورخین کے نزدیک مشہور ہے اور حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے صرف چالیس دن کے لیے جانشین ہوئے تھے۔

قاضی عیاض اور امام نووی نے جو کچھ فرمایا ہے۔ وہی تمام اہل سنت کا مسلک ہے۔ لیکن یہ تصور کرنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو اپنی جگہ مدینہ کی امارت سپرد کر کے گئے تھے۔ تو یہ تخیل قطعاً غلط ہے۔ آپؐ حضرت علیؓ کو صرف اپنے گھر والوں کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ مدینہ کی امارت محمدؓ بن مسلمہ انصاری کے سپرد کی تھی۔ محدث ابن کثیر لکھتے ہیں۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پر محمدؓ بن مسلمہ انصاری کو خلیفہ بنایا۔ البدایۃ والنہایہ ج ۵ ص ۷۔

ابن کثیر آگے لکھتے ہیں

محمد بن اسحاق کا قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنے گھر والوں کی نگہداشت

کے لیے چھوڑا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ان کے ساتھ مدینہ میں رہیں۔

اس کی تائید صحیح مسلم کی حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ چھوڑا اور منافقین نے حضرت علیؓ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا تو انہوں نے آکر عرض کیا۔

تخلفنی فی النساء والصبیان — مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ رہے ہیں۔

مدینہ مردوں سے کلی طور پر خالی نہیں ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ انہیں عورتوں اور بچوں کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ عرض کیا تھا۔

الغرض اس امر پر تو روافض اور اہل سنت دونوں کا اتفاق ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس حدیث میں حضرت علیؓ کو حضرت ہارونؑ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اب اختلاف صرف اس امر کا ہے کہ یہ تشبیہ کس بات میں دی گئی ہے۔

علم بیان کی رو سے تشبیہ کے لیے چار چیزوں کا وجود شرط ہوتا ہے۔ مشبّہ، جسے تشبیہ دی جائے۔ مشبّہ بہ، جس چیز سے تشبیہ دی جائے۔ حرف تشبیہ، جس حرف یا لفظ کے ذریعہ تشبیہ دی جائے اور وجہ شبہ۔ جس سبب سے یہ تشبیہ دی جا رہی ہے۔

اس حدیث میں مشبّہ حضرت علیؓ ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام مشبہ بہ ہیں اور لفظ منزلہ حرف شبہ ہے۔ لیکن وجہ تشبیہ یہاں مذکور نہیں اور عام طور پر جب بھی کسی کو کسی سے تشبیہ دی جاتی ہے تو وجہ شبہ کا الفاظ میں کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ اسے سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذہن سے فیصلہ کرے کہ یہ تشبیہ کس بات میں دی جا رہی ہے اور علم بیان کا ایک اصول یہ ہے کہ وجہ تشبیہ کو الفاظ میں بیان کرنا خلاف فصاحت و بلاغت ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں بولتے ہیں کہ فلاں تو شیر ہے۔ کس بات میں شیر ہے یہ امر سننے والے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص یہ ہرگز نہ سمجھے گا کہ فلاں کے بھی ایسے ہی پنجے ہیں جیسے شیر کے پنجے ہوتے ہیں۔ سب کا ذہن اسی بات کی طرف جائے گا کہ یہ تشبیہ صرف بہادری میں ہے۔ نہ کہ صورت و شکل یا درندگی میں۔ حالانکہ اس جملہ میں بھی وجہ شبہ مذکور نہیں۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک امر کا تو فیصلہ فرما دیا کہ یہ تشبیہ نبوت میں نہیں ہے۔ ورنہ حضرت ہارونؑ تو نبی بھی تھے۔

الا انه لانبی بعدی — مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں

اب اگر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ تشبیہ خلافت کے باعث دی گئی ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ کو خلیفہ بنا کر گئے تھے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو اپنی جگہ چھوڑ کر گئے تو اس طرح حضرت علیؓ خلیفہ ہوتے اور تشبیہ خلافت میں ہوئی اور چونکہ انہیں خلیفہ نہیں بنایا گیا۔ لہٰذا ان کا حق غصب کیا گیا۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں حضرت علیؓ کو ہرگز خلافت نہ ملنی چاہیئے تھی۔ اس لیے کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے بعد خلیفہ نہیں ہوئے بلکہ یوشعؑ بن نون خلیفہ ہوئے تو اگر حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا جاتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تشبیہ غلط ہوتی اور نبی کی زبان سے کوئی غلط بات صادر نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو حضرت ہارونؑ سے تشبیہ دے کر صحابہ کو اس امر کی تلقین کر رہے ہیں کہ دیکھو میرے بعد علیؓ کو ہرگز خلیفہ نہ بنانا۔ کیونکہ ہارونؑ بھی موسیٰؑ کے بعد خلیفہ نہیں ہوئے تھے۔

بلکہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ حضرت علیؓ کو جب حضرت ہارونؑ سے تشبیہ دی گئی تو وہ حضرت موسیٰؑ کی حیات میں انتقال کر گئے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ حضرت علیؓ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں دنیا سے رخصت ہو جاتے، تو ایسا دعویٰ غیر صحیح قرار نہ دیا جا سکے گا۔

اسی طرح ہارونؑ کی نسل میں کوئی خلیفہ نہیں ہوا۔ لہٰذا ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ حضرت علیؓ کی اولاد میں کسی کو خلافت نہ ملے، اس طرح حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو ہمیشہ حق خلافت سے محروم کر دیا جائے۔ ان امور سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تشبیہ کسی اور ہی سلسلہ میں ہے۔ جس کی جانب لوگوں کا ذہن نہیں گیا ہے۔ ایک وجہ تو وہ ہو سکتی ہے جو سطور بالا میں موسیٰ جار اللہ نے تورات کے حوالہ سے بیان کی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب ہم قرآن پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ صاف نظر آتا ہے کہ حضرت ہارونؑ کی یہ وقتی خلافت قطعی ناکام ثابت ہوئی اور زبردست اختلاف کا شکار رہی ۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے جانے کے بعد سامری نے گوسالہ بنایا ۔ بنی اسرآئیل اسی کی پوجا کرنے لگے ۔ حضرت ہارونؑ نے روکنے کی کوشش کی، لیکن وہ ان کے قتل کے درپے ہو گئے ۔

حضرت موسٰیؑ جب واپس تشریف لائے اور یہ صورت حال دیکھی تو بھائی کا سر اور داڑھی پکڑ کر اپنی جانب گھسیٹا اور ان سے پوچھ گچھ شروع کی تو حضرت ہارونؑ نے بے بس ہو کر کہا ۔

یَا ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَکَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۔	اے میری ماں کے بیٹے ۔ قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے ۔ لہٰذا مجھے ظالم قوم کے ساتھ شامل نہ کیجیے ۔

الاعراف ۔ ۱۵۰

معلوم ہوا کہ حضرت ہارونؑ کی وقتیہ خلافت نہ صرف ناکام ہوئی بلکہ ان کی قوم نے انہیں قتل تک کی دھمکیاں دیں ۔ جس پر حضرت ہارونؑ بے بس ہو گئے اور لوگ ان کے قابو میں نہ آسکے ۔

لہٰذا ہم جب حضرت علیؓ کے دور خلافت پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح نظر آتی ہے کہ امت کے ایک بڑے گروہ نے ان کی بیعت نہیں کی ۔ کچھ لوگ تو قصاص عثمانؓ کے مسئلہ کے باعث ان سے برسرپیکار ہوئے اور بیشتر صحابہ نے یہ کہہ کر بیعت سے انکار کر دیا کہ ہم کسی مسلم پر ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار نہیں، جب سب لوگ آپ کی بیعت کر لیں گے تو ہم بھی آپ کی بیعت کر لیں گے ۔

یہ طریقہ کار تو ان لوگوں کا تھا جو حضرت علیؓ کے مخالف تصور کیے گئے اور جنہیں سبائی زبان و لہجہ میں قاسطین و ناکثین سے تعبیر کیا گیا ۔ اب ایک نمونہ حضرت علیؓ کے فدا کاروں کا بھی ملاحظہ کر لیجیے ۔

مورخ طبری میدان صفین میں قرآن اٹھائے جانے کے بعد کی صورت حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔

اس پر مسعر بن فدکی التیمی اور زید بن حصین الطائی جو بعد میں قاریوں کی ایک جماعت کے ساتھ خارجی

بن گئے تھے بولے۔

اے علیؓ جب تجھے کتاب اللہ کی دعوت دی جا رہی ہے تو تو اسے قبول کر، ورنہ ہم تجھے اور تیرے مخصوص ساتھیوں کو ان لوگوں کے ہاتھوں میں (امیر معاویہ کے ساتھی) دیدیں گے۔ یا جو سلوک ہم نے عفان کے بیٹے کے ساتھ کیا وہی تیرے ساتھ کریں گے (کامل ابن الاثیر میں ہے جس طرح ہم نے عثمانؓ بن عفان کو قتل کیا تھا۔ اسی طرح تجھے بھی قتل کر دیں گے) ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم اللہ عزوجل کی کتاب پر عمل پیرا ہوں ہمیں شامیوں کی یہ دعوت قبول ہے۔ اللہ کی قسم یا تو تجھے ضرور بالضرور اس پر عمل کرنا ہوگا یا ہم تیرا بھی وہی حشر کریں گے۔ (یعنی عثمانؓ جیسا حشر)

حضرت علیؓ نے فرمایا میری اس غیر رضامندی کو دماغ میں رکھو اور میری یہ بات یاد رکھو کہ اگر تم میری اطاعت کرتے ہو تو تمہیں جنگ کرنی چاہیئے اور اگر تم میری نافرمانی کرتے ہو تو تم جو بہتر سمجھو وہ کرو۔
ان لوگوں نے جواب دیا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ آدمی بھیج کر اشتر کو میدان جنگ سے واپس بلا لیجئے (یعنی آپ ہمارے حکم کے پابند ہیں۔) "تاریخ طبری ترجمہ خلافت راشدہ حصہ سوم ص۲۶۱"۔

اس سے قارئین کرام خود اندازہ فرمالیں کہ یہ شیعان علیؓ حضرت علیؓ کے کتنے ہمدرد تھے اور ان کے نزدیک حضرت علیؓ کی کیا پوزیشن تھی؟ حضرت علیؓ تو حضرت ہارونؑ کی طرح ایک بے بس انسان تھے انہیں تو مفت میں حضرت ہارونؑ کی طرح بدنام کر دیا گیا۔ کیونکہ یہودیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ گوسالہ ہمیں خود ہارونؑ نے بنا کر دیا تھا اور انہوں نے ہی گوسالہ کی عبادت کا انتظام کیا تھا۔ اسی طرح پاکستان کے نوزائیدہ خارجی اس کے دعویدار ہیں کہ حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ نے شہید کر دیا۔ نعوذ باللہ من ذلک

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی جملہ میں حضرت علیؓ کو حضرت ہارونؑ سے تشبیہ دے کر آئندہ کی پوری صورت حال بیان فرما دی۔ میں اس تشبیہ سے جو کچھ سمجھا ہوں وہ میں نے پیش کر دیا۔ اب یہ علماء کا کام ہے کہ اس پر غور کر کے کوئی اور وجہ شبہ ان کے ذہن میں ہو تو اسے واضح فرما دیں۔

اے اہلِ محشر اپنی نگاہیں نیچی کرلیں

سبائیوں نے حضرت فاطمہؓ کو ازواج مطہرات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر صاحبزادیوں پر فضیلت دینے کے لیے طرح طرح کی کہانیاں وضع کیں اور انہیں اس طرح پھیلایا کہ آج ہمارے بڑے بڑے اکابر علماء خطبوں میں صرف فاطمہؓ کا نام لیتے اور آپؐ کی دیگر صاحبزادیوں کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ جس کے نتائج یہ برآمد ہوتے ہیں کہ جاہل سنی، حضرت فاطمہؓ کے علاوہ آپؐ کی کسی صاحبزادی کے نام تک سے واقف نہیں۔ اپنی دینی ماؤں کے ناموں سے تو انہیں کیا واقفیت ہوتی، بلکہ بیشتر حضرات تو یہی تصور کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک ہی صاحبزادی تھیں جو بی بی فاطمہؓ اور خاتون جنت کے لقب سے ممتاز تھیں۔ ہزارہا داستانیں خاتون جنت کے نام سے عوام میں پھیلی ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک داستان ہم قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

یہ داستان کچھ اس طرح ہے۔

"حضرت ابوایوبؓ انصاری بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو عرش کے درمیان سے ایک منادی ندا کرے گا۔ اے جمع ہونے والو اپنی نگاہیں نیچی کر لو، تاکہ فاطمہؓ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پل صراط سے گزر جائیں۔ وہ بجلی کی طرح ستر ہزار حوروں کے ساتھ گزریں گی۔ اللآلی المصنوعہ فی احادیث الموضوعہ ج ۱ صفحہ ۴۰۲۔ میزان الاعتدال ج ۱ صفحہ ۵۳۴۔

ہمارے نزدیک اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ جنت کی حوروں کو حضرت فاطمہؓ کا ساتھ دینے کے لیے پہلے تو جنت سے کھینچ کر میدانِ حشر میں لایا جائے گا اور پھر حضرت فاطمہؓ کے ساتھ انہیں پل صراط سے بھی گزارا جائے گا۔

ہماری معلومات کے مطابق پل صراط سے صرف انسانوں اور جنات کا گزر ہوگا۔ نہ کہ اس مخلوق

کا جو سرے سے مکلف نہ ہو۔ ان بیچاریوں کو بزبردستی کی سزا دی جائے گی۔ جو خلاف عقل و نقل ہے۔

۲۔ حوریں مردوں کے لیے ہوں گی۔ جو مرد جنت میں داخل ہوں گے یہ ان کی زوجیت میں دی جائیں گی۔ ارشاد الہٰی ہے۔

وَزَوَّجْنٰهُم بِحُورٍ عِينٍ الطور ۲۰ اور ہم نے ان کا حورعین سے نکاح کر دیا۔

عورتوں سے ان بیچاری حوروں کا کیا واسطہ ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ ان بیچاریوں کو کوئی مرد ہی نہ ملا ہو اور یہ ٹھنڈی سانسیں بھر کر اپنا وقت پورا کر رہی ہوں اور دل کو بہلانے کے لیے میدان حشر میں آپہنچ گئی ہوں۔

ابوالفضل جلال الدین عبدالرحمان بن کمال سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں۔ اس کے راوی محمد بن یونس الکدیمی، حسین بن حسن الاشقر، قیس بن الربیع اور طریف بن سلیمان ہیں جو یہ روایت ایک دوسرے سے نقل کر رہے ہیں۔ چاروں متروک ہیں۔ اللالی المصنوعہ ج ۱ ص ۴۰۔

سیوطی نے سب سے آخری راوی یعنی اصبغ بن نباتہ کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اس کذب و افتراء میں سب کا استاد ہے۔ ہم ان پانچوں راویوں پر جدا جدا گفتگو کریں گے۔

محمد بن یونس الکدیمی : یہ بصرہ کا باشندہ ہے۔ ذہبی لکھتے ہیں۔ اس کا شمار متروکین میں ہوتا ہے۔ ۱۸۵ھ میں پیدا ہوا، اور ۲۸۶ھ میں اس کی موت واقع ہوئی اس کی عمر سو سال سے زیادہ ہوتی ہے۔

ابن عدی کہتے ہیں اس پر وضع حدیث کا الزام ہے۔ اس نے بہت سے ایسے لوگوں سے روایات سننے کا دعویٰ کیا ہے جن کو اس نے زندگی میں بھی نہ دیکھا تھا۔ ابن حبان لکھتے ہیں۔ اس نے ایک ہزار سے زائد روایات وضع کی ہیں۔ امام ابوداؤد، امام موسیٰ بن ہارون اور امام قاسم بن المطرز برملا اسے کذاب کہا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ قاسم بن زکریا المطرز المتوفی ۳۰۵ھ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ کل جب میں اللہ کے روبرو حساب دوں گا تو وہاں بھی بارگاہ الٰہی میں عرض کروں گا کہ یہ شخص تیرے رسول اور علماء پر جھوٹ بولتا تھا۔ میزان الاعتدال ج ۴ ص ۷۵۔

ابو محمد عبد الرحمان بن ابی حاتم محمد بن ادریس بن المنذر التیمی الحنظلی الرازی المتوفی ۳۲۷ھ لکھتے ہیں کہ میں نے اس محمد بن یونس کی ایک روایت اپنے والد کے سامنے پیش کی ۔ فرمایا یہ حدیث سچے لوگوں کی نہیں ہے۔ الجرح والتعدیل ج ۸ صـ۱۲۲ ۔

محمد بن یونس الکدیمی نے یہ داستان حسین بن حسن الاشقر الکوفی سے نقل کی ہے۔ محدثین کے اس کے بارے میں کیا تخیلات ہیں وہ بھی ہمارے قارئین ملاحظہ فرمالیں ۔

حسین بن حسن الاشقر : ابن عدی لکھتے ہیں ضعیف راویوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو اپنی غلط روایات اس اشقر کی جانب منسوب کرتا رہتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کہانی کا کچھ حصّہ یہ اشقر بیان کرتا ہے اور یہ غلط قسم کے لوگ مزید اس میں حاشیہ آرائی کرتے ہیں اس اشقر کی روایات منکر ہوتی ہیں ۔ ہمارے نزدیک یہ کہانی اسی اشقر کی تیار کردہ ہے ۔

جوزجانی کہتے ہیں یہ غالی (بدبودار) رافضی ہے ۔ نیک لوگوں کو گالیاں دیتا ہے۔ ابو معمر الہذلی کا قول ہے کذاب ہے ۔ نسائی اور دارقطنی کہتے ہیں قوی نہیں ۔ ۲۰۸ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ میزان ج ۱ صـ۵۳۱ ۔

• بخاری لکھتے ہیں ضعیف ہے۔ الضعفاء الصغیر صـ۳۳ ۔

عبد الرحمان بن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ میرے والد ابو حاتم فرماتے ہیں ۔ یہ شخص قوی نہیں اور ابو زرعہ فرماتے ہیں۔ یہ منکر الحدیث ہے۔ الجرح والتعدیل ج ۳ صـ۳۹ ۔

حافظ ابن حجر تحریر کرتے ہیں ۔ اسی حسین الاشقر الکوفی سے نسائی نے روایت لی ہے ۔ سچا ہے لیکن وہم ہوتا ہے ۔ غالی شیعہ ہے ۔ تقریب صـ۷۳ ۔

گویا حافظ ابن حجر نے اس کی منکرات پر وہم کا پردہ ڈال دیا ہے اور چونکہ نسائی نے اس سے روایت لی ہے۔ اس لیے سچا ہے ۔ حالانکہ خود نسائی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے ۔

حسین الاشقر نے یہ کہانی قیس بن الربیع کی جانب منسوب کی ہے ۔

قیس بن الربیع : یہ حضرت سابقہ دونوں حضرات کے مقابلہ میں با غنیمت ہیں ۔ اس کی روایات ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ میں پائی جاتی ہیں ۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

قیس بن الربیع الاسدی ابومحمد الکوفی سچّا شخص ہے۔ لیکن بڑھاپے میں دماغ میں تغیر پیدا ہوگیا تھا۔ صاحبزادہ صاحب ابا جان کی روایات میں خود آیا جان سے خلط ملط کراتے اور ان میں اضافات کراتے تھے۔ سنہ ۱۶۰ھ کے بعد اس کا انتقال ہوا۔ تقریب صفحہ ۲۹۳۔

ذہبی لکھتے ہیں بالذات تو یہ سچّا انسان تھا۔ لیکن اس کا حافظہ خراب تھا۔ امام شعبہ اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ لیکن ابوحاتم رازی کہتے ہیں یہ شخص سچّا تو ہے لیکن قوی نہیں۔ یحیٰی بن معین کہتے ہیں ضعیف ہے اس کی روایت نہ لکھی جاتے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں یہ شیعہ تھا۔ بہت غلطیاں کرتا تھا۔ اس کی روایات منکر ہوتی ہیں۔ امام وکیع المتوفی ۱۹۷ھ اور علی بن المدینی المتوفی ۲۳۴ھ فرماتے ہیں ضعیف ہے۔ نسائی لکھتے ہیں متروک ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔

فن رجال کے سب سے بڑے امام یحیٰی بن سعید بن فروخ القطان البصری المتوفی ۱۹۸ھ فرماتے ہیں یہ ناقابلِ قبول ہے عفان کا بیان ہے کہ یہ قیس جو بھی روایت بیان کرتا۔ بیٹا اس میں اضافہ کرتا رہتا ابن نمیر کہتے ہیں اس کا بیٹا آفت کا پرکالا تھا۔ اس کی ہر روایت کو تبدیل کرتا رہتا۔

ابن حبان کہتے ہیں جب یہ جوان تھا تو اچھا آدمی تھا (یعنی جب تک بیٹا ہوشیار نہیں ہوا تھا) لیکن بڑھاپے میں اس کا حافظہ خراب ہوگیا۔ اللہ نے اسے ایک بدترین قسم کا بیٹا دیا۔ جو باپ کی بیان کردہ روایات میں اضافہ کرتا رہتا۔ ابوداؤد طیالسی کہتے ہیں۔ ہمیں اس کی روایات کی کوئی حاجت نہیں اس کی سات روایات ایسی ہیں جنہیں میرا دل قبول نہیں کرتا (ممکن ہے کہ یہ جوانی کی روایات ہوں) محمد بن عبید الطنافسی الکوفی المتوفی ۲۰۴ھ فرماتے ہیں۔ خلیفہ منصور نے اس قیس بن الربیع کو مدائن کا والی متعین کیا۔ یہ ہر وقت عورتوں کی چھاتیوں سے چپٹا رہتا۔ اگر عورتیں اس کی خواہشات کی تکمیل نہ کرتیں تو یہ ان پر بھیڑیں چھڑوا دیتا۔ ایک روز اس نے ایک شخص پر حد جاری کی۔ اس کے بعد اچانک اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس لیے اس کے اصل حالات منظرِ عام پر نہ آسکے۔

محمد بن المثنیٰ کا بیان ہے کہ شعبہ اور سفیان ثوری اس سے روایات نقل کرتے لیکن یحیٰی بن سعید

القطان اور عبدالرحمان بن مہدی اس کی روایات قبول نہ کرتے تھے۔ خود شعبہ کا بیان ہے کہ ایک بار اسی قیس نے مجھ سے ابوحصین کی روایات بیان کیں اور وہ اتنی منکر روایات تھیں کہ میرا دل چاہتا تھا کہ یہ مکان ہم پر گر پڑے۔ "تاکہ ہم دونوں اس کے نیچے دب کر مر جائیں (یعنی قیس یہ منکرات بیان کرنے کے جرم میں اور شعبہ یہ خرافات سننے کی پاداش میں)

ابوالحسن القطان کہتے ہیں یہ قیس ابن ابی لیلیٰ اور شریک کی طرح ضعیف ہے محمد بن عبید کہتے ہیں کہ جب تک یہ قاضی نہ بنا تھا۔ اس وقت تک یہ صحیح تھا۔ لیکن قاضی بننے کے بعد اس نے ایک شخص کو قتل کر دیا جس کے بعد یہ سارا فساد شروع ہوا۔

امام احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ فرماتے ہیں۔ اس کا بیٹا مسعر، سفیان اور دیگر منقدمین کی احادیث لے کر ان کی روایات میں خلط ملط کر دیتا اور اسے کچھ بھی علم نہ ہوتا (قربان جائیے اس سادگی کے) امام بخاری نے "تاریخ الاوسط" میں ابوداؤد طیالسی سے بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ میزان ج ۳ صہ ۳۹۳۔

امام بخاری لکھتے ہیں کہ قیس بن الربیع متروک الحدیث ہے۔ الضعفاء الصغیر للبخاری صہ ۸۹۔ نسائی لکھتے ہیں۔ قیس کا انتقال ۱۶۷ھ میں ہوا۔ امام وکیع بن الجراح نے اسے ضعیف قرار دیا ہے الضعفاء الصغیر للنسائی صہ ۹۵۔

قیس بن الربیع نے یہ کہانی سعد بن طریف کی جانب منسوب کی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا چہرہ بھی ملاحظہ کر لیا جائے۔ حافظ شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں۔

سعد بن طریف الاسکاف الحنظلی الکوفی: ہے۔ متروک ہے ابن حبان نے اس پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔ یہ رافضی تھا۔ اس سے ترمذی اور ابن ماجہ نے روایات لی ہیں۔ تقریب صہ ۱۱۸۔

ذہبی لکھتے ہیں۔ یہ کوفہ کا باشندہ تھا اور اسکاف کے لقب سے مشہور تھا۔ امام الجرح والتعدیل ابوزکریا یحییٰ بن معین المتوفی ۲۳۳ھ فرماتے ہیں کسی شخص کے لیے یہ حلال نہیں کہ اس سعد بن طریف

سے روایت نقل کرے۔ امام احمد اور ابو حاتم فرماتے ہیں ضعیف ہے۔ نسائی اور دارقطنی کہتے ہیں۔ یہ ثقہ نہیں۔ حافظ ابو حاتم محمد بن حبان البستی المتوفی ۳۵۴ھ لکھتے ہیں۔ یہ سعد توقی البدیہہ احادیث وضع کر لیا کرتا تھا۔ فلاس کہتے ہیں ضعیف ہے۔ غالی شیعہ ہے۔ بخاری کہتے ہیں قوی نہیں۔ میزان ج ۲ صد ۱۲۳۔

اصبغ بن نباتہ: اس سعد بن طریف نے یہ کہانی اصبغ بن نباتہ کی جانب منسوب کی ہے جو حضرت علیؓ کے شاگردوں میں سے تھا۔ حضرت عمارؓ اور حضرت ابو ایوبؓ انصاری سے روایات نقل کرتا ہے۔ قاری ابوبکر بن عیاش الکوفی المتوفی ۱۶۴ھ فرماتے ہیں یہ اصبغ کذاب ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں ثقہ نہیں۔ ایک بار فرمایا یہ کچھ نہیں۔ ابن حبان اور نسائی کہتے ہیں متروک ہے۔ ابن عدی لکھتے ہیں اس کا ضعف ظاہر ہے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں اس کی حدیث ضعیف ہوتی ہے۔ عقیلی لکھتے ہیں یہ حضرت علیؓ کی دنیا میں دوبارہ آمد پر ایمان رکھتا تھا۔ (یعنی رجعی تھا) ابن حبان لکھتے ہیں اس نے حب علیؓ میں مبتلا ہو کر خوب دل کھول کر جھوٹ گھڑا ہے میزان ج ۱ صد ۲۷۱۔

نسائی لکھتے ہیں یہ متروک الحدیث ہے۔ الضعفاء الصغیر للنسائی صد ۲۲۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔ متروک ہے رافضی ہے۔ ابن ماجہ نے اس سے روایت لی ہے۔ تقریب صد ۳۸۔

اس روایت کا کوئی راوی بھی ایسا نہیں ہے جو رافضی اور کذاب نہ ہو۔ اس کہانی پر تو یہ مثل صادق آتی ہے کہ " اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔"

ہمارے سُنی بھائی اتنے سادہ ہیں کہ اس کہانی میں جو تبرا کیا گیا ہے اسے سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ حضرت فاطمہؓ کے لیے آپ کی آنکھیں جھکوا کر ان تبرائیوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی تھیں اور اگر چار تھیں تو بقیہ تین اس لائق نہ تھیں کہ ان کے لیے نگاہیں جھکائی جائیں اور ازواج مطہرات یعنی امت کی ماؤں کے لیے تو اس کا سوال بھی پیدا

نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ سنی بھائی اپنی ماؤں تک سے واقف نہیں۔ اور سبائی ہماری ماؤں کے پیدائشی دشمن ہیں۔ اس لیے قیامت کے روز ہر کس و ناکس کو اس کی اجازت ہو گی کہ ان محترمات کو بے شک خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ لے۔ قربان جائیے بدبختوں کی اس بے غیرتی کے کہ وہ بھی بر سرِ منبر خوب مزے لے لے کر یہ روایت بیان کرتے ہیں۔

یہ تو اس سابقہ روایت کا حال ہے جو حضرت ابوالیوبؓ انصاریؓ سے مروی ہے اور سطور بالا میں گزر چکی ہے۔ لیکن اس مضمون کی ایک اور روایت حضرت علیؓ کی جانب بھی منسوب ہے۔ جسے تمام نے اپنی "فوائد" میں اور حاکم نے "المستدرک" میں نقل کیا ہے اور حاکم نے اسے نقل کر کے حسبِ عادت لکھا ہے۔ یہ روایت بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ اس کا صرف ایک راوی ایسا ہے جس سے بخاری نے روایت نہیں لی یعنی عباس بن الولید بن بکار الضبی۔

سیوطی لکھتے ہیں اس روایت کی اور بھی شہادتیں موجود ہیں اور حضرت علیؓ کی روایت تو صحیح الاسناد ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس پر خاموشی اختیار کی۔ لیکن ذہبی نے حضرت علیؓ کی اس روایت پر شدت سے اعتراض کیا اور تخریج مستدرک میں لکھا۔ یہ ہرگز صحیح نہیں۔ اللہ کی قسم یہ بخاری کی شرط پر تو صحیح کہاں ہوتی یہ تو موضوع ہے۔ ابن جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔

حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کرنے والے ابو جحیفہؓ صحابی ہیں۔ ان سے عامر شعبی، شعبی سے بیان، بیان سے خالد واسطی، خالد سے عباس بن الولید البکار اور عباس سے ابراہیم بن عبداللہ الکوفی۔ اس طرح حاکم اور حضرت علیؓ کے درمیان چھ راوی ہوتے۔ ان میں سے ایک راوی ابو جحیفہ تو صحابی ہیں اور عامر شعبی سب کے نزدیک ثقہ ہیں۔ بقیہ چار راویوں کا مختصر سا حال پیش خدمت ہے۔

ابراہیم بن عبداللہ الکوفی اس کا شمار متروکین میں ہوتا ہے۔ ابن حبان لکھتے ہیں یہ ثقہ راویوں کی جانب غلط روایات منسوب کرتا ہے۔ ذہبی کہتے ہیں یہ کذاب ہے۔ حاکم خود دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔ اس کی روایات موضوع ہوتی ہیں۔ میزان ج ۱ ص ۴۲۔

ابراہیم نے یہ روایت عباس بن الولید البکار سے نقل کی ہے۔

عباس بن الولید البکار

دار قطنی کہتے ہیں کذاب ہے۔ ذہبی لکھتے ہیں۔ محدثین نے اس روایت کے وضع کرنے کا الزام اسی عباس پر لگایا ہے۔ ورنہ حضرت علیؓ نے اس قسم کی کوئی روایت بیان نہیں کی۔ عقیل کہتے ہیں اس کی اکثر روایات منکر ہوتی ہیں۔ ابن عدی نے اس کی متعدد روایات کو منکر قرار دیا ہے۔ میزان ج ۲ ص۳۸۲۔

عباس نے یہ روایت خالد بن عبد اللہ الواسطی کی جانب منسوب کی ہے۔ لیکن وہ ثقہ ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کی جانب یہ نسبت صریح جھوٹ ہے۔ لہٰذا پہلے دو راویوں میں سے کسی ایک نے یہ روایت وضع کی ہے۔ ذہبی لکھتے ہیں یہ روایت عباس بن الولید نے وضع کی ہے۔

لیکن ہمارا خیال یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ تو صرف اندھے نقال ہیں۔ ورنہ اصل خبیث تو بیان بن سمعان ہے۔

بیان بن سمعان النہدی

اس کا تعلق بنو تمیم خاندان سے تھا۔ سنہ ۱۱۹ھ کے بعد اس نے عراق پر غلبہ حاصل کیا۔ یہ حضرت علیؓ کو الٰہ کہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت علیؓ میں حلول کر گئے ہیں۔ پھر ان کے بعد محمد بن حنفیہ میں، پھر محمد کے بیٹے ہاشم میں اور ہاشم کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھ میں حلول کیا۔ اس نے ابوجعفر باقر کو خط لکھا کہ میں نبی ہوں اس لیے مجھ پر ایمان لاؤ۔ میزان ج ۱ ص۳۵۷۔

حضرت علیؓ والی روایت کا واضع یہ بیان ہے۔ سنیوں اور شیعوں نے اس کی وضع کردہ کہانی کو تو سینوں سے لگا لیا۔ لیکن اس کی نبوت اور محمد بن الحنفیہ اور ان کے بیٹے کی ولایت کو فریقین نے قبول نہیں کیا۔ اب تو سنی بیچارے اس سے بھی واقف نہیں کہ یہ محمد بن حنفیہ کون ہیں بعض لوگوں نے تو ان کا نام حنیف رکھ دیا ہے اور اس نام سے ایک حنیف نامہ بھی تیار کر دیا ہے۔ ابن حبان لکھتے ہیں یہ بیان کذاب ہے۔ ابن جوزی لکھتے ہیں یہ روایت موضوع ہے۔ الموضوعات ج ۱ ص۳۴۴۔

تشیع نے جلال الدین سیوطی کے ذہن و دماغ کو اس بری طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اس روایت کو چھوڑنے اور نذر آتش کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنی کتاب کا

نام" اللالی المصنوعہ فی احادیث الموضوعہ" رکھا ہے۔ جس سے ہمیں یہ دھوکا ہوا کہ واقعتاً اس کتاب میں موضوعات پر بحث کر کے یہ ثابت کیا گیا ہوگا کہ یہ مصنوعی موتے اور جھوٹے نگینے ہیں۔ لیکن کتاب کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ سیوطی صاحب تو ان نگینوں کو جنہیں ابن جوزی نے مصنوعی قرار دیا تھا چمکانے کی کوشش میں مصروف ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات انہیں یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کیا کچھ لکھ رہے ہیں۔ اگر سیوطی یہ ناکام کوشش نہ کرتے تو شاید ہم بھی اس پر تفصیلی بحث نہ کرتے اور چونکہ ہمیں یہ بھی خطرہ تھا کہ روایتوں کے نام سے کہانیوں کے پجاری سیوطی کی وکالت کرتے ہوئے کہیں ہم پر یہ الزام نہ لگا دیں کہ ہم نے ابن جوزی کی وکالت اپنے ذمے لے لی ہے۔ اسی لیے ہم نے اس کہانی پر نہ ابن الجوزی کا تبصرہ نقل کیا اور نہ ان کی کتاب کا کوئی حوالہ دیا۔ سیوطی آگے لکھتے ہیں۔

ابوبکر الشافعی نے اپنی" فوائد" میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی یہ روایت نقل کی ہے کہ قیامت کے روز ایک منادی ندا کرے گا۔ اے لوگو! نگاہیں نیچی کر لو، تاکہ فاطمہؓ گزر کر جنت میں چلی جائیں۔

سیوطی صاحب فرماتے ہیں اس سے پہلی روایتوں کی تائید ہوتی ہے۔ اس طرح پہلی کہانی کا ایک شاہد اور حاضر ہے۔

سیوطی نے اس کی جو سند نقل کی ہے۔ اس کے لحاظ سے ابوبکر شافعی اور حضرت ابو ہریرہؓ کے درمیان پانچ راوی ہیں۔ سمانہ بنت حمدان بن موسیٰ، حمدان بن موسیٰ الانباری، عمرو بن زیاد الثوبانی عبدالملک بن ابی سلیمان اور عطاء۔

عطا نامی بہت سے افراد ہیں۔ جن میں سے متعدد عطا نامی اشخاص نے حضرت ابو ہریرہؓ سے احادیث سنی ہیں۔ کچھ ان میں ثقہ ہیں اور کچھ غیر ثقہ، للٰہذا ہم اس تفصیل میں نہ اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں اور نہ قارئین کرام کا۔ اسی طرح ہم عبدالملک بن ابی سلیمان کو بھی سندِ قبولیت بخشنے کے لیے تیار ہیں۔ اس طرح زیر بحث اب تین راوی رہ جاتے ہیں۔

سمانہ جہاں تک حمدان بن موسیٰ الانباری کا تعلق ہے۔ مجھے ان حضرت کا تذکرہ کہیں نہیں ملا۔ اس طرح یہ حضرت تو تاریخ و رجال سے غائب ہیں۔ بلکہ مفقود الخبر ہیں۔ ہاں ان کی بیٹی سمانہ کے حال میں ذہبی لکھتے ہیں۔ یہ اپنے باپ کے واسطے سے عمرو بن زیاد الثوبانی کی

باطل روایات نقل کرتی ہے۔ میزان ج ۲ صـ۲۰۶ ۔ گویا یہاں یہ خود ناقابلِ اعتبار ہے۔ وہاں اس کو یہ شہرت حاصل ہے کہ یہ اپنے مفقود الخبر باپ سے باطل روایات نقل کرکے انہیں پھیلاتی ہے۔ اور یہ جتنی روایات ہوتی ہیں سب عمرو بن زیاد الثوبانی کی ہوتی ہیں۔

عمرو بن زیاد الثوبانی

یہ عمرو بن زیاد الباہلی کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کی کنیت ابوالحسن ہے۔ یعقوب قمی کا شاگرد ہے۔ بغداد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

ابوحاتم رازی کہتے ہیں کذاب ہے۔ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ کھلم کھلا جھوٹ گھڑ گھڑ کر ثقہ راویوں کی جانب منسوب کرتا۔ ابن عدی لکھتے ہیں یہ پہلے بردان میں رہتا تھا۔ لوگوں کی جھوٹی روایات ثقہ راویوں کی جانب منسوب کرکے بیان کرتا ہے۔ واضع الحدیث ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ میزان ج ۳ صـ۲۶۱۔

ہمیں سیوطی پر حیرت ہے کہ اس قسم کی باطل روایات کو پیش کرکے شیعوں کے لیے مزید ثبوت فراہم کرنا چاہتے ہیں کہ واقعتاً حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوگا۔ یہ تو ہم ماننے کے لیے تیار نہیں کہ سیوطی ان راویوں سے واقف نہ ہوں گے۔ لیکن تجاہل عارفانہ کی یہ صورت بہت عمدہ ہے غالباً سباٸی برادری تو اس پر قربان ہوگئی ہوگی۔ ہم تو صرف اتنا ہی عرض کرتے ہیں کہ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

جلال الدین سیوطی نے اپنے ضعف پرستی کے مرض میں مبتلا ہوکر ان جھوٹے نگینوں کو سچا ثابت کردکھانے کے لیے بطور شہادت ایک اور کہانی پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں ابوالحسن بن بشران نے اپنی "فوائد" کی ابتداء میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا۔ قیامت کے روز ایک منادی ندا کرے گا۔ اے مخلوقات کے گروہو، اپنے سر اس وقت تک کے لیے جھکالو، جب تک فاطمہؓ نہ گزر جائیں۔

سیوطی کا دعویٰ ہے کہ اس روایت کو خطیب بغدادی نے بھی دو سندات سے نقل کیا ہے۔

ایک سند تو وہی ہے جو ابوالحسین بن بشران نے بیان کی ہے۔ ہم اولاً ابوالحسین بن بشران ہی کی سند پر گفتگو کریں گے۔ لیکن اس سے قبل ہمارے قارئین کرام یہ ضرور ذہن نشین کر لیں کہ ارشاد الٰہی ہے،

لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ۔ عبس - ۳۶

ان میں سے ہر شخص اس روز ایسی حالت میں مبتلا ہوگا جو اسے دوسرے سے بے پرواہ کر دیگی۔

جہاں ہر ہر شخص اپنی فکر میں اس طرح غلطاں ہوگا کہ وہ اپنے اعزاؤ اقارب کو بھی نہ پہچان سکے گا اور نہ انسان کو اپنی ذات کے علاوہ کسی دوسرے کی فکر دامن گیر ہوگی۔ وہاں تمام مخلوق کا حال یہ ہوگا،

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ۔ عبس - ۳۴ - ۳۵ - ۳۶

اس روز آدمی اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھی بھاگے گا۔

لیکن سیوطی جیسے ضعف پرست حضرات کو اُس وقت بھی حضرت فاطمہؓ کی فکر دامن گیر ہوگی۔ حالانکہ وہ سیوطی جیسے کروڑہا انسانوں سے بہتر حالت میں ہوں گی۔ لہٰذا ان روایت پرست لوگوں کو اپنی فکر کرنی چاہیئے، نہ کہ حضرت فاطمہؓ کی۔

ابوالحسین بن بشران نے یہ روایت احمد بن سلیمان النجاد، حسین بن معاذ المجبی، عبداللہ بن عبدالوہاب المجبی، شاذ بن فیاض، حماد بن سلمہ، ہشام اور عروہ کے واسطے سے حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے یعنی ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور ابوالحسین بن بشران کے درمیان سات راوی ہیں۔ لیکن عروہ اور ہشام ثقہ رواۃ میں داخل ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم ان پر کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔ اسی طرح حماد بن سلمہ بہت بڑے محدث ہیں۔ اور اکثر محدثین نے ان سے روایات لی ہیں۔ اگرچہ ان سے اکثر محدثین شاکی بھی ہیں کہ ان میں وہم بہت پایا جاتا تھا اور ان کی متعدد روایات منکر ہیں۔ لیکن ہم ان باتوں کو بھی نظرانداز کیے دیتے ہیں۔ لہٰذا اب ہم ابتدائی چار رواۃ کا سرسری طور پر تذکرہ کریں گے۔

احمد بن سلیمان النجاد

حافظ ذہبی لکھتے ہیں ان کا نسب نامہ یہ ہے، احمد بن سلیمان بن الحسن بن اسرائیل بن یونس، ابوبکر ان کی کنیت ہے۔ حنبلی مذہب کے مشہور فقیہ ہیں، فقہ اور روایت حدیث میں استاد ہیں امام ابوداؤد سجستانی سے انہوں نے کافی روایات

نقل کی ہیں۔ ذہبی کہتے ہیں میری رائے میں تو یہ سچے ہیں۔ لیکن دارقطنی کہتے ہیں کہ انہوں نے دوسروں کی تحریرات سے ایسی روایات نقل کی ہیں جو ان کے تحریر کردہ مسودات میں موجود نہ تھیں۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں بعض طلباء اپنے اپنے مزاج کے مطابق ان کو روایات سناتے اور پھر ان روایات کو ان کی جانب منسوب کر دیتے۔ (گویا خطیب کے نزدیک یہ کہانی بھی اسی قسم کی ہے) میزان ج ۱ صفحہ ۴۰۳۔

حسین بن معاذ الجمی احمد بن سلیمان النجاد نے یہ داستان حسین بن معاذ الجمی سے نقل کی ہے ذہبی لکھتے ہیں یہ بصرہ کے باشندہ تھے۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن نہ اس پر کوئی جرح کی اور نہ اس کی توثیق کی۔ لیکن اس حسین کے ذریعہ یہ منکر روایت نقل کی۔ پھر آگے یہ تحریر کیا کہ یہ حسین بن معاذ کبھی تو اس روایت کو شاذ بن فیاض کی جانب منسوب کرتا اور کہتا ہے کہ شاذ نے حماد بن سلمہ سے نقل کی ہے اور کبھی کہتا ہے کہ مجھ سے یہ روایت ایک شخص نے نقل کی ہے۔ لیکن اس شخص کا اتا پتا کچھ معلوم نہیں (گویا وہ ایک موسمی پرندہ تھا جو یہ داستاں گا کر چلا گیا) ہر صورت میں یہ روایت باطل ہے۔ میزان ج ۱ صفحہ ۵۴۵۔

گویا سیوطی نے جن دو سندات کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ دو سندات ہرگز نہ تھیں بلکہ اس حسین الجمی نے یا تو غلطی سے یا فریب دہی کے لیے اس روایت کو دو اشخاص کی جانب منسوب کر کے دو سندات بنا دیا تھا۔ جس سے سیوطی یا تو خود بھی دھوکہ کھا گئے یا شیعہ پرستی میں اس فریب کاری پر انہوں نے پردہ ڈال دیا۔ لیکن بقول ذہبی یہ سارا فساد اسی حسین بن معاذ کا پیدا کردہ ہے۔ اس حسین کا انتقال ۲۷۷ھ میں ہوا۔

یہ بھی غور طلب امر ہے کہ ہشام بن عروہ کی روایات سے تمام کتب احادیث معمور نظر آتی ہیں۔ آج روئے زمین پر حدیث کی قلمی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جو ہشام کی روایات سے خالی ہو۔ لیکن دوسری اور تیسری صدی کی کتابوں میں اس روایت کا کوئی وجود نظر نہیں آتا ہاں چوتھی اور پانچویں صدی کی ان کتابوں میں یہ روایت نظر آتی ہے جو رطب و یابس سے معمور اور محدثین کے نزدیک ناقابل اعتبار ہیں۔ اس کی بقول شاہ ولی اللہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو صورت یہ ہو سکتی ہے

کہ ابتدائی صدیوں میں اس روایت کا کوئی وجود نہ تھا، تو پھر یہ بعد میں کیسے وجود میں آگئی تو یہ اس امر کی ثبوت ہے کہ یہ دماغی بھٹیوں میں تیار ہوتی ہے اور جعلی سکہ کی طرح اسے بازار میں چلایا گیا ہے۔ اگر کہا جاتا ہے کہ اس کا وجود تھا۔ تو پہلوں کا متفقہ طور پر اسے نقل نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بیکھانی بازاری گپ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ (حجۃ اللہ البالغہ) اور ایسی روایات کو اپنی کتابوں میں جگہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے کسی نہ کسی لحاظ سے ان کا وجود تسلیم کر لیا۔ بعد کے مصنفین نے یہی کام انجام دیا ہے اور سیوطی اس کام کے نہ صرف استاد ہیں بلکہ ان داستانوں کی نشر و اشاعت کے ٹھیکہ دار ہیں بلکہ ان روایات پر اعتقاد کی بنیاد رکھنے کا سہرا ان کے سر بندھا ہوا ہے اور بقول شاہ عبدالعزیز جو کتابیں محدثین کے نزدیک ناقابلِ اعتبار ہیں وہ سیوطی کا علمی ماخذ ہیں۔ ان کی تمام تصنیفات حافظ ابن حجر کے ایک رسالہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتیں (بستان المحدثین) لیکن اسے کیا کہیئے کہ ہمارے موجودہ دور کے علماء کی دوڑ سیوطی پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔

جلال الدین سیوطی آگے لکھتے ہیں کہ یہ روایت ازدی نے بھی حضرت ابو سعیدؓ خدری سے نقل کی ہے۔ لیکن ازدی کہتے ہیں کہ اس کا ایک راوی داؤد بن ابراہیم مجہول ہے۔

قربان جائیے اس چرکاری کے، اگر کوئی روایت صحیح سند کے ساتھ مروی ہوتی تو اسے شہادت کے طور پر پیش کرنا درست بھی ہوتا۔ لیکن افسوس کہ سیوطی ایک جھوٹ کو سچ کر دکھانے کے لیے دوسرا اور بڑا جھوٹ پیش کر رہے ہیں اور کہتے ہیں یہ بھی ایک دلیل ہے، اگرچہ جھوٹی ہے:

حافظ ازدی نے اپنی کتاب الضعفاء میں یہ روایت داؤد بن ابراہیم کے ترجمہ میں نقل کر کے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور مصنفین، رجال کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر ایک روایت کے متعدد راوی ضعیف ہوں تو وہ کسی ایک راوی کے حالات میں اسے نقل کر کے ضعیف قرار دے دیتے ہیں۔ اور دوسرے مقامات پر بعض اوقات اس کا صرف اشارہ کرتے ہیں۔

رہا سیوطی کا یہ دعویٰ کہ داؤد بن ابراہیم کو ازدی نے مجہول قرار دیا ہے۔ یہ قطعی غلط ہے۔ حافظ ذہبی میزان میں داؤد بن ابراہیم العقیلی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

کذبہ الازدی۔ میزان ج ۲ ص ۴ ۔ اسے ازدی نے کذاب کہا ہے۔

حافظ ابن حجر لسان میں لکھتے ہیں ۔ داؤد بن ابراہیم العقیلی خالد بن عبداللہ الطحان سے روایت کرتا ہے ۔ ازدی نے اسے کذاب کہا ہے۔ ازدی کے الفاظ میں

مجہول کذاب لا یحتج بہ ۔ مجہول ہے، کذاب ہے، حجت نہیں ہے۔

پھر میدانِ حشر کی یہ فرضی کہانی نقل کر کے لکھتے ہیں ۔

ھذا منکر لا تحتملھا ھذا الاسناد، لسان المیزان ج ۲ ص ۴۱۵ ۔ یہ روایت منکر ہے یہ سند اس روایت کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔

گویا سیوطی نے ازدی کے آخری الفاظ حذف کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ روایت اتنی گئی گزری نہیں ہے کہ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے کیونکہ ایک راوی ایسا ہے جو صرف مجہول ہے اور مجہول کی روایت موضوع کے درجہ میں نہیں ہوتی ۔ لہٰذا اسے شہادت میں پیش کرنا درست ہے ۔ ۔ اور نتیجۃً یہ کہانی قابل قبول ہے ۔ ہمیں سیوطی سے ایسی توقعات ہرگز نہ تھیں کہ وہ مصنف کی عبارت بھی کھا جائیں گے اللہ تعالیٰ ہمیں لغزشوں کی باز پرس سے محفوظ رکھے ۔

شیخ محمد طاہر بن علی الپٹنی المتوفی ۹۸۶ھ لکھتے ہیں ۔

یہ روایت کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو پس پردہ سے ایک منادی ندا کرے گا ۔ اے جمع ہونے والو نگاہیں نیچی کر لو ۔ تاکہ فاطمہؓ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم گزر جائیں اس کا راوی عباس بن الولید ہے جو کذاب ہے ۔ اگرچہ حاکم نے اسے نقل کر کے بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے ۔ لیکن ذہبی نے حاکم کے قول کا رد کیا ہے ۔ اسی مضمون کی ایک روایت ابوہریرہؓ سے مروی ہے ۔ جس کا سیوطی نے اللآلی میں ذکر کیا ہے ۔ تذکرۃ الموضوعات ص ۹۹ ۔

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر المقدسی المعروف بابن القیسرانی المتوفی ۵۰۷ھ لکھتے ہیں ۔

یہ روایت کہ اے لوگو نگاہیں نیچی کر لو ۔ آخر تک ۔ اس کا راوی عباس بن الولید ہے جو عجیب عجیب کہانیاں نقل کرتا ہے ۔ تذکرۃ الموضوعات للمقدسی ص ۲۴ ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق و باطل میں تمیز عطاء فرمائے ۔ آمین ۔

حکایات کے پردے میں تبرّا

(امیر معاویہؓ پر)

عوفی نے منتخب الحکایات میں ایک نہایت مضحکانہ روایت لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

سیدنا معاویہؓ کا جب آخری وقت آیا تو آپ نے اپنے فرزند کو وصیت کی کہ جب میرا جنازہ قبر پر رکھا جائے تو تم (حضرت) عمرؓو بن العاص سے استدعا کرنا کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں لہٰذا آپ نماز جنازہ پڑھائیں۔ پھر عرض کرنا کہ برکت کے لیے قبر میں آپ ہی اتار دیں۔ جب وہ قبر میں اتر جائیں اور میری نعش رکھ دی جائے تو تلوار سونت کر کھڑے ہو جانا کہ اب تم قبر میں سے اس وقت تک نہیں نکل سکتے جب تک میری خلافت کی بیعت نہ کر لو۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ امیر یزیدؒ نے جب تلوار سونت لی تو عمرؓو بن العاص نے امیر معاویہؓ کی لاش کی جانب منہ کر کے کہا۔ کیوں صاحب مرتے مرتے بھی چالاکی سے باز نہ آئے اور پھر یزید کی بیعت کر لی۔

قارئین کرام آپ حضرات نے غور کیا کہ حکایات و لطائف کے پردے میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کس طرح مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اور امیر معاویہؓ کو بدنام کرنے کے لیے کس طرح ایک جھوٹی وصیت وضع کر کے ان کی جانب منسوب کی گئی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس عوفی نے یہ کہانی خود وضع کی تھی، یا عام سنیوں کی طرح یہ صرف سبائی داستانوں کی تشہیر کا ذمہ دار ہے۔

غالباً یہ عوفی تبرائی تو یہ بھی نہ جانتا ہو گا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ تو حضرت امیر معاویہؓ کی وفات سے سترہ سال قبل انتقال کر چکے تھے۔ امیر معاویہؓ ۴۱ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۶۰ھ میں ان کی وفات ہوئی لیکن حضرت عمرو بن العاص ۴۳ھ میں انتقال فرما گئے تھے۔

حافظ ابن کثیر ۴۳ھ کے حال میں لکھتے ہیں

ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ اسی سن میں عمروؓ بن العاص کا انتقال ہوا۔ البدایۃ والنہایہ ج ۸ ص ۲۴
اور صفحہ ۲۵ پر لکھتے ہیں کہ اسی ۴۳ھ میں عمروؓ بن العاص نے وفات پائی۔

امیر معاویہؓ نے جب حضرت علیؓ کے زمانہ میں محمد بن ابی بکر سے مصر چھینا تو حضرت عمرو بن العاصؓ کو مصر کا والی بنایا اور وہ اپنی وفات تک مصر کے والی رہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے سن وفات میں اختلاف ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی وفات ۵۱ھ میں بیان کی جاتی ہے۔ ایک قول ۴۷ھ اور ایک قول ۴۸ھ کا ہے۔ البدایۃ والنہایہ ج ۸ ص ۲۶۔

الغرض ہر صورت میں حضرت عمرو بنؓ العاص حضرت امیر معاویہؓ سے ایک طویل عرصہ قبل انتقال کر گئے تھے۔ کیا وہ امیر معاویہؓ کی نماز جنازہ پڑھانے انہیں قبر میں اتارنے اور یہ حکایت وجود میں لانے کے لیے دوبارہ زندہ ہوکر دنیا میں تشریف لائے تھے۔؟

سبائی طبقہ یہ بات خوب جانتا ہے کہ سنی تصوف کے زیر اثر حکایات اور کہانیوں پر ایمان رکھتے ہیں لہٰذا اس زہر کو حکایات کے پردے میں پیش کرنا چاہیئے۔ اس لیے عوفی نے اپنی منتخب الحکایات" کے لیے اس کہانی کو بھی منتخب کیا۔

اس کے علاوہ از روئے تاریخ یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ امیر معاویہؓ کی نماز جنازہ حضرت ضحاکؓ بن قیس الفہری نے پڑھائی تھی۔ وہ امیر معاویہؓ کی جانب سے دمشق کے داروغہ تھے۔ جب امیر معاویہؓ کی وفات کا وقت آیا تو یزید دمشق میں موجود نہ تھا۔ امیر معاویہؓ نے یزید کے آنے تک ہر قسم کی ذمہ داری حضرت ضحاکؓ کے سپرد کی۔ حضرت ضحاکؓ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور انہیں دفن کیا۔ پھر ضحاکؓ لشکر لے کر حوارین کی جانب گئے۔ جہاں یزید اس وقت مقیم تھا۔ لیکن ابھی ثنیۃ العقاب پر پہنچے تھے کہ یزید کا سامان آتا نظر آیا۔ حضرت ضحاکؓ نے اسی مقام پر یزید سے امیر معاویہؓ کی تعزیت کی۔ یزید حضرت ضحاکؓ کے ساتھ دمشق واپس آیا۔ اس کی پوری تفصیل حافظ ابن کثیر نے البدایۃ والنہایہ ج ۸ ص ۱۴۳ پر دی ہے۔

الغرض اس حکایت کے روپ میں جتنے دعوے کیے گئے، سب جھوٹ ہیں۔ اور یہ حکایت صرف اس لیے وجود میں لائی گئی تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ یزید کی بیعت برضا و رغبت نہیں بلکہ تلوار کے بل بوتے پر ہوئی ہے اور یہ سبق امیر معاویہؓ اپنی زندگی میں پڑھا کر گئے تھے۔ یعنی جب ان کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ طرز عمل تھا، تو اغیار کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتے ہوں گے۔

فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ — ہماری جانب سے جھوٹوں پر اللہ کی لعنت

ال عمران۔ ۶۱ — (القرآن)

میری اُمّت کا اختلاف رحمت ہے

یہ ایک ایسی روایت ہے جسے ہمارے تمام علماء اختلافی مسائل میں بطور دلیل پیش کیا کرتے ہیں گویا ہم کتنا بھی سرپھٹول کریں، کتنا بھی کسی کا مذاق اڑائیں اور کتنے بھی کسی کے خلاف فتوے صادر کریں۔ یہ سب اللہ کی رحمت ہے اور جب یہ اختلاف رحمت الٰہی ہے تو خود ہی سوچ لیجیے کہ ہم اتفاق و اتحاد کی دعوت کیسے دے سکتے ہیں۔ وہ تو اللہ کا ایک عذاب ہوگا۔ کیونکہ جو شئے رحمت الٰہی نہ ہوگی۔ وہ یقیناً عذاب ہوگی۔ خواہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں یہ فرماتا رہے۔

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ الانفال - ۴۵ -

اور باہم نہ جھگڑو ورنہ تم پھسل جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

اور خواہ یہ ارشاد ہو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۖ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ آل عمران ۱۰۳

اور اللہ کی رسی کو سب مل کر پکڑو اور متفرق نہ ہو جاؤ اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر کی گئی کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔

اور خواہ رسول یہ حکم دیں کہ ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کی کوشش نہ کرو اور اللہ کے بندو باہم بھائی بھائی بن جاؤ۔

تو بات یہ ہے کہ ہمارے بزرگ اور اکابرین کوئی ناسمجھ لوگ نہ تھے۔ آخر وہ بھی قرآن سے واقف تھے۔ لیکن پھر بھی وہ یہ روایت پیش کرتے رہے۔ تو اس کا مقصود تو یہ ہوا کہ چونکہ ہم قرآن کو صحیح

معنی میں سمجھ نہیں پا رہے۔ لہٰذا ہمارے لیے ان کا عمل حجت ہے، اور اس حدیث پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ وہ دلیل ہے جو ہمارے بزرگان دین اور علماء پیش کیا کرتے اور قرآن پر خط نسخ پھیرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ہم اس کہانی کی صورت حال معلوم کرنے پر مجبور ہوئے۔

ہم نے بچپن سے لے کر آج تک جتنی کتابوں کا مطالعہ کیا خواہ وہ کسی فن سے متعلق ہوں۔ لیکن کسی مصنف نے آج تک اس کی سند بیان نہیں کی۔ بلکہ حقیقی معنی میں یہ روایت علم سینہ بسینہ کی قسم کی ایک گپ ہے جسے خاص طور پر ہمارے صوفیاء بطور دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔

علامہ عبدالرحمان بن علی الشیبانی الاثری الشافعی رقم طراز ہیں۔

اکثر آئمہ حدیث کا خیال ہے کہ یہ روایت بے اصل ہے۔ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ ہاں خطابی نے "غریب الحدیث" میں اس کا ذکر کیا ہے جس سے لوگوں کو یہ گمان پیدا ہوا کہ اس کی کوئی اصل ہوگی۔

جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں اسے نصر المقدسی نے "الحجہ" میں اور بیہقی نے "الرسالۃ الاشعریہ" میں بلا سند نقل کیا ہے۔ اسی طرح حلیمی، قاضی حسین اور امام الحرمین وغیرہ نے بھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ متقدمین کی ان کتابوں میں ہو جو ہم تک نہیں پہنچیں۔ تمیز الطیب من الخبیث صلا۔

یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ پانچویں صدی کے بعد کی ایک بازاری گپ ہو۔ کیونکہ جن لوگوں نے اسے اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے یہ سب پانچویں صدی کے بعد کے افراد ہیں اور سب بلا سند نقل کر رہے ہیں

علامہ ناصر الدین البانی لکھتے ہیں۔

اس روایت کی کوئی اصل نہیں۔ اگرچہ بہت سے محدثین نے اس کی سند معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے حتیٰ کہ سیوطی جیسے (اس روایت کی تخریج میں) یہاں تک کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ ان کتابوں میں ہو جو ہم تک نہیں پہنچیں (گویا سیوطی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بہت سی روایات ہم سے ضائع ہوگئیں اور اس طرح ہم دین کے بہت سے حصہ سے محروم ہو گئے)

مناوی نے علامہ تاج الدین ابو نصر عبدالوہاب بن تقی الدین السبکی المتوفی ۷۷۱ھ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

یہ روایت محدثین کے نزدیک غیر معروف ہے۔ اس کی کوئی سند موجود نہیں۔ نہ صحیح نہ ضعیف اور نہ موضوع۔ السلسلۃ الاحادیث الضعیفہ ج ۱ ص۷۶۔

ملا علی قاری "موضوعات کبیر" میں لکھتے ہیں۔

یہ روایت کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اکثر آئمہ کا بیان یہ ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں۔ اس روایت کو قرطبی نے "غریب الحدیث" میں درمیان کلام میں کچھ اس طرح ذکر کیا ہے۔ جس سے یہ تخیل پیدا ہوتا ہے کہ قرطبی کے نزدیک اس کی کوئی اصل ہوگی۔ سیوطی لکھتے ہیں۔ نصر المقدسی نے "الحجہ" میں، بیہقی نے "الرسالۃ الاشعریہ" میں بغیر سند کے۔ حلیمی، قاضی حسین اور امام الحرمین وغیرہ نے بلا سند روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ شاید یہ ان حافظین حدیث کی کتابوں میں ہو جو ہم تک نہیں پہنچیں۔

زرکشی لکھتے ہیں۔ اسے نصر المقدسی نے "کتاب الحجہ" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بیان کیا ہے اور بیہقی نے "المدخل" میں قاسم بن محمد تابعی المتوفی ۱۰۶ھ کا قول بیان کیا ہے۔

عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے کہ اگر صحابہ کرام اختلاف نہ کرتے تو مجھے یہ امر اچھا نہ لگتا۔ اس لیے کہ ان کے اختلاف کے باعث ہمارے لیے رخصت پیدا ہوگئی ہے۔ سیوطی لکھتے ہیں اس سے مراد اختلاف فی الاحکام ہے۔

غالباً ان حضرات کا اشارہ اس روایت کی جانب ہے جو جویبر نے ضحاک کے ذریعہ ابن عباسؓ سے مرفوعاً نقل کی ہے کہ میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لیے رحمت ہے (یہ روایت بھی ضعیف ہے)

ابن سعد نے طبقات میں قاسم بن محمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا اختلاف لوگوں کے لیے رحمت ہے۔

گویا صحابہ کرام کے علاوہ اور لوگوں کا اختلاف ایک زحمت اور عذاب ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مقصد یہ ہو کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ جب لوگ گمراہی کا راستہ اختیار کریں گے۔ تو کوئی نہ کوئی سیدھی راہ دکھانے کے لیے اختلاف کرے گا تو یہ اختلاف رحمت ہوگا۔

موضوعات کبیر ص۲۶ ۔

حاصل کلام یہ کہ یہ روایت بے اصل ہے ۔ اس کا کوئی وجود نہیں ۔ ہاں عمر بن عبدالعزیز اور قاسم بن محمد کی اپنی رائے ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اختلاف نہ کرتے تو ہمارے لیے رخصت پیدا نہ ہوتی ۔ اس لحاظ سے اُن کا اختلاف رحمت ہے ۔ لیکن یہ تابعی کا قول ہے حدیث نہیں ۔ اسے حدیث کے طور پر دلیل میں پیش کرنا جائز نہیں ۔

میری امت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کی طرح ہیں

دیگر روایات کی طرح یہ روایت بھی عوام وخواص میں مشہور عام ہے ۔ لیکن یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خالص جھوٹ ہے اور بازاری گپ ہے امام احمد اس قسم کی روایات کو حدیث السوق، بازاری حدیث کہا کرتے تھے ۔

ملا علی قاری رقم طراز ہیں کہ دمیری زرکشی اور حافظ ابن حجر کا قول ہے کہ یہ روایت بے بنیاد ہے ۔ سیوطی نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے ۔ موضوعات کبیر ص۸۳ حافظ سخاوی رقم طراز ہیں ۔ ہمارے شیخ ابن حجر اور ان سے قبل دمیری اور زرکشی نے بیان کیا ہے کہ یہ روایت بے اصل ہے بلکہ بعض حضرات نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس روایت کا کسی معتبر کتاب میں کوئی وجود نہیں ۔ المقاصد الحسنہ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتہرۃ علی الالسنۃ ۲۸۶ تمییز الطیب من الخبیث فی ما یدور علی السنۃ الناس من الحدیث ص۱۰۷ تذکرۃ الموضوعات لمحمد طاہر پٹنی ص۲۰

اللہ اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے

(امیر معاویہؓ کا)

امام مسلم نے ابوحمزۃ القصاب کے ذریعہ ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اتنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ تو میں دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں اچانک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس پہنچ گئے اور میرے مونڈھے پکڑ کر ہلاتے اور فرمایا۔ جاؤ میرے پاس معاویہؓ کو بلا کر لاؤ۔ میں کچھ دیر کے بعد حضورؐ کے پاس آیا اور عرض کیا وہ تو کھانا کھا رہے ہیں۔ آپ نے کچھ دیر بعد پھر فرمایا جاؤ، معاویہؓ کو بلا لاؤ۔ میں نے پھر آکر کہا کہ وہ تو کھانا کھا رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اللہ اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے۔ مسلم ج ۲ صـ ۳۲۶ ۔

امام مسلم نے اس روایت کو کتاب المناقب میں ذکر نہیں کیا۔ جہاں اسے ذکر کرنا چاہیئے تھا، بلکہ اس روایت کو کتاب البر والصلہ میں ذکر کیا اور اس سے قبل چار احادیث اس مضمون کی پیش کیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برسر منبر یہ دعا فرمائی۔ اے اللہ میں ایک بشر ہوں۔ لہٰذا بلحاظ بشریت میری زبان سے کسی مومن کو اذیت پہنچی ہو۔ یا میں نے اسے برا بھلا کہا ہو (اسے ہم نے سب کا ترجمہ کیا ہے۔ مودودی صاحب نے خلافت و ملوکیت میں جگہ جگہ گالیوں سے ترجمہ کر کے بنی امیہ پر الزام لگایا ہے کہ وہ برسر منبر حضرت علیؓ اور ان کے گھر والوں کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ لہٰذا بقول مودودی صاحب یہاں ترجمہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جسے میں نے گالیاں دی ہوں، یعنی عیاذ باللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی گالیاں دیا کرتے تھے) یا اس پر لعنت بھیجی ہو، یا اس کو مارا ہو، یا اس کے ساتھ بدتہذیبی کی ہو یا اسے بد دعا دی ہو، تو ان تمام امور کو اس مومن کے لیے رحمت اور اپنے پاس قرب کا ذریعہ بنانا اور میری اس زیادتی کو اس کے لیے نجات بنا دینا۔

امام مسلم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت انسؓ سے نقل کر کے پھر ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی۔ جس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اگرچہ

یہ الفاظ بظاہر بد دعائیہ ہیں لیکن مذکورہ احادیث کے باعث یہ الفاظ امیر معاویہؓ کے لیے دعا اور تقرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ بلکہ بار بار طلب کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبی لگاؤ کی علامت ہے کہ بار بار آپ ان کو یاد فرما رہے ہیں۔

لیکن چونکہ ہمارے رگ و پے میں بغض معاویہؓ کا زہر سمایا ہوا ہے اس لیے رئیس احمد جعفری نے، جو تمام زندگی سنّی بنے رہے۔ صحیح مسلم کے ترجمہ میں جسے لاہور سے غلام علی اینڈ سنز نے طبع کیا ہے۔ اس حدیث پر یہ سرخی قائم کی۔ "معاویہؓ کے لیے بد دعا" حالانکہ امام مسلم نے پوری کتاب میں کہیں سرخی قائم نہیں کی۔ اسی وجہ سے اس کی سرخیاں حاشیہ پر لکھی جاتی ہیں جو امام نووی نے صدیوں بعد قائم کی ہیں لیکن امام نووی نے ایسی گندی ذہنیت کی کوئی سرخی قائم نہیں کی تھی یہ کام تو ایک خالص تقیہ باز تبرائی ہی انجام دے سکتا ہے۔ حالانکہ اس روایت کو اگر از ابتدا تا انتہا بغور پڑھا جائے تو یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ یہ کہیں بیان نہیں کر رہے ہیں کہ میں معاویہؓ کے پاس گیا تھا۔ بلکہ اپنا بچپنا بیان کر رہے ہیں کہ میں نے جھوٹ موٹ آکر کہہ دیا کہ کھانا کھا رہے ہیں، یعنی یہ ایک بہانہ تھا اور ابتداء میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا اور آپ کو دیکھ کر چھپ گیا تھا۔ جس طرح یہ چھپ جانا میرا ایک بچپن کا عمل تھا۔ اسی طرح آکر یہ بہانا کرنا بھی ایک بچپنا پن تھا۔ یعنی کمزوری تھی تو ابن عباسؓ اپنی بیان فرما رہے ہیں۔ لیکن رئیس احمد جعفری جیسے تقیہ باز کی رگ شیعیت پھڑک اٹھی اور انہوں نے امیر معاویہؓ کو مورد الزام بنا دیا۔

حالانکہ بلحاظ سند بھی یہ روایت اتنے اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے اس پر ایمان لایا جائے۔ ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کرنے والا ابوحمزہ القصاب ہے۔

ابوحمزہ القصاب

اس کا نام عمران بن ابی عطاء الاسدی الواسطی ہے امام شرف الدین نووی صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں۔ اس نے ابن عباسؓ سے اس روایت کے علاوہ کوئی اور روایت نقل نہیں کی۔ اور بخاری نے اس سے کوئی روایت نہیں لی اور امام مسلم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بد دعا نہیں بلکہ دعا ہے۔

ذہبی میزان میں لکھتے ہیں۔ امام احمد کا قول ہے کہ اس سے شعبہ، ہشیم اور ابو عوانہ نے روایت کی ہے۔ لہٰذا اس کی روایت اچھی ہوتی ہے۔ ابو زرعہ کہتے ہیں یہ کمزور ہے۔ عقیلی کہتے ہیں اس روایت کو کوئی اور روایت نہیں کرتا اور یہ ضعیف ہے۔ ابو داؤد کا بیان ہے کہ ابو عوانہ نے اس سے بیس سے زیادہ روایات نقل کی ہیں۔ اسے عمران الجلاب بھی کہتے ہیں، یہ کچھ نہیں ضعیف ہے۔ میزان ج ۳ صہ ۲۳۹۔

ابن ابی حاتم نے اپنے والد ابو حاتم سے نقل کیا ہے کہ یہ عمران بن ابی عطا قوی نہیں الجرح والتعدیل ج ۷ صہ ۳۰۲

امام مسلم نے تو یہ روایت اتنی ہی نقل کی تھی لیکن حافظ ابن کثیر نے المستدرک اور مسند احمد کے حوالہ سے آخر میں اس ابو حمزہ کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ اس دعا کے بعد معاویہؓ کا پیٹ کبھی نہیں بھرا۔ اس دعا کے ذریعہ معاویہؓ دنیا و آخرت میں بہت فائدہ اٹھاتے رہے۔ دنیا میں صورتِ حال یہ تھی کہ جب وہ شام کے [illegible] تو وہ دن میں سات مرتبہ کھانا کھاتے۔ ان کے سامنے ایک طباق بھر کر کھانا لایا جاتا جس میں بہت سا گوشت اور پیاز ہوتے اسی طرح دن میں سات مرتبہ گوشت کھاتے اور اس کے علاوہ حلوا اور بہت سے میوے کھاتے اور کہتے اللہ کی قسم میرا پیٹ کبھی نہ بھرے گا۔ میں بھوکا ہی رہوں گا۔ یہ زیادہ کھانا ایک ایسی نعمت ہے جو تمام بادشاہوں میں پائی جاتی ہے۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۸ صہ ۱۱۹۔

سوال یہ ہے کہ ابتدائی واقعہ جو ہم نے مسلم کے حوالہ سے پیش کیا ہے وہ تو ابو حمزہ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ لیکن یہ ہوائی گپ کس سے نقل کی۔ ابو حمزہ اس کا نام بیان نہیں کرتا۔

گویا اس کا دعویٰ یہ ہے کہ امیر معاویہؓ کی بھوک شام کا امیر بن جانے کے بعد کھلی۔ اس سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا کوئی اثر نہیں ہوا اور آخر میں کہتا ہے کہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ بادشاہوں پر اللہ کی رحمت ایسی ہی ہوتی ہے۔

یعنی یہ ابو حمزہ رحمت الٰہی کے پردہ میں امیر معاویہؓ کو ایک ایسا دنیا دار بادشاہ ثابت کر رہا ہے جسے پیٹ بھرنے سے فرصت نہ ملتی تھی۔ اور اس بیچارے کو کھانے کو نہیں ملتا تھا

حضرت آدم کی توبہ کس طرح قبول ہوئی ؟

اگر نامِ محمدؐ را نہ آوردے شفیع آدم

نہ آدم یافتے توبہ نہ نوح از غرق نجّینا

حاکم نے "المستدرک" میں ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں اور بیہقی نے "دلائل النبوت" میں حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب آدمؑ سے غلطی سرزد ہوئی تو انہوں نے بارگاہ الہٰی میں عرض کیا۔ اے پروردگار میں آپ سے محمدؐ کے واسطے سے سوال کرتا ہوں کہ میری مغفرت فرما دیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم نے محمدؐ کو کیسے پہچانا۔ حالانکہ انہیں ہم نے ابھی پیدا ابھی نہیں کیا۔ حضرت آدمؑ نے عرض کیا جب آپ نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور مجھ میں اپنی روح ڈالی۔ تو میں نے اپنا سر اٹھایا تو عرش کے پایہ پر لکھا دیکھا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ تو میں نے اس سے سمجھ لیا کہ آپ نے اپنے نام کے ساتھ اسی شخص کا نام ملایا ہوگا جو آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے آدمؑ تو نے سچ کہا۔ وہ میری مخلوق میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے تو مجھے اس کے واسطے سے پکار، میں تیری مغفرت کر دوں گا۔ کیوں کہ اگر محمد نہ ہوتے تو میں تجھے بھی پیدا نہ کرتا۔ المستدرک ج ۲ صـ ۲۱۵۔

ہر سہ مذکورہ کتب میں اس کی ایک ہی سند ہے اور مستدرک میں اس کے جو راوی ہیں۔ انہی راویوں سے سمعانی اور بیہقی نے اسے نقل کیا ہے۔ یعنی عبد اللہ بن مسلم، اسماعیل بن مسلمہ، عبد الرحمان بن زید بن اسلم، اسلم، حضرت عمرؓ۔

بیہقی نے دلائل النبوت" میں اسے روایت کر کے لکھا ہے کہ یہ روایت عبد الرحمان بن اسلم کے علاوہ کوئی نقل نہیں کرتا اور وہ ضعیف ہے۔

حاکم لکھتے ہیں یہ روایت صحیح الاسناد ہے۔ یہ پہلی حدیث ہے جو میں نے اس عبد الرحمٰن سے

"مستدرک" میں نقل کی ہے۔

حافظ ذہبی "تخریج مستدرک" میں حاکم کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ روایت کیسے اور کہاں سے صحیح ہوتی؟ یہ روایت تو موضوع ہے اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم واہی ہے اور عبداللہ بن مسلم الفہری کو میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟

لیکن عبداللہ بن مسلم الفہری کا میزان میں ذکر کرتے ہوئے یہ روایت نقل کر کے لکھتے ہیں: یہ روایت باطل ہے۔ یعنی اے آدمؑ اگر محمد نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا نہ کرتا۔ میزان ج ۲ ص۵۰۴۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔ یہ روایت قطعی طور پر ضعیف ہے۔ البدایۃ والنہایہ ج ۲ ص۳۲۳۔

حافظ ابن حجر "لسان" میں لکھتے ہیں یہ روایت باطل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عبداللہ بن مسلم الفہری سے مراد عبداللہ بن مسلم بن رشید ہو۔ جس کا ذکر ابن حبان نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اس عبداللہ بن مسلم پر احادیث وضع کرنے کا الزام ہے۔ یہ امام مالک، امام لیث اور عبداللہ بن لہیعہ کے نام سے احادیث وضع کرتا تھا۔ اس کی روایت کا لکھنا تک حلال نہیں، اس نے ایک کتاب تیار کی تھی۔ جس میں ابن ہدبہ کی روایات ہیں اور یہ سب موضوع ہیں۔ لسان المیزان ج ۳ ص۳۵۹۔

اس حدیث کو طبرانی نے "المعجم الصغیر" ص۲۰۷ پر عبدالرحمان بن اسلم سے نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس سند کے علاوہ اس کی کوئی اور سند نہیں۔

ہیثمی "مجمع الزوائد" ج ۸ ص۲۵۳ پر لکھتے ہیں۔ یہ روایت طبرانی نے "اوسط" اور "صغیر" میں نقل کی ہے۔ اس کے بعض راوی تو مجہول ہیں۔ اور آخر میں یہی عبدالرحمان موجود ہے۔

امام ابن تیمیہ اپنی کتاب "القاعدۃ الجلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ" کے ص۶۹ پر لکھتے ہیں۔

اس روایت کے باعث حاکم پر سخت اعتراض کیا گیا ہے۔ کیونکہ حاکم خود اپنی کتاب "المدخل فی معرفۃ الصحیح من السقیم" میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمان بن زید اپنے باپ کے نام سے موضوع احادیث روایت کرتا ہے اور یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ یہ روایت عبدالرحمان نے وضع کی ہے۔ کیونکہ عبدالرحمان تمام محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ یہی بات ابن الجوزی نے تحریر کی ہے، بلکہ علی بن المدینی اور ابن سعد

نے تو اسے انتہائی ضعیف قرار دیا ہے۔

طحاوی لکھتے ہیں یہ محدثین کے نزدیک انتہائی ضعیف ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں یہ حدیث میں تبدیلیاں کرتا ہے۔ قولِ تابعی کو حدیث رسول بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس لیے اس کی روایت ترک کر دی گئی۔

حافظ ابو نعیم نے حاکم کا قول نقل کیا ہے کہ یہ عبدالرحمان اپنے باپ کے نام سے جھوٹی احادیث روایت کرتا ہے۔ السلسلۃ الاحادیث الضعیفہ ج ۱ ص ۳۸۔ پھر بھی حاکم مستدرک میں اس کہانی کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ اور حیرت تو بیہقی جیسے شخص پر ہے جنہوں نے اس موضوع کہانی کو" دلائل النبوت" میں نقل کر کے اسے دلیل نبوت بنا دیا ہے۔ اگرچہ انہوں نے ضعیف بھی لکھا ہے۔ لیکن ایسی لغو کہانی نقل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ؟

دراصل یہ تمام فساد قرآن کی ایک آیت کی تفسیر میں برپا کیا گیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ

آدم نے اپنے رب سے کلمات حاصل کیے۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول کی۔

یہ تمام احتمالات تو اس وقت پیدا ہو سکتے تھے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوئی وضاحت نہ کی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ سورہ اعراف میں خود وضاحت فرما رہا ہے کہ ہم نے یہ کلمات تلقین کیے تھے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ الاعراف ۲۳

اے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ فرمائیں گے اور رحم نہ کریں گے تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں داخل ہو جائیں گے۔

لیکن چونکہ روایت پرستی ہماری رگ وپے میں رچ بس گئی ہے اس لیے قرآن مجید کی سیدھی سادھی بات ہماری عقل میں نہیں آتی، بلکہ ہمیں دیو مالائی داستانوں کی ضرورت ہے حتیٰ کہ قرآن بھی ان جھوٹی داستانوں کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ لہٰذا ایک ایسی داستان ہم سے سن لیجئے جس سے یہ داستان خود بخود کالعدم ہو جاتی ہے

ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدمؑ ہندوستان میں اتارے گئے۔ جب تنہائی سے گھبرانے لگے تو جبریلؑ آئے اور اذان دی، اللہ اکبر اللہ اکبر، اشہد ان لا الٰہ الا اللہ، اشہد ان

محمدا رسول اللہ ۔ اشہدان محمدان رسول اللہ ۔ یہ سن کر حضرت آدم بولے یہ محمد کون ہے ؟ جبرئیل نے جواب دیا یہ تیری اولاد میں سے آخری نبی ہے ۔ ابن عساکر ج ۲ ص۳۲۳ ۔

اس روایت سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت آدمؑ کو ایک عرصہ دراز تک بھی اس کا علم نہ ہوا کہ محمد کون ہیں ۔ یہ دونوں روایات متضاد ہیں (ایک عرش کی ہے تو دوسری زمین کی) اب روایت پرستوں کو خود ہی فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کہانیوں کے ساتھ کیا سلوک ہو ۔ اور بقول علامہ ناصر الدین البانی یہ روایت پہلی روایت سے بلحاظ سند بہت بہتر ہے ۔ اگرچہ قابل اعتبار یہ بھی نہیں ۔ لیکن ایک مردود کہانی کا دوسری مردود کہانی کے ذریعہ رد کرنا زیادہ مناسب ہے ۔ السلسلۃ الاحادیث الضعیفہ ج ۱ ص۳۹۷ ۔

ہم جب اس قسم کی روایات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی کچھ اکھاڑے اس قسم کے کھلے ہوتے تھے ، جن میں ہر فنکار انوکھے قسم کے جھوٹ تیار کر کے دوسرے جھوٹوں کو شکست دے کر تمغہ امتیاز حاصل کر سکے اور ماشاء اللہ یہ فن اتنے عروج پر تھا کہ انسان کے زہد و تقویٰ اور شرافت کی پہچان بن گیا تھا اور من و عن ہر گدی اور ہر منبر سے یہ مقابلہ آج بھی جاری ہے ۔ بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے ۔ اللہ تعالیٰ بھی جانتا تھا کہ امت محمدیہ میں ایسے فنکار ضرور پیدا ہوں گے جو اللہ اور اس کے رسول پر فی البدیہ جھوٹ گھڑ کر اس کی تلقین کریں گے ۔ اس لیے اس نے جواب کے طور پر سورہ اعراف میں یہ کلمات نازل فرما دیے ۔ تاکہ کھرا کھوٹا جدا ہو جائے اور پرکھنے والا ہر جھوٹ کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ سکے ۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ قرآن و احادیث صحیحہ کی رو سے دعا کے لیے صرف دو وسیلے یا واسطے اختیار کیے جا سکتے ہیں ۔ ایک اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ اور دوسرے اپنے نیک عمل ۔ بصورت دیگر قرآن و فرمان رسولؐ کی خلاف ورزی کہلائے گی اور نقصان دہ ثابت ہوگی ۔ حضرت آدمؑ پر تو صرف رسول اللہ کا واسطہ استعمال کرنے کی تہمت لگائی گئی ہے ، ہم نے تو اپنی دعاؤں کے لیے واسطوں وسیلوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست مرتب کر رکھی ہے جس میں اسماء الحسنیٰ اور نیک اعمال کے بجائے صرف مردوں ہی کے نام درج ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں اس قسم کے شرک سے نجات حاصل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے ۔ آمین

حضرت علیؓ کا بھائی چارہ کس سے ہوا؟

(ہجرت مدینہ کے بعد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو چونکہ یہ تمام حضرات اپنا مال و متاع اور ہر قسم کا ساز و سامان چھوڑ کر مدینہ آئے تھے اور سب بے سر و سامانی کی حالت میں تھے۔ ان پر آسمان کے علاوہ کوئی سایہ نہ تھا، اور پیٹ بھرنے کے لیے ان کے پاس ایک دانہ نہ تھا۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مہاجرین کا انصار سے بھائی چارہ کرایا۔ تاکہ ان مہاجرین کے پاس سر چھپانے کو جگہ ہو جاتے اور جب تک یہ لوگ اپنے قدموں پر کھڑے ہو جائیں اس وقت تک ان کے پیٹ بھرنے کا بھی کوئی ذریعہ ہو، اور یہ حضرات اطمینان سے اپنے معاشی حالات درست کر سکیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ انصار نے ان حضرات پر اپنا سب کچھ قربان کیا۔

لیکن مؤرخین جہاں اس بھائی چارے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہاں ان مؤرخین نے خاموشی کے ساتھ بارفیا کا انجکشن بھی لگا دیا ہے یہ خطرناک زہر آج کل کے سنیوں کے سینوں کو چاٹ رہا ہے وہ زہر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انصار و مہاجرین کا بھائی چارہ کرایا تو حضرت علیؓ کو اپنا بھائی بنایا۔

لیکن ان عقل کے کودنوں کو اتنی عقل بھی نہ آئی کہ ایک مہاجر کا مہاجر سے بھائی چارہ کرنے کا کیا فائدہ حالانکہ حضرت علیؓ تو خود خونی رشتے سے بھائی تھے، اس بھائی چارے کا مقصد تو یہ ہوگا کہ حضرت علیؓ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی رشتہ نہ تھا جو اب بھائی چارہ کرایا جا رہا ہے اور ان دونوں حضرات میں سے کیا ایک انصاری ہے اور ایک مہاجر ہے۔ یہ ایک ایسی احمقانہ بات ہے جس سے بڑی حماقت کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مؤرخ محمد بن اسحاق لکھتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مہاجرین وانصار کا بھائی چارہ کرایا تو حضرت علیؓ کا ہاتھ تھاما اور فرمایا۔ یہ میرا بھائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید المرسلین، امام المتقین، رسول رب العالمین اور ایک ایسی ہستی تھے۔ جن کی نظیر بندوں میں ملنی ممکن نہیں تو آپ اور علیؓ بھائی بھائی بنے۔ حمزہؓ بن عبدالمطلب جو اسد اللہ واسد رسولہ تھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ ان کا بھائی چارہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مولی زیدؓ بن حارثہ سے کیا۔ اور جعفرؓ بن ابی طالب ذوالجناحین اور معاذ بن جبلؓ کو بھائی بنایا۔ زبیرؓ بن العوام اور عبدؓ اللہ بن مسعود کو بھائی بنایا۔ اور عمارؓ اور حذیفہ بن الیمانؓ جو عبدالاشہل کے حلیف تھے۔ انہیں آپس میں بھائی بھائی بنایا۔ اور سلمان اور ابوالدرداءؓ کو بھائی بھائی بنایا۔

ابن اسحاق کی یہ عبارت ہم نے حافظ ابن کثیر کی البدایۃ والنہایہ سے نقل کی ہے۔ ابن اسحاق کا ہم تفصیلی حال اوّل حصہ میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ ایرانی النسل شیعہ ہے اور متعدد ائمہ محدثین نے اسے کذاب کہا ہے۔

ہم نے یہ عبارت بہت دل پر جبر کر کے لکھی ہے ورنہ ہمیں تو خطرہ یہ تھا کہ شدید صدمہ کے باعث ہمیں کہیں ڈاکٹر کی ضرورت پیش نہ آجاتے اور کچھ دیر کے لیے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ واقعتاً یا تو ہم بے وقوف ہیں یا پھر محمد بن اسحاق اول درجہ کا چالباز اور مکار ہے۔ بھلا کوئی یہ تو پوچھے ......

۱۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے مناقب وفضائل بیان کر کے یہ کہنا کہ حضرت علیؓ آپ کے بھائی بنے۔ اس میں آخر کیا راز پوشیدہ ہے؟ کیا ابن اسحاق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان خصوصیات کے بھی حصے بخرے کرنا چاہتا ہے۔ آخری جملے سے یہ امر خود بخود واضح ہو رہا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق میں بے نظیر ہیں تو جسے آپ نے بھائی بنایا وہ بھی بے نظیر ہوا۔ اسی طرح ہمارے قارئین دیگر صفات کے بھی حصے بخرے کر کے دیکھ لیں۔ ان پر یہ امر خود بخود واضح ہو جائے گا کہ ہم واقعتاً بے وقوف ہیں اور ابن اسحاق کی چالبازی کا جواب نہیں۔

۲۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کا بھائی چارہ کرایا گیا۔ حالانکہ یہ دونوں بھی مہاجر تھے۔ ہو سکتا ہے ابن اسحاق کے ذہن میں یہ کیڑا کلبلایا ہو کہ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

اور حضرت علیؓ کا بھائی چارہ کیسے ہوا۔ یہ دونوں تو مہاجر تھے ؟ تو جھٹ جواب حاضر ہے کہ جیسے حضرت حمزہؓ اور زیدؓ کا ہوا۔ قربان جایئے اس فن کاری کے۔ اور اس فن کاری کو پیش کرنے کے لیے حضرت حمزہؓ کے ساتھ ان کے خطابات اسد اللہ و اسد رسولہ بھی لگائے۔ تاکہ آپ اسے سچ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں ورنہ شیعہ بلکہ موجودہ دور کے سنی بھی اسد اللہ الغالب کے خطاب سے صرف حضرت علیؓ کو نوازتے ہیں اسی لیے ہمارے یہاں تین ٹانگوں کا شیر اسد اللہ الغالب کی پہچان بن گیا ہے جس کا چہرہ شیر کے چہرے سے مماثلت رکھنے کے بجائے ناک نقشے کے اعتبار سے مکمل طور پر انسانی ہے۔ جس کی تصدیق حبیب پلازہ کراچی پر منقش شیر کی بڑی سی تصویر سے کی جاسکتی ہے۔

۳۔ حضرت جعفرؓ ۵ نبوی میں ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے۔ وہاں سے ان کی واپسی ۷ھ میں فتح خیبر کے موقع پر ہوئی اور یہ بھائی چارہ ہجرت مدینہ کے آٹھ ماہ بعد ہوا حقیقت یہ ہے کہ یا تو ابن اسحاق احمق ہے یا ہم اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ جسے چاہیں احمق قرار دیں۔

۴۔ حضرت سلمانؓ فارسیؓ ہجرت کے وقت ایک یہودی کے غلام تھے۔ اسلام لانے کے بعد انہوں نے اس یہودی سے آزادی کے لیے کہا تو اس نے بڑی کڑی شرائط لگائیں۔ جن کی تکمیل میں چار سال کا عرصہ لگ گیا اور ۵ھ میں آزاد ہوئے۔ ان کا بھائی چارہ کیا آسمانوں پر کرا دیا گیا تھا یا اس لیے اس کی ضرورت پیش آئی کہ وہ ایرانی تھے اور بقول ایرانیوں کے وہ علوم اولین و آخرین کے مالک تھے۔ حتیٰ کہ وہ پانچ افراد جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت مومن باقی رہ گئے تھے، ان کا علم اگر حضرت سلمانؓ کے علم کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ بھی کافر قرار پاتے، جیسا کہ اصول کافی میں موجود ہے۔

گویا روئے زمین پر صرف ایک مومن تھا اور اس کا بھائی چارہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے ہوا تھا۔ لیکن نہ معلوم کس جرم میں حضرت معاذؓ کو ایمان سے خارج کیا گیا۔ حالانکہ بھائی چارے کے اعتبار سے انہیں تو روئے زمین پر دوسرا مومن ہونا چاہیئے تھا۔ بلکہ جس طرح نقش بندی سلسلہ حضرت سلمانؓ سے لگایا جاتا ہے اسی طرح ایک سلسلہ حضرت معاذؓ سے بھی ملحق ہونا چاہیئے تھا۔ امید ہے کہ صوفیا اس پر غور کر کے جلد اسے روبہ عمل لائیں گے۔

۵۔ حضرت زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا باہم بھائی چارہ کرایا گیا۔ اتفاق سے یہ دونوں بھی مہاجر تھے۔

۶۔ حضرت عمارؓ اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا بھائی چارہ کرایا گیا۔ یہ بھی دونوں مہاجر تھے۔

امام ابن کثیر اس بھائی چارے پر تبصرہ کرتے ہوتے لکھتے ہیں۔

کہ ابن اسحق کی بعض باتوں پر اعتراض ہے۔ جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے بھائی چارے کا تعلق ہے تو علماء نے اس کا انکار کیا ہے اور وہ اس کی صحت کے منکر ہیں (امام ابن کثیر نے چودھویں صدی کے پاک و ہند کے سنی علماء کو نہیں دیکھا تھا، ورنہ اتنی بے باکی سے ایسی بات نہ لکھتے) کیونکہ یہ بھائی چارہ تو اس لیے ہوا تھا کہ مہاجرین وانصار میں محبت قائم ہو۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علیؓ سے بھائی چارہ۔ اسی طرح ایک مہاجر کا دوسرے مہاجر سے بھائی چارہ جیسے حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ کا بھائی چارہ ایک لایعنی شئے ہے۔

اسی طرح حضرت جعفرؓ اور حضرت معاذ بن جبل کے بھائی چارے پر بھی اعتراض ہے۔ مورخ ابن ہشام دمشقی نے بھی اس پر اعتراض کیا ہے۔ کیونکہ حضرت جعفرؓ تو مدینہ ۷ھ میں فتح خیبر کے موقع پر آتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آتے ہی ان کا بھائی چارہ کیسے کرا دیا۔ البدایۃ والنہایہ ج ۳ صـ ۲۲۷۔

اس بھائی چارے کو برقرار رکھنے کے لیے سبائی برداری نے چند روایات بھی وضع کر ڈالیں۔ اتفاق سے ان میں سے ایک روایت حاکم نے "المستدرک" اور ترمذی نے اپنی جامع میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے بایں الفاظ نقل کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے صحابہ کا بھائی چارہ کرایا تو حضرت علیؓ روتے ہوئے آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے اپنی ساتھیوں کا بھائی چارہ کرایا۔ لیکن میرا بھائی چارہ کسی سے نہیں کرایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا تو دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے۔ ترمذی ج ۲ صـ ۲۳۶۔ المستدرک ج ۳ صـ ۱۴۔

حکیم بن جبیر: علامہ عبدالرحمان مبارک پوری "العرف الشذی شرح ترمذی" میں فرماتے ہیں اس روایت میں ایک راوی حکیم بن جبیر ضعیف ہے اور شیعہ ہے۔

بخاری کہتے ہیں شعبہ کو اس پر اعتراض ہے۔ احمد کہتے ہیں حکیم بن جبیر ضعیف ہے، منکرالحدیث ہے نسائی کہتے ہیں قوی نہیں۔ دارقطنی لکھتے ہیں، متروک الحدیث ہے۔ معاذ کا بیان ہے کہ ہم نے امام شعبہ سے عرض کیا کہ آپ ہم سے حکیم بن جبیر کی احادیث بیان کیجیے۔ انہوں نے جواباً فرمایا۔ اس کی احادیث بیان کرنے سے مجھے جہنم میں جانے کا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔

فلاس کا بیان ہے کہ عبدالرحمان بن مہدی اس کی روایت قبول نہ کرتے تھے اور فرماتے تھے اس سے اگرچہ بہت کم روایات مروی ہیں لیکن ان میں سے اکثر منکر ہیں۔ جوزجانی لکھتے ہیں حکیم بن جبیر کذاب ہے میزان ج ۱ ص۵۸۴۔ کتاب الضعفاء والمتروکین للدارقطنی ص۲۷۔

علی بن قادم اس کی سند کا ایک اور راوی علی بن قادم ابوالحسن الخزاعی الکوفی ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ابن سعد کا قول ہے منکرالحدیث ہے۔ پکا شیعہ تھا۔ ابن عدی لکھتے ہیں میرے نزدیک اس کی بہت سی روایات منکر ہیں۔ میزان ج ۱ ص۱۰۔

اس کی سند کا آخری راوی جمیع بن عمیر التیمی ہے جو اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کر رہا ہے۔

جمیع بن عمیر التیمی: بخاری لکھتے ہیں۔ اس نے اگرچہ ابن عمرؓ اور عائشہؓ سے احادیث سنی ہیں لیکن محدثین کو اس کی روایات پر اعتراض ہے۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ یہ بدترین رافضی ہے۔ یہ اپنے دل سے روایات وضع کیا کرتا تھا۔ ابن نمیر کہتے ہیں اس کا شمار تو سب سے زیادہ جھوٹے لوگوں میں ہوتا ہے۔

ابن عدی لکھتے ہیں اس کی یہ کہانی منکر ہے اور اس کی عام روایات ایسی ہوتی ہیں جنہیں کوئی روایت نہیں کرتا۔ میزان ج ۱ ص۴۲۱۔

گویا ترمذی کی روایت میں تو تین رافضی جمع ہیں جن میں سے دو شخصوں پر وضع حدیث کا الزام ہے اور جس پر وضع حدیث کا الزام ہو، اس کی روایت موضوع ہوتی ہے۔

حاکم نے "المستدرک" میں یہ کہانی اسحاق بن بشر الکاہلی کے ذریعہ سالم بن ابی حفصہ سے نقل کی ہے جمیع کا حال تو اوپر گزر چکا، رہا اسحاق بن بشر اور سالم کا حال تو وہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

اسحاق بن بشر: ذہبی لکھتے ہیں، ابوبکر بن ابی شیبہ، موسیٰ بن ہارون اور ابو زرعہ رازی کہتے ہیں یہ کذاب ہے۔ دارقطنی لکھتے ہیں اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو روایات وضع کیا کرتا تھا۔ یہ کذاب و مفتری ہے۔ میزان ج ا ص۱۸۶۔ کتاب الضعفاء والمتروکین ص۱۶۔

سالم بن ابی حفصۃ العجلی الکوفی: فلاس کہتے ہیں ضعیف ہے۔ غالی قسم کا شیعہ تھا۔ نسائی کہتے ہیں ثقہ نہیں۔ ابن عدی کہتے ہیں اس پر تشیع میں غلو کا الزام ہے۔

محمد بن بشر العبدی کا بیان ہے کہ میں نے سالم بن ابی حفصہ کو دیکھا۔ اس کی داڑھی بہت لمبی تھی اور یہ اپنی داڑھی سے بھی زیادہ احمق تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ میں علی علیہ السلام کے ساتھ ہر جنگ میں ان کا شریک ہوتا۔

جریر بن عبد الحمید کہتے ہیں کہ میں نے سالم کو طواف کعبہ کرتے دیکھا۔ وہ یہ تلبیہ پڑھ رہا تھا، لبیک مہلک بنی امیۃ' اسے بنی امیہ کو تباہ کرنے والے میں حاضر ہوں۔ اس پر داؤد بن علی العباسی نے اسے ایک ہزار اشرفیاں عطا کیں۔

ایک بار عمر بن ذر نے سالم بن ابی حفصہ سے کہا کہ تو نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے۔ اس نے کہا یہ کیسے؟ عمر بن ذر نے جواب دیا کہ تو ان کے قتل پر راضی ہے تو تو نے ہی قتل کیا ہے۔

حسین بن علی الجعفی کا بیان ہے کہ یہ تلبیہ یں کہا کرتا تھا۔ لبیک مہلک بنی امیہ (اے بنی امیہ کو ہلاک کرنے والے میں حاضر ہوں۔ لبیک قاتل نعثل (اے نعثل کے قاتل میں حاضر ہوں)

(نعثل مدینہ کے ایک یہودی کا نام تھا۔ سبائی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لینے کے بجائے انہیں نعثل کہتے تھے)

علی بن المدینی کہتے ہیں میں نے جریر بن عبد الحمید کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں نے سالم کی روایات کو ترک کر دی ہیں۔ کیونکہ وہ شیعوں کی طرف سے سنیوں سے جھگڑتا تھا۔ علی بن المدینی کہتے ہیں جس کی روایت کو جریر شیعہ نے ترک کر دیا ہو وہ کتنا غالی رافضی ہوگا۔

بخاری لکھتے ہیں یہ ثقہ نہیں ۔ الضعفاء الصغیر ص۳۶ ۔
خلف بن حوشب کا بیان ہے کہ یہ ان لوگوں کا سرغنہ تھا جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو برا کہتے ہیں میزان ج ۲ ص۱۱

علامہ محمد طاہر پٹنیؒ رقم طراز ہیں ۔
یہ روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے بھائی چارہ کیا اور حضرت علی سے بھائی چارے کی تمام روایات اور ترمذی کی روایات سب ضعیف ہیں ۔ تذکرۃ الموضوعات ص۹۷ ۔

ناصر الدین البانی لکھتے ہیں ۔ امام ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں لکھا ہے کہ حضرت علی کے بھائی چارے کی جتنی روایات ہیں سب موضوع ہیں اور ذہبی نے بھی مختصر منہاج السنہ میں یہی کچھ تحریر کیا ہے ۔ السلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ ج ۱ ص۳۵۶ ۔

ذہبی نے میزان الاعتدال میں جمیع بن عمیر کے ترجمہ میں اس روایت کو منکر قرار دیا ہے اور تخریج مستدرک میں لکھتے ہیں ۔ جمیع نامی راوی متہم ہے ۔ اور اسحاق بن بشر الکاہلی ایک آفت ہے اور یہ کہانی موضوع ہے ۔
حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت علیؓ کا بھائی چارہ حضرت سہل بن حنیف انصاری سے ہوا ۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں ۔

قال محمد بن کعب القرظی و ھاجر علی بعد خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ وکان قد امرہ بقضاء دیونہ و ردود ائعہ ثم یلحق بہ فامتثل ما امربہ ثم ھاجر واخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بینہ وبین سہل بن حنیف ۔ البدایۃ والنہایہ ج ۷ ص۲۲۵ ۔

محمد بن کعب القرظی کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے کے بعد مکہ سے ہجرت کی ۔ کیونکہ آپ نے انہیں قرضوں کی ادائیگی اور امانتوں کی واپسی کے بعد مدینہ آنے کا حکم دیا تھا ۔ حضرت علیؓ یہ حکم بجا لانے کے بعد ہجرت کر کے مدینہ پہنچے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور سہلؓ بن حنیف کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا ۔

کربلائی مٹی

جس کے متعلق کہا جاتا ہے

(وہ خاک خون ہوئی تھی بروز عاشورہ۔ جو رکھ گئے تھے رسالت مآب شیشے میں)

حضرت حسین کی شہادت کو ایک افسانوی رنگ دینے کے لیے جہاں طرح طرح کے تاریخی جھوٹ بولے گئے وہاں روایات کی صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اس کی بشارتیں بھی وضع کی گئیں۔ ایک بشارت قارئین بھی ملاحظہ فرمالیں۔

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ حضرت جبرائیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوتے تھے اور حسینؓ میرے پاس تھے۔ وہ رونے لگے۔ میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے۔ حضرت جبرائیلؑ نے فرمایا اے محمد کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟ آپ نے جواب دیا ہاں۔ انہوں نے فرمایا تیری امت اسے قتل کرے گی اور اگر آپ چاہیں تو میں اس سرزمین کی مٹی لاکر آپ کو دکھا دوں جہاں یہ قتل کیے جائیں گے

ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے وہ مٹی دیکھی تو وہ کربلا کی مٹی تھی۔ میزان ج ۱ ص ۱۳۔

حضرت ام سلمہؓ چونکہ ماہر طبقات الارض تھیں اس لیے وہ پہچانتی تھیں کہ کونسی مٹی کس سرزمین کی ہے خواہ انہوں نے کبھی سرزمینِ عراق کا سفر بھی نہ کیا ہو۔ لیکن اگر وہ اس مٹی کو نہ پہچانتیں تو پھر یہ کہانی کیسے وجود میں آتی۔

ہاں ہم یہ ضرور سنتے اور پڑھتے آئے تھے کہ نبی کے علاوہ کسی انسان میں یہ قدرت نہیں کہ وہ کسی فرشتے کو دیکھ سکے۔ اگر فرشتہ انسانی صورت میں بھی آئے گا، تب بھی نبی کے علاوہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ یہ فرشتہ ہے۔ تاوقتیکہ وہ خود اس سے مطلع نہ کرے یا نبی اس کی اطلاع دے۔ کجا کہ اس کا کلام سننا کیونکہ یہ غیر نبی کے لیے ممکن ہی نہیں۔

حضرت ام سلمہؓ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ جبرئیل تشریف فرما ہیں اور یہ مکالمہ ہو رہا ہے روایت

کے الفاظ یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ چشم دید واقعہ ہے جو اس کے جھوٹ ہونے کی ایک واضح دلیل ہے۔

امام ذہبی نے یہ کہانی ابان بن ابی عیاش کے ترجمہ میں نقل کی ہے۔ امام ذہبی نے اس ابان پر کیا تبصرہ کیا ہے وہ بھی ملاحظہ کر لیجیے۔

صوفی ابان بن ابی عیاش اس کی کنیت ابو اسمٰعیل ہے۔ بصرہ کا باشندہ ہے۔ اسے صوفی دینار زاہد بھی کہا جاتا ہے۔ یہ چھوٹے درجہ کا تابعی ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں اس کا شمار ضعیف راویوں میں ہوتا ہے۔

امام شعبہ فرماتے ہیں اس کی روایت بیان کرنے سے بہتر تو یہ ہے کہ انسان گدھے کا پیشاب پی لے۔ اور ایک بار فرمایا کہ اس کی روایت لینے سے بہتر یہ ہے کہ انسان زنا کر لے (کیونکہ زنا سے عقیدہ تو خراب نہ ہوگا اور انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے سے محفوظ تو رہے گا۔

امام احمد اور یحییٰ بن معین کہتے ہیں یہ شخص متروک الحدیث ہے ابو عوانہ کہتے ہیں میں نے اس سے حسن بصری کی بہت سی روایات سنی تھیں۔ لیکن اب میں ان کا بیان کرنا بھی حلال نہیں سمجھتا۔ جوزجانی کہتے ہیں یہ ساقط الاعتبار ہے۔ نسائی کہتے ہیں متروک ہے۔ ابن عدی لکھتے ہیں۔ اس کی سب روایات منکر ہیں، ان منکرات میں سے ایک مذکورہ روایت بھی ہے۔

امام شعبہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ ابان بن ابی عیاش جھوٹ نہ بولتا ہو تو میرا گھر اور میری سواری مساکین کے لیے صدقہ ہے (یعنی اگر اس کا جھوٹا نہ ہونا ثابت ہو جائے) اگر مجھے لوگوں سے شرم محسوس نہ ہوتی تو میں اس کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھتا۔

یزید بن زریع فرماتے ہیں میں نے اس کی روایات ترک کر دی ہیں۔ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں یہ حدیث میں بہت بھولتا ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان اور عبد الرحمان بن مہدی اس کی روایات قبول نہ کرتے۔

علی بن المسہر کا بیان ہے کہ میں نے اور حمزۃ الزیات نے اس ابان سے سن کر پانچ سو احادیث لکھی تھیں۔ کچھ روز بعد میری حمزہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کو دیکھا کہ میں آپ کے روبرو اباںؔ کی احادیث پڑھ رہا ہوں۔ آپ نے پانچ یا چھ احادیث کے علاوہ سب سے انکار کر دیا (گویا ایک فی صد صحیح کا حساب بنا۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ ورنہ بعد کے صوفیاء میں تو ایک فی صد کا حساب بھی نہیں بنتا)

احمد بن علی الابار کا بیان ہے کہ میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ سے عرض کیا۔ کیا آپ اباں سے راضی ہیں ؟ فرمایا نہیں۔

ابن حبان لکھتے ہیں کہ یہ بہت زاہد و متقی اور نیک انسان تھا۔ تمام رات نماز پڑھتا اور ہمیشہ روزے رکھتا (گویا اپنے وقت کا قطب تھا) اس نے حضرت انسؓ سے چند روایات سنی تھیں اور حسن بصری کی مجلس میں شریک ہوتا۔ یہ اکثر اوقات حسن بصری کی ذاتی رائے اور قول کو حضرت انسؓ کے ذریعہ حدیث بنا کر پیش کرتا ہے حتیٰ کہ خود بھی اسے اس کا احساس نہیں ہوتا۔ میزان ج ۱ ص۱۰۔

دارقطنی لکھتے ہیں۔ اس اباں کے باپ کا نام فیروز ہے۔ بصرہ کا باشندہ ہے۔ متروک ہے الضعفاء والمتروکین ص۱۴۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں اباں کی روایات کچھ نہیں، ابو زرعہ کہتے ہیں کہ اس نے حضرت انس، شہر اور حسن بصری سے کچھ باتیں سنیں۔ لیکن اسے تو اتنی بھی تمیز نہیں کہ کون سا قول کس کا ہے۔ الجرح والتعدیل ج ۱ ص۲۹۶۔

اس اباں نے اس کہانی کو شہر کی جانب منسوب کیا ہے۔ اس نے یہ روایت شہر سے کہاں سنی اور کب سنی ؟ اس لیے کہ شہر دمشق کا باشندہ ہے۔ اور اباں بصرہ کا رہنے والا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ بھی اس کا ایک جھوٹ ہے۔ ویسے بھی شہر صاحب کوئی اچھی شہرت کے مالک نہیں۔

شہر بن حوشب : یہ حضرت ام سلمہؓ، ابو ہریرہؓ اور اسماءؓ بنت یزید بن السکن سے احادیث روایت کرتا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں۔ یہ اسماءؓ بنت یزید سے اچھی احادیث روایت کرتا ہے۔ (یعنی بقیہ بے کار ہوتی ہیں)

ابو حاتم فرماتے ہیں یہ حجت نہیں۔ نسائی اور ابن عدی کہتے ہیں قوی نہیں۔ ابن عون کہتے ہیں، محدثین نے اس سے روایت لینی ترک کر دی ہے۔

ابوبحر الکربانی کا بیان ہے کہ یہ بیت المال میں ملازم تھا اس نے اس میں سے چند درہم چرا لیے جس پر ایک شاعر نے اس کی مذمت میں اشعار بھی کہے۔

دولابی کہتے ہیں اس کی روایات دیگر لوگوں کی طرح نہیں ہوتیں یہ جب روایت بیان کرتا ہے تو اس کی تفصیل کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ جیسے یہ حضور کی اونٹنی کی لگام تھامے ساتھ موجود رہا ہو۔ فلاس کہتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید اس سے روایت نہ لیتے۔ شعبہ نے بھی اس کی روایت ترک کر دی ہے عباد بن منصور کا بیان ہے کہ یہ میرے ساتھ حج کو گیا۔ اس نے میری تھیلی چرا لی۔ گویا یہ عادی چور تھا ابن عدی لکھتے ہیں۔ شہر کی کوئی روایت حجت نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی روایت کو دین سمجھ کر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ میزان ج ۲ ص ۲۸۴۔

یعنی اس کہانی کا اگر راوی صرف شہر ہی ہوتا تب بھی یہ ناقابلِ قبول ہوتی۔ لیکن اس کی سند میں تو ابان جیسا خطرناک انسان موجود ہے۔ لہٰذا اب اس روایت کے منکر ہونے میں کیا شک وشبہ ہو سکتا ہے؟ ایسی روایت کو تو کوئی سبائیت زدہ ذہن ہی قبول کر سکتا ہے۔

یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر ایک مشہور اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کیا، چنانچہ جناب مولانا مودودی صاحب نے بھی یہ اعتراض کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ کام خالص اپنے مفاد کے لیے کیا تھا، وہ لکھتے ہیں:۔

"یزید کی ولی عہدی کے لیے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہ بن شعبہؓ) نے اپنے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس طرح امتِ محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔"

(خلافت و ملوکیت ص ۱۵۰)

اس کے بعد انہوں نے ابن اثیرؒ وغیرہ کی مختلف روایات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کے لیے بیعت لینے میں جبر و اکراہ، خوف و طمع اور رشوت کے ذرائع سے کھلم کھلا کام لیا۔

اس موضوع پر اپنی گفتگو شروع کرنے سے قبل ہم ابتداء ہی میں یہ بات صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ یہاں دو مسئلے الگ الگ ہیں:۔

۱۔ حضرت معاویہؓ کا یزید کو ولی عہد بنانا رائے، تدبیر اور نتائج کے اعتبار سے صحیح تھا یا غلط؟

۲۔ دوسرے یہ کہ حضرت معاویہؓ نے یہ کام نیک نیتی کے ساتھ جواز شرعی کی حدود میں رہ کر کیا تھا یا خالص اپنے ذاتی مفاد کے لیے حدود اللہ کو پامال کر کے؟

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے اس میں ہمیں مولانا مودودی صاحب سے اختلاف نہیں ہے جمہور

اُمّت کے محقق علماء ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست ثابت نہیں ہوا اور اس کی وجہ سے امت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا۔ لہٰذا اگر مولانا مودودی صاحب اپنی بحث کو اس حد تک محدود رکھتے تو ہمیں اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ مولانا سے ہمارا اختلاف دوسرے مسئلے میں ہے، مولانا نے حضرت معاویہؓ کے اس اقدام کو محض رائے اور تدبیر کے اعتبار سے غلط قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ براہ راست حضرت معاویہؓ کی نیت پر تہمت لگا کر اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ ان کے پیش نظر بس اپنا ذاتی مفاد تھا اور اس ذاتی مفاد پر انہوں نے پوری امت کو قربان کر دیا۔

جمہور امت کا موقف اس معاملے میں یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو بلحاظ تدبیر و رائے تو غلط کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی نیت پر حملہ کرنے اور ان پر مفاد پرستی کا الزام عائد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، لہٰذا ہماری آئندہ گفتگو کا حاصل یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام واقعے کے اعتبار سے سو فیصد درست اور نفس الامر میں بالکل صحیح تھا یا انہوں نے جو کچھ کیا وہ بالکل ٹھیک کیا، بلکہ ہماری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ وہ اپنے اس اقدام میں نیک نیت تھے، انہوں نے جو کچھ کیا وہ نیک نیتی کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور خلافت کا مسئلہ ہمارے زمانے میں بڑی نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس مسئلے پر بحث و مباحثہ کی گرم بازاری نے مسلمانوں میں دو ایسے گروہ پیدا کر دیئے ہیں جو افراط و تفریق کی بالکل آخری حدود پر کھڑے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو یزید کو کھلا فاسق و فاجر قرار دے کر حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ پر مفاد پرستی، خود غرضی، رشوت ستانی اور ظلم و عدوان کے الزامات عائد کر رہا ہے، دوسری طرف ایک گروہ ہے جو یزید کو فرشتہ قرار دے کر حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کو ہوسِ اقتدار، جاہ طلبی اور انتشار پسندی کا مجرم بنا رہا ہے اور جمہور امت نے اعتدال کا جو راستہ اختیار کیا تھا، وہ مناظرے کے جوش و خروش میں دونوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

اس افراط و تفریق کی سادی وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے باہمی اختلافات کو موجودہ زمانے کی سیاسی پارٹیوں

کے اختلافات پر قیاس کر لیا گیا ہے اور چونکہ آج کی مفاد پرست دنیا میں یہ تصور مشکل ہی سے آتا ہے کہ دو مخالف سیاسی جماعتیں بیک وقت نیک نیتی کے ساتھ کسی صحیح، جائز اور نیک مقصد کے لیے ایک دوسرے سے لڑ سکتی ہیں، اس لیے صحابہ کرامؓ کی جماعتوں کے بارے میں بھی یہ تصور کرنا مذکورہ گروہوں کو مشکل نظر آتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ وہ سرسری طور پر کسی ایک جماعت کے برحق اور نیک نیت ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں اور یہ فیصلہ ذہن میں جما کر اس کی تائید وحمایت کے لیے دلائل تلاش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں دوسرے فریق کے صحیح مؤقف کو سمجھنے کی کوشش کیے بغیر اس پر الزامات داعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔

ہم دونوں فریقوں کو سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو جمعہ کے دن ہر خطبے میں دہرایا جاتا ہے کہ :-

اللہ اللہ فی اصحابی، لا تتخذوھم غرضاً من بعدی۔	میرے صحابہ کے معاملے میں خدا سے ڈرو، خدا سے ڈرو، میرے بعد انہیں (اعتراضات) کا نشانہ مت بنانا۔

ہم سیّد الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا واسطہ دے کر یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ صحابہ کرامؓ کی عظمتِ شان کو پیش نظر رکھ کر ان کے صحیح مؤقف کو ٹھنڈے دل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں اور دل سے بدگمانیوں کا غبار دھو کر اس مسئلے پر غور فرمائیں۔

اس دردمندانہ گزارش کے بعد ہم اس مسئلے میں اپنے مطالعے کا حاصل پیش کرتے ہیں۔ یہاں تین چیزیں قابلِ غور ہیں :-

۱۔ ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲۔ یزید خلافت کا اہل تھا یا نہیں؟

۳۔ ان روایات کی کیا اصلیت ہے جن میں یزید کی بیعت کے لیے خوف و طمع کے ذرائع سے کام لینے کا ذکر کیا گیا ہے؟ ہم مسئلے کے ان تینوں گوشوں پر مختصر گفتگو کرتے ہیں :-

ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت

یہاں دو مسئلے قابلِ تحقیق ہیں، ایک یہ کہ کوئی خلیفہ وقت اپنے بعد کے لیے کسی کو خاص طور سے اپنے کسی رشتہ دار کو

اپنا ولی عہد بنا دے تو اس کی یہ وصیت امت پر لازم ہو جاتی ہے یا اس کی وفات کے بعد اہل حل و عقد کی منظوری کی پابند رہتی ہے؟

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے، اس بات پر امّت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفۂ وقت اگر کسی شخص میں نیک نیتی کے ساتھ شرائط خلافت پاتا ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ولی عہد بنا دے خواہ وہ اس کا باپ، بیٹا یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، البتہ بعض علماء نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر وہ اس کا باپ یا بیٹا ہو تو اہل حل و عقد کے مشورے کے بغیر ولی عہد بنانا بھی جائز نہیں ہے۔[1]

رہا دوسرا مسئلہ تو اس میں علامہ ماوردیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور ابن خلدونؒ کے بیانات سے تو بڑے توسعات معلوم ہوتے ہیں، ان کا رجحان اس طرف ہے کہ اگر کوئی خلیفہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنا دے جس میں خلافت کی اہلیت ہو تو اس کی وصیت ساری امّت پر لازم ہو جاتی ہے اور اس کا نفاذ اہل حل و عقد کی مرضی پر موقوف نہیں ہوتا، لیکن علماء محققین کی رائے یہی ہے کہ ولی عہد بنانے کی حیثیت ایک تجویز کی سی ہوتی ہے اور جب تک امت کے ارباب حل و عقد اسے منظور نہ کریں، یہ تجویز امت پر واجب العمل نہیں ہوتی۔ خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ کی گئی ہو، بلکہ امت کے ارباب حل و عقد کو حق ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو باہمی مشورے سے اس تجویز کو قبول کریں اور چاہیں تو رد کر دیں۔ اسلامی سیاست کے مشہور عالم اور مصنف قاضی ابویعلی الفراء الحنبلیؒ (متوفی ۴۵۸ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"خلیفہ کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے بعد کے لیے کسی شخص کو ولی عہد بنائے اور اس معاملہ میں اہل حل و عقد کی موجودگی کوئی ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد بنایا، اور حضرت عمرؓ نے چھ صحابۂ کرام کو یہ فریضہ سپرد کیا، اور سپرد کرتے وقت کسی نے بھی اہل حل و عقد کی موجودگی کو

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص ۵ جلد اوّل مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ والاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۸، المطبعۃ المحمودیۃ مصر، الاحکام السلطانیہ لابی یعلی الفرّاء ص ۹ مصطفی البابی مصر ۱۳۵۶ھ، مقدمہ ابن خلدون ص ۳۷۶، ۳۷۷، دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۶ء

ضروری نہیں سمجھا اس کی عقلی وجہ یہ ہے کہ کسی کو ولی عہد بنانا اس کو خلیفہ بنانا نہیں ہے۔ ورنہ ایک ہی زمانے میں دو خلفاء کا اجتماع لازم آجائے گا جو جائز نہیں ہے اور جب یہ خلافت کا عقد نہیں ہے تو اہل حل و عقد کی موجودگی بھی ضروری نہیں، ہاں ولی عہد بنانے والے کی وفات کے بعد ان کی موجودگی ضروری ہے۔"

چند سطروں کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"خلیفہ کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنائے جو اس کے ساتھ باپ یا بیٹے کا رشتہ رکھتا ہو، بشرطیکہ وہ خلافت کی شرائط کا حامل ہو، اس لیے کہ خلافت محض ولی عہد بنانے سے منعقد نہیں ہو جاتی بلکہ مسلمانوں کے قبول کرنے سے منعقد ہوتی ہے اور اس وقت ہر تہمت دور ہو جاتی ہے"[1]

محقق علماء کے نزدیک صحیح بات یہی ہے کہ اگر خلیفۂ وقت تنہا اپنی مرضی سے کسی کو ولی عہد بنا دے تو اس کے لیے تو یہ جائز ہے، لیکن اس کا یہ فیصلہ ایک تجویز کی حیثیت رکھتا ہے جسے امت کے اہل حل و عقد اس کی وفات کے بعد قبول بھی کر سکتے ہیں اور رد بھی۔ دلائل کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے مختصر یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد تو بلاشبہ بنایا تھا لیکن بنانے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اہل شوریٰ سے استصواب فرمایا اور جب دیکھا کہ تمام لوگ ان پر متفق ہیں، تب اپنے اس فیصلے کا اعلان فرمایا۔[2] نیز ان کی وفات کے بعد بھی امت ان پر متفق ہو گئی۔

اس تفصیل سے دو باتیں بہرحال واضح ہو جاتی ہیں:۔

۱۔ اگر کوئی خلیفہ وقت نیک نیتی کے ساتھ اپنے بیٹے کو خلافت کا اہل سمجھتا ہے تو وہ اُسے اپنا ولی عہد

---

[1] ابو یعلی الفراء: الاحکام السلطانیہ ص ۹، مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۵۶ھ، عبارت یہ ہے: "ویجوز ان یعہد الی من ینتسب الیہ بابوۃ او بنوۃ، اذا کان المعہود لہ علی صفات الائمۃ، لان الامامۃ لا تنعقد للمعہود الیہ بنفس العہد وانما تنعقد بعہد المسلمین، والتہمۃ تنتفی عنہ"

[2] ملاحظہ ہو الطبری ص ۶۱۸، ج ۲ والامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبۃ ص ۱۹، ۲۰ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۵۶ھ۔

مقرر کرسکتا ہے، یہ بات علماء کے ان دونوں گروہوں کے نزدیک متفق علیہ ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ علماء محققین کے نزدیک بیٹے کو ولی عہد بنانے کے لیے ارباب حل و عقد سے مشورہ کرنا اور ان کا منظور کرنا ضروری ہے اس کے بغیر اس کی خلافت منعقد نہیں ہوتی، اور یہی قول صحیح و مختار ہے، البتہ ایک جماعت اس بات کی بھی قائل رہی ہے کہ خلیفۂ وقت تنہا اپنی مرضی سے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اہل حل و عقد کی منظوری کی بھی ضرورت نہیں ہے اور اس کی وصیت تمام امت پر لازم ہو جاتی ہے۔

اب یزید کی ولی عہدی کے مسئلے پر غور فرمائیے، مندرجہ بالا احکام کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، دیانت داری سے اپنے بیٹے یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے تو اسے ولی عہد بنا دینا شرعی اعتبار سے بالکل جائز تھا، اگر وہ یہ کام پوری امت کے مشورے سے کرتے تب تو باتفاق ان کا یہ فیصلہ ہر فرد کے لیے واجب الاتباع ہوتا اور اگر تنہا اپنی رائے سے کرتے تو ان کے فعل کی حد تک تو یہ فیصلہ باتفاق جائز تھا اور علماء کے ایک گروہ کے نزدیک امت کے لیے واجب العمل بھی تھا، لیکن علماء کے راجح قول کے مطابق اس سے اہل حل و عقد کی منظوری کے بغیر یزید کی خلافت منعقد نہیں ہو سکتی تھی۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا یا محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے؟

کیا حضرت معاویہؓ یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے؟

واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری دیانت داری اور نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل ہے، متعدد تواریخ میں منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ کے صاحبزادے حضرت سعید بن عثمانؒ نے آکر حضرت معاویہؓ سے شکایت کی کہ "آپ نے یزید کو ولی عہد بنا دیا ہے، حالانکہ میرا باپ اس کے باپ سے، میری ماں اس کی ماں سے اور خود میں اس سے افضل ہوں" حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ "خدا کی قسم! تمہارے والد مجھ سے بہتر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تھے، تمہاری ماں بھی یزید

کی ماں سے افضل ہے لیکن جہاں تک یزید کا تعلق ہے اگر سارا غوطہ تم جیسے آدمیوں سے بھر جائے تو بھی یزید تم سے بہتر اور زیادہ محبوب ہوگا" حضرت معاویہؓ کے یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ کسی ذاتی برتری کے تصور یا رشتے کی بناء پر یزید کو افضل نہیں سمجھ رہے تھے بلکہ ان کی دیانت دارانہ رائے یہی تھی۔ اس کے علاوہ متعدد تواریخ میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک خطبہ میں یہ دعا فرمائی کہ :۔

اللّٰھم ان کنت تعلم انی ولیتہ لانہ فیما اراہ اھل لذلک فاتمم لہ ما ولیتہ وان کنت ولیتہ لانی احبہ فلا تتمم لہ ما ولیتہ [1]

"اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے اسے (یزید) اس لیے ولی عہد بنایا ہے کہ وہ میری رائے میں اس کا اہل ہے تو اس ولایت کو اس کے لیے پورا فرما دے اور اگر میں نے اس لیے اس کو ولی عہد بنایا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے تو اس ولایت کو پورا نہ فرما۔"

اور حافظ شمس الدین ذہبیؒ اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے عطیہ بن قیس کے حوالہ سے اس دعا کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں :۔

اللّٰھم ان کنت عھدت لیزید لما رأیت من فضلہ فبلغہ ما املت واعنہ وان کنت انما حملنی حب الوالد لولدہ وانہ لیس لما صنعت بہ اھلا فاقبضہ قبل ان یبلغ ذلک" [2]

"اے اللہ! اگر میں نے یزید کو اس کی فضیلت دیکھ کر ولی عہد بنایا ہے تو اسے اس مقام تک پہنچا دے جس کی میں نے اس کے لیے امید کی ہے اور اس کی مدد فرما اور اگر مجھے اس کام پر صرف اس محبت نے آمادہ کیا ہے جو باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے تو اس کے مقام خلافت تک پہنچنے سے پہلے اس کی روح قبض کر لے۔"

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ص ۸۰ ج ۸۔

[2] الذہبی : تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر والاعلام ص ۲۶۷ ج ۲۔ مکتبۃ القدسی قاہرہ ۱۳۶۸ھ والسیوطی: تاریخ الخلفاء ۱۵۵ اصح المطابع کراچی ۱۳۷۸ھ۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جس باپ کے دل میں چور ہو، کیا وہ جمعہ کے دن مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر قبولیت کی گھڑی میں اپنے بیٹے کے لیے ایسی دعا کر سکتا ہے؟ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس پرخلوص دعاء کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ انہوں نے یزید کو نااہل سمجھنے کے باوجود محض بیٹا ہونے کی وجہ سے خلافت کے لیے نامزد کیا تھا تو یہ اتنا بڑا حکم ہے جس کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے کسی شخص کی نیت پر حملہ کرنا زندگی میں بھی شریعت نے جائز قرار نہیں دیا۔ چہ جائیکہ اس کی وفات کے ساڑھے تیرہ سو برس بعد اس ظلم کا ارتکاب کیا جائے۔

یزید کی جو مکروہ تصویر عموماً ذہنوں میں بسی ہوئی ہے، اس کی بنیادی وجہ کربلا کا المناک حادثہ ہے ایک مسلمان کے لیے واقعتہً یہ تصوّر کرنا مشکل ہے کہ جس شخص پر کسی نہ کسی درجہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب نواسے کے قتل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسے صالح اور خلافت کا اہل قرار دیا جائے۔ لیکن اگر حقیقت حال کی واقعی تحقیق مقصود ہو تو اس معاملے میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ جس وقت یزید کو ولی عہد بنایا جا رہا تھا، اس وقت حادثۂ کربلا واقع نہیں ہوا تھا اور کوئی شخص یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یزید کی حکومت میں حضرت حسینؓ کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس وقت یزید کی شہرت چھوٹوں کو بھی اس حیثیت سے نہیں تھی جس حیثیت سے آج ہے۔ اس وقت تو وہ ایک صحابی اور ایک خلیفۂ وقت کا صاحبزادہ تھا۔ اس کے ظاہری حالات، صوم وصلوٰۃ کی پابندی، اس کی دنیوی نجابت اور اس کی انتظامی صلاحیت کی بناء پر یہ رائے قائم کرنے کی پوری گنجائش تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے اور صرف یہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے نہیں تھی، بلکہ بہت سے دوسرے جلیل القدر صحابہؓ اور تابعین بھی یہ رائے رکھتے تھے، دوسری صدی ہجری کے مشہور مؤرخ علامہ بلاذریؒ مؤرخ مدائنی کے حوالے سے امام المفسرین حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کرتے ہیں:۔

قال عامر بن مسعود الجمحی انا لبمکۃ	عامر بن مسعود جمحی کہتے ہیں کہ جب ایک قاصد حضرت
اذ مر بنا برید ینعی معاویۃ فنھضنا الی	معاویہؓ کی وفات کی خبر لے کر آیا تو ہم مکہ مکرمہ میں تھے
ابن عباسؓ وھو بمکہ وعندہ جماعۃ	ہم اٹھ کر حضرت ابن عباسؓ کے پاس چلے گئے وہ بھی

وقد وضعت المائدة ولم يوت بالطعام فقلنا له يا ابن عباس جاء البريد بموت معاوية فوجم طويلاً ثم قال اللهم اوسع لمعاوية اما والله ما كان مثل من قبله ولا ياتي بعده مثله وان ابنه يزيد لمن صالحي اهله فالزموا مجالسكم واعطوا طاعتكم وبيعتكم۔ ؎۱

مکہ ہی میں تھے، ان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے اور دسترخوان بچھ چکا تھا مگر ابھی کھانا نہیں آیا تھا ہم نے ان سے کہا کہ اے ابن عباسؓ! قاصد حضرت معاویہؓ کی موت کی خبر لے کر آیا ہے، اس پر وہ کافی دیر خاموش بیٹھے رہے، پھر انہوں نے کہا کہ یا اللہ حضرت معاویہؓ کے لیے اپنی رحمت کو وسیع فرما دے، خدا کی قسم! وہ اپنوں سے پہلوں کی طرح نہیں تھے اور ان کے بعد ان جیسا نہیں آئے گا اور بلاشبہ ان کا بیٹا یزید ان کے صالح اہل خانہ میں سے ہے، لہٰذا تم اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو اور اپنی طاعت اور بیعت اسے دے دو۔"

اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہؒ کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ فتنہ حرّہ کے موقعہ پر عبداللہ بن مطیع اور ان کے ساتھی حضرت محمد بن حنفیہؒ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "یزید شراب پیتا ہے اور نماز چھوڑ دیتا ہے اور کتاب اللہ کے احکام سے تجاوز کرتا ہے۔" اس کے جواب میں حضرت محمد بن حنفیہؒ نے فرمایا:۔

قد حضرته واقمت عنده فرایته مواظباً علی الصلوٰة متحرّیا للخیر یسال عن الفقه ملازماً للسنّة

میں اس کے پاس گیا ہوں اور ٹھہرا ہوں، میں نے اس کو نماز کا پابند اور خیر کا طالب پایا، وہ فقہ کے مسائل پوچھتے رہتے ہیں اور سنت کا پابند ہے۔"

انہوں نے کہا کہ یزید نے آپ کے سامنے تصنعاً ایسا کیا ہو گا، حضرت محمد بن حنفیہؒ نے فرمایا کہ اسے مجھ سے کون سا خوف یا کون سی امید تھی؟ اور کیا اس نے تمہیں خود بتایا ہے تو تم بھی اس کے شریک

؎۱ البلاذریؒ: انساب الاشراف ص ۳، ج ۴ قسم ۲، یروشلم ۱۹۴۰ء

ہو گئے اور اگر اس نے تمہیں نہیں بتایا تو تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم بغیر علم کے شہادت دو۔" انہوں نے کہا کہ "اگرچہ ہم نے دیکھا نہیں، لیکن ہم اس خبر کو سچ سمجھتے ہیں۔" حضرت محمد بن حنفیہؒ نے فرمایا "اللہ نے شہادت دینے والوں کے لیے ایسی بات کہنے کو جائز قرار نہیں دیا۔ قرآن کا ارشاد ہے الامن شهد بالحق وهو يعلمون، لہٰذا مجھے تمہارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" انہوں نے کہا "شاید آپ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ اس معاملے (یزید کے خلاف بغاوت) کی سرداری آپ کے سوا کسی اور کو ملے لہٰذا ہم آپ ہی کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔" حضرت محمدؒ نے فرمایا کہ "میں قتال کو نہ تابع ہو کر حلال سمجھتا ہوں نہ قائدین کر۔" ؎

ان روایات سے یہ بات واضح ہے کہ یزید کے ظاہری حالات ایسے نہ تھے کہ ان کی موجودگی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے صحابی اس کے صالح اور اہلِ خلافت ہونے کی رائے رکھ سکتے تھے۔

دوسری طرف اگر اس ماحول کو پیش نظر رکھا جائے، جس میں یہ خلافت منعقد ہو رہی تھی تو بلاشبہ یہ رائے قائم کرنے کی بھی پوری گنجائش تھی کہ وہ موجودہ حالات میں خلافت کا اہل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ماحول میں حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ وغیرہ جیسے جلیل القدر صحابہ، صلحائے امت اور مدبرین موجود ہوں، اس ماحول میں یزید کو خلافت کے لیے نااہل یا غیر موزوں سمجھنا کچھ بعید نہیں ہے، زمانہ صحابہ کرامؓ اور کبار تابعین کا تھا، امت میں خیر و صلاح کا دور دورہ تھا، ایسے حالات میں خلافت کے لیے عدالت و تقویٰ کے جس معیارِ بلند کی ضرورت تھی، ظاہر ہے کہ یزید اس پر پورا نہیں اترتا تھا، اسی لیے بعض صحابہ کرامؓ نے اس نامزدگی کی کھل کر مخالفت کی۔

تیسرے صحابہ کرام کا ایک گروہ وہ تھا جو حضرت حسینؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ جیسے صحابہ کے مقابلے میں یزید کو خلافت کے لیے بہتر تو نہیں سمجھتا تھا لیکن اس خیال سے اس کی خلافت کو گوارا کر رہا

؎ البدایۃ والنہایۃ ص ۲۳۴ ج ۸

تھا کہ امت میں افتراق و انتشار برپا نہ ہو مثلاً حمید بن عبدالرحمان کہتے ہیں کہ میں یزید کی ولی عہدی تک حضرت بشیرؓ کے پاس گیا جو صحابہ میں سے تھے، تو انہوں نے فرمایا :۔

یقولون انما یزید لیس بخیر اُمۃ محمّد صلی اللہ علیہ وسلم وانا اُقول ذٰلک ولکن لان یجمع اللہ امۃ محمّد احب الی من اُن تفترق"[1]	لوگ کہتے ہیں کہ یزید امت محمد میں سب سے بہتر نہیں ہے اور میں بھی یہی کہتا ہوں لیکن امت محمدؐ کا جمع ہو جانا مجھے افتراق کی بہ نسبت زیادہ پسند ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یزید کے بارے میں صحابۂ کرامؓ کا یہ اختلاف بھی درحقیقت رائے اور اجتہاد کا اختلاف تھا اور اس معاملے میں کسی کو بھی مطعون نہیں کیا جا سکتا، حضرت معاویہؓ یزید کو محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اسے خلافت کا اہل سمجھنے کی وجہ سے، ولی عہد بنانا چاہتے تھے اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت دیانت داری کے ساتھ ان کی ہمنوا تھی اور وہ پانچ صحابۂ کرام جنہوں نے اس کی مخالفت کی تھی، وہ کسی ذاتی خصومت یا حرصِ اقتدار کی بناء پر مخالفت نہیں کر رہے تھے، بلکہ وہ دیانتداری سے یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں، مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی رائے واقعہ کے لحاظ سے سو فیصد درست تھی اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ نفس الامر میں ٹھیک کیا بلکہ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی رائے کسی ذاتی مفاد پر نہیں، بلکہ دیانت داری پر مبنی تھی اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ امانت کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔ ورنہ جہاں تک رائے کا تعلق ہے، جمہور امت کا کہنا یہ ہے کہ اس معاملے میں رائے انہی حضرات صحابہؓ کی صحیح تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے، جس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں :۔

---

[1] الذہبیؒ، تاریخ الاسلام ص ۲۶۷، ۲۶۸ ج ۲ -

(۱) حضرت معاویہؓ نے تو بیشک اپنے بیٹے کو نیک نیتی کے ساتھ خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا لیکن ان کا یہ عمل ایک ایسی نظیر بن گیا جس سے بعد کے لوگوں نے نہایت ناجائز فائدہ اٹھایا، انھوں نے اس کی آڑ لے کر خلافت کے مطلوبہ نظام شوریٰ کو درہم برہم کر ڈالا اور مسلمانوں کی خلافت بھی شاہی خاندانوں میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

(۲) بلا شبہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں یزید کا فسق و فجور کسی قابل اعتماد روایت سے ثابت نہیں اس لیے اس کو خلافت کا اہل تو سمجھا جا سکتا تھا، لیکن امت میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی جو نہ صرف دیانت و تقویٰ بلکہ ملکی انتظام اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے بھی یزید کے مقابلے میں بدرجہا بلند مقام رکھتے تھے، اگر خلافت کی ذمہ داری ان کو سونپی جاتی تو بلاشبہ وہ اس سے کہیں بہتر طریقے پر اہل ثابت ہوتے۔

یہ درست ہے کہ افضل کی موجودگی میں غیر افضل کو خلیفہ بنانا شرعاً جائز ہے۔[۱] (بشرطیکہ اس میں شرائط خلافت موجود ہوں) لیکن افضل یہی ہے کہ خلیفہ ایسے شخص کو بنایا جائے جو تمام امت میں اس منصب کا سب سے زیادہ لائق ہو۔

(۳) نیک نیتی کے ساتھ بیٹے کو ولی عہد بنانا بھی شرعاً جائز تو ہے لیکن ایک طرف موضع تہمت ہونے کی وجہ سے اس سے بچنا ہی بہتر ہے اور شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنا اپنے آپ کو ایک سخت آزمائش میں ڈالنا ہے اس لیے تمام خلفاء راشدین نے اس سے پرہیز کیا۔ خاص طور سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے تو لوگوں کے کہنے کے باوجود اپنے قابل اور لائق فرزندوں کو ولی عہد بنانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔[۲]

یزید اور اس کی ولی عہدی کے سلسلہ میں ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے، جمہور امت کے معتدل اور محقق

---

[۱] الماوردیؒ: الاحکام السلطانیہ ص ۷۶، المطبعۃ المحمودیہ مصر و ابویعلی الفراءؒ: الاحکام السلطانیہ ص ۷، مصطفیٰ البابی ۱۳۵۶ھ و ابن العربیؒ: العواصم من القواصم ص ۲۱۱، السلفیۃ ۱۳۷۱ھ و ابن الہمامؒ: المسایرہ ص ۱۳۶، ۱۳۷ دار العلوم دیوبند ۱۳۷۷ھ

[۲] الطبری ص ۲۹۲ ج ۳ و ص ۱۱۲ و ۱۱۳ ج ۴ مطبعۃ الاستقامۃ، القاہرہ ۱۳۵۸ھ

علماء کا یہی مسلک ہے، قاضی ابوبکر بن عربی مالکی حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو جائز قرار دینے کے ساتھ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:۔

ان معاویۃ ترک الافضل فی ان یجعلھا شوریٰ والا یخص بھا احدا من قرابتہ فکیف ولدا، وان یقتدی بما اشاربہ عبداللہ ابن الزبیر فی الترک او الفعل۔[1]

بلاشبہ افضل یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ خلافت کے معاملے کو شوریٰ کے سپرد کر دیتے اور اپنے کسی رشتہ دار اور خاص طور سے بیٹے کے لیے اس کو مخصوص نہ کرتے اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان کو جو مشورہ دیا تھا ولی عہد بنانے یا نہ بنانے میں اسی پر عمل کرتے لیکن انہوں نے اسی افضل کام کو چھوڑ دیا۔

اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

"کان معاویۃ لما صالح الحسن عھد الحسن بالامر من بعدہ فلما مات الحسن قوی امر یزید عند معاویۃ ورأی انہ لذلک اھلا (؟) وذاک من شدۃ محبۃ الوالد لولدہ ولما کان یتوسم فیہ من النجابۃ الدنیویۃ وسیما اولاد الملوک ومعرفتھم بالحروب وترتیب الملک والقیام بأبھتہ، وکان ظن ان لا یقوم احد من ابناء الصحابۃ فی ھذا المعنی ولھذا قال لعبداللہ بن عمرؓ فیما خاطبہ

جب حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے صلح کی تھی تو انہی کو اپنا ولی عہد بھی بنایا تھا لیکن جب ان کی وفات ہوگئی تو یزید کی طرف حضرت معاویہؓ کا رجحان قوی ہوگیا ان کی رائے یہ تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے اور یہ رائے باپ بیٹے کی شدید محبت کی وجہ سے تھی، نیز اس لیے تھی کہ وہ یزید میں دنیوی نجابت اور شاہزادوں کی سی خصوصیات فنونِ جنگ سے واقفیت انتظام سلطنت اور اس کی ذمہ داری کو پورا کرنے کی صلاحیت دیکھتے تھے اور ان کا گمان یہ تھا کہ صحابۂ کرام کے صاحبزادوں میں سے کوئی اس اعتبار سے بہتر انتظام نہ کر سکے گا، اسی لیے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ

---

[1] العواصم من القواصم ص ۲۲۲

بہ انی خفت آن اذر الرعیۃ	سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے خوف ہے کہ میں
من بعدی کالغنم المطیرۃ لیس	عوام کو بکریوں کے منتشر گلے کی طرح چھوڑ کر نہ چلا جاؤں
لہا راع [۱]	جس کا کوئی چرواہا نہ ہو۔

اور علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :-

"یزید کے بارے میں لوگوں کے دو فریق ہیں اور کچھ لوگ بیچ کی رائے رکھتے ہیں، بعض لوگوں کا اعتقاد تو یہ ہے کہ وہ صحابہ یا خلفائے راشدین یا انبیاء میں تھا، یہ اعتقاد بالکل باطل ہے اور کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ وہ اور اس کا اصل مقصد اپنے کافر رشتہ داروں کا بدلہ لینا تھا۔ یہ دونوں قول باطل ہیں، ہر عقل مند انسان ان اقوال کو باطل سمجھے گا۔ اس لیے کہ یہ شخص (یزید) مسلمان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اور شاہی طرز کے خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا، نہ وہ ایسا تھا (جیسا پہلے گروہ نے کہا)، اور نہ ویسا (جیسا دوسرے گروہ نے کہا)[۲]

اور علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :-

"حضرت معاویہؓ کے دل میں دوسروں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا جو داعیہ پیدا

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ص ۸۰ ج ۸۔

[۲] ابن تیمیہؒ، منہاج السنۃ ص ۲۴۶ و ۲۴۷ ج ۲ بولاق مصر ۱۳۲۱ھ عبارت یہ ہے :- الناس فی یزید طرفان ووسط، قوم یعتقدون آنہ من الصحابۃ او من الخلفاء الراشدین المھدیین اومن الانبیاء وھذا کلہ باطل وقوم یعتقدون انہ کافر منافق فی الباطن وانہ کان لہ قصد فی اخذ ثار کفار اقاربہ من اھل المدینۃ وبنی ھاشم ..... وکلا القولین باطل یعلم بطلانہ کل عاقل فان الرجل ملک من ملوک المسلمین وخلیفۃ من الخلفاء الملوک لا ھذا ولا ھذا۔

ہوا اس کی وجہ امت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی، بنو امیہ کے اہل حل و عقد اس پر متفق ہو گئے تھے کیونکہ وہ اس وقت اپنے علاوہ کسی اور پر راضی نہ ہوتے اور اس وقت قریش کی سربرآوردہ جماعت وہی تھی اور اہل ملت کی اکثریت ان ہی میں سے تھی، اس لیے حضرت معاویہؓ نے اس کو ترجیح دی اور افضل سے غیر افضل کی طرف رجوع کیا۔۔ حضرت معاویہؓ کی عدالت اور صحابیت اس کے سوا کچھ اور گمان کرنے سے مانع ہے۔[۵۲]"

اصل میں جمہور امت کا طرز عمل صحابۂ کرامؓ کے بارے میں ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اگر ان کے کسی فعل کی کوئی ایسی توجیہہ ہو سکتی ہو جو صحابیت کے مقام بلند اور ان کی مجموعی سیرت کے شایانِ شان ہو تو ان کے فعل کو اسی توجیہہ پر محمول کیا جاتا ہے، مولانا مودودی صاحب بھی اصولی طور پر اس طریقہ کار کو درست قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" تمام بزرگانِ دین کے معاملہ میں عموماً اور صحابۂ کرام کے معاملہ میں خصوصاً، میرا طرزِ عمل یہ ہے کہ جہاں تک کسی معقول تاویل سے یا کسی معتبر روایت کی مدد سے ان کے کسی قول یا عمل کی صحیح تعبیر ممکن ہو، اسی کو اختیار کیا جائے اور اس کو غلط قرار دینے کی جسارت اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ اس کے سوا چارہ نہ رہے۔"

(خلافت و ملوکیت ص: ۳۰۸)

سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا بحث کے بعد یہ بات ثابت نہیں ہو جاتی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اقدام کی "معقول تاویل ممکن ہے"، اور بقول مولانا مودودی صاحب "لیپ پوت" یا "بھونڈی وکالت" کے بغیر ان کے اس عمل کو نیک نیتی پر محمول کیا جا سکتا ہے اور جب صورتِ حال یہ ہے تو خود مولانا کے بیان کردہ اصول کی روشنی میں انہیں "بدنیت اور مفاد پرست قرار دینا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

---

۵۲ ابن خلدونؒ : مقدمہ ص ۲۰۷، باب ۳ فصل ۳ بیروت ۱۹۵۶ء

ان معروضات کو گوش گزار کرنے کے بعد ہم اپنے علماء کرام سے چند سوالات کرنا چاہتے ہیں

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین حسب ذیل مسئلہ میں کہ ایک شخص عبد اللہ نامی ان امور کا قائل ہے۔ کیا یہ امور صحیح ہیں یا غلط؟ قرآن و سنت اور عمل صحابہ سے ان امور کا فیصلہ فرمائیے:۔

۱۔ تاریخی طور پر یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ یزید کے مقابلہ میں حضرت حسینؓ کا کسی صحابی نے ساتھ نہیں دیا۔ سبائی طبقہ اور ان کے ہمنوا اس بات کے دعویدار ہیں کہ یہ تمام لوگ یزید کے ہاتھوں بک گئے تھے۔ ان لوگوں نے حق کو ترک کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے باطل کا ساتھ دیا۔ یا یہ ڈر کے مارے چپ ہو کر بیٹھ گئے۔

۲۔ ایسی صورت میں صحابہ کرام جن کی ثابت قدمی اور حق کی خاطر جان فروشی کے دعوے قرآن کر رہا ہے کیا یہ تمام قرآنی دعوے غلط نہ کہلائیں گے اور اس صورت میں کیا یہ قرآن کا انکار نہ ہو گا اور پھر ایسے لوگوں کا اسلام سے کیا واسطہ ہو گا؟

۳۔ قرآن ان حضرات کے لیے مغفرت اور جنت کے اعلانات کر رہا ہے ایسی صورت میں قرآن کے ان اعلانات کی کیا حیثیت ہو گی؟

۴۔ جب خلافت موروثی شئے نہیں تو حضرت حسینؓ کا حق کس دلیل سے ثابت ہو گا۔ جب کہ اس وقت حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن عباسؓ اور عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ جیسی جلیل القدر ہستیاں حیات تھیں۔ انہیں نظر انداز کر کے حضرت حسینؓ کی حقانیت کے دعوے کیا درست ہوں گے؟

۵۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یزید نے شریعت کو ترک کر دیا اور باطل کی راہ اختیار کی تھی پھر بھی ان صحابہ رضی کی بڑی تعداد (۳۰۰ بنتی ہے) نے اس کی بیعت کی تو گویا ان تمام صحابہ نے گمراہی پر اتفاق کیا۔ کیا اس طرح یہ سب گمراہ نہ کہلائیں گے؟ اور امت مسلمہ کا یہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کرام امت کے لیے نمونہ ہدایت ہیں۔

ان کا فعل و عمل سنت ہے ان کا اجماع حجت شرعیہ ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسلام کی خاطر ہمہ قسم کے مصائب برداشت کیے۔ قرآن ان کے فضائل سے معمور ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں ان کی خوبیوں کے گن گائے ہیں۔ ان کے سامنے وحی نازل ہوتی رہی، یہ اپنی آنکھوں سے ہمہ قسم کے معجزات کا مشاہدہ کرتے رہے۔

اہل سنت والجماعت کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کے حق ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ ان کی ذات پر صحابۂ کرام مجتمع ہوئے اور متفقہ طور پر تمام صحابہ نے انہیں قبول کیا۔

یہ بھی اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ صحابۂ کرام گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتے۔ ہم آج جمعہ کے دن دو اذانیں دیتے ہیں۔ اس لئے کہ حضرت عثمان نے اسے جاری کیا اور تمام صحابہ نے اس پر سکوت اختیار کیا۔ جو ان کے اتفاق کی دلیل ہے۔

یہ بھی اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ خلافت موروثی شئے نہیں بلکہ یہ افضل کا حق ہے۔ اسی لیے ابوبکر کو خلیفہ بنایا گیا اور ان کے بعد عمرؓ پھر عثمانؓ اسی اصول پر منتخب ہوئے۔

کیا واقعتہً اہل سنت والجماعت کا یہ مسلک ہے۔ یا یہ خالص سبائی عقیدہ ہے؟ اس سلسلہ میں تین سو صحابہ کرام کی فہرست منسلک کی جا رہی ہے۔ یہ وہ صحابہ ہیں جو یزید کی خلافت کے وقت حیات تھے اور ان میں سے بیشتر بعد تک حیات رہے۔

۶۔ صحابہ کرام کو گمراہ، بے دین، باطل پرست، تارک حق اور دنیا پرست کہنے والوں کے بارے میں ہمارے علماء کیا فرماتے ہیں؟ ہم یہ سوال ہرگز نہیں کر رہے کہ یزید کیسا تھا؟ ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارا سوال صرف اتنا ہے کہ اس کا ساتھ دینے والے یہ صحابہ کیسے ہیں؟

۷۔ صحابہ کرام کی عزت و ناموس کی حفاظت ہمارا دین و ایمان ہے۔ تمام قرآن اور سنت رسول انہی کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔ اگر یہ باطل پرست ہیں تو پھر قرآن کے حق ہونے کی کیا دلیل ہوگی اور سنت رسول کس طرح ثابت ہوگی؟

۸۔ وہ صحابہ جنہوں نے یزید کی بیعت کر کے عیاذاً باللہ باطل کو اپنایا تو ان کی بیان کردہ احادیث کا کیا

مقام ہو گا۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاص، انسؓ بن مالک، جابر بن عبداللہؓ، ابوسعید خدریؓ، براء بن عاذبؓ، سہیل بن سعدؓ، سلمۃ بن الاکوع اور دیگر صحابہ سے ہزارہا احادیث کتبِ احادیث میں مروی ہیں۔

۹۔ عبداللہ نامی فرد کا دعویٰ ہے کہ اس قسم کا ذہن رکھنے والے سب سبائی ہیں۔ جب صحابہ کرام نے یزید پر اتفاق کر لیا تو ان کا یہ اتفاق اس بات کی دلیل ہے کہ یزید کے بارے میں تمام پروپیگنڈے جھوٹ، سبائیوں کے وضع کردہ ہیں اور جو اسے گمراہ اور ملعون اور جہنمی قرار دیتا ہے، وہ صحابہ کرام کو بھی گمراہ قرار دے رہا ہے اور ایسے شخص کے کفر میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ اس قسم کے تمام افراد سبائی ہیں۔

فہرست

صحابۂ کرام جنہوں نے یزید کے خلیفہ بن جانے کے بعد انتقال فرمایا

نوٹ :- یزید رجب ۶۰ھ میں خلیفہ بنا اور ۶۴ھ میں انتقال کیا

اسماء گرامی	تاریخ وفات
۱۔ بلال بن حارث المزنی المدنی	۶۰ھ
۲۔ برّہ مولاۃ عائشہ	۶۰ھ کے بعد
۳۔ بشیر بن سعد بن ثعلبۃ الانصاری البدری صحابی جبیل قتل بعین التمر	"
۴۔ جاریۃ بن قدامۃ التیمی السعدی	"
۵۔ ابو حمید الساعدی۔ منذر بن سعد۔ احد اور بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے، خلافت یزید کے دوران انتقال ہوا	"
۶۔ طخفۃ بن قیس الغفاری	"
شیبۃ بن عثمان بن ابی طلحۃ الحجبی	"
۷۔ عقبۃ بن عامر الجہنی۔ مشہور صحابی ہیں	"
۸۔ عقیل بن ابی طالب الہاشمی، حضرت علی کے بڑے بھائی ہیں۔	"
۹۔ ابو اسید الساعدی مالک بن ربیعہ، بدری صحابی ہیں۔ اور بدریین میں سب سے آخر میں ان کا انتقال ہوا۔	"
۱۰۔ قیس بن سعد بن عبادۃ الانصاری	۶۰ھ
۱۱ سمرۃ بن جندب بن ہلال الفزاری	"

نمبر	نام و کیفیت	سنہ وفات
۱۲-	سعید بن العاص الاموی	سنہ ۶۰ کے بعد
۱۳-	دغفل بن حنظلہ بن زید السدوسی۔ خارجیوں سے	〃
۱۴-	جنگ کے دوران دریا میں غرق ہوئے	〃
۱۵-	ابوبشیر الانصاری المدنی۔ ان کا نام قیس بن عبید ہے، جنگ خندق میں حاضر ہوئے	〃
۱۶-	ابومحذورۃ الجمحی المکی مشہور صحابی ہیں۔ مسجد حرام کے مؤذن تھے۔ یزید کے زمانہ میں انتقال ہوا۔	〃
۱۷-	نعیم بن ہزال	〃
۱۸-	نوفل بن معاویۃ بن عروۃ الدیلی۔ فتح مکہ کے روز اسلام لائے۔ ایک سو بیس سال کی عمر میں یزید کے زمانہ میں انتقال ہوا	〃
۱۹-	جابر بن عتیک الانصاری السلمی بدری۔ فتح مکہ کے وقت یہ اپنے قبیلے کے علمبردار تھے	سنہ ۶۱
۲۰-	شیبۃ بن عثمان بن ابی طلحۃ الحجبی۔ خانہ کعبہ کے کلید بردار تھے	〃
۲۱-	عبدالمطلب بن ربیعۃ بن حارث بن عبدالمطلب الہاشمی۔ یہ حضورؐ کے بھتیجے تھے۔ دمشق کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ وفات کے وقت یزید کو اپنے مال کی وصیت کی اور وہ اس وقت امیرالمومنین تھا	سنہ ۶۲
۲۲-	ولید بن عقبۃ بن ابی معیط حضرت عثمان کے ماں جائے بھائی تھے۔ ان کی والدہ اروی حضور کی پھوپھی ام البیضا کی صاحبزادی تھیں	〃
۲۳-	جندب بن عبداللہ بن سفیان البجلی	سنہ ۶۳ کے بعد
۲۴-	جندب بن ازمع۔ ان کا شمار اہل صفہ میں تھا	〃
۲۵-	عائذ بن عمرو بن ہلال المزنی۔ بیعت رضوان میں شریک تھے۔ بصرہ کی سکونت اختیار کی	〃
۲۶-	عبداللہ بن سخبرۃ الازدی۔ کوفہ کی سکونت اختیار کی	〃

نمبر	نام و کیفیت	وفات
۲۷ -	عبدالرحمان بن زید بن الخطاب، حضرت عمرؓ کے بھتیجے ہیں۔ یزید نے انہیں مکہ کا امیر بنایا تھا	٦١ھ کے بعد
۲۸ -	خنانۃ بن کعب العبسی	٦٢ھ کے بعد
۲۹ -	سنین بن واقد الظفری	//
۳۰ -	صفوان بن المعطل السلمی۔ غزوۂ خندق اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے	//
۳۱ -	عبداللہ بن زمعۃ القرشی الاسدی	//
۳۲ -	مول بن کثیف بن حمل الصابی	//
۳۳ -	عمرو بن حزم۔ بڑے پایہ کے صحابی ہیں۔ عہدِ رسالت میں نجران کے گورنر رہے۔ یزید کے زمانہ میں انتقال کیا۔	//
۳۴ -	مسلم بن مخلد الانصاری۔ ۱ھ میں پیدا ہوئے۔ فتح مصر میں شریک تھے امیر معاویہ اور یزید کی جانب سے مصری لشکر کے سالار تھے	//
۳۵ -	ابو زمعۃ البلوی۔ بیعت رضوان میں شریک تھے۔ یزید کے زمانہ میں مراکش میں وفات پائی۔	//
۳۶ -	انس بن مالک الکعبی۔ بصرہ کی سکونت اختیار کی۔	//
۳۷ -	عبداللہ بن ہبیرۃ الحرشی	//
۳۸ -	عبداللہ بن عصام الاشعری	//
۳۹	عمرو بن اخطب الانصاری۔ ہجرت مدینہ کے فوراً بعد ایمان لائے۔ تیرہ غزوات میں شریک رہے۔	//
۴۰	عمرو بن غیلان الثقفی۔	//
۴۱ -	قیس بن بایۃ الخولانی۔ کم سنی کے باوجود جنگِ بدر میں شریک ہوئے	//
۴۲ -	معبد بن یربوع المخزومی۔ فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔	//
۴۳ -	یُسیر الانصاری	//

۴۴۔ بریدۃ بن الحصیب ابوسہل الاسلمی۔ غزوۂ بدر سے قبل اسلام لائے — سنہ ۶۳

۴۵۔ عبداللہ بن صفوان بن امیۃ بن خلف الجمحی — ″

۴۶۔ عبداللہ بن حنظلۃ بن ابی عامر الراہب — ″

۴۷۔ عبداللہ بن زید بن عاصم الانصاری المزنی — ″

۴۸۔ عبدالرحمان بن ازہر الزہری ابوجبر المدنی — ″

۴۹۔ معاذ بن الحارث الانصاری — ″

۵۰۔ محمد بن ثابت بن قیس الانصاری وفاتِ رسول کے وقت بچّہ تھے۔ — ″

۵۱۔ محمد بن کعب الانصاری۔ انہوں نے حضور کو دیکھا ہے۔ — ″

۵۲۔ ام المومنین میمونہ بنت الحارث الہلالیہ — ″

۵۳۔ عبداللہ بن عمرو العاص۔ ماہ ذی الحجہ میں طائف میں انتقال فرمایا۔ امیر معاویہ اور یزید کی جانب سے مصر کے گورنر رہے۔ انہوں نے حضور کی حیات میں احادیث جمع کی تھیں اور حضورؐ کو دکھائی تھیں۔ — ″ یا سنہ ۶۵

۵۴۔ معاذ بن الحارث الانصاری النجاری۔ وفات رسولؐ کے وقت کم سن تھے۔ آپ کو دیکھا ہے — ″

۵۵۔ عبداللہ بن زید بن عاصم بن کعب الانصاری المازنی

۵۶۔ ربیعۃ بن کعب بن مالک الاسلمی ابوالفراس۔ یہ اہل صفہ میں سے ہیں — ″

۵۷۔ بشیر بن عبید بن اوس الانصاری خود بھی صحابی ہیں اور والد بھی صحابی تھے — ″

۵۸۔ جریر بن خویلد المدنی۔ اہل صفہ میں سے ہیں۔ — ″

۵۹۔ عقبۃ بن نافع الفہری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور افریقہ میں بسکرہ کے مقام پر شہید ہوئے — ″

۶۰۔ عمرو بن سفیان البکائی — سنہ ۶۵

۶۱۔ حارث بن حاطب بن الحارث الجمحی۔ چھوٹے درجہ کے صحابی ہیں — سنہ ۶۶ کے بعد وفات ہوئی

۶۲- عفیف بن حارث السکونی	۶۶ھ کے بعد وفات ہوئی
۶۳- ابوفراس الاسلمی، ربیعۃ بن کعب	//
۶۴- ابو واقد حارث بن عوف بن اسید	//
۶۵- جنادۃ بن ابی امیۃ الازدی	۶۷ھ
۶۶- سہل بن ابی حثمۃ الانصاری الاوسی	//
۶۷- ابوواقد اللیثی عوف بن مالک	۶۸ھ
۶۸- عدی بن حاتم بن عبداللہ بن سعد بن الحشرج الطائی۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی تھی	//
۶۹- خویلد بن عمرو ابو شریح الخزاعی الکعبی۔ فتح مکہ کے سال اسلام لائے	//
۷۰- زید بن ارقم بن زید بن قیس الانصاری الخزرجی۔ غزوۂ خندق اور بعد کے غزوات میں شریک ہوئے	//
۷۱- عبداللہ بن عباس بن عبد المطلب الہاشمی	//
۷۲- عبداللہ بن کعب بن مالک الانصاری	//
۷۳- عبدالرحمان بن زید بن الخطاب۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔	//
۷۴- عبدالرحمان بن حسان بن ثابت۔ حضور کے عہد میں پیدا ہوئے	//
۷۵- عبدالرحمان بن الاسود بن عبد یغوث بن وہیب بن عبد مناف الزہری حضور کے عہد میں پیدا ہوئے	//
۷۶- عبدالرحمان بن حاطب بن ابی بلتعۃ اللخمی۔ حضور کے عہد میں پیدا ہوئے۔	//
۷۷- عبداللہ بن یزید بن حصین الاوسی۔ بیعت رضوان میں شریک ہوئے	//
۷۸- ابوالجہم صاحب الانبجانیہ	۶۹ھ
۷۹- عمرو بن سعید الاشدق	//
۸۰- اسماء بنت یزید بن السکن۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ جنگ یرموک میں خیمہ کی لکڑی سے نو رومیوں کو قتل کیا۔ حالانکہ اسی رات ان کی شادی ہوئی تھی۔ دمشق میں سکونت اختیار کی اور وہیں باب الصغیر میں دفن ہوئیں۔	//

۸۲ قبیصۃ بن جابر الاسدی	سنہ ۶۹
۸۳ فضالۃ بن عبید الانصاری	//
۸۴ ابو لیلی جعدی	//
۸۵ جندب بن عبداللہ بن سفیان البجلی	//
۸۶ قبیصۃ بن ذویب الخزاعی۔ انہوں نے حضور کو دیکھا ہے۔ مدینہ کے فقیہ تھے۔	سنہ ۷۰ یا سنہ ۸۵
۸۷ شام کی سکونت اختیار کر لی تھی۔	
۸۸ ابراہیم بن ابی موسیٰ الاشعری۔ آپؐ کو دیکھا ہے	سنہ ۷۰
۸۹ زید بن خالد الجہنی۔ مشہور صحابی ہیں۔ کوفہ میں انتقال ہوا	//
۹۰ جابر بن سمرۃ بن جنادہ۔ خود بھی صحابی ہیں اور والد بھی صحابی ہیں۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی	سنہ ۷۰ کے بعد انتقال ہوا
۹۱ حبیب بن سباع ابو جمعۃ الانصاری۔ شام میں اقامت اختیار کی	//
۹۲ عاصم بن عمر بن الخطاب۔ حضور کو دیکھا ہے	سنہ ۷۰
۹۳ عبداللہ بن عتبۃ بن مسعود الہذلی۔ عبداللہ بن مسعود کے بھتیجے ہیں۔ حضورؐ کو دیکھا ہے	سنہ ۷۰ کے بعد
۹۴ عبداللہ القبطی حضرت ماریہ قبطیہ کے بھائی ہیں	سنہ ۶۳
۹۵ ضحاک بن قیس بن خالد الفہری۔ امیر معاویہ کی جانب سے دمشق پر ان کے نائب تھے۔	
۹۶ مرج الراہق میں شہید ہوئے	سنہ ۶۵
۹۷ نعمان بن بشیر الانصاری۔ خود بھی صحابی ہیں اور والد بھی صحابی تھے۔ شام کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ امیر معاویہؓ اور یزید کی جانب سے کوفہ کے گورنر رہے اور حمص میں سنہ ۶۴ میں شہید ہوئے	سنہ ۶۴
۹۸ اخنس بن شریق۔ فتح مکہ میں شریک تھے۔	//
۹۹ سعد بن الاطول بن عبداللہ الجہنی۔ بصرہ کی سکونت اختیار کی	//
۱۰۰ شداد بن اوس بن ثابت ابو یعلی۔ بیعت رضوان میں شریک تھے۔ شام میں انتقال کیا	//
۱۰۱ مخنف بن سلیم بن الحارث الازدی۔ عین الوردہ کی جنگ میں شریک ہوئے۔	//

۱۰۲ مسور بن مخرمہ بن نوفل بن اہیب بن عبد مناف الزہری۔ خود بھی صحابی ہیں اور والد بھی صحابی تھے۔ | ۶۴ھ

۱۰۳ ثابت بن الضحاک بن خلیفۃ الاشہلی۔ مشہور صحابی ہیں | ״

۱۰۴ معقل بن سنان الاشجعی ابو یزید | ״

۱۰۵ معقل بن یسار المزنی، بیعت رضوان میں شریک تھے | ״

۱۰۶ قرۃ بن ایاس بن ہلال المزنی۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی | ״

۱۰۷ ابو عبد الملک محمد بن عمرو بن حزم الانصاری المدنی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے | ״

۱۰۸ عبد اللہ بن السائب بن عائذ بن عبد اللہ المخزومی المکی | ״

۱۰۹ ابو سعید حارث بن نفیع بن لیلی الانصاری | ״

۱۱۰ حارثہ بن بدر بن حصین التمیمی | ״

۱۱۱ وہب بن عبد اللہ ابو جحیفۃ العامری | ״

۱۱۲ قیس بن ثور السلولی۔ فتح مصر میں شریک تھے۔ یزید کی وفات کے بعد انتقال ہوا | ۶۵ھ

۱۱۳ معن بن یزید بن جیب السلمی۔ یہ ان کے والد اور دادا تینوں صحابی ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی اور مرج الراہط میں شہید ہوئے | ״

۱۱۴ مروان بن الحکم الاموی ۲ھ پیدا ہوئے اور ۶۵ھ میں طاعون سے انتقال ہوا | ״

۱۱۵۔ عبد اللہ بن سعدۃ الفزاری۔ انہیں صحبت رسول حاصل ہے۔ دمشق میں سکونت اختیار کی۔ | ״

۱۱۶ ابو برزۃ الاسلمی نضلۃ بن عبید، فتح مکہ سے قبل ایمان لائے اور سات غزوات میں شریک رہے۔ پھر بصرہ میں سکونت اختیار کی اور غزوۂ خراسان میں شریک ہوئے اور خراسان ہی میں انتقال ہوا۔ | ״

۱۱۷ ایوب بن بشیر بن سعد بن النعمان ابو سلیمان المدنی | ״

ابو سعید بن المولی | ״

۱۱۸ حکم بن عمرو الغفاری الحکم بن اقرع ۔ بصرہ میں سکونت اختیار کی ۔	۶۵ھ
۱۱۹ اسماء بن خارجۃ بن حصین الفزاری ابو حسان الکوفی	//
۱۲۰ مالک بن ہبیرۃ بن خالد الکندی	//
۱۲۱ جبیر بن مطعم بن عدی القرشی ۔ بیعت رضوان کے بعد اسلام لائے ۔	//
۱۲۲ زمل بن عمرو العذری	//
۱۲۳ عامر بن مسعود بن امیۃ الجمحی	//
۱۲۴ عبد اللہ بن سعدۃ الفزاری	//
۱۲۵ عمارۃ بن رویبۃ الثقفی ابو زہیر	۷۰ھ کے بعد
۱۲۶ مالک بن ہبیرۃ بن خالد السکونی ۔ حمص میں سکونت اختیار کر لی تھی	//
۱۲۷ عمیر مولی آبی اللحم الغفاری ۔ غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے	//
۱۲۸ ولید بن عبادۃ بن الصامت الانصاری ۔ حضورؐ کو دیکھا ہے ۔	//
۱۲۹ یحییٰ بن خلاد بن رافع بن مالک العجلانی الزرقی ۔ حضورؐ کو دیکھا ہے	//
۱۳۰ ابو جمعۃ الانصاری حبیب بن سباع ۔ شام کی سکونت اختیار کی ۔ پھر مصر میں اقامت گزیں ہوئے ۔	//
۱۳۱ حارث بن عمرو بن غزیۃ المزنی	//
۱۳۲ سعید بن نمران الہمدانی	//
۱۳۳ عبد اللہ بن معقل الانصاری ۔ غزوۂ احد میں شریک تھے	//
۱۳۴ سفینۃ مولاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	۷۱ھ
۱۳۵ عمرو بن اخطب ابو زید الانصاری ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تیرہ غزوات میں شریک ہوئے	//
۱۳۶ یزید بن الاسود الجرشی السکونی ۔ شام میں سکونت اختیار کی ۔ بہت عابد و زاہد تھے لوگ ان سے بارش کی دعائیں کراتے اور بارش ہو جاتی ۔ ایک بار امیر معاویہ نے بھی ان سے بارش کی دعا کرائی	//

۱۳۷ سائب بن خلاد بن سوید الخزرجی المدنی	۷۱ھ
۱۳۸ عبداللہ بن ابی حوالۃ الازدی۔ انہوں نے شام میں رہائش اختیار کی	؍؍
۱۳۹ عبداللہ بن حازم السلمی۔ بصرہ کی سکونت اختیار کی	۷۱ھ کے بعد
۱۴۰ علقمۃ بن اخطب الانصاری۔ اکیس غزوات میں شریک ہوئے	۷۱ھ
۱۴۱ حیدۃ بن معاویۃ القشیری	؍؍
۱۴۲ عبداللہ بن السائب بن صیفی المخزومی	۷۲ھ
۱۴۳ عطیۃ بن بسر المازنی۔ حمص میں سکونت اختیار کی	؍؍
۱۴۴ معبد بن خالد الجہنی۔ قدیم الاسلام ہیں۔ فتح مکّہ کے روز قبیلہ جہینہ کا علم ان کے	؍؍
۱۴۵ ہاتھ میں تھا۔	
۱۴۶ ابوجہم بن حذیفۃ القرشی اسمہ عبید اللہ	؍؍
۱۴۷ حارث بن سوید التیمی ابو عائشہ	؍؍
۱۴۸ اسماء بنت زید بن الخطاب العدوی۔ حضرت عمر کی بھتیجی ہیں۔	۷۳ھ
۱۴۹ زینب بنت ابی سلمۃ بن عبدالاسد المخزومیۃ۔ ۷۳ھ میں عبداللہ بن عمران کے جنازے میں شریک ہوتے اور پھر مکّہ حج کو گئے اور وہیں مکہ میں حج کے بعد انتقال کیا۔ یہ ام المومنین ام سلمہ کی صاحبزادی ہیں، ان کے والد ابوسلمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے۔ لہٰذا ان کی تربیت آپ کے گھر میں ہوئی۔	؍؍
۱۵۰ ثابت بن الضحاک الانصاری ابو زید الاشہلی۔ بیعت رضوان میں شریک تھے۔	؍؍
۱۵۱ عبداللہ بن ابی حدرد الاسلمی۔ ان کا انتقال مدینہ میں ہوا۔	؍؍
۱۵۲ عبداللہ بن سعد بن خثیم الانصاری۔ بہت عبادت گزار اور زبردست مجاہد تھے	؍؍
۱۵۳ عوف بن مالک بن ابی عوف الاشجعی الغطفانی۔ غزوۂ موتہ اور فتح مکہ میں شریک تھے۔ شام میں انتقال ہوا۔	

۱۵۴ عبداللہ بن صفوان بن امیۃ بن خلف الجمحی ابوصفوان المکی۔ آپ کو دیکھا ہے	۳ھ
۱۵۵ اسید بن ظہیر بن رافع الانصاری الاوسی	۳ھ کے بعد
۱۵۶ ربیعۃ بن کعب بن مالک الاسلمی ابوالفراس المدنی۔ ان کا شمار اہل صفہ میں ہے	//
۱۵۷ سائب بن جناب صاحب المقصورۃ	//
۱۵۸ صعصعۃ بن معاویۃ بن حصین التیمی	//
۱۵۹ عبداللہ بن حازم السلمی نزیل البصرہ	//
۱۶۰ عبدالرحمان بن عثمان بن عبیداللہ التیمی	//
۱۶۱ عبیدۃ بن عمرو السلمانی	//
۱۶۲ عبیدۃ بن عمیر بن قتادۃ اللیثی ابوعاصم المکی	//
۱۶۳ عبداللہ بن عدی الانصاری۔ بعثت کے بعد پیدا ہوئے	۳ھ و
۱۶۴ عبدالرحمان بن عثمان بن عبیداللہ	//
۱۶۵ ابوسعید بن معلی الانصاری المدنی ویقال ابن نفیع	//
۱۶۶ نافع بن خدیج ابوعبداللہ الحارثی۔ غزوۂ احد اور بعد کے غزوات میں شریک ہوئے	//
۱۶۷ رافع بن اوسی ابوسعید	//
۱۶۸ رافع بن خدیج بن رافع الانصاری۔ بہت بلند پایہ صحابی ہیں۔ بدر کے علاوہ سب غزوات میں شریک ہوئے۔	۳ھ
۱۶۹ ابوسعید الخدری، سعد بن مالک بن سنان الانصاری۔ مشہور فقیہ صحابی ہیں غزوات کے وقت کم سن سمجھ کر چھوڑ دیئے گئے تھے	//
۱۷۰ عبداللہ بن عمر بن الخطاب العدوی۔ اپنے والد کے ساتھ اسلام لائے اور ہجرت کی۔ سب سے اوّل غزوۂ خندق میں شریک ہوئے	//
۱۷۱ ابوجحیفہ وہب بن عبداللہ السوائی۔ آپ کو دیکھا ہے، چند احادیث روایت کی ہیں	

۱۷۲ سلمۃ بن الاکوع بن عمرو بن سنان الانصاری۔ بیعت رضوان میں شریک تھے۔ مدینہ میں انتقال ہوا۔	۷۴ھ
۱۷۳ ابو معرض الاسدی مغیرۃ بن عبداللہ الکوفی	"
۱۷۴ محمد بن حاطب بن الحارث بن العمر الجمی الکوفی۔ چھوٹے درجہ کے صحابی ہیں	"
۱۷۵ براء بن عاذب بن الحارث بن عدی الانصاری الاوسی۔ خود بھی صحابی ہیں	
۱۷۶ والد بھی صحابی تھے۔ کوفہ کی سکونت اختیار کی۔ غزوۂ احد میں کم عمری کے باعث شریک نہیں ہوئے۔	"
۱۷۷ ابو عنبۃ الخولانی	۷۴ھ کے بعد
۱۷۸ عامر بن ابی عامر الاشعری	۷۴ھ
۱۷۹ سعد بن عائذ مولاۃ لانصاری المعروف بہ سعد القرظ۔ قباء میں مؤذن تھے	"
۱۸۰ خرشۃ بن حر الفزاری۔ حضرت عمر کے بھانجے ہیں۔ حضورؐ کو دیکھا ہے	"
۱۸۱ اسماء بنت ابی بکر الصدیق۔ ذوالنطاقین ان کا لقب ہے۔ سو سال کی عمر میں انتقال ہوا	"
۱۸۲ سائب بن جناب ابو مسلم	"
۱۸۳ زرارۃ بن جزی بن عمرو الکلابی	"
۱۸۴ عثمان بن عبیداللہ التیمی۔ حضرت طلحۃ بن عبیداللہ کے بھائی ہیں۔ قدیم الاسلام اور مہاجر ہیں۔	"
۱۸۵ عرباض بن ساریۃ السلمی۔ حمص میں سکونت اختیار کی۔ بہت بلند پایہ صحابی ہیں قدیم الاسلام ہیں اہل صفہ میں ان کا شمار ہے	۷۵ھ
۱۸۶ ابو ثعلبۃ بن جرہم الخشنی۔ بیعت رضوان میں شریک تھے۔ دمشق میں سکونت اختیار کی۔	"
۱۸۷ ابو عامر الاشعری عبداللہ بن عبد ہانی	"

۱۸۸ قباث بن اشیم بن عامر الکندی	۷۵ھ
۱۸۹ عمرو بن سفیان بن عبد شمس ابو الاعور السلمی ۔ غزوہ حنین کے بعد اسلام لائے	〃
۱۹۰ عبد اللہ بن قیس بن مخرمۃ بن المطلب المطلبی ۔ انہوں نے حضورؐ کو دیکھا ہے	۷۶ھ
۱۹۱ زہیر بن قیس البلوی ۔ فتح مصر میں شریک ہوئے ۔ انہیں رومیوں نے برقہ کے مقام پر شہید کر دیا تھا ۔	〃
۱۹۲ سائب بن جناب المدنی	۷۷ھ
۱۹۳ عبد اللہ بن غنم الاشعری	〃
۱۹۴ جابر بن عبد اللہ بن عمرو بن حرام ابو عبد اللہ الانصاری ۔ بیعت عقبی میں شریک تھے ۔ جنگِ بدر میں شرکت کا ارادہ تھا ۔ لیکن ان کے والد خود غزوہ میں شریک ہوئے اور انہیں بہنوں کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ دیا ان سے ایک ہزار پانچ سو چالیس احادیث مروی ہیں ۔ مدینہ میں انتقال ہوا	۷۸ھ
۱۹۵ جنادۃ بن امیۃ الازدی ۔ ان کی وفات شام میں ہوئی	〃
۱۹۶ عبد الرحمان بن غنم الاشعری	〃
۱۹۷ ثعلبۃ بن الحکم اللیثی ۔ انہیں صحبت رسول حاصل ہے	۷۹ھ
۱۹۸ جبیر بن نفیر بن مالک الحضرمی ۔ انہیں صحبت رسول حاصل ہے ۔ یہ اپنے علم اور عبادت میں مشہور تھے ، شام میں وفات پائی	۸۰ھ
۱۹۹ عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب ۔ حبشہ میں پیدا ہوئے ۔ یہ بنو ہاشم خاندان کے آخری فرد ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا	〃
۲۰۰ ۔ سفیان بن ہانی المصری ابو سالم الجیشانی	۸۰ھ کے بعد
۲۰۱ عائذ اللہ بن عبد اللہ الخولانی ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پیدا ہوئے	۸۰ھ
۲۰۲ حضرت ابو الدرداؓ کے بعد شام کے بہت بڑے عالم تصوّر کیے جاتے تھے	

٢٠٣ شریح بن الحارث بن قیس الکوفی النخعی	سنہ کے بعد
٢٠٤ عبداللہ بن انیس الجہنی۔ عقبہ میں شریک تھے۔ شام میں وفات پائی	سنہ
٢٠٥ عبداللہ بن عمرو الانصاری۔ یہ ام حرام کے صاحبزادے ہیں۔ بیت المقدس میں سکونت اختیار کی	سنہ کے بعد
٢٠٦ معاذ بن انس الجہنی الانصاری مصر میں سکونت اختیار کی	״
٢٠٧ سوید بن غفلۃ الجعفی۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی	سنہ۸۰
٢٠٨ عبداللہ بن حوالۃ ابوحوالۃ۔ شام کی سکونت اختیار کی	״
٢٠٩ حمزۃ بن ابی اسید الانصاری اسعدی ابومالک	سنہ۸۱
٢١٠ جنادۃ بن امیۃ بن مالک الدوسی	״
٢١١ عفان بن وہب الخولانی ابوایمن۔ مصر کی سکونت اختیار کی اور وہیں وفات پائی	سنہ۸۲
٢١٢ طارق بن شہاب بن عبدشمس الاحمسی۔ حضور کو دیکھا ہے۔ مدینہ میں انتقال ہوا	سنہ۸۳
٢١٣ عبیداللہ بن عدی بن الخیار	״
٢١٤ زر بن حبیش بن حباشۃ۔ ان کی عمر ایک سو تئیس سال ہوئی	״
٢١٥ عبداللہ بن شداد بن الہاد ابوالولید المدنی	״
٢١٦ عتبۃ بن المنذر السلمی مشہور صحابی ہیں اہل صفہ میں شامل ہیں	״
٢١٧ ابوغنیم الخولانی۔ حمص کی سکونت اختیار کی اور وہیں وفات پائی	سنہ۸۴
٢١٨ عبداللہ بن ودیعۃ بن حزام الانصاری	״
٢١٩ عبداللہ بن ابی طلحۃ الانصاری۔ ماں کی جانب سے حضرت انس کے بھائی ہیں	״
٢٢٠ عبداللہ بن عامر بن ربیعۃ العنزی	״
٢٢١ عبداللہ بن حارث بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب ابومحمد المدنی۔ انہوں نے حضور کو دیکھا ہے۔ ان کے والد اور دادا دونوں صحابی تھے یہ حضور کے سب سے بڑے چچا حارث کے پڑپوتے ہیں بصرہ کے امیر رہے	״

۲۲۲ سود بن ہلال المحاربی ابو سلام۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی	۸۴ھ
۲۲۳ اسماء بن حارثہ بن سعید الاسلمی۔ ان کا شمار اہل صفہ میں ہوتا ہے	″
۲۲۴ واثلۃ بن اسقع بن کنانۃ اللیثی۔ مشہور صحابی ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی	۸۵ھ
۲۲۵ عمرو بن حریث بن عمرو بن عثمان المخزومی ابو سعید۔ ہجرت سے دو سال قبل پیدا ہوئے	″
۲۲۶ عمرو بن سلمۃ بن قیس الجرمی چھوٹے صحابی ہیں۔ بصرہ کی سکونت اختیار کی	″
۲۲۷ کثیر بن العباس بن عبد المطلب الہاشمی۔ عبد اللہ بن عباس کے بھائی	″
۲۲۸ عمر بن ابی سلمۃ المخزومی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب اور رضاعی بھتیجے ہیں۔ حضرت ام سلمہ کے صاحبزادے ہیں	″
۲۲۹ بشیر بن عمرو۔ ابتدائے ہجرت میں پیدا ہوئے۔	″
۲۳۰ عبد اللہ بن ابی اوفی الاسلمی الکوفی۔ بیعت رضوان میں شریک تھے۔ کوفہ کے صحابہ میں سب سے آخر میں ان کا انتقال ہوا۔	۸۷ھ
۲۳۱ عبد اللہ بن حارث بن جزء الزبیدی۔ مصر کی سکونت اختیار کی اور مصر کے صحابہ میں سب سے آخر میں ان کی وفات ہوئی۔	۸۶ھ
۲۳۲ ابو امامۃ الباہلی صدی بن عجلان۔ شام میں اقامت گزیں تھے	″
۲۳۳ بسر بن ارطاۃ القرشی العامری۔ چھوٹے صحابی تھے۔ شام ہی اقامت اختیار کی	″
امیۃ بن عبد اللہ بن خالد بن اسید المکی	۸۷ھ
۲۳۴ ابو سعید المقبری۔ ان کا نام کیسان ہے۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں ان کا انتقال ہوا۔	″
۲۳۵ قبیصۃ بن ذویب ابو اسحاق المدنی، حضور کو دیکھا ہے۔ دمشق کی سکونت اختیار کی	″
امۃ بنت خالد بن سعید بن العاص بن امیہ۔ ان کے والد مشہور صحابی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور زرد رنگ کی چادر اوڑھائی۔	″

۲۳۶ زیاد بن جاریۃ الدمشقی۔ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں قتل کیے گئے۔	۷۷ھ
۲۳۷ مقدام بن معدی کرب الکندی ابوکریمہ۔ شام میں سکونت اختیار کی	〃
۲۳۸ عبیداللہ بن عباس بن عبدالمطلب الہاشمی چھوٹے صحابہ میں سے تھے	〃
۲۳۹ عتبۃ بن السلمی ابوالولید۔ مشہور صحابی ہیں۔ اصحاب صفہ میں سے تھے۔ سب سے اوّل غزوۂ قریظہ میں شامل ہوئے	〃
۲۴۰ عبداللہ بن بسر بن ابی بسر المازنی۔ حمص کی سکونت اختیار کی۔ شام کے صحابہ میں سب سے آخر میں ان کی وفات ہوئی	۸۸ھ
۲۴۱ عمیر بن حکیم العنسی۔ حضورؐ کو دیکھا ہے۔ شام کی سکونت اختیار کی	〃
۲۴۲ سہل بن سعد بن مالک بن خالد الانصاری۔ یہ بھی صحابی ہیں اور ان کے والد بھی صحابی ہیں۔ مدینہ کے صحابہ میں سب سے آخر میں ان کا انتقال ہوا	〃
۲۴۳ عبدالرحمان بن عبدالقاری۔ انہوں نے حضورؐ کو دیکھا ہے	〃
۲۴۴ عبداللہ بن ثعلبۃ بن صعیر العذری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ آپ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔	۸۹ھ
۲۴۵ حصین بن جندب بن الحارث ابوظبیان الکوفی	۹۰ھ
۲۴۶ وابصۃ بن معبد بن عتبۃ الاسدی	〃
۲۴۷ سائب بن یزید بن سعد بن ثمامہ۔ انہوں نے اپنے والد کے ساتھ حجۃ الوداع میں شریک تھے۔ اس وقت ان کی عمر سات سال تھی۔ بخاری کہتے ہیں یہ ۳ھ میں پیدا ہوئے	۹۱ھ
۲۴۸ ابوسنان العبدی	〃
۲۴۹ مالک بن اوس بن حدثان المدنی النصری۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔	۹۲ھ

۲۵۰ انس بن مالک بن النضر الانصاری الخزرجی ابوحمزۃ - انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی۔ بصرہ کی سکونت اختیار کی تھی اور وہیں انتقال ہوا	سنہ ۹۳
۲۵۱ عبدالرحمان بن یزید بن جاریۃ ابومحمد المدنی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے	″
۲۵۲ مالک بن الحویرث ابوسلیمان اللیثی صحابی ہیں بصرہ کی سکونت اختیار کی	سنہ ۹۴
۲۵۳ حارث بن اوس بن معلی الانصاری	″
۲۵۴ سعد بن ایاس ابوعمرو الشیبانی۔ ان کی عمر ایک سو بیس سال ہوئی	سنہ ۹۵
۲۵۵ سعید بن وہب الخیوانی۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے	″
۲۵۶ عبدالرحمان بن مل ابوعثمان النہدی۔ یہ ساٹھ سال کی عمر میں اسلام لائے۔ ان کی عمر ایک سو تیس سال ہوئی	″
۲۵۷ عبدالرحمان بن کعب بن مالک الانصاری	سنہ ۹۶
۲۵۸ عبداللہ بن بسر المازنی۔ چھوٹے صحابی ہیں۔ ان کے والد بھی صحابی تھے	″
۲۵۹ محمود بن لبید بن عقبۃ الاشہلی۔ چھوٹے صحابی ہیں	″
۲۶۰ عبداللہ بن کعب بن مالک الانصاری ابوفضالۃ	سنہ ۹۸
۲۶۱ ابوامامۃ اسعد بن سہل بن حنیف۔ حضورؐ کو دیکھا ہے	سنہ ۱۰۰
۲۶۲ عداء بن خالد بن ہوذۃ العامری۔ یہ اور ان کے والد اور دادا ایک ساتھ اسلام لائے	سنہ ۱۰۰ کے بعد
۲۶۳ بشیر بن عاصم بن سفیان الثقفی	سنہ ۱۰۰
۲۶۴ حصین بن الحرسات	ولید بن عبدالملک
۲۶۵ حصین بن نمیر السکونی الکندی	عبدالملک
۲۶۶ سعد بن زید الانصار	″
۲۶۷ سلمۃ بن ابی سلمہ المخزومی	″

۲۶۸ سنان بن سلمۃ بن المحبق الہذلی ۔ چھوٹے صحابی ہیں اور ان کے والد بھی صحابی تھے	عبدالملک
۲۶۹ سندر بن ابی الاسود ۔ یہ خود بھی صحابی ہیں ۔ ان کے والد بھی صحابی ہیں ۔	//
۲۷۰ یہ حجۃ الوداع میں شریک تھے	
۲۷۱ عبداللہ بن سندر الجذامی	//
۲۷۲ عبداللہ بن نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب الہاشمی	//
۲۷۳ عبدالرحمان بن ابی سبرۃ الجعفی ۔ ان کے والد بھی صحابی ہیں	//
۲۷۴ عقبۃ بن عامر الجہنی ۔ ہجرت النبی کے بعد اسلام لائے	یزید کے زمانہ میں
۲۷۵ علقمۃ بن وقاص اللیثی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں پیدا ہوئے	عبدالملک
۲۷۶ عکرشی بن ذویب ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بنو نزال سے صدقات کی وصولی پر مامور فرمایا تھا	//
۲۷۷ لجلاج العامری ۔ ان کی عمر ایک سو بیس سال ہوئی	//
۲۷۸ مالک بن عبداللہ بن سنان النخعی	//
۲۷۹ ولید بن عبادۃ بن الصامت	//
۲۸۰ معاویۃ بن الحکم السلمی ۔ کوفہ کی سکونت اختیار کی ۔ ان سے ایک حدیث مروی ہے	سنہ ۱۰۰ھ
۲۸۱ ابوالطفیل عامر بن واثلۃ اللیثی الکنانی صحابی ہیں ۔ ان کا انتقال تمام صحابہ کے بعد ہوا	سنہ ۱۱۰ھ
۲۸۲ حکم بن عمرو الغفاری ۔ انہیں حکم بن اقرع بھی کہا جاتا ہے ۔ بصرہ کی سکونت اختیار کی تھی	سنہ ۱۰۵ھ
۲۸۳ سائب بن ابی لبابۃ بن عبدالمنذر الانصاری	سنہ ۱۰۵ھ کے بعد
۲۸۴ عبدالرحمان بن حسان بن ثابت الانصاری المدنی ۔ حضور کے عہد میں پیدا ہوئے	//
۲۸۵ ابوعنبۃ الخولانی ۔ ان کا نام عمارہ ہے ۔ حمص کی سکونت اختیار کی ۔ عبدالملک کے زمانہ میں انتقال ہوا	//
۲۸۶ قبیصۃ بن ذویب الخزاعی المدنی ۔ دمشق میں سکونت اختیار کی ۔ حضورؐ کو دیکھا ہے	سنہ ۸۸ھ

۲۸۷ کثیر بن العباس بن عبد المطلب الہاشمی چھوٹے صحابی ہیں۔ عبد الملک کے زمانہ میں انتقال ہوا	سنہ ۸۸
۲۸۸ عامر بن ابی عامر الاشعری صحابی ہیں۔ عبد الملک کے زمانہ میں انتقال ہوا	//
۲۸۹ ابو نملہ بن معاذ بن زرارۃ الانصاری	ایام عبد الملک
۲۹۰ ابو سعید انصاری زوج اسماء بنت یزید بن السکن	//
۲۹۱ ابو الغادیۃ الجہنی، بیعت رضوان میں شریک تھے۔ ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں انتقال ہوا۔	خلافت ولید
۲۹۲ ابو کاہل الاحمسی	عبد الملک
۲۹۳ ارطات بن زفر المزنی	//
۲۹۴ اسیر بن عمرو الکندی و یقال یسیر۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے	//
۲۹۵ معن بن یزید السلمی	//
۲۹۶ یزید بن رکانۃ بن عبد یزید بن ہاشم بن عبد المطلب القرشی۔ ان کے والد بھی صحابی ہیں	//
۲۹۷ قباث بن اشیم بن عامر الکندی	//
۲۹۸ عمران بن ملحان ابو رجاء العطاردی۔ فتح مکہ کے روز اسلام لائے۔	ہشام بن عبد الملک

سنہ خلافت

خلافت یزید۔ سنہ ۶۰ تا سنہ ۶۴

عبد الملک۔ سنہ ۶۵ تا سنہ ۸۶

ولید بن عبد الملک۔ سنہ ۸۶ تا سنہ ۹۶

سلیمان۔ سنہ ۹۶ تا سنہ ۹۹

عمر بن عبد العزیز ۔ ۹۹ھ تا ۱۰۱ھ

یزید بن عبد الملک ۔ ۱۰۱ھ تا ۱۰۵ھ

ہشام بن عبد الملک ۔ ۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ

چونکہ یہ حصّہ دوم کافی ضخیم ہو گیا ہے، اس لیے ہم اپنے مضامین کو یہیں پر ختم کرتے ہیں اور آخر میں بارگاہ الٰہی میں دست دُعا دراز کرتے ہوئے عرض کناں ہیں :۔

یاالٰہی ۔ تو ہمیں سبائی اثرات اور ان کے پروپیگنڈے سے محفوظ رکھ ۔

الٰہ العالمین ۔ تو ہمیں اس شر سے محفوظ رکھ کہ ہم تیرے نبی کے ساتھیوں پر زبانِ طعن و تشنیع دراز کریں اور انہیں دنیا میں ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کریں ۔ جب کہ آپ کا ارشاد ہے ۔

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ط التحریم ۔ ۸

اس روز اللہ اپنے نبی اور ان مومنین کو جو نبی کے ساتھ ہیں ۔ رسوا نہ کرے گا ۔

یا الٰہ العالمین ۔ جو لوگ بے ناروا حرکات کرتے ہیں وہ تیرے کلام کے بھی دشمن ہیں اور تیرے نبی اور تیرے نبی کے ساتھیوں کے بھی دشمن ہیں وہ صحابہ کو باطل پرست قرار دے کر یہ دعویٰ کرنا چاہتے ہیں کہ تیرے نبی کی تعلیم و تربیت ہی ناقص تھی ۔ اعوذ باللہ من ہذا الکفر العظیم ۔

الٰہ العالمین ۔ تو نے ہمارے لیے جن حضرات کو نمونہ ہدایت بنایا ہے ۔ وہ یقیناً گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتے ۔ انہوں نے یزید کے اقدامات کو شرعی طور پر یقیناً صحیح مانا ہو گا ۔

الٰہ العالمین میرا عقیدہ وہی ہے جو قاضی ابوبکر ابن العربی المتوفی ۵۴۳ھ نے اپنی "العواصم" میں حمید بن عبد الرحمان بن عوف سے نقل کیا ہے کہ جب یزید بن معاویہ کی بیعت ہوئی تو ہم حضرت عبد اللہ بن عمر صحابی کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ انہوں نے ہماری باتیں سن کر فرمایا ۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ یزید امت محمدیہ میں سب سے بہتر نہیں ہے ۔ نہ سب سے بڑا فقیہ ہے اور نہ سب سے زیادہ عظیم و شریف ہے (یعنی یہ تو تسلیم ہے کہ سب سے زیادہ نہ سہی لیکن وہ بہتر بھی ہے ۔ فقیہ بھی ہے اور عظیم و شریف بھی ہے) لیکن میں تو ایک بات یہ کہتا ہوں کہ امت محمدیہ کا متحد ہونا ان کے متفرق ہونے سے بہتر ہے ۔

غور کرو کہ اگر کسی مکان کا ایک ہی دروازہ ہو اور تمام امت اس میں داخل ہو چکی ہو اور اس نے پوری امت کو اپنے میں سمو لیا ہے تو کیا ایک شخص کے لیے اس مکان میں گنجائش نہیں نکل سکتی، اگر وہ شخص اس میں داخل ہونا چاہے۔ ہم نے عرض کیا کیوں نہیں۔ انہوں نے فرمایا بھلا خیال کرو کہ جب تمام امت نے یہ فیصلہ کر لیا کہ نہ تو میں اپنے بھائی کا خون بہاؤں گا اور نہ اس کا مال لوں گا تو کیا یہ بات کافی نہیں ہے ہم نے عرض کیا کیوں نہیں۔ انہوں نے فرمایا میں بھی یہی کہتا ہوں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ حیا تو تیرے پاس بھلائی لے کر آئے گی۔ العواصم القواصم ص۲۲۶۔

الہ العالمین میرا عقیدہ ہے کہ ان حضرات نے یزید میں کسی قسم کی خامی نہیں پائی۔ اگر یہ حضرات یزید میں وہ عیوب پاتے جو یزید کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں تو وہ ہرگز اس کی بیعت نہ کرتے۔

الہ العالمین۔ ان صحابہ کو دیکھتے ہوئے میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ جو شخص یزید کو بُرا کہے۔ یا یہ کہے کہ حضرت حسینؓ نے حق کی خاطر جان دی۔ وہ یقیناً سبائی ہے اس لیے کہ حضرت حسینؓ نے مقام قادسیہ میں اپنے موقف سے رجوع کر لیا تھا۔ جس کے بعد ان کی موت صرف مظلومیت کی موت کہلانے کی مستحق ہے خواہ وہ کسی کے ہاتھوں واقع ہوئی ہو۔

حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی

محرّم کا کھچڑا

بچپن سے آج تک یہ تماشا دیکھتے آرہے ہیں کہ جہاں ماہ محرم شروع ہوا۔ گھر گھر کھچڑا پکنا شروع ہوجاتا ہے اور اس کے کھانے کے لیے لوگ ادھر سے اُدھر دوڑ لگاتے پھرتے ہیں۔ اور اسی دوڑ میں اسے ہضم کرتے ہیں تاکہ دوسری جگہ کھایا جا سکے اور یہ بھاگ دوڑ اگرچہ چہلم کے ختم ہونے تک جاری رہتی ہے۔ لیکن ماہِ محرم میں تو یہ بھاگ دوڑ بڑے زور کے ساتھ چلتی ہے۔

زندگی بھر کے مشاہدات اور تجربہ کے بعد ہمارے علم میں جو امور سامنے آتے انہیں کچھ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ یہ عمل صرف اہل سنت والجماعت میں پایا جاتا ہے جس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اس معاملے میں ہمارا طریقۂ کار سبائیوں سے بالکل جداگانہ ہے۔

۲۔ اس کی ابتدا محرم کی پہلی تاریخ سے ہوتی ہے اور تقریباً چہلم کے خاتمہ تک جاری رہتی ہے۔

۳۔ یہ وبا صرف برصغیر میں پائی جاتی ہے۔ عرب اور افریقی ممالک اس مرض لاعلاج سے محفوظ ہیں۔

۴۔ عام طور پر یہ حلیم شریف۔ المعروف بہ کھچڑا چندے سے تیار کیا جاتا ہے۔ بلکہ ہم نے تو بعض حضرات کو یہاں تک دیکھا ہے کہ وہ ایک ایک گھر اور ایک ایک دکان سے چندا کرتے پھرتے ہیں بلکہ اس کارِ خیر کے لیے دوسرے محلے کو بھی معاف نہیں کرتے اور ایک دیگ تیار کر کے لوگوں کا منہ بند کرتے اور خود مہینوں اس جمع شدہ پونجی سے ہوٹلوں کی دعوتیں اڑاتے ہیں۔ گویا یہ چندا بازی ایک مخفی تجارت ہے جو محرم میں تعزیہ، سبیل اور کھچڑے کے نام سے جاری رہتی ہے اور بقیہ سال میں ختم قرآن، گیارہویں تعمیر مسجد اور مدرسہ کے نام سے جاری رہتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسا مبارک دن آتا ہے کہ دن میں

آٹھ دس پارٹیاں آکر دروازہ پیٹتی ہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں اپنے دروازے کی طرف سے فکر لاحق ہونے لگتی ہے۔

۵۔ یہ کھچڑا اہل محلہ رات بھر جاگ کر پکاتے ہیں اور پھر پکانے والے دیگچیاں بھر بھر کر لے جاتے ہیں۔ گویا یہ مختانہ ہے جو صبح ہوتے ہی وصول کر لیا جاتا ہے۔

اس معاملہ میں جب لوگوں سے استفسار کیا گیا کہ بھائیو یہ حلیم شریف کس سلسلہ میں پکایا جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں چند امور سامنے آئے۔

ا۔ یہ ایصال ثواب کی غرض سے پکایا جاتا ہے۔

ب۔ امام حسینؓ کی نیاز کے طور پر پکایا جاتا ہے۔

ج۔ ہمارے بزرگ پکاتے رہے لہٰذا ہم بھی پکاتے ہیں۔

د۔ ہم نہیں جانتے کس لیے پکایا جاتا ہے۔ ایک رسم چلی آرہی ہے۔ لہٰذا کھانا پینا ہو جاتا ہے۔

ہ۔ ہمارے دیوبندی حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ دس محرم کو خوب کھلانے سے تمام سال رزق میں کشادگی رہتی ہے۔ لہٰذا ہم اس لیے پکاتے ہیں۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے مابین ایک مخفی تجارت ہے جو ہم انجام دیتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کا حکم دیا ہے لہٰذا اس پر عمل کیوں نہ کیا جائے۔

اس سلسلہ میں ہماری بھی چند معروضات ہیں، وہ بھی سن لیجئے۔

ا۔ اگر نیاز حسین یا ایصال ثواب سے مقصود یہ ہے کہ حضرت حسین راضی ہوں اور ان کی رضا سے ہمیں کچھ فوائد حاصل ہوں تو پھر اس صورت میں یہ قطعاً حرام ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وما اھل بہٖ لغیر اللہ — اور وہ چیزیں حرام کی گئیں جو غیر اللہ کے نام سے کی جائیں۔

ایسی صورت میں اس کا کھانا اور پکانا دونوں حرام ہیں۔

۲۔ اگر مقصود یہ ہے کہ ایصال ثواب کے ذریعہ حضرت حسین کو کچھ فائدہ پہنچایا جاتے تو ہم اپنی کتاب "ایصال ثواب قرآن کی نظر میں" میں وضاحت کر چکے ہیں کہ ایصال ثواب سے مرنے والے کو قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس لحاظ سے یہ عمل مہمل ہے اور اگر پہنچتا بھی ہے تو حضرت حسینؓ سے کہیں زیادہ ہم اس کے مستحق ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے گناہ پہاڑوں سے بھی زیادہ ہیں حضرت حسینؓ کو آپکے ایصال ثواب کی کوئی ضرورت نہیں۔

۳۔ کسی نیک عمل کا اجر اسی وقت ملتا ہے جب وہ خالصتاً للہ ہو۔ اور اس کا مقصود صرف رضائے الٰہی ہو اور جو عمل صرف رسم پوری کرنے اور اپنی خواہشِ نفس کی تکمیل کے لیے ہو، اس پر اجر کے بجائے عذاب ملتا ہے، لہٰذا اس صورت میں یہ فعل ایک گناہ بن سکتا ہے۔

۴۔ رہ گئی یہ وجہ کہ حدیث میں آتا ہے۔

من وسع علی عیالہ وسع اللہ علیہ سائر سنتہ — جو اس روز اپنی عیال پر وسعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر سارا سال وسعت فرماتے گا۔

اگر یہ روایت زبردستی صحیح مان بھی لی جائے تب بھی اس روایت سے حسب ذیل نتائج ظاہر ہوں گے۔

۱۔ اس کھچڑا پکانے کا یہ فائدہ اس وقت حاصل ہو گا جب کہ یہ خاص طور پر دس محرم کو پکایا جائے کسی اور روز قطعاً حاصل نہ ہو گا۔

۲۔ یہ فائدہ اس وقت ہو گا جب انسان اپنے خرچے سے پکا کر کھلاتے۔ چندہ مانگ کر اگر پکایا جاتے تو ہو سکتا ہے کہ یہ عمل الٹ ہو جاتے۔ اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ کیونکہ اگر کوئی عمل الٹ ہو جاتے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ ہم نے بزرگوں اور عاملوں سے یہی سنا ہے

۳۔ اس روایت میں زیر کفالت لوگوں پر خرچ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ انہی کی ذمہ داری اس کے سر ہے۔ محلہ کے حوالی موالی، ہٹے کٹوں کو کھلانے کا حکم نہیں دیا گیا۔

۴۔ اس روایت میں اپنی عیال پر وسعت کا حکم دیا گیا ہے جو عام ہے اس لحاظ سے کہ وسعت

کھلانے میں بھی ہو سکتی ہے۔ پہنانے میں ہو سکتی ہے اور پیسے دینے دلانے میں بھی ہو سکتی ہے اس لحاظ سے یہ وسعت عام ہوئی تو آپ نے کس دلیل سے اسے کھانے کے ساتھ خاص کیا۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اس سے مراد کھانے میں وسعت ہے تب بھی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ کھچڑا کس دلیل سے پکایا گیا۔ مرغ قورمہ، بریانی، شیرمال اور دیگر پھل فروٹ کیوں نہیں کھلائے جاتے کبھی ان چیزوں کو بھی وسعت میں داخل کر کے دیکھا ہوتا۔ لیکن چونکہ ہمارا مقصود کھلانا پلانا نہیں۔ بلکہ ایک رسم پوری کرنی ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے زبردستی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا سہارا تلاش کیا جا رہا ہے۔ اسی لئے ہماری جو بات ہوتی ہے وہ الٹی ہی ہوتی ہے۔

جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے تو یہ روایت قطعاً موضوع ہے۔ بلکہ یہ ابراہیم بن محمد بن المنتشر تبع تابعی کا قول ہے۔ انہوں نے یہ بات رافضیوں کے ماتوں کے جواب میں چڑانے کے لیے کہی تھی جسے بعد کے کذابین نے حدیث بنا کر پیش کر دیا۔

یہ روایت چار صحابہ کی جانب منسوب کی جاتی ہے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، ابو ہریرہؓ، ابو سعید خدریؓ اور جابرؓ۔ ابن عمرؓ کی روایت کا راوی یعقوب بن حرہ نامی ناقابلِ اعتبار اور ابو ہریرہؓ کی روایت میں سلیمان بن ابی عبد اللہ مجہول ہے۔

امام ابن الجوزیؒ نے دارقطنی سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ابن عمرؓ کی روایت منکر ہے یہ ابراہیم بن محمد بن المنتشر کا قول بیان کیا جاتا ہے۔ ابن عمرؓ کی روایت میں یعقوب بن حرہ ضعیف اور ابو ہریرہؓ کی روایت کے بارے میں عقیلی کہتے ہیں کہ سلیمان مجہول ہے اور یہ روایت درست نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں کوئی مستند روایت مروی نہیں۔ العلل المتناہیہ فی احادیث الواہیہ ج ۲ صہ ۵۵۳۔

حضرت جابرؓ کی روایت ابن عبد البر نے الاستذکارہ، میں ابو الزبیر کی سند سے نقل کی ہے۔ ابن عبد البر کا دعویٰ ہے کہ یہ شرط مسلم پر صحیح ہے اور اسی روایت کو دیکھتے ہوئے سیوطی جیسے حضرات اس کہانی کو حقیقت ثابت کرنے کی سعی لاحاصل میں مصروف نظر آتے

ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ابوالزبیر مسلم کے راوی ہیں۔ لیکن اس پر بھی اتفاق ہے کہ یہ مدلس ہیں اور حضرت جابرؓ کی روایات میں خاص طور پر تدلیس سے کام لیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی ایسی روایت جو عن سے مروی ہو قابلِ قبول نہیں اور یہ روایت بھی عن سے مروی ہے۔ نہ معلوم درمیان سے کس قسم کا راوی حذف کیا گیا ہو۔ اور ابوالزبیر کے سلسلہ میں خاص طور پر ایک اصول یہ ہے کہ ان کی حضرت جابرؓ سے صرف وہ روایات قابل قبول ہیں جو لیث بن سعد نے ابوالزبیر سے نقل کی ہوں کیونکہ ان کی بقیہ روایات میں تدلیس ہوتی ہے اور یہ روایت ابوالزبیر سے لیث نے نقل نہیں کی۔ اس طرح جن تنکوں پر یہ آشیانہ بنایا گیا تھا وہی تیکھے ہوا دے رہے ہیں۔

یہ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں حدیث کے سلسلہ میں جتنی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے کسی کتاب میں بھی اس روایت کا وجود نہیں۔ لیکن چوتھی صدی میں دارقطنی اور ابن عدی وغیرہ نے نقل کر کے اسے ضعیف قرار دیا اور پانچویں صدی میں اس کے سر پر صحت کا تاج سجایا جانے لگا۔ فیاللعجب۔ یعنی ابتدائی صدیوں میں تو کوئی اس روایت سے واقف نہ تھا لیکن بعد کی صدیوں میں برساتی کیڑوں کی طرح یہ کہاں سے نمودار ہو گئی۔

اور یہ بھی غور طلب ہے کہ ابوالزبیر سے اس روایت کو شعبہ نے نقل کیا ہے اور شعبہ خاص طور پر ابوالزبیر کی روایات کو ناقابلِ قبول قرار دیتے ہیں۔ کہیں کسی راوی نے یہ روایت ان کی جانب منسوب کر کے کوئی مذاق تو نہیں کیا۔ "تاریخ حدیث میں اس قسم کی دلچسپ مثالیں دستیاب ہوتی ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ "لسان المیزان" میں فرماتے ہیں۔ یہ حدیث انتہا سے زیادہ منکر ہے۔ خطیب بغدادی نے ایک روایت مالک عن نافع عن ابن عمر کی سند سے نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کے کئی راوی مجہول ہیں اور امام مالک سے یہ روایت قطعاً مروی نہیں۔

امام بیہقی کا قول ہے کہ ان تمام روایات کی سندات ضعیف ہیں۔ لیکن متعدد سندات جمع ہونے کی وجہ سے اس روایت کو کچھ تقویت حاصل ہو گئی ہے۔ (یعنی کلی طور پر اسے رد نہیں کیا جا سکتا)

ابراہیم بن محمد المنتشر کا بیان ہے کہ عام لوگوں میں اس بات کا چرچا تھا کہ جو اس روز اپنے گھر والوں پر کشادگی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس پر تمام سال رزق کی کشادگی فرماتے گا۔

حافظ عقیلی کا بیان ہے کہ اس موضوع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں ہاں اسے ابراہیم بن محمد بن المنتشر نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اللآلی المصنوعہ ج ۲ ص ۱۱۳۔

شیخ تقی الدین ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں اس مضمون کی کوئی حدیث کسی امام الحدیث نے نقل نہیں کی اور یہ ابراہیم بن محمد بن المنتشر کا قول ہے۔

بیہقی نے یہ روایت "شعب الایمان" میں محمد بن المنکدر کے واسطے سے حضرت جابرؓ سے نقل کی ہے۔ بیہقی لکھتے ہیں اس کی سند ضعیف ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بیہقی کی کرم فرمائی ہے کہ انہوں نے اسے ضعیف کہا ہے۔ حالانکہ اس روایت کی سند میں محمد بن یونس الکدیمی مشہور کذاب اور وضاع الحدیث ہے۔

اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں یہ روایت حضرت ابو سعیدؓ خدری سے بھی نقل کی ہے۔ لیکن اس کی سند میں ایک ایسا چلتا پھرتا مجہول آدمی ہے جس کا نام تک راوی کو معلوم نہیں۔ ابو سعید خدریؓ کی اس حدیث کو طبرانی نے "اوسط" میں بھی نقل کیا ہے۔ لیکن اس کے دو راوی ضعیف ہیں یعنی محمد بن اسمٰعیل الجعفری اور عبد اللہ بن مسلمۃ الربعی۔ اللآلی المصنوعہ ج ۲ ص ۱۱۳۔

ملا علی قاری، محمد طاہر بن علی الپٹنی۔ حافظ محمد بن عبد الرحمان السخاوی اور علامہ عبد الرحمان الاثری نے یہ تمام امور اپنی اپنی موضوعات میں مختصر طور پر نقل کیے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں تمیز الطیب من الخبیث ص ۱۷۶۔ المقاصد الحسنہ ص ۴۳۱۔ تذکرہ الموضوعات ص ۱۱۸۔ موضوعات کبیر ص ۱۲۷۔

لیکن امام ابن الجوزی اور حافظ مقدسی کے علاوہ تقریباً سب ہی نے یہ بات دہرائی ہے کہ اگرچہ اس روایت کی تمام سندات ضعیف ہیں۔ لیکن چونکہ یہ ایک دوسرے کی تائید کر رہی ہیں۔ لہٰذا ان میں کچھ قوت پیدا ہو گئی ہے۔ بلکہ ایک روایت تو مسلم کی شرط پر ہے۔ لہٰذا اس روایت کو موضوع کہنا زیادتی ہے۔ اس طرح یہ ابعد کے تمام متاخرین سیوطی کی تقلید میں ابن جوزی کا رد کرنے کی ناکام کوشش

کرتے رہے۔ لیکن اگر واقعتاً ان حضرات کو اس روایت کے صحیح ہونے کا یقین تھا تو اپنی اپنی "موضوعات" میں اسے نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ موضوعات میں تو وہی روایات پیش کی جاتی ہیں، جو موضوع ہیں۔

ہاں۔ اس طریقۂ کار سے ان متاخرین نے یہ کام ضرور انجام دیا ہے کہ موضوع کو ضعیف اور ضعیف کو حسن قرار دے کر اسلام میں نئے نئے افسانے پھیلاتے۔ اور یہ سب کھیل ایک خاص اصول کے تحت انجام دیئے گئے۔ اور وہ اصول یہ ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف روایت قابلِ قبول ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے تقریباً تمام علماء نے اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ متقدمین ضعیف روایت کو قطعاً قبول نہیں کرتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف روایت پر جرح نہ کریں اور جن حضرات کے نزدیک ضعیف روایت قابل قبول ہے۔ ان کے یہاں بھی چند شرائط ہیں۔ بلا شرط ضعیف روایت قبول نہیں کی جاتی۔

حافظ ابن حجر نے اس کی چار شرائط بیان کی ہیں۔

۱۔ روایت شدید ضعیف نہ ہو۔

۲۔ کسی اصول شرعیہ کے خلاف نہ ہو۔

۳۔ اسے حدیث سمجھ کر یا اسے حضور کی جانب منسوب کر کے عمل نہ کیا جائے۔

۴۔ اس پر عمل اتفاقی ہو اجتماعی نہ ہو۔

یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اجتماعی صورت میں ہو رہا ہے اور حدیث رسول اور دین سمجھ کر کیا جا رہا ہے اور روایت بھی شدید ضعیف ہے۔ جن حضرات نے سیوطی وغیرہ کی تقلید میں اس روایت کو صحیح یا حسن قرار دینے کی کوشش کی ہے اور پھر اس سے کھچڑے کا جواز استنباط کیا ہے۔ انہوں نے انتہائی غلط روش اختیار کی ہے اور ہزاروں بدعات کے دروازے کھولے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں عقل سلیم عطا فرمائے۔ آمین

رہا یہ تصور کہ متعدد سندات کے جمع ہونے سے روایت کو تقویت حاصل ہوتی ہے، اور وہ

حسن کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب راوی میں صرف حافظہ کی کمزوری پائی جاتی ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ایک کذاب کی شہادت دوسرا کذاب دے تو وہ کذاب باقی نہ رہے۔

رافضیوں کا دعویٰ ہے کہ امامت کا حق حضرت علیؓ کو حاصل تھا اور ابوبکرؓ و عمرؓ غاصب ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ہزاروں روایات پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ قرآن کو محرف مانتے ہیں اور اس سلسلہ میں دو ہزار روایات پیش کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تعدد طرق کیا ہوگا ؟ کیوں نہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ سب صحیح روایات ہیں ؟ آگے مزید اگر کچھ عرض کریں گے تو گستاخی ہوگی اور ہمارے اکابرین ناراض ہو جائیں گے اور فتوؤں کی مشین چالو ہو جائے گی۔

دراصل جب غم حسین میں رافضیوں نے ماتمی روایات وضع کیں تو رد عمل کے طور پر فریق مخالف نے بھی کچھ روایات وضع کیں۔ انہوں نے غم حسین میں سیاہ کپڑے پہنے اور یہی صورت بگاڑی تو فریق مخالف نے یہ روایت پیش کر دی کہ جو اس روز سرمہ لگائے گا۔ تمام سال اس کی آنکھیں دکھنے نہ آئیں گی رافضیوں نے اس روز چولھا ٹھنڈا کیا تو ابراہیم بن محمد بن المنتشر نے جواباً یہ بات کہی کہ جو اس روز اپنے گھر والوں کو خوب کھلائے گا وہ تمام سال عیش کرے گا۔ ابراہیم بن محمد بن المنتشر نے غالباً یہ بات بطور جوب کہی تھی۔ لیکن بعد میں یار لوگوں نے اسے بھی حدیث بنا کر پیش کر دیا۔

تاریخ میں ایک اور واقعہ بھی اسی قسم کا دستیاب ہوتا ہے کہ قاری اعمش کوفی کے سامنے کسی سائل نے یہ روایت پیش کی کہ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ میں قیامت کے روز جنت تقسیم کروں گا تو انہوں نے ہنس کر فرمایا کہ یہ بھی تو کہا تھا کہ میں دوزخ تقسیم کروں گا۔ بعد میں یہ روایت اس طرح سامنے آئی کہ اعمش نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ حضرت علی جنت اور دوزخ تقسیم کریں گے۔ بلکہ متعدد حضرات تو اعمش سے یہ معلوم کرنے گئے کہ کیا واقعتاً تم نے یہ حدیث بیان کی ہے۔ ؟

اسی طرح اس جگہ ابراہیم کے قول کے ساتھ بھی یہی حشر کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے

حضرت انسؓ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جنت تین افراد کی مشتاق ہے۔ علی۔ عمار اور سلمانؓ۔ ترمذی لکھتے ہیں یہ حدیث غریب ہے۔ اس حدیث کو حسن بن صالح کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا۔ ترمذی ج ۲ ص۲۴۳۔

امام ترمذی کا دعویٰ ہے کہ اس روایت کو حسن بن صالح کے علاوہ کوئی بیان نہیں کرتا۔ اس لیے اس روایت کا تمام تر دارو مدار اصل میں حسن بن صالح پر ہے۔ لہٰذا سب سے اوّل حسن بن صالح کا حال ملاحظہ فرمائیں۔

حسن بن صالح

حسن بن صالح بن حی الفقیہ۔ ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ ہمدان کے باشندے ہیں اور قبیلہ ثور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سے مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے احادیث روایت کی ہیں۔ ہاں بخاری نے ان کی روایت نہیں لی۔ انہوں نے سماک بن حرب اور قیس بن مسلم وغیرہ سے احادیث روایت کی ہیں۔ اور ان سے یحییٰ بن آدم۔ احمد بن یونس، علی بن الجعد اور ایک بڑی مخلوق نے حدیث روایت کی ہے۔

امام ذہبی لکھتے ہیں ان میں تھوڑا سا تشیع پایا جاتا تھا اور وہ جمعہ نہیں پڑھتے تھے (یعنی حکومت کے پیچھے)

زافر بن سلیمان کا بیان ہے۔ میں نے حج کا ارادہ کیا۔ مجھ سے حسن بن صالح نے فرمایا۔ اگر تیری ملاقات سفیان ثوری سے ہو تو انہیں میرا سلام کہنا اور ان سے کہنا۔ ہم ابھی تک پہلی بات پر قائم ہیں۔ زافر کا بیان ہے کہ میری ملاقات سفیان سے ہوئی۔ اور انہیں حسن کا پیغام پہنچایا۔ سفیان نے سن کر فرمایا۔

پھر جمعہ کا کیا ہو گا۔ پھر جمعہ کا کیا ہو گا۔

خلاد بن یحییٰ کا قول ہے کہ مجھ سے سفیان نے فرمایا کہ حسن بن صالح نے احادیث سن ہیں لیکن جمعہ تب بھی ترک کرتے ہیں۔

عبداللہ بن ادریس الاودی کا قول ہے کہ میں اور حسن بن صالح جمعہ اور جہاد جائز نہیں سمجھتے۔

ابونعیم کا بیان ہے کہ سفیان ثوری کے سامنے ایک بار اس حسن کا تذکرہ کیا گیا۔ انہوں نے فرمایا وہ تو امت کے خلاف تلوار نکالنے کو جائز سمجھتا ہے۔ یعنی ظالم حاکموں کے خلاف خروج کو۔

(یہ ذہن میں رہے کہ دور صحابہ، دور تابعین اور دور تبع تابعین میں اس امر پر سب کا اتفاق تھا کہ جو ظالم حکومت کے خلاف بغاوت کو جائز سمجھتا ہو وہ یا تو شیعہ ہو گا یا خارجی۔ اور جو حکومت کی اطاعت کو لازم سمجھتا ہو اور اتحاد امت کا دعویدار ہو اور مسلمانوں پر تلوار اٹھانا حرام سمجھتا ہو وہ اہل سنت ہے۔ آج کل کے سیاسی دور میں جو ہر حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کئے جاتے اور حکومت کے خلاف ہر کوشش کو جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے یہ سب تشیع کی کارفرمائیاں ہیں۔ اسی لیے ایسے موقعہ پر حضرت حسینؓ کی قربانی اور یزید کی ظالمانہ روش کا سبق دہرایا جاتا ہے)

خلف بن تمیم کا قول ہے کہ امام زائدہ ہر اس شخص سے توبہ کراتے جو حسن بن صالح کے پاس جاتا۔

احمد بن یونس فرماتے ہیں کہ اگر حسن بن صالح بن حی پیدا نہ ہوتا تو یہ اس کے لیے بہتر ہوتا۔ یہ حسن جمعہ ترک کرتا اور مسلمانوں پر تلوار نکالنے کو جائز سمجھتا ہے۔ میں اس کے پاس بیس سال تک اٹھتا بیٹھتا رہا ہوں اس کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ میں نے اسے کبھی آسمان کی جانب سر اٹھاتے نہیں دیکھا اور نہ کبھی دنیا کا ذکر کرتے دیکھا۔

یحییٰ بن معین وغیرہ فرماتے ہیں یہ ثقہ ہے۔ امام احمد کا قول ہے کہ یہ شریک سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں۔ یہ حسن ثقہ ہے۔ حدیث میں محتاط ہے اور حافظ ہے، ابوزرعہ کا قول ہے کہ اس میں اعتباط، فقہ، عبادت اور زہد سب جمع تھے۔ الجرح والتعدیل ج ۳ ص۱۸۔

نسائی کہتے ہیں ثقہ ہیں۔ لیکن ابن المثنیٰ کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن سعید القطان اور عبدالرحمان

بن مہدی کو اس سے کوئی روایت لیتے نہیں دیکھا۔

فلاس کا بیان ہے کہ عبدالرحمان بن مہدی اوّل اس سے حدیث لیا کرتے تھے۔ پھر اس سے روایت لینی ترک کر دی اور یحییٰ بن سعید نے ایک بار ان حسن کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ یہ سکّہ کی طرح کھرا شخص نہیں۔

ابونعیم کہتے ہیں کہ ایک بار ثوری جمعہ کے روز مسجد میں گئے تو حسن بن صالح کو نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا ہم اللہ سے اس منافقانہ خشوع سے پناہ مانگتے ہیں۔ اس کے بعد سفیان اپنے جوتے اٹھا کر دوسرے ستون کی طرف چلے گئے۔

امام وکیع فرماتے ہیں۔ حسن بن صالح ہمارے نزدیک امام ہیں۔ کسی نے ان سے کہا کہ حسن تو حضرت عثمان پر رحم نہ کرتے تھے۔ وکیع نے جواب دیا کیا تو حجاج پر رحم کرتا ہے؟ امام وکیع فرماتے یہ تمثیل انتہائی مردود ہے ان دونوں اشخاص میں کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ میزان ج ۲ صہ۴۹۶۔

بلکہ جو شخص حضرت عثمان غنی کو حجاج بن یوسف سے تشبیہ دے کم از کم ہم ہرگز بھی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے کہ وہ اندرونی طور پر شیعہ نہ ہوگا۔ یہ تمام بیانات اہل سنت والجماعت کے تھے۔

اب آیئے ایک شیعہ مصنف عبدالحسین شرف الدین موسوی کا بیان بھی سن لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

حسن بن حی۔ اور حی کا نام صالح بن ابی صالح الہمدانی ہے۔ یہ علی بن صالح کے بھائی ہیں، یہ دونوں بھائی علماء شیعہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ دونوں جڑواں پیدا ہوتے تھے۔ ہاں علی حسن سے کچھ دیر قبل پیدا ہوئے ذہبی نے میزان میں حسن کے تذکرہ میں بیان کیا ہے کہ ان میں تشیّع کی بدعت پائی جاتی تھی۔ یہ جمعہ نہیں پڑھتے تھے اور ظالم امراء کے خلاف خروج جائز سمجھتے اور عثمان پر رحم نہ کرتے اور ابن سعد نے طبقات کی چھٹی جلد میں تحریر کیا ہے کہ حسن ثقہ ہیں۔ صحیح الحدیث ہیں۔ ان سے بکثرت احادیث مروی ہیں۔ لیکن شیعہ ہیں ابن قتیبہ نے اپنی "المعارف" میں جہاں اصحاب حدیث کا حال بیان کیا ہے۔ وہاں ان کے شیعہ ہونے کی صراحت کی ہے اور آخر میں جہاں شیعہ راویوں کی فہرست پیش کی ہے۔ اس کا نام بھی پیش کیا ہے۔ المراجعات صہ۸۰۔

البوربیعتہ، الغرض حسن بن صالح شیعہ تھے اور انہوں نے یہ روایت البوربیعۃ الایادی سے نقل

ہے ۔ ابن جوزی کا بیان ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔ اور ابو ربیعہ ایادی کا نام زید بن عوف ہے۔ اس کا لقب فہد ہے ۔ ابن المدینی کا بیان ہے کہ اس کی حدیث ردی ہوتی ہے ۔ فلاس اور مسلم بن الحجاج کہتے ہیں یہ متروک الحدیث ہے ۔ العلل المتناہیہ فی احادیث الواہیہ ج ۱ صفحہ ۲۸۴ ۔

لیکن ہیثمی کا دعویٰ ہے کہ ابو ربیعہ کے علاوہ اس کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں ۔ شیخ خلیل مدیر اذہر لبنان لکھتے ہیں ابو ربیعہ سے مراد زید بن عوف نہیں بلکہ عمر بن ربیعہ ابو ربیعہ الایادی ہے ۔ جسے یحییٰ بن معین ثقہ اور ابو حاتم منکر الحدیث کہتے ہیں ۔ العلل ج ۱ صفحہ ۲۸۴ ۔

حافظ ذہبی نے یحییٰ بن معین کے قول کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ۔ ہاں یہ تحریر کیا ہے کہ ابو حاتم کے نزدیک یہ منکر الحدیث ہے ۔ میزان ج ۳ صفحہ ۱۹۶

اس ابو ربیعہ الایادی نے یہ روایت حسن بصری سے نقل کی ہے اور حسن نے حضرت انس رضی سے اور حسن تدلیس میں مشہور ہیں اور مدلس کی عن والی روایت قابلِ قبول نہیں ہوتی ۔ لیکن امام ذہبی کا دعویٰ ہے کہ حسن بن صالح نے یہ روایت ابو ربیعہ سے نقل نہیں کی ۔ بلکہ اسمعیل بن مسلم سے نقل کی ہے اور اسمٰعیل نے حسن بصری سے ۔ ہو سکتا ہے کہ بعد کے راوی سفیان بن وکیع نے یہ غلطی کی ہو ۔ کیونکہ ان کی روایت بھی قابلِ قبول نہیں ۔

اسمٰعیل بن مسلم البصری : یہ بصرہ کا باشندہ ہے ۔ حسن بصری کا شاگرد ہے ۔ آخر میں مکہ کی سکونت اختیار کر کے وہاں کا مجاور بن گیا تھا ۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے اس سے روایات لی ہیں ۔

ابو زرعہ فرماتے ہیں ۔ یہ بصرہ کا باشندہ ہے ضعیف ہے ۔ اس نے مکہ کی سکونت اختیار کر لی تھی ۔ احمد وغیرہ کہتے ہیں منکر الحدیث ہے ۔ نسائی وغیرہ کا قول ہے متروک ہے ۔

فلاس کہتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید اور عبد الرحمان بن مہدی اس کی روایات قبول نہیں کرتے تھے ۔ علی بن المدینی کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن سعید سے اس اسمٰعیل بن مسلم کے بارے میں دریافت کیا ۔ انہوں نے فرمایا یہ تو ایک پاگل انسان تھا ۔ ایک حدیث کو تین تین صورتوں میں بیان کرتا ۔

یحییٰ بن معین کہتے ہیں اسمٰعیل بن مسلم کچھ نہیں ہے ۔ علی بن المدینی کا قول ہے کہ اس کی روایت لکھی

بھی نہ جائے۔ سعدی کہتے ہیں یہ اسمٰعیل تو انتہا سے زیادہ ردی ہے۔ اس کے بعد ذہبی نے اس کی پانچ منکر روایات پیش کیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے۔

اسماعیل بن مسلم نے حسن کے واسطہ سے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے۔ علیؓ، عمارؓ اور سلمانؓ میزان الاعتدال ج ۱ ص۲۵۰۔

یعنی یہ روایت امام ذہبی کے نزدیک منکرات اسماعیل بن مسلم میں داخل ہے اور اسماعیل سے اسے حسن بن صالح نے نقل کیا ہے۔ اسماعیل ناقابلِ اعتبار ہے اور حسن بن صالح معتبر ہونے کے باوجود شیعہ ہے۔ اور شیعوں کا مذہب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صرف تین افراد مومن باقی رہ گئے تھے۔ اور باقی مرتد ہو گئے تھے۔ لیکن حسن بن صالح سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے حضرت علیؓ کو مومنین میں شامل کر دیا ہے ورنہ اصول کافی میں وہ تین افراد جو مومن باقی رہ گئے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ عمار، سلمان اور مقداد۔ اس طرح سبائی برادری نے حضرت علی کو بھی مومنین سے خارج کیا تھا۔ پھر جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو پانچ مومنین والی روایت وضع کی گئی۔ یعنی علیؓ، سلمانؓ، عمارؓ، مقدادؓ، اور ابوذرؓ۔ لیکن اگر حضرت علیؓ، حضرت ابوذر حضرت مقدادؓ اور حضرت عمارؓ کا علم حضرت سلمانؓ کے علم کے روبرو پیش کیا جائے تو یہ سب کافر بن جائیں گے۔ واحد مومن سلمان ہیں۔ جن کو علوم اولین و آخرین حاصل ہیں۔ کیونکہ وہ فارسی النسل ہیں اسی باعث آج تک ان کی عمر کا صحیح پتہ نہ چل سکا۔ دو سو سال سے ساڑھے پانچ سو سال تک کی روایات ہیں۔ اب اصل عمر کیا ہے یہ عقدہ تو قیامت کے روز ہی کھلے گا۔ ہم نے اپنی اصول فقہ میں یہ روایات نقل کی تھیں۔ لیکن اب ہم ان روایات کو خرافات سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دے سکتے۔ اصول فقہ ہماری پرانی تصنیف ہے اور اس وقت تک ہم نے تحقیق و تنقید کے میدان میں قدم نہ رکھا تھا۔ بلکہ بالفاظ دیگر اوروں کی طرح نابالغ العلم تھے۔ اللہ ہم سب کو معاف فرمائے۔

تم جس سے جنگ کرو گے میں بھی اس سے جنگ کرونگا

زیدؓ بن ارقم کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے فرمایا۔ تم لوگ جس سے جنگ کروگے میں اس سے جنگ کروں گا اور تم جس سے صلح کروگے میں اس سے صلح کرونگا۔ ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث غریب ہے۔ ہمیں اس سند کے علاوہ اس کی کوئی اور سند معلوم نہیں۔ اور صُبَیح جو حضرت اُمِ سلمہؓ کا غلام ہے۔ وہ معروف نہیں۔ ترمذی ج ۲ صہ ۲۵۰ ابن ماجہ مترجمہ ج ۱ صہ ۸۳

ترمذی اور ابن ماجہ میں اس کے اوپر کے تینوں روات یعنی صُبَیح سدّی اور اسباط بن نصر مشترک ہیں۔ یعنی تینوں راویوں تک سوائے ایک ایک شخص کے اس کو کسی نے روایت نہیں کیا۔ لہٰذا اس روایت کی صحت و عدم صحت کا تمام تر دارو مدار ان تین ہستیوں پر موقوف ہے ان میں سب سے اوّل راوی صُبَیح ہے۔

صُبَیح

اس کے بارے میں نیچے کا راوی یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ یہ حضرت اُمِ سلمہؓ کا غلام ہے لیکن امام ترمذی فرماتے ہیں وہ معروف نہیں۔ اوّل تو اس کے نام و نسب اور حالاتِ زندگی سے کوئی واقف نہیں۔ بلکہ یہ امر بھی ثابت نہیں کہ صُبَیح نامی کوئی حضرت اُمِ سلمہؓ کا غلام بھی تھا۔

ابن عدی اور حافظ ذہبی نے بھی صرف ترمذی کا قول نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور مزید کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میزان ج ۲ صہ ۳۰۶۔

حافظ ابن حجرؒ "تقریب" میں لکھتے ہیں۔ صُبَیح اُمِ سلمہؓ کا غلام ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ زید بن اسلم کا غلام ہے۔ چھٹے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مقبول ہے۔ تقریب صہ ۱۵۰۔ اور حافظ صاحب تقریب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ چھٹے طبقہ سے مراد وہ اشخاص ہیں جنہوں نے کسی صحابی کو نہ دیکھا ہو یعنی اس صبیح نے زیدؓ بن

ارقم کو نہیں دیکھا اور نہ ام سلمہ کو دیکھا گویا اس طرح درمیان سے ایک راوی چھوٹ گیا ہے۔ رہا صبیح کا مقبول ہونا وہ اس کے معروف ہونے پر موقوف ہے۔ عبد الرحمان بن ابی حاتم۔ دار قطنی اور نسائی وغیرہ نے اس کا تذکرہ تک بھی نہیں کیا۔ بخاری نے تاریخ الکبیر میں صرف اتنا بیان کیا کہ یہ زید بن ارقم کا غلام ہے۔ گویا صرف اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ غلام ہے۔ لیکن کس کا غلام ہے یہ بھی نامعلوم ہے اور تو کیا معلوم ہوتا اور راوی جب مجہول ہو تو روایت ناقابل قبول ہوتی ہے۔

اس روایت کا دوسرا راوی سُدّی ہے امام ترمذی نے اس کی جانب کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ دراصل سُدّی دو ہیں۔ ایک سُدّی کبیر ہے اور ایک سُدّی صغیر ہے۔ ہم ذیل میں دونوں کی تصویر پیش کیے دیتے ہیں

سُدّی کبیر اس کا نام اسمٰعیل بن عبد الرحمان ہے۔ کوفہ کا باشندہ ہے۔ تابعی ہے۔ اس کی روایات بخاری کے علاوہ بقیہ پانچوں کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں یہ سُدّی ثقہ ہے۔

لیکن یحییٰ بن معین کہتے ہیں یہ ضعیف ہے۔ ابو حاتم رازی کہتے ہیں اس کی حدیث حجت نہیں۔ عبد الرحمان بن مہدی کا قول ہے کہ ضعیف ہے۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ اس پر تشیع کا الزام ہے امام لیث بن سعد مصری فرماتے ہیں کہ کوفہ میں اصل کذاب تو دو ہیں۔ ایک سُدّی اور ایک کلبی۔

حسین بن واقد کا بیان ہے کہ میں اس سُدّی سے حدیثیں سننے گیا۔ ابھی مجھے بیٹھے کچھ دیر بھی گذری تھی کہ یہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو گالیاں دینے لگا۔ اسی لیے میں اس کے پاس دوبارہ کبھی نہیں گیا۔ گویا یہ سُدّی کبیر بدلو دار قسم کا رافضی ہے۔

سُدّی صغیر اس کا نام محمد بن مروان ہے یہ بھی کوفہ کا باشندہ ہے۔ لیکن بلحاظ عمر پہلے سُدّی سے چھوٹا ہے اسی لیے سُدّی صغیر کہلاتا ہے

ابن عدی لکھتے ہیں اس کی حدیث تمام محدثین نے ترک کر دی ہے۔ بلکہ بعض محدثین نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے اور یہ مشہور کذاب کلبی رافضی کا شاگرد ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں اس کی روایات قطعاً نہ لکھی جاتے یحییٰ بن معین کہتے ہیں یہ ثقہ نہیں۔ امام احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ میں نے اسے اس کے بڑھاپے میں دیکھا

ہے۔ میں نے اس کی حدیث ترک کر دی ہے۔

عوام میں جو تفسیر تفسیر ابن عباسؓ کے نام سے مشہور ہے وہ کلبی کذاب سے اسی سُدی نے نقل کی ہے اس تفسیر میں آیت

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ　　آپ فرما دیجئے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے

کی تفسیر میں ان دونوں خبیثوں نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ فضل الٰہی سے مراد محمدؐ اور رحمت الٰہی سے مراد علیؓ ہیں۔

ابن عدی لکھتے ہیں اس کا ضعف اس کی روایات سے ظاہر ہے۔

حاصل کلام یہ کہ خواہ کوئی سا بھی سُدی ہو۔ ہر دو رافضی ہیں اور رافضی کی کوئی ایسی روایت کسی محدث کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں، جس سے اس کے مذہب کی تائید ہوتی ہو یا حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے فضائل میں روایت بیان کی جا رہی ہو۔

معنوی لحاظ سے بھی یہ امر غور طلب ہے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ تو بچے تھے۔ ان سے یہ بات کہنا کہ تم جس سے صلح کرو گے میں اس سے صلح کروں گا اور تم جس سے جنگ کرو گے۔ میں اس سے جنگ کروں گا بے معنی ہے۔ اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی کوئی بات فرمائی ہوتی تو تمام صحابہ حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کا ساتھ دیتے۔ لیکن صحابہ کرام کی اکثریت نے جب اس پر عمل نہیں کیا اور حضرت حسینؓ کا تو کسی نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔ ورنہ صحابہ کرام ہرگز بھی پیچھے نہ رہتے۔

اس روایت کا تیسرا راوی اسباط بن نصر ہے۔

اسباط بن نصر الھمدانی

اس سے بخاری کے علاوہ تمام محدثین نے روایات لی ہیں۔ یہ اسمٰعیل السُدی سے احادیث روایت کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ روایت سُدی کبیر سے مروی ہے۔ یحییٰ بن معین نے اس اسباط بن نصر کو ثقہ قرار دیا ہے۔ امام احمد نے اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا۔ لیکن ابونعیم اور نسائی کہتے ہیں ضعیف ہے۔

ابن عدی کہتے ہیں اس کی یہ روایت جو زیر بحث ہے منکر ہے اور اس کے علاوہ اسے کوئی اور روایت نہیں کرتا۔ میزان الاعتدال ج ۱ صـ۱۷۵۔

ضعف اس تجزیہ سے یہ امر ظاہر ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی مختلف فیہ، ایک مجہول اور دو رافضی ہیں گویا ایک روایت میں تین ضعف جمع ہیں۔

اس مضمون کی ایک روایت خطیب بغدادی، احمد اور حاکم نے ابو ہریرہؓ سے نقل کی ہے اور حاکم نے ابو ہریرہؓ کی روایت بیان کر کے کہا ہے کہ یہ روایت امام احمد بن حنبل نے تلید بن سلیمان سے نقل کی ہے۔ اور یہ روایت حسن ہے اور اس کا ایک اور شاہد زیدؓ بن ارقم کی روایت ہے۔ جس پر سطور بالا میں بحث کی گئی ہے

اس ابو ہریرہؓ کی روایت کو امام ابن الجوزی نے بیان کر کے لکھا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ اس لئے کہ تلید بن سلیمان رافضی ہے۔ حضرت عثمانؓ کو گالیاں دیتا تھا۔ امام احمد اور یحییٰ کہتے ہیں یہ کذاب تھا۔ العلل المتناہیہ فی احادیث الواہیہ ج ۱ صـ۲۶۸۔

تلید شیخ خلیل المیس مدیر ازہر لبنان نے العلل کے حاشیہ میں تہذیب کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ تلید ضعیف ہے۔ رافضی ہے اس کے سلسلہ میں امام احمد سے اختلاف مروی ہے۔ ایک بار فرمایا کہ اس میں کوئی برائی نہیں۔ لیکن دوسری بار فرمایا جھوٹ بولتا ہے۔ خود حاکم کا بیان ہے کہ ردی المذہب ہے، منکر الحدیث ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے اسے کذاب کہا ہے۔ شیخ خلیل لکھتے ہیں جب یہ راوی خود حاکم کے نزدیک کذاب ہے تو یہ روایت حسن کیسے بن گئی؟ العلل المتناہیہ ج ۱ صـ۲۶۸۔

امام ذہبی لکھتے ہیں۔ تلید بن سلیمان کوفہ کا باشندہ ہے۔ اس سے ترمذی نے روایات نقل کی ہیں۔ یہ لنگڑا تھا اور اس کے لنگڑا ہونے کی وجہ امام یحییٰ بن معین نے یہ بیان کی ہے کہ ایک بار یہ چھت پر چڑھا ہوا تھا اور وہیں سے حضرت عثمان علیہ السلام کو گالیاں دے رہا تھا۔ اتفاق سے حضرت عثمانؓ کے کسی غلام کی اولاد میں سے ایک شخص گزر رہا تھا۔ وہ یہ برداشت نہ کرسکا اور اس نے اس کے تیر مارا جس سے یہ نیچے گرا اور اس کے دونوں پاؤں ٹوٹ گئے۔

امام ابوداؤد فرماتے ہیں یہ رافضی تھا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر علیہم السلام کو گالیاں دیا کرتا تھا۔

اور ایک بار ابو داؤد نے یہ الفاظ کہے کہ یہ خبیث ہے۔ نسائی کا قول ہے ضعیف ہے یحییٰ بن معین کہتے ہیں کذاب ہے۔ حضرت عثمان علیہ السلام کو گالیاں دیتا تھا۔ میزان ج ۱ ص۳۵۸۔

امام ابن جوزی نے صرف تلید کے باعث اس روایت کو ناقابلِ اعتبار قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ تلید نے جس راوی سے یہ روایت نقل کی ہے یعنی ابو الجحاف وہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس کی بھی کسی روایت کو آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ابو الجحاف: اس کا نام داؤد بن ابی عوف ہے۔ ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے اس کی روایات نقل کی ہیں۔ یہ ابو حازم الاشجعی اور عکرمہ وغیرہ سے احادیث روایت کرتا ہے اس سے دونوں سفیان اور علی بن عابس وغیرہ احادیث روایت کرتے ہیں۔

امام احمد اور یحییٰ نے اسے ثقہ کہا ہے نسائی کہتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔ ابو حاتم کہتے ہیں اس کی روایت اچھی ہوتی ہے۔ لیکن

ابن عدی کا بیان ہے کہ میرے نزدیک یہ اس قابل نہیں کہ اس کی روایت کو حجت مانا جائے۔ کیونکہ شیعہ ہے اور اس کی عام روایات اہل بیت کی فضیلت میں ہوتی ہیں۔ اس نے یہ روایت بیان کی ہے "اے علی تجھے جس نے چھوڑا اس نے مجھے چھوڑا اور جس نے مجھے چھوڑا اس نے اللہ کو چھوڑا" اور یہ روایت منکر ہے۔

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ زیر بحث روایت تلید کی وضع کردہ ہے۔ اسی نے یہ آفت ڈھائی ہے۔ میزان الاعتدال ج ۱ ص۱۸۔

حاصل کلام یہ کہ مذکورہ روایت موضوع ہے اس کی دونوں سندات لغو اور نہ صرف ناقابلِ قبول بلکہ سبائی فیکٹری کی خود ساختہ ہیں۔

حضرت علی کیلئے مسجد میں جنابت کی اجازت

ابو سعیدؓ کا بیان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا۔ اے علیؓ کسی کے لئے یہ حلال نہیں کہ اس مسجد (یعنی مسجد نبوی) میں میرے اور تیرے علاوہ کوئی جنبی ہو ... علی بن المنذر کا بیان ہے میں نے ضرار بن صرد سے سوال کیا کہ اس حدیث کا مطلب کیا ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ میرے اور تیرے علاوہ حالت جنابت میں کسی کے لیے اس مسجد سے گزرنا حلال نہیں۔

ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ہمیں اس سند کے علاوہ اس کی کوئی اور سند معلوم نہیں محمد بن اسمٰعیل (بخاری) نے مجھ سے یہ حدیث سنی اور اسے غریب قرار دیا۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۳۷

غریب : اصطلاح حدیث میں ہر وہ روایت کہلاتی ہے جس کی سند میں کسی مقام پر صرف ایک تنہا راوی رہ گیا ہو اور اس کے علاوہ کوئی اور روایت نہ کرتا ہو۔ یعنی عرف عام میں غریب کو خبر واحد کہا جاتا ہے۔

اس روایت غریب کی تین قسمیں ہیں۔ صحیح، ضعیف اور حسن۔ امام ترمذی سے قبل خبر واحد کی صرف دو اقسام تھیں۔ خبر یا صحیح ہوگی یا ضعیف۔ لیکن یہ تیسری شق کہ روایت بین بین بھی ہوتی ہے کہ نہ صحیح ہو اور نہ ضعیف ہو بلکہ بین بین ہو یعنی نیم دروں اور نیم بروں۔

امام ترمذی کی اس تیسری قسم یعنی حسن سے متاخرین علماء نے بہت سے ناجائز فائدے اٹھائے ہیں بلکہ ہمارے علماء آج تک یہ بھی فیصلہ نہ کر سکے کہ امام ترمذی کے نزدیک حسن سے کیا مراد ہے، کبھی وہ غریب کو حسن کہتے ہیں اور کبھی صحیح کے ساتھ لفظ حسن لگا دیتے ہیں۔ الغرض یہ ایک معمہ ہے نہ سمجھنے کا اور نہ سمجھانے کا۔

" قوت المغتذی شرح ترمذی" میں ہے کہ یہ روایت ان روایات میں سے ہے جسے سراج الدین قزوینی

نے موضوع قرار دیا ہے۔ صلاح الدین علائی کا ارشاد ہے کہ ترمذی نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ روایت حسن ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ یہ روایت نہ صرف ضعیف بلکہ انتہائی درجہ کی ردی روایت ہے۔ کیونکہ سالم بن ابی حفصہ اور عطیۃ العوفی دونوں غالی قسم کے شیعہ ہیں۔ ہشیم، احمد اور علی بن المدینی نے عطیہ کو ضعیف قرار دیا ہے تو ایسی صورت میں ترمذی کا اس روایت کو حسن کہنا ایک انتہائی حیرت ناک امر ہے۔ بلکہ اس کا ایک راوی حرام بن صرو کذاب ہے۔

پھر یہ امر بھی انتہائی حیران کن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی معاملہ میں کسی کو حکم شریعت کی مخالفت کی اجازت دی ہو۔ یا خود شریعت کی مخالفت کی ہو۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک اتہام ہے (حاشیہ ترمذی۔ ماخوذ من قوت المغتذی شرح ترمذی ج ۲ صفحہ ۲۳۷۔ مطبوعہ قرآن محل۔

علامہ محمد طاہر بن علی الہندی المعروف بہ پٹنی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ یہ روایت موضوع ہے۔ ابن جوزی کا فیصلہ بھی یہی ہے:۔ تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۹۶۔

امام ابن الجوزی لکھتے ہیں یہ حدیث قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اس میں تو کئی آفتیں جمع ہیں۔ اول تو عطیہ کے ضعف پر تمام محدثین کا اجماع ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں۔ یہ کلبی کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ کلبی جب یہ کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو یہ لکھ لیتا اور اسے لوگوں سے یہ کہہ کر بیان کرتا کہ ابو سعید نے حدیث بیان کی لوگ ابو سعید خدری صحابی سمجھتے۔ حالانکہ اس نے کلبی کذاب کی کنیت ابو سعید رکھ چھوڑی تھی۔ ابن حبان کہتے ہیں اس کی حدیث کا لکھنا بھی حلال نہیں۔ بجز اس شکل کے کہ ایسی بے ہودہ روایت پر حیرت کا اظہار مقصود ہو رہا کثیر النواء۔ اسے رازی اور نسائی نے ضعیف کہا ہے۔ سعدی کا قول ہے یہ تو گمراہ ہے۔ اور ابن عدی کا بیان ہے کہ یہ انتہائی غالی قسم کا رافضی تھا۔ بلکہ اس معاملہ میں حد سے متجاوز تھا۔ الموضوعات ج ا صفحہ ۳۶۸۔

قوت المغتذی شرح ترمذی" میں سالم مولی ابی حفصہ اور عطیہ پر جرح کی گئی ہے۔ جب کہ ابن جوزی نے کثیر النواء اور عطیہ پر بحث کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عطیہ سے یہ کہانی نقل کرنے والے دو شخص ہیں۔ ایک سالم مولی ابی حفصہ اور ایک کثیر النواء۔ ترمذی نے سالم والی روایت نقل کی ہے اور ابن جوزی نے کثیر النواء والی۔ حالانکہ امام ترمذی نے یہ روایت جس سند سے نقل کی ہے۔ اس سند کے تمام راوی ما شاء اللہ چشم بددور

قسم کے ہیں۔ یعنی علی بن المنذر اور محمد بن فضیل ہر دو شیعہ ہیں۔ رہے سالم مولیٰ ابی حفصہ اور جناب عطیہ اور سب سے بڑھ کر حضرت جناب کلبی۔ یہ تو ایسے حضرات ہیں کہ جن کی نوازشوں سے زمین آسمان بھی لرزاٹھیں۔ ان کی بہت سی نوازشات کو ترمذی اور ابن ماجہ نے ہم تک پہنچایا ہے۔ یہ ترمذی اور ابن ماجہ کا کرم ہے کہ ہم ان جیسوں کی نوازشات سے فیض یاب ہوتے ورنہ بخاری و مسلم تو ہم بے چاروں کو ناواقف ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

ہم ان ارکان ثلثہ پر اپنی کتابوں میں متعدد جگہ تبصرہ کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں ان سب کا تفصیلی حال پیش کیے دیتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ کثیر النواء کا بھی۔ اس طرح یہ چار یار ہوئے۔ لیکن آئندہ ہم سے ان حضرات پر دوبارہ تبصرہ کی توقع نہ رکھیئے گا۔ ہاں ہماری جانب سے ایک اصول ضرور ذہن میں رکھیں۔

جب حدیث کی کسی کتاب میں یہ نظر آئے کہ فلاں حدیث عطیہ نے ابوسعید سے روایت کی ہے۔ تو ہرگز یقین نہ کریں کہ یہ حدیث ہے۔ بلکہ یہ یقین رکھیں کہ یہ کلبی کذاب رافضی کا جھوٹ ہے۔ خواہ ایسی روایت کہیں بھی پائی جائے۔ آئیے سب سے اول کثیر النواء کا زائچہ ملاحظہ کیجئے۔ بعد میں بقیہ ارکان ثلثہ پر بحث کریں گے

کثیر النواء ۱- امام بخاری لکھتے ہیں یہ بنو تیم اللہ خاندان کا غلام تھا۔ کوفی ہے۔ ضعیف ہے۔ الضعفاء الصغیر۔ صفحہ ۹۰۔

۲- ذہبی میزان میں لکھتے ہیں۔ کثیر کے باپ کا نام اسماعیل اور اس کی کنیت ابو اسماعیل ہے اور لقب نواء ہے۔ صرف ترمذی نے اس سے روایات لی ہیں۔ یہ عطیہ وغیرہ سے روایات نقل کرتا ہے۔ بہت کٹر قسم کا شیعہ ہے۔

ابو حاتم اور نسائی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں غالی قسم کا شیعہ تھا اور سعدی کہتے ہیں گمراہ ہے۔ میزان ج ۳ صفحہ ۴۰۲۔

اس کے بعد ذہبی نے اس کی دو مزید منکر روایات بیان کیں۔ جن میں سے ایک روایت ہم آئندہ صفحات میں پیش کریں گے۔

سالم بن ابی حفصہ العجلی الکوفی : اس کوفی کی روایات ترمذی میں پائی جاتی ہیں۔ یحیٰی بن معین کہتے ہیں ثقہ ہے۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ اس میں غلو تو بہت پایا جاتا تھا

لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ۔ فلاس کہتے ہیں ضعیف ہے ۔ بہت غالی شیعہ ہے ۔ نسائی کہتے ہیں یہ ثقہ نہیں ۔ محمد بن بشر العبدی کا بیان ہے کہ میں نے سالم بن ابی حفصہ کو دیکھا ہے ۔ اس کی داڑھی کافی طویل تھی ۔ بلکہ وہ اپنی داڑھی سے بھی زیادہ احمق تھا اور کہا کرتا تھا کہ میری تمنا تو یہ تھی کہ میں علی علیہ السلام کے ساتھ ہر حال میں شریک کار ہوتا (یعنی جمل و صفین میں)

جریر بن عبد الحمید کا بیان ہے کہ میں نے سالم بن ابی حفصہ کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا وہ کہہ رہا تھا لبیک مھلک بنی امیۃ (اے بنو امیہ کو ہلاک کرنے والے ۔ اللہ میں حاضر ہوں ۔ یہ سن کر داؤد بن علی عباسی نے اسے ایک ہزار دینار انعام میں دیے ۔

یہ داؤد بن علی خلیفہ منصور کا چچا اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا پوتا ہے ۔ عباسیوں کے ذہن ہوس خلافت میں اتنے ماؤف ہو چکے تھے کہ وہ ایسی لغو باتوں پر انعام تقسیم کر رہے ہیں ۔ اس قصہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بنو عباس نے کس طرح لوگوں میں دولت تقسیم کر کے بنو امیہ کے خلاف زہر پھیلایا ۔ ہمارے یہ تمام مورخین آخر بنو عباس کے دور کی پیداوار ہیں ۔ ان مورخین میں سے ایک مورخ بھی ایسا نہیں جو دور امویہ کی پیداوار ہو ۔ جس سے یہ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنو امیہ کے خلاف تاریخ میں جو کچھ بھرا ہوا ہے یہ سب یک طرفہ کارروائی ہے اور جس کا مقصود صرف اپنی جیبیں بھرنا یا سبائی مذہب کا پرچار کرنا تھا

امام سفیان بن عیینہ کا بیان ہے کہ عمر بن ذر نے ایک روز اس سالم بن ابی حفصہ سے کہا تو نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا ہے ۔ اس پر یہ بات اسے بہت شاق گزری ۔ کیونکہ وہ اس وقت پیدا بھی ہوا تھا ۔ حیرت سے کہنے لگا کہ کیا میں نے قتل کیا ہے ؟ عمر بن ذر نے جواب دیا ہاں ۔ جب تو ان کے قتل پر راضی ہے تو گویا تو نے ہی قتل کیا ہے ۔

حسین بن علی الجعفی کا بیان ہے کہ میں نے سالم بن ابی حفصہ کو دیکھا ہے جو انتہائی احمق تھا ۔ اس کی داڑھی بہت لمبی تھی اور وہ تلبیہ پڑھ رہا تھا ۔ لبیک قاتل نعثل ۔ لبیک مھلک بنی امیۃ ۔ اے نعثل کے قاتل میں حاضر ہوں ، اے بنو امیہ کے ہلاک کرنے والے میں حاضر ہوں ۔

نعثل : مدینہ کے ایک یہودی کا نام تھا ۔ جب یہودیوں اور ایرانیوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف

زہر اگلنا شروع کیا تو انہیں نعثل کا خطاب دیا۔ اور بعد میں سبائیوں میں حضرت عثمانؓ کو نعثل سے یاد کیا جانے لگا۔

امام علی بن المدینی کا بیان ہے کہ میں نے جریر بن عبد الحمید کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں نے سالم بن ابی حفصہ کی روایات ترک کر دی ہیں کیونکہ وہ شیعوں کی طرف سے لوگوں سے جھگڑتا تھا۔ اس کے بعد علی بن المدینی نے فرمایا اس شخص کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ جس کی روایات جریر نے ترک کر دی ہوں (کیونکہ جریر خود شیعہ تھا)

ابن عیسیٰ کا قول ہے کہ تیرا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو جریر جیسے شخص کے نزدیک غلو سے کام لیتا ہو۔ کیونکہ جریر میں خود تشیع پایا جاتا ہے۔

خلف بن حوشب کی رائے ہے کہ سالم بن ابی حفصہ ان لوگوں کا قائد تھا جو امام ابوبکرؓ اور امام عمرؓ کی تنقیص کیا کرتے تھے اور اس کا دستور یہ تھا کہ عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے ابتداً امام ابوبکرؓ اور امام عمرؓ کی فضیلت بیان کرتا اور پھر ان کی برائیاں بیان کرتا۔ میزان الاعتدال ج ۲ ص۱۱۱۔

عطیۃ بن سعد الکوفی : عبد الرحمان بن ابی حاتم لکھتے ہیں۔ اس کی کنیت ابو الحسن ہے۔ یہ ابو سعید خدریؓ ابو ہریرہؓ، ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے احادیث روایت کرتا ہے اس سے اعمش اور اسماعیل بن ابی خالد احادیث روایت کرتے ہیں۔ نیز عبد الرحمان لکھتے ہیں کہ مجھے عبد اللہ بن احمد نے یہ لکھ کر بھیجا ہے کہ ان کے والد امام احمد فرماتے تھے کہ یہ عطیہ ضعیف الحدیث ہے۔ یہ کلبی کے پاس جاتا اور اس سے تفسیر حاصل کیا کرتا تھا۔ سفیان ثوری اور ہشیم اس کی حدیث کو ضعیف کہا کرتے تھے۔

عبد الرحمان کہتے ہیں میں نے اپنے والد (یعنی امام ابو حاتم رازی) سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا یہ ضعیف الحدیث ہے۔ لیکن اس کی روایت (بغرض تحقیق) نوٹ کر لی جاسکتی ہے۔ اور ابو نضرہ مجھے عطیہ سے زیادہ پسند ہے۔

ابو زرعہ رازی سے اس عطیہ کے بارے میں دریافت کیا گیا فرمایا۔ کوفی ہے کمزور ہے۔ الجرح والتعدیل ج ۷ ص۳۸۳۔

امام بخاری لکھتے ہیں عطیۃ العوفی ضعیف ہے۔ الضعفاء الصغیر للبخاری ص ۹۲۔

امام ذہبی تحریر فرماتے ہیں۔ عطیہ بن سعد الکوفی مشہور تابعی ہے۔ ابو داؤد ترمذی اور ابن ماجہ نے اس کی روایات لی ہیں۔ یہ ضعیف ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں یہ اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کی روایت لکھی جائے۔ سالم المرادی کا قول ہے کہ عطیہ شیعہ تھا۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں اچھا آدمی ہے۔ لیکن ہشیم کو اس پر اعتراض تھا۔ ابن المدینی نے یحییٰ بن سعید سے نقل کیا ہے کہ میرے نزدیک عطیہ، ابو ہارون عبدی اور بشر بن حرب یکساں ضعیف ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں یہ کلبی کے پاس جاتا تھا۔ اس سے تفسیر حاصل کرتا تھا اور اس کلبی کی کنیت اس نے ابوسعید رکھ رکھی تھی۔ جب بھی وہ کسی روایت میں یہ کہتا کہ ابوسعید نے یہ فرمایا۔ اس سے مراد کلبی کذاب ہوتا ہے۔ میزان ج ۳ ص ۸۰۔

یعنی اس روایت کی سند میں چار راوی ہیں، علی بن المنذر، محمد بن فضیل۔ سالم اور عطیہ اور چاروں سبائی بزرگ ہیں اور پھر یہ روایت ابوسعید کی جانب منسوب کی گئی ہے اور ابوسعید سے مراد حضرت ابوسعید خدری نہیں بلکہ جناب کلبی کذاب ہیں، گویا ایں خانہ ہمہ سیاہ است۔ اس کے باوجود اس روایت کو ترمذی نے حسن کہا ہے اور یہ روایت چونکہ ترمذی میں پائی جاتی ہے اور اسے ہمارے بزرگوں نے صحاح میں داخل کیا ہے۔ لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ہم آنکھیں بند کر کے اس پر ایمان لائیں۔ اور چونکہ ہم نے پردہ چاک کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم مجرم ہیں آئیے اب جناب ابو سعید صاحب یعنی کلبی کذاب کا حال بھی سن لیجئے۔

یہ کلبی کی نسبت سے مشہور ہے، متروک ہے۔ الضعفاء والمتروکین للدارقطنی ص ۱۵۱۔

محمد بن السائب: نسائی کہتے ہیں متروک الحدیث ہے کوفی ہے۔ الضعفاء والمتروکین للنسائی ص ۹۱

بخاری لکھتے ہیں۔ اس کی کنیت ابوالنضر ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان نے اس کی روایت ترک کی ہے سفیان ثوری کا بیان ہے کہ ایک بار مجھ سے کلبی نے یہ بیان کیا کہ ابوصالح نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے تجھ سے جتنی بھی روایات بیان کی ہیں سب جھوٹ ہیں۔ محمد بن اسحاق جب یہ کہتا ہے کہ یہ روایت ابوالنضر نے بیان کی تو اس کی مراد یہی کلبی کذاب ہوتا ہے، الضعفاء الصغیر ص ۱۰۱۔

قربان جائیے اس ادا کے کہ کلبی نے ابو صالح کے واسطہ سے ابن عباسؓ سے پوری تفسیر نقل کر ڈالی۔ اور یہ بھی بیان کر دیا کہ یہ سب ابو صالح کا جھوٹ ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ یہ بھی ایک جھوٹ ہے۔ کلبی نے تو اس ابو صالح کو راہ چلتے دیکھا تھا تب بھی پوری تفسیر لکھ ماری۔ خیر یہ فیصلہ قارئین خود کریں گے کہ کون جھوٹا ہے ہمارے نزدیک تو اس روایت میں سبھی جھوٹے جمع ہیں۔

امام ذہبی تحریر فرماتے ہیں۔

محمد بن السائب الکلبی۔ اس کی کنیت ابو النضر ہے، کوفہ کا باشندہ ہے۔ مفسر ہے۔ مؤرخ ہے اور ماہر نسب ہے۔ اس کی روایات ترمذی میں پائی جاتی ہیں۔

سفیان ثوری کہتے ہیں اس کلبی کا بیان تھا کہ مجھ سے ابو صالح نے کہا تھا۔ تو نے مجھ سے ابن عباسؓ کی جتنی روایات سنی ہیں کسی سے بیان نہ کرنا (لیکن اس کمبخت نے امامت کا تمام راز فاش کر دیا)

ابو معاویۃ الضریر کا بیان ہے کہ میں نے کلبی کو یہ کہتے سنا کہ میں نے جتنی جلدی قرآن حفظ کیا تھا۔ اتنی جلدی کسی نے نہیں کیا تھا یعنی چھ یا سات دن میں۔ اور جتنی بھول مجھے واقع ہوئی اتنی بھول کسی کو واقع نہ ہوئی ہوگی۔ میں نے اپنی داڑھی مٹھی میں اس غرض سے پکڑی کہ اسے نیچے سے کاٹوں گا اور غلطی سے اوپر سے کاٹ بیٹھا۔

یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ کلبی نے مجھ سے کہا تھا۔ میں نے جو کچھ بھی یاد کیا۔ میں اسے بھول گیا۔ ایک بار مٹھی میں داڑھی پکڑی اور حجام سے یہ کہنے کا ارادہ کیا کہ نیچے سے کاٹ دے۔ لیکن غلطی سے اوپر سے کاٹنے کا حکم دے دیا۔ یعنی ایک دفعہ خود کاٹی اور ایک دفعہ حجام سے کٹوائی۔

یعلی بن عبید کہتے ہیں کہ امام سفیان ثوری نے فرمایا اس کلبی کی روایتوں سے بچو۔ کسی نے ان سے کہا کہ آپ تو خود اس کی روایات نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا میں تو اس کے سچ اور جھوٹ کو پہچانتا ہوں۔

امام بخاری فرماتے ہیں اس ابو النضر الکلبی کی روایات کو یحییٰ بن سعید القطان اور عبد الرحمان بن مہدی نے قبول کرنا چھوڑ دیا تھا۔ امام بخاری نے سفیان سے نقل کیا ہے کہ کلبی نے خود مجھ سے کہا تھا کہ میں نے ابو صالح کی جتنی روایات بیان کی ہیں وہ سب جھوٹ ہیں (حالانکہ تفسیر ابن عباسؓ میں تمام روایات اسی سے مروی

ہیں۔ لہٰذا تفسیر ابن عباسؓ تو خالص جھوٹ ہے)

یحییٰ بن لیلی نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ میں کلبی کے پاس جاتا اور اس سے قرآن پڑھتا۔ ایک دفعہ میں نے اسے یہ کہتے سنا کہ میں ایک بار بیمار ہوا اور اس بیماری میں مجھے جو کچھ یاد تھا سب بھول گیا۔ میں آل محمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے میرے منہ میں تھوک دیا۔ جس سے سب کچھ بھولا ہوا یاد آگیا۔ لیلی کا بیان ہے کہ یہ سننے کے بعد میں نے قسم کھائی کہ میں آئندہ اس کی کوئی روایت نقل نہیں کروں گا۔ لہٰذا میں نے اس کی روایات نقل کرنی چھوڑ دیں۔

یزید بن زریع کا قول ہے کہ کلبی سبائی تھا اور اعمش کہا کرتے تھے کہ اس سبائی سے بچو۔ کیونکہ میں نے جتنے لوگوں کو دیکھا ہے وہ سب ان سبائیوں کو کذاب کہا کرتے تھے۔

ابن حبان کا بیان ہے کہ کلبی سبائی تھا اور ان لوگوں میں سے تھا کہ جو یہ کہا کرتے تھے کہ حضرت علیؓ کی موت واقع نہیں ہوئی۔ وہ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور اسے ظلم وجور سے صاف کر کے عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ یہ طبقہ جب کوئی بادل دیکھتا تو کہتا اس بادل میں امیرالمومنین تشریف لے جا رہے ہیں۔

ابوعوانہ کا بیان ہے کہ جبرئیل جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آتے اور آپ بیت الخلا چلے جاتے تو جبرئیل علیؓ پر وحی اتار کر چلے جاتے۔

احمد بن زہیر کا قول ہے کہ میں نے امام احمد سے دریافت کیا کہ کیا کلبی کی تفسیر (یعنی تفسیر ابن عباسؓ) دیکھنا حلال ہے۔ انہوں نے فرمایا نہیں۔

یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ کلبی ثقہ نہیں ہے۔ جوزجانی وغیرہ کہتے ہیں یہ کذاب ہے۔ دارقطنی اور ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ متروک ہے۔

ابن حبان کہتے ہیں کہ دین کے معاملہ میں تو اس کا مذہب ظاہر ہے اور اس کا جھوٹ بھی اظہر من الشمس ہے کہ جس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ یہ ابوصالح کے ذریعہ ابن عباسؓ سے تفسیر نقل کرتا ہے۔ حالانکہ ابوصالح نے ابن عباسؓ کو دیکھا تک نہیں اور کلبی نے ابوصالح سے ایک دو ہی باتیں سنی تھیں۔ لہٰذا اس کلبی کو جب بھی جھوٹ بولنا ہوتا ہے تو اس ابوصالح کو زمین کی تہ سے نکال لاتا ہے۔ کتابوں میں اس کلبی کی روایات کا ذکر بھی حلال

نہیں گیا کہ اس کی روایت کو بطور دلیل پیش کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ میزان ج ۲ صفحہ ۵۵۶۔

لیکن حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ شاید ہی کوئی تفسیر ایسی ہو۔ جس میں اس کی بکواسات کو بطور دلیل پیش نہ کیا گیا ہو۔

زیر بحث روایت میں ترمذی نے علی بن المنذر کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ میں نے ضرار بن صرد سے حدیث کے معنی دریافت کیے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی مختصر سا ذاتیچہ پیش کر دیا جائے تاکہ پنج تن ناپاک پورے ہو جائیں۔

ضرار بن صرد : دارقطنی لکھتے ہیں ضرار بن صرد کوفی متروک ہے۔ الضعفاء والمتروکین لدارقطنی صفحہ ۱۰۹ اس کی کنیت ابو نعیم ہے متروک الحدیث ہے۔ الضعفاء والمتروکین للنسائی صفحہ ۵۶ بخاری کہتے ہیں متروک ہے۔ نسائی کہتے ہیں ثقہ نہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے
امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کوفہ میں نمبر ایک کے دو جھوٹے ہیں۔ ایک ضرار بن صرد اور ایک ابو نعیم النخعی۔ میزان ج ۲ صفحہ ۳۲۷۔

اس طرح ایک روایت میں پنج تن ناپاک جمع ہو گئے۔ پھر بھی ہم اس پر اس لیے ایمان رکھتے ہیں کہ یہ ترمذی شریف میں پائی جاتی ہے۔ ہم نے خود ایک مولوی صاحب کو جمعہ کی تقریر کے دوران یہ کہتے سنا کہ فلاں روایت موضوعات شریف میں پائی جاتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ امام ترمذی ایسی منکر اور موضوع روایات کو بھی حسن کہہ دیتے ہیں، گویا یہ لفظ حسن لکڑ ہضم اور پتھر ہضم قسم کا کوئی چورن ہے اور یہ چورن کھلا کر امام ترمذی پتھر بھی ہمیں ہضم کرانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے محدثین کہتے ہیں لا تغتر بتحسین الترمذی۔ ترمذی جب کسی حدیث کو حسن کہیں تو ہرگز دھوکا نہ کھانا۔ اسی لئے ہم نے قارئین کے سامنے پوری تفصیل پیش کی ہے تاکہ ہمارے قارئین اسے پڑھنے کے بعد آئندہ چند اصول ہر وقت پیش نظر رکھیں۔

۱۔ تفسیر ابن عباسؓ جھوٹ کا ایک پلندہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے بہتر ہے کہ انسان کوئی فلم دیکھ لے کیونکہ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ وہ کم از کم غلط عقیدوں سے محفوظ رہے گا اور اس کے دماغ میں جھوٹ نہیں بھرے گا۔

۲۔ جب عطیہ ابوسعیدؓ سے کوئی روایت نقل کرے تو وہ روایت اس کلبی کذاب کا جھوٹ ہوتی ہے۔ خواہ وہ ترمذی میں ہو یا کسی اور کتاب میں۔ مثلاً فضائل وغیرہ میں۔

۳۔ ترمذی جب کسی حدیث کو حسن کہیں ہرگز دھوکا نہ کھانا۔

۴۔ فضائل کی روایات پر پہلے ائمہ نے عام طور پر درگزر سے کام لیا ہے۔ جس نے اب پوری امت کے عقائد کو تہ وبالا کر کے رکھ دیے ہیں۔ ان پر روایت درایت کے لحاظ سے تحقیق کی ضرورت ہے۔ ان پر آنکھیں بند کر کے ایمان نہیں لایا جا سکتا۔ پھر یہ فضائل خواہ کسی قسم کے بھی ہوں۔ یعنی ان کا تعلق شخصیات سے ہو یا اعمال سے سب تحقیق طلب ہیں۔ لہٰذا قارئین ایسی روایات پر کلی اعتماد نہ فرمائیں۔

میرے چودہ رفیق ہیں

ترمذی نے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ہر نبی کے سات منتخب رفیق ہوتے ہیں اور میرے چودہ رفیق ہیں۔ ہم نے عرض کیا وہ کون سے۔ جواب دیا (حضرت علیؓ) میں، میرے دونوں بیٹے۔ جعفرؓ، حمزہؓ، ابوبکر، عمرؓ، مصعب بن عمیرؓ، بلالؓ۔ سلمانؓ، عمارؓ۔ مقدادؓ، حذیفہؓ اور عبد اللہ بن مسعود۔

ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث اس سند سے حسن غریب ہے اور یہ حدیث حضرت علیؓ سے موقوفاً بھی روایت کی گئی ہے۔ ترمذی ج ۲ صد ۲۴۳۔

یعنی ایک روایت یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں بلکہ حضرت علیؓ کا قول ہے۔
اور امام محمد بن سیرین کا فرمان ہے کہ

کل ما یروی عن علی فھو باطل — حضرت علیؓ سے جو کچھ بھی نقل کیا جاتا ہے وہ سب باطل ہے۔

محمد بن سیرین کا یہ قول ذہبی نے میزان میں اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور اس پر تمام محدثین متفق ہیں کہ حضرت علیؓ کے سب ساتھی جھوٹے ہیں۔ لہٰذا حضرت علیؓ کی صرف وہ روایات قبول کی جائیں گی جو ان سے صحابہ روایت کریں۔ یا عبد اللہ بن مسعود کے شاگرد۔ بقیہ تو سبائیوں کا جھوٹ ہوتا ہے۔ گویا کسی روایت میں

حضرت علیؓ کا نام آنا ایک خطرہ کی گھنٹی ہے کہ ہوشیار ہو جاؤ کہ اس کے پس پردہ کسی سبائی کا ذہن تو کارفرما نہیں ہے۔

یہ منطق بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ عشرہ مبشرہ میں سے صرف تین حضرات کا ذکر کیا گیا ہے یعنی حضرت علیؓ جن کا شمار سب سے اوّل ہے اور ابوبکرؓ و عمرؓ۔ بقیہ سات عشرہ مبشرہ کا اس روایت میں کوئی ذکر نہیں بلکہ دیگر افراد کو ان سات حضرات پر فضیلت دی گئی جو تمام احادیث صحیحہ اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ سب سے افضل عشرہ مبشرہ ہیں۔

دوسرا ظلم یہ ڈھایا گیا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے پہلے حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت حمزہؓ کا ذکر کیا گیا۔

تیسرا ظلم یہ کیا گیا کہ آپؐ کے بقیہ دو دامادوں کا کوئی ذکر نہیں۔

یہ امور اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس کے پس پردہ سبائی ذہنیت کارفرما ہے اور ان احمقوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ نواسے نانا کی آنکھوں کا تارا تو ضرور ہوتے ہیں لیکن رفیق ہرگز نہیں ہوتے اور پانچ سات سال کی عمر کے بچے رفیق ہرگز نہیں بنتے۔ حالانکہ ہم حصہ اوّل میں ثابت کر چکے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت حسنؓ کی عمر تین سال اور حضرت حسینؓ کی عمر دو سال تھی۔

ہمارے نزدیک اس روایت میں ایک بہت بڑی سیاست کارفرما ہے اس لیے کہ ابتدائی دور کے بہت سے شیعہ حضرات ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کو بُرا تصوّر نہ کرتے تھے۔ ان رفقاء میں ابوبکرؓ و عمرؓ کا نام اسی لیے لیا گیا تاکہ وہ لوگ بھی ناراض نہ ہوں اور اہل سنت بھی یہ گولی آرام سے نگل لیں۔

دوسری جانب خارجی حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ وغیرہ کو رافضیوں کی طرح کافر سمجھتے تھے لیکن ابوبکرؓ و عمرؓ پر ان کا ایمان تھا۔ اس لئے ہر دو حضرات کا تذکرہ لازمی تھا۔ ورنہ اس کہانی کا مصنف چکی کے دو پاٹوں میں پھنس جاتا۔ لہٰذا بچاؤ کی راہ یہ تلاش کی گئی کہ بقیہ عشرہ مبشرہ کا ذکر نہ کیا جائے۔

اس کا واحد راوی کثیر النوا ہے جس سے ترمذی کے علاوہ کسی نے روایت نہیں لی اور ہم نے اوپر اس کا حال لکھنے کے بعد عرض کیا تھا کہ ہم اس کی ایک کہانی اور پیش کریں گے وہ کہانی یہی ہے۔

یہ کثیر کبھی تو اس روایت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بیان کرتا ہے، کبھی حضرت علی کا قول بتاتا ہے کبھی کہتا ہے میں نے یہ روایت ابوادریس سے لی ہے اور وہ مجہول ہے اور کبھی عبداللہ بن ملیل کا نام لیتا ہے الغرض اس روایت کا تمام تر دارو مدار کثیر النوا پر ہے۔ امام ابن الجوزی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں۔

اس روایت کا تمام تر دارو مدار کثیر النواء پر ہے۔ نسائی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ غالی قسم کا شیعہ ہے۔ بلکہ تشیع میں حد سے بڑھا ہوا تھا۔ العلل المتناہیہ فی احادیث الواہیہ ج ۱ صہ ۲۸۲ یسعدی کہتے ہیں گمراہ ہے۔ میزان ج ۳ صہ ۴۰۲۔

جہاں تک عبداللہ بن ملیل کا تعلق ہے۔ تو بخاری اور ابن ابی حاتم کے علاوہ اس کا کسی نے تذکرہ تک نہیں کیا۔ بخاری تاریخ الکبیر میں لکھتے ہیں۔ اس نے حضرت علیؓ سے روایت نقل کی ہے۔ لیکن یہ کثیر کا دعویٰ ہے، جو خود رافضی ہے۔ اس کے علاوہ اس عبداللہ بن ملیل کا کچھ حال معلوم نہیں۔ بس اتنا اتا پتا معلوم ہے کہ یہ کوفہ کی پیداوار ہے۔

ابن جوزی لکھتے ہیں اس روایت کو سالم بن ابی حفصہ نے عبداللہ بن ملیل سے نقل کیا ہے۔ لیکن یہ سب تیار کرنے والا ابزاری ہے اور ہم بار ہا بیان کر چکے ہیں کہ وہ کذاب ہے اور اپنے ہاتھوں روایت تیار کرنے کا ماہر ہے۔ العلل المتناہیہ ج ۱ صہ ۲۸۲۔

اس سند میں ابزاری کے علاوہ سالم بن ابی حفصہ جیسا راوی موجود ہے۔ جس کا تفصیلی حال ہم اوپر بیان کر چکے ہیں رہ گئے جناب ابزاری۔ ان کا چہرہ مہرہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

اس کا نام حسن بن عبداللہ ہے۔ علامہ طاہر پٹنی لکھتے ہیں حسن بن عبداللہ الابزاری احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ تذکرۃ الموضوعات صہ ۲۳۹۔

ذہبی لکھتے ہیں۔ حسن بن عبداللہ الابزاری ایک بے حیا اور کذاب شخص ہے۔ اس سے صرف خلدی نے حدیث روایت کی ہے۔ لیکن اصل میں اس کا نام حسن نہیں، بلکہ حسین ہے۔ میزان ج ۱ صہ ۵۰۲۔

دوسرے مقام پر ذہبی لکھتے ہیں کہ حسین بن عبیداللہ بن الخطیب الابزاری بغداد کا باشندہ ہے۔

• ۲۹۵ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ احمد بن کامل کا بیان ہے کہ کذاب ہے۔ اسی نے یہ روایت وضع کی ہے کہ حضرت فاطمہؓ جنت کی کھجوروں کی تاثیر سے پیدا ہوئیں اور حضور اکثر ان کا پیار لیتے۔ میزان ج ۱ ص ۵۴۱۔ اس روایت پر بحث کسی اور جگہ کی گئی ہے

غور طلب ہے کہ:-

رستم تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا۔ یہ عالت (جنگ) دیکھ کر تخت سے کود پڑا اور دیر تک مردانہ وار لڑتا رہا۔ جب زخموں سے بالکل چور ہو گیا تو بھاگ پڑا۔ ہلال نامی ایک سپاہی نے تعاقب کیا۔ اتفاق سے ایک نہر سامنے آ گئی۔ رستم کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے ساتھ ہی ہلال بھی کود پڑے اور ٹانگیں پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ پھر تلوار سے کام تمام کر دیا۔

ہلال نے لاش خچروں کے پاؤں میں ڈال دی اور چڑھ کر پکارے کہ میں نے رستم کا خاتمہ کر دیا۔ ایرانیوں نے دیکھا تو تخت سپہ سالار سے خالی تھا۔ تمام فوج میں بھاگڑ مچ گئی مسلمانوں نے دور تک تعاقب کیا اور ہزاروں لاشیں میدان میں بچھا دیں۔ الفاروق شبلی ص ۱۶۵۔

جنگ قادسیہ کا یہ واقعہ محرم ۱۴ھ میں پیش آیا۔ لیکن ....

اے سُنّی بھائیو۔ سوچو اور غور کرو کہ کہیں غم حسینؓ کے نام سے غم رستم تو نہیں منایا جا رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ رستم کا قصاص حضورؐ کے نواسے سے لیا گیا ہو۔ کیونکہ کربلا قادسیہ کے قریب ایک منزل پر واقع ہے۔

ذرا یہ بھی سوچیئے کہ خیبر کا علاقہ محرم ۷ھ میں فتح ہوا۔ کہیں ابن سبا کی روحانی اولاد اس واقعہ کا تو غم نہیں مناتی؟

حضور کی نجاست کو زمین نگل لیتی ہے

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی حاجت ضروریہ کے لیے بیت الخلا جاتے تو میں فوراً آپ کے بعد جاتی تو وہاں کچھ بھی نظر نہ آتا۔ میں نے حضور سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ ہمارے اجسام اہل جنت کی ارواح پر بنائے گئی ہیں۔ ہمارے جسم سے جو نجاست خارج ہوتی ہے۔ اسے زمین نگل لیتی ہے۔

ایک اور روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب مرحمت فرمایا کہ اللہ نے زمین کو حکم دے رکھا ہے کہ انبیاء کے جسم سے جو کچھ خارج ہو اسے نگل لے۔

ابن الجوزی کہتے ہیں۔ یہ روایت صحیح نہیں۔ اس کی پہلی سند میں حسین بن علوان ہے۔

حسین بن علوان امام احمد اور امام یحیٰی کہتے ہیں کذاب ہے۔ نسائی۔ دار قطنی اور ابو حاتم کہتے ہیں متروک الحدیث ہے۔ اور ابن عدی کہتے ہیں۔ یہ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔

دوسری سند کے بارے میں دار قطنی لکھتے ہیں۔ اس روایت کو محمد بن حسان کے علاوہ کوئی نقل نہیں کرتا۔ اور وہ کذاب ہے۔ العلل المتناہیہ فی احادیث الواہیہ ج ا ص ۱۸۸

امام ذہبی میزان میں تحریر فرماتے ہیں کہ حسین بن علوان الکلبی ہشام سے روایات نقل کرتا ہے۔ یحیٰی کہتے ہیں کذاب ہے۔ علی بن المدینی کہتے ہیں۔ انتہائی ضعیف ہے۔ ابو حاتم۔ نسائی اور دار قطنی کہتے ہیں۔ متروک الحدیث ہے۔ اور ابن حبان کا کہنا ہے کہ یہ ہشام وغیرہ کے نام سے جھوٹی روایات وضع کرتا تھا۔ اس کی روایات کا تو لکھنا بھی حلال نہیں۔ الا یہ کہ اس پر

حیرت کا اظہار کرنا مقصود ہو (یعنی کیسے کیسے احمق لوگوں سے دنیا بھری ہوئی ہے) ابن عدی نے اس کی متعدد منکرات پیش کی ہیں۔ جس میں سے ایک کہانی یہ بھی ہے۔ میزان ج ۴ ص ۵۴۳

یہ تو محدثین کرام کا کام ہے کہ تعددا یاتی طور پر جرح کریں۔ ہم تو صرف معمولی سی باتیں جانتے ہیں۔

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں گھروں میں بیت الخلا ہی نہ تھے۔ حضرت عائشہ رض اس تانک جھانک کے لیے کہاں تشریف لے جاتیں۔

۲۔ اس قسم کی خرافات حضرت عائشہ رض کی ہی طرف کیوں منسوب ہوتی ہیں۔

۳۔ اور کیا وجہ کہ ایسی سب کہانیاں ہشام سے منقول ہوتی ہیں۔ اور ان سے یہ سب کہانیاں نقل کرنے والے اہل عراق ہوتے ہیں۔ اہل مدینہ یہ کہانیاں نقل نہیں کرتے جب کہ ہشام مدینہ ہی کے باشندے ہیں۔ اور امام مالک نے ان سے روایات لی ہیں۔ لیکن ان خرافات سے ان کا دامن پاک ہے۔

ہر روز دریائے فرات میں جنت کی برکات نازل ہوتی ہیں

حضرت عبداللہ رض بن مسعود سے روایت کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کوئی روز ایسا نہیں گزرتا کہ جب جنت کی برکتوں کے ڈھیر دریائے فرات میں نازل نہ ہوتے ہوں۔

اور آج کل تو جب سے خمینی صاحب ولایت فقیہ کے ایک نئے عہدے پر سرفراز ہوئے، ان برکات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ عراق کی بمباری کے ذریعہ اس میں روز بروز اضافہ فرما رہا ہے۔

ابن الجوزی کہتے ہیں یہ حدیث صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کا ایک راوی ربیع بن بدر ہے۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں، یہ کچھ نہیں۔ نسائی کہتے ہیں متروک الحدیث ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ یہ روایات میں تبدیلیاں کر کے ان ثقہ راویوں کی جانب منسوب کرتا۔ اور ضعیف راویوں سے موضوع روایات نقل کرتا ہے۔ العلل المتناہیہ فی احادیث الواہیہ ج ۱ ص ۳۰

امام ذہبی نے یحییٰ بن معین اور نسائی کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔ ابو داؤد کہتے ہیں یہ ضعیف ہے۔ اور ابن عدی فرماتے ہیں اس کی عام روایات ایسی ہوتی ہیں جنھیں کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا۔ میزان ج ۲ ص ۳۹ ۔ ابن عدی نے اس روایت کو ربیع بن بدر کی منکرات میں داخل کیا۔

امام بخاری "کتاب الضعفاء الصغیر" میں فرماتے ہیں۔ اس ربیع بن بدر کو علیلۃ السعدی التیمی بھی کہا جاتا ہے۔ اسے قتیبہ نے ضعیف کہا ہے۔ الضعفاء الصغیر بخاری ص ۴۵

امام نسائی لکھتے ہیں اسے علیلۃ بن بدر بھی کہتے ہیں۔ یہ بصری ہے اور متروک الحدیث ہے الضعفاء الصغیر للنسائی ص ۴۱ ۔

ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے والد امام ابو حاتم رازی سے سنا۔ وہ فرماتے تھے۔ یہ ربیع بن بدر اس لائق نہیں کہ اس کی روایت میں مشغولیت اختیار کی جائے۔ یہ ضعیف الحدیث اس کی حدیث ردی ہوتی ہے۔ الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۴۵۵ ۔

اس لیے ہم بھی بہتر یہی سمجھتے ہیں کہ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ ویسے بھی کربلا کے اردگرد کا علاقہ ایک مخصوص طبقہ کے نزدیک متبرک ہے۔ اور ان برکات مجوسیہ میں سے ایک یہ بھی برکت تھی جو ہم قارئین کے سامنے پیش کر کے گنہگار بنے ہیں۔

سورۃ واقعہ پڑھنے سے فاقہ نہیں آتا

ابوطبیہ نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے نقل فرمایا ہے کہ جو شخص ہر رات کو سورۃ واقعہ پڑھے گا۔ اسے کبھی فاقہ نہیں پہنچے گا۔

اس حدیث یا روایت کو بیہقی نے "شعب" میں اور دار قطنی، ابویعلی، اور ثعلبی۔ ابن عساکر، ابوعبید اور حارث بن اسامہ نے نقل کیا ہے۔

یہ ایک مشہور عام روایت ہے۔ اور ہم بھی شروع جوانی میں اس کا ورد کرتے رہے۔ بلکہ متعدد علماء نے اس کے پڑھنے کے مختلف طریقے بیان کیے ہیں اور ہم نے تقریباً ہر ایک پر عمل کرکے دیکھا۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں یہ حدیث منکر ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں میں نہیں جانتا یہ شجاع اور سری کون ہیں۔ العلل المتناہیہ ج ۱ ص ۱۱۳

بات کچھ یوں ہے کہ یہ داستان حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے نقل کرنے والا ابوطبیہ ہے۔۔۔ کوئی اسے ابوظبیہ کہتا ہے۔ کوئی ابوطیبۃ الجرجانی۔ خواہ یہ کوئی بھی ہو۔ لیکن محدثین لکھتے ہیں ہم اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں۔ ہاں بعض راویوں نے اسے جرجانی بیان کیا ہے۔ گویا یہ بھی کوئی ایرانی پرندہ تھا جو اپنی بولی بول کر اڑ گیا۔

اس ابوطبیہ سے یہ کہانی نقل کرنے والا ایک شخص شجاع نامی ہے۔ کوئی اسے ابوشجاع کہتا ہے۔ لیکن ماہرین رجال کا کہنا ہے کہ ہمیں شجاع، یا ابوشجاع نامی کسی مخلوق کا پتہ نہیں چل سکا۔ ان شجاع صاحب کے گرگے ہیں سری بن یحیی۔ یہ بھی مفقود الخبر ہیں

غالباً اب آپ امام احمد کے قول کا مفہوم سمجھ گئے ہوں گے۔

علامہ ناصرالدین البانی رقمطراز ہیں۔

اس روایت کو حارث بن ابی اسامہ نے اپنی مسند صـ ۱۷۸ پر، ابن السنی نے عمل الیوم و اللیلہ صـ ۲۷۴ پر اور بیہقی نے " شعب " میں نقل کیا ہے۔ اور دو ایک محدثین نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ لیکن سب نے اسے ابوشجاع نامی شخص سے نقل کیا ہے۔ اور اس نے ابو طیبہ سے اور اس نے ابن مسعود رضؓ سے۔

تو یہ سند تو ضعیف ہے۔ ذہبی لکھتے ہیں۔ ابوشجاع مجہول ہے۔ اسے کوئی نہیں جانتا۔ یہ ابو طیبہ سے نقل کر رہا ہے یہ کون ہے؟ ۔ اس کا اتہ پتہ موجودہ عاملین وظیفہ خواں بتا دیں۔ یہ دونوں نامعلوم شخص اسے ابن مسعود رضؓ سے مرفوعاً نقل کر رہے ہیں۔ گویا امام ذہبی یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ دونوں مجہول ہیں۔

البانی لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے " لسان " میں وضاحت کی ہے کہ اس روایت میں تین اضطراب ہیں۔

حافظ زیلعی حنفی لکھتے ہیں۔ اس روایت میں کئی امراض پائے جاتے ہیں۔

۱ ۔ منقطع ہے۔ درمیان سے راوی چھوٹا ہوا ہے جیسا کہ دارقطنی شافعی نے اس کی وضاحت کی ہے۔

۲ ۔ اس کا مضمون بھی منکر ہے۔ جیسا کہ امام احمد نے بیان کیا ہے۔

۳۔ اس کے راوی بھی ضعیف ہیں۔

۴۔ اس کی سند مضطرب ہے۔

اس روایت کے ناقابل اعتبار ہونے پر امام احمد، امام ابو حاتم رازی۔ ان کے صاحبزادے ابن ابی حاتم۔ دارقطنی اور بیہقی کا اجماع ہے۔ (اس میں ذہبی اور ابن جوزی بھی داخل ہیں) السلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ ج ۱ صـ ۳۰۴ ۔

سطور بالا میں امام احمد کا قول نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ سری اور شجاع کون ہیں؟ اور جب اس دور کے حضرات اس نامعلوم مخلوق سے واقف نہ تھے تو ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کا حل تو وہی حضرات تلاش کر سکتے ہیں جو اس قسم کے عملیات پڑھتے رہتے ہیں۔ ان حضرات کو شاید کشف قبور یا ان کے غیب داں جنات کے ذریعہ کچھ اطلاع مل جائے۔

خون پینے کا ثواب

حضرت سفینہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پچھنے لگوائیں۔ پھر اپنا خون مجھے عطا کیا اور فرمایا جا لیجا اور اسے مٹی میں چھپا دے۔ میں وہ خون لے کر گیا اور مٹی میں دبانے کے بجائے اسے میں نے خود پی لیا۔ جب میں واپس حاضر خدمت ہوا۔ تو آپ نے سوال فرمایا کہ اس خون کا کیا کیا؟ میں نے جواب دیا کہ اسے چھپا دیا یا پی لیا۔ آپ نے فرمایا تو نے خود کو آگ سے محفوظ کر لیا۔

ابن جوزی کہتے ہیں یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس کا راوی ابراہیم بن عمر ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں اس روایت کو حجت میں پیش کرنا حلال نہیں۔ ابن حبانؒ نے ایک روایت ابن عباسؓ سے ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

"قریش کے کسی لڑکے نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھنے لگائیں۔ اور فراغت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خون لے کر دیوار کے پیچھے چلا گیا۔ اول اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کوئی دیکھنے والا نہیں تو وہ خون پی گیا۔ پھر وہ واپس آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر نظر پڑی۔ آپ نے فرمایا افسوس تجھ پر تو نے خون کا کیا کیا؟ اس نے جواب دیا میں نے دیوار کے پیچھے غائب کر دیا ہے۔ آپ نے سوال کیا کہاں غائب کر دیا؟ اس نے عرض کیا میں نے آپ کا خون زمین پر گرانے سے بہتر یہ سمجھا کہ اسے پی لوں۔ لہٰذا اب وہ میرے پیٹ میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اچھا جا تو نے اپنے آپ کو آگ سے محفوظ کر لیا۔

ابن جوزی کہتے ہیں اس کہانی کا راوی نافع (ابن ہرمز) ہے۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔ یہ کذاب ہے اور دار قطنی کہتے ہیں متروک ہے۔ العلل المتناہیہ فی احادیث الواہیہ ج اص ۱۷۶

ابراہیم بن عمر : یہ حضرت سفینہؓ کا پوتا ہے۔ اسے بُرَیہ بھی کہا جاتا ہے دار قطنی کہتے ہیں۔ ضعیف ہے۔ اور ابن حبان کہتے ہیں اس کی روایت کسی صورت میں پیش کرنا حلال نہیں۔ میزان ج اص ۵

ذہبی بَریہ کے حالات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یہ حضرت سفینہؓ کا پوتا ہے اس کا نام ابراہیم ہے۔ یہ اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے احادیث روایت کرتا ہے۔ اس کی روایات ابوداؤد اور ترمذی میں پائی جاتی ہیں۔

بخاری کہتے ہیں اس کی سند مجہول ہے۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ یہ ایسی نرالی داستانیں بیان کرتا ہے جنہیں کوئی بیان نہیں کرتا۔ ذہبی کا بیان ہے کہ اس سے یہ داستان ابی فدیک نے بھی نقل کی ہے۔ لیکن ان کی روایت کے آخر میں یہ ہے کہ حضور سفینہؓ کے جواب پر ہنسنے لگے۔ میزان ج اص ۳۰۶

نافع بن ہرمز : اس کی کنیت ابو ہرمز ہے۔ عقیلی کا بیان ہے کہ اس کا نام نافع بن عبد الواحد ہے۔

امام احمد اور محدثین کی ایک جماعت نے اسے ضعیف کہا ہے۔ ابن معین کہتے ہیں کذاب ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں متروک ہے اس کی روایت ردی ہوتی ہے۔ اور نسائی کہتے ہیں ثقہ نہیں۔ میزان الاعتدال ج ۴ ص ۲۴۳۔

حکایات صحابہؓ میں مزید دو واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ایک ابن الزبیرؓ کا اور ایک مالکؓ بن سنان کا لیکن اس کے ثبوت کیلئے انہوں نے تاریخ الخمیس اور قرۃ العیون جیسی تاریخی گری پڑی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ اور مزید یہ کہ اس پر ایک فقہی مسئلہ کی بنیاد بھی رکھی ہے۔ ہمارے قارئین بھی پڑھیں اور محظوظ ہوں۔ فرماتے ہیں۔

حضور کے فضلات، پیشاب، پاخانہ وغیرہ سب پاک ہیں۔ حکایات صحابہ باب دوازدہم

ص ۱۸۵

سب سے اوّل تو ہماری عرض یہ ہے کہ آج تک فقہائے احناف، فقہائے شافعیہ، فقہائے مالکیہ، فقہائے حنابلہ اور اہل حدیث میں سے کسی نے تاریخی داستوں پر مسائل کی بنیاد نہیں رکھی۔ کیونکہ تاریخی روایات کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ ان روایات پر فقہی مسائل کی بنیاد رکھنے والا جنت الحمقار میں بستا ہے۔ ایسی حرکت تو وہی شخص کرسکتا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے نام کو تفقہ کا مادہ پیدا نہ فرمایا ہو۔

۲۔ کسی روایت یا واقعہ سے کسی مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اوّل اس واقعہ کی صحت ثابت کی جائے۔ اور یہ ثابت کیا جائے کہ دیگر احادیث صحیحہ، قرآن مجید اور عمل صحابہ اس کے خلاف نہیں ہے۔ اور اس پر اسلاف کا عمل رہا ہے۔ لیکن مصنف تحریہ تمام منزلیں طے کیے بغیر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

۳۔ پیشاب، پاخانہ کو خون پر قیاس کیا گیا جو درست نہیں۔ اس لیے کہ اسلام سے قبل خون لوگوں کے استعمال میں آتا تھا۔ اور اسلام نے اگرچہ اسے حرام قرار دیا ہے۔ لیکن تب بھی ہمہ قسم کا خون حرام نہیں کیا گیا بلکہ بہنے والا خون حرام کیا گیا ہے۔ جب کہ پیشاب، پاخانہ کو تمام روئے زمین کے باشندے آج تک نجس سمجھتے رہے۔ اور شریعت محمدیہ نے اس حاجت سے فراغت کے بعد وضو یا تیمم ضروری قرار دیا۔ ارشاد ہے۔

اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ	یا تم میں سے کوئی پاخانہ سے آئے یا عورتوں
فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا ـ	کو چھوئے۔ پھر اگر تم پانی نہ پاؤ تو تیمم کرو۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فراغت ضروریہ کے بعد وضو فرماتے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ حضور کی فضلات بھی ناپاک اور ناقض وضو تھے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے ہر بہنے والے خون کو حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا   بابہتے والا خون

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شے کو اللہ تعالیٰ حرام قرار دے رہا ہو۔ نبی اسے جہنم سے بچنے کا ذریعہ بیان کرے۔ اور مخالفت قرآن کرتے ہوئے یہ ثابت کرے کہ یہ بہت بڑا کار ثواب ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اگر کسی صحابی نے غلطی سے ایسی حرکت کی بھی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تنبیہ فرماتے کہ تم نے غلط حرکت کی ہے۔ لیکن اس کے بجائے ان خبیث مورخوں اور راویوں نے فضیلت کے جامہ میں یہ روایت پیش کی۔ اور یہ ثابت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ مخالف قرآن تھے۔ جنھیں اللہ کے کسی حکم کی پرواہ نہ تھی۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مخالفت قرآن کے صلہ میں جہنم سے نجات کے پروانے تقسیم کیا کرتے تھے۔ اعوذ باللہ من ہذا الشر العظیم

۵۔ قاعدہ اور اصول تو یہ ہے کہ اگر کوئی صحیح حدیث بھی قرآن کے خلاف واقع ہو تو وہ ناقابل قبول ہو گی۔ اور ہمارے علماء ان رام لیلائی کہانیوں کے ذریعہ حکم قرآنی کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ ہم ایسے علماء کے سلسلے میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں۔

برین عقل و دانش بباید گریست

۶۔ نیز یہ واقعات خلاف عقل بھی ہیں۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس قسم کی کوئی بات فرماتے۔ تو ہر شخص اس فکر میں مبتلا ہو جاتا کہ کسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خون حاصل ہو عیاذاً باللہ

الغرض ان روایات کو جس طرح پرکھا جائے گا تو صاف نظر آئے گا کہ اس قسم کی تمام روایات گندگی کی ایک پوٹ ہیں ...... بے شک اس سے بہتر تو پیشاب، پاخانہ ہے۔ ان کے استعمال سے عقائد تو خراب نہ ہونگے۔

غالباً۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا۔

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع۔ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرے۔

اور اسی لیے یہ ارشاد فرمایا گیا تھا۔

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار۔ — جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عقل سلیم عطا فرمائے اور ان ہذیانات سے ہر مسلم کو محفوظ رکھے۔ (آمین)

ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا
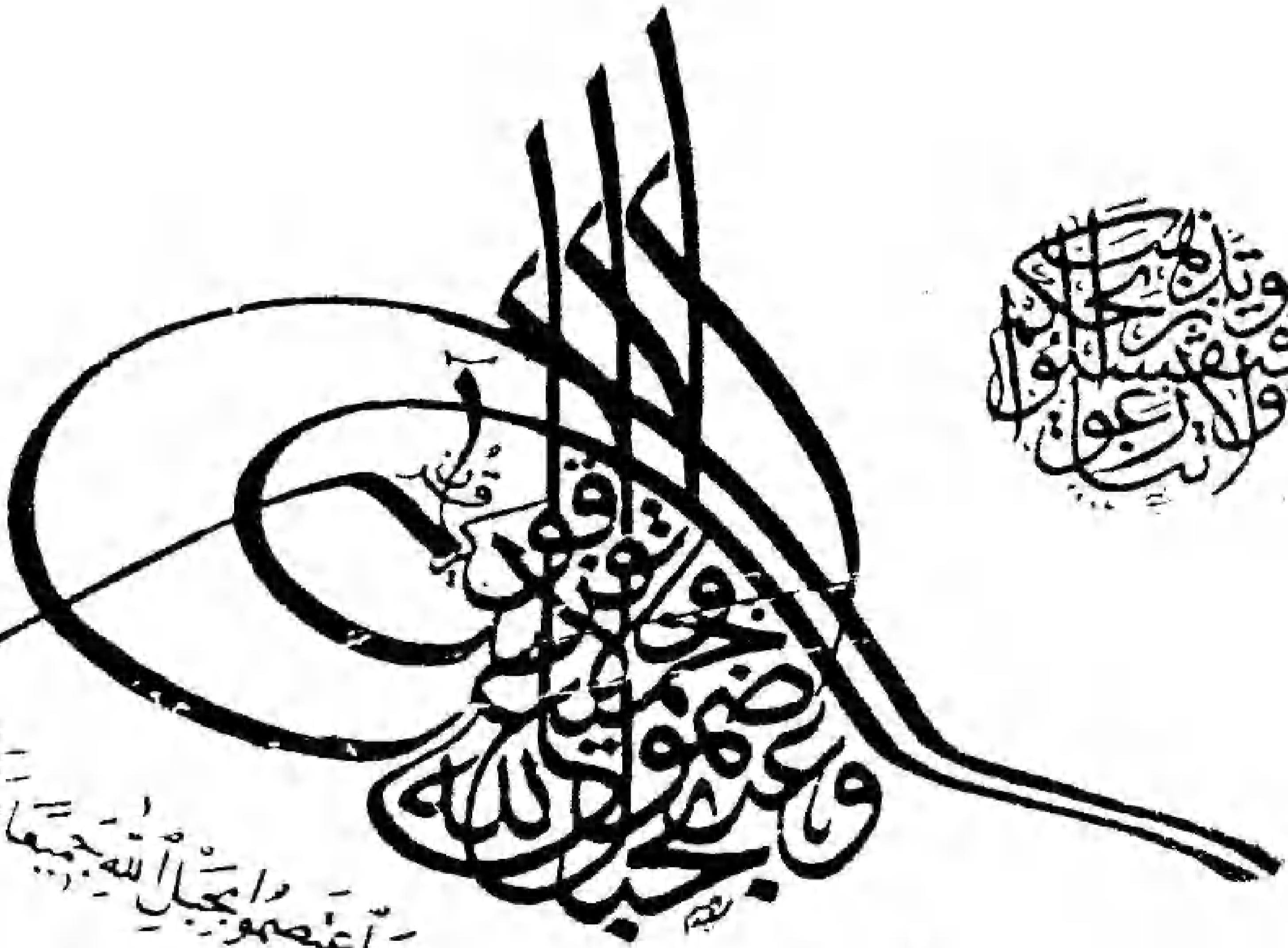
حضرت ام کلثومؓ کی تجہیز و تکفین

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی کا انتقال ہوا۔ ہم آپ کے ساتھ اس کے جنازے میں شریک ہوئے آپ قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تم میں سے جس شخص نے رات اقراف نہ کیا ہو وہ قبر میں اترے۔ حضرت ابوطلحہؓ نے عرض کیا کہ میں نے اقراف نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا اچھا تم قبر میں اترو۔ لہذا ابوطلحہؓ قبر میں اترے

بخاری ج ۱ ص ۱۷۱

حدیث کے الفاظ ہیں لم یقارف اللیۃ۔ اس لفظ لم یقارف کے کیا معنی ؟ حدیث کا تمام مفہوم اس لفظ کے معنی پر موقوف ہے۔

ہم نے بخاری کی اس حدیث کا مفہوم سمجھنے کے لئے شروحات بخاری کا مطالعہ کیا۔ تقریباً ان تمام شارحین یعنی حافظ ابن حجر، قسطلانی، کرمانی۔ خطابی وغیرہ نے ایک ہی قسم کا مفہوم بیان کیا ہے۔ اور علامہ بدرالدین محمود بن احمد العینی المتوفی ۸۵۵ھ نے اس روایت کے الفاظ و معانی پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔ اسی لیے ہم اولاً اس کو ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ بعد ازیں اپنی معروضات پیش کریں گے۔

امام عینی لکھتے ہیں۔

صاحبزادی سے مراد حضرت ام کلثومؓ ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں حضرت ام کلثومؓ کے تذکرہ میں یہ واقعہ واقدی کے واسطے سے فلیح بن سلیمان سے نقل کیا ہے۔ اوپر کی سند

وہی ہے جو بخاری میں ہے۔ یہی بات دولابی۔ طبری اور طحاوی نے بیان کی ہے کہ یہ حضرت ام کلثوم رض تھیں۔ اور ان کی وفات ۹ھ میں ہوئی

حماد بن سلمہ نے یہ ثابت البانی کے واسطہ سے حضرت انس رض سے نقل کیا ہے کہ یہ صاحبزادی حضرت رقیہ تھیں۔ حماد بن سلمہ کی یہ روایت۔ امام بخاری نے "الاوسط" میں اور حاکم نے مستدرک میں نقل کی ہے۔ امام بخاری یہ روایت نقل کر کے فرماتے ہیں۔ میں نہیں جانتا یہ غلطی کس سے واقع ہوئی ہے۔ اس لیے کہ حضرت رقیہ رض کا انتقال غزوۂ بدر کے موقعہ پر ہوا۔ جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرما نہ تھے۔

خطابی نے ایک نرالی بات کہی ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی تھی جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا گیا۔

لم یقارف۔ مقارفہ سے بنا ہے۔ خطابی کہتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ اور ایک ضعیف قول یہ ہے کہ اپنی بیوی سے ہم بستری نہ کی ہو۔ (عمدۃ القاری ج ۸ ص ۷۶)

طحاوی سے منقول ہے کہ یہ لفظ لم یقارف غلط ہے۔ اصل لفظ لم یقاول تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ دوران کلام کوئی جھگڑا نہ کیا ہو۔ کیونکہ صحابہ نماز عشا کے بعد گفتگو پسند نہ کرتے تھے۔

کرمانی لکھتے ہیں کہ اگر مقارفت کے معنی مجامعت کے لیے جائیں تو اس میں حکمت یہ ہوگی کہ آپ ایسے شخص کو قبر میں اتارنا نہ چاہتے ہوں۔ جس نے زمانہ قریب میں عورتوں سے اختلاط کیا ہو تاکہ اس کا دل مطمئن ہو۔ اور وہ خواہش نفس کو بھول چکا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رض نے اس رات اپنی باندی سے مباشرت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا۔ آپ کو یہ بات پسند نہ آئی کہ آپ کی بیٹی تو موت کے منہ میں مبتلا ہو۔ یعنی حضرت ام کلثوم رض جو حضرت عثمان رض کی زوجہ تھیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان رض کو سرزنش کرنے کے لیے یہ بات فرمائی کہ عثمان رض قبر میں نہ اتریں۔ یہ بات کہہ کر عثمان رض مراد لیے گئے تھے۔ یعنی ان پر چوٹ کی گئی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طلحہ رض سے فرمایا قبر میں اترو۔ کیونکہ اس کا فیصلہ آپ ہی کو کرنا تھا کہ کون قبر میں اترے؟ لیکن بعض حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ امر قابل تسلیم نہیں۔ اس لیے کہ حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قبر میں صرف اس شخص کو اترنا تھا جس نے مجامعت نہ کی ہو۔

علامہ عینی کہتے ہیں مجھے اس پر اعتراض ہے۔ اس لیے کہ حضرت ام کلثوم رض کے جنازہ میں صحابہ کی ایک جماعت حاضر تھی۔ اور یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمام صحابہ اس رات اپنی اپنی بیویوں سے ہم بستر ہوئے ہوں اور ایک صرف ابو طلحہ رض محفوظ ہوں ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو طلحہ رض کے سلسلہ میں حضور کو کچھ علم ہو۔

ابن عبد البر نے استیعاب میں ام کلثوم رض کے تذکرہ میں بیان کیا ہے کہ ابو طلحہ رض نے خود قبر میں اترنے کی اجازت طلب کی تھی جو آپ نے انھیں عطا فرمائی۔ عمدۃ القاری ج ۸ ص ۷۶

مسعود احمد صاحب بی۔ ایس۔ سی امیر جماعت المسلمین اپنی "تاریخ الاسلام والمسلمین" میں یہ حدیث بیان کرتے ہوئے لم یقارف کے معنی ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں "کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جس نے آج کی رات کو کمائی نہ کی ہو"

پھر حاشیہ میں اس کمائی کی تشریح اس طرح رقم فرماتے ہیں۔

کاروبار میں عموماً جھوٹ سچ کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن جس نے کاروبار ہی نہ کیا ہو وہ اس سے محفوظ ہوتا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ قبر میں اتر کر اس کی درستی وغیرہ کرنے والا ایسا آدمی ہو جس نے کم از کم ایک رات تو لغزش کے بغیر گزاری ہو۔ تاریخ الاسلام والمسلمین ص ۶۴۹

مفسر قرطبی اپنی تفسیر احکام القرآن میں رقم طراز ہیں۔

نزل فی قبر ام کلثوم علی والفضل واسامۃ

احکام القرآن ج ۷ ص ۲۲۵

مولانا احمد علی سہارنپوری مرحوم حاشیہ بخاری میں، قسطلانی کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ خطابی

کا قول ہے۔ لم یقارف کے معنی ہیں کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ علامہ عینی نے خطابی کا یہ قول نقل کیا ہے جیساکہ سطور بالا میں گزر چکا۔

ان تمام تشریحات پر غور کرنے کے بعد چند سوالات ذہن میں الجھن پیدا کر رہے ہیں۔ کاش ہمارے علماء ہماری اس الجھن کو دور فرماسکیں۔ ہم اپنی یہ الجھنیں قارئین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ لم یقارف کے معنی گناہ نہ کیا ہو۔ یعنی ابوطلحہؓ انصاری کے علاوہ وہاں جتنے صحابہ تھے وہ سب کے سب گناہ گار تھے۔ قربان جائیے اس حسن ادا کے کہ کتنے حسین اور خوبصورت الفاظ میں امام خطابی نے صحابہ کرام پر تبرا فرمایا ہے۔

کہ دلچسپ ہے، آفت ہے، قیامت ہے، غضب ہے ادا ان کی قد ان کا چال ان کی۔ چلن ان کا

۲۔ حضرت قسطلانی فرماتے ہیں لم یقارف کے معنی ہیں عورت کے پاس نہ گیا ہو۔ یہ بات تو امام بدر الدین عینی کے حلق سے بھی نیچے نہ اتر سکی۔ اس لیے انھوں نے تحریر فرمایاکہ یہ بات تو ناممکنات میں سے ہیں کہ سب ہی اپنی اپنی بیویوں کے پاس گئے ہوں۔

۳۔ ہوسکتا ہے کہ ان حضرات صحابہ میں بعض حضرات ایسے بھی ہوں جنھوں نے تا ہنوز شادی ہی نہ کی ہو۔ اور ان کے پاس کوئی باندی بھی نہ ہو۔ مثلاً خود حضرت انسؓ جو اس وقت کے واقعہ کو نقل کررہے ہے جو اس وقت بہ ۲۰ سال کے بچہ تھے۔ لہذا ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ سب سے اوّل انھیں قبر میں اتارا جاتا۔

۴۔ قسطلانی نے یہ قول لفظ قیل سے نقل کیا ہے جو کسی قول کے ضعف کی دلیل ہوتا ہے اور جس کے قائل کا اتہ پتہ بھی نہیں ہوتا۔ یعنی یہ ایک بازاری گپ ہے جس پر ہمارے شارحین حدیث اتنی بلند وبالا عمارت تعمیر فرمارہے ہیں۔ اتفاق سے اس قائل کا اتہ پتہ امام عینی نے بیان نہیں کیا۔

بہرصورت اس نامعلوم مخلوق نے یہ پھلجھڑی چھوڑی کہ حضرت عثمان رضؓ پر طنز تھا کہ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی توموت کی کشمکش مبتلا ہیں اور حضرت عثمان رض ایک باندی کے مزے لوٹتے رہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ معلوم کیا جاتا کہ یہ بکواس کرنے والا کون ہے۔ اور اس بکواس کی کوئی حقیقت بھی ہے یا نہیں۔ اور اس کا کوئی ثبوت بھی ہے یا نہیں۔ قسطلانی نے یہ تمام امور نظر انداز کر کے یہ تو تسلیم کر لیا کہ ایسا ہوا ہوگا۔ اور پھر اس کی تاویلات شروع فرمائیں۔ لکھتے ہیں

ہو سکتا ہے کہ حضرت ام کلثوم رض کے مرض نے طوالت اختیار کر لی ہو۔ اور بیوی سے علیحدگی حضرت عثمان رض کی برداشت سے باہر ہو گئی ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ ان کے وہم وگمان میں یہ بات نہ ہو کہ حضرت ام کلثوم رض اس رات انتقال فرما جائینگی۔ یہ مقصد نہیں کہ عین وفات کے وقت یا وفات کے فوراً بعد ہم بستر ہوئے تھے۔ ہم اس ضمن میں صرف یہی کہہ سکتے ہیں۔ ع سچ کہتے ہو؟ بجا کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو۔

۵۔ اگرچہ یہ سب مفروضات ہیں لیکن بقول جناب قسطلانی ان مفروضات سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ حضرت عثمان رض نے یہ حرکت کی تھی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر طنز فرمایا تھا لیکن سوال یہ ہے کیا حضرت عثمان رض نے گناہ کیا تھا؟ اور ہمیں یقین ہے کہ کوئی اہل سنت عالم یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ حضرت عثمان رض نے کوئی گناہ کیا تھا۔ تو وہ فرد جرم کیا تھا جس کے باعث حضرت عثمان رض پر طنز کیا گیا؟

۶۔ کیا قبر کے پاس حضرت عثمان رض اور حضرت ابو طلحہ رض کے علاوہ کوئی اور شخص نہ تھا جو یہ حضرت عثمان رض پر طنز قرار پاتے۔ اور جب اور صحابہ بھی موجود تھے۔ اور ان کی خاموشی اس امر کا ثبوت ہے کہ ان حضرات سے بھی یہ حرکت سرزد ہوئی تھی تو پھر حضرت عثمان رض پر طنز کا کیا مقصد اس کے مرتکب تو تمام صحابہ ہوئے تھے۔

۵۔ بخاری کی روایت میں نہ یہ ذکر ہے کہ حضرت عثمان رض پر طنز تھا۔ اور نہ یہ ذکر ہے کہ حضرت عثمان رض باندی سے ہم بستر ہوئے تھے ان حضرات شارحین نے اس بات کو بخاری کی حدیث کے ساتھ ٹانکا ہے۔ اس سے تو یہ ظاہر ہے کہ ان حضرات کا ذہن خطرناک حد تک سبائی

پروپیگنڈے سے متاثر ہے۔ اور حدیث کی یہ تشریح فرماکر ان حضرات نے امام بخاری کو بدنام کیا ہے۔

۷۔ قبر میں جب جنازہ اتارہ جاتا ہے تو قبر میں عموماً دو شخص اترتے ہیں۔ ایک سرہانے اور ایک پائنیتی۔ اب وہ دوسرا شخص کون تھا۔ ان حضرات نے اس کا اتا پتا بیان نہیں کیا۔ اور نہ اس امر کی وضاحت کی کہ اس دوسرے نے کوئی گناہ کیا تھا یا نہیں اور اپنی بیوی یا باندی کے پاس گیا تھا یا نہیں؟ اس بیچارے کا بھی تو کچھ حال بیان کرنا چاہیئے تھا۔ یا حضرت عثمانؓ پر تیر بازی میں اتنے محو ہوئے کہ اس دوسرے فرد کو بھول گئے۔

۸۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ حضرت ام کلثومؓ کو قبر میں حضرت فضلؓ بن عباس حضرت اسامہؓ بن زید اور حضرت علیؓ نے اتارا تھا۔ اور قرطبی نے اس امر میں کوئی اختلاف یا شک ظاہر نہیں کیا جو اس امر کا ثبوت ہے کہ قرطبی نے بخاری کی اس روایت کو قبول نہیں کیا۔

۹۔ کیا یہ تینوں حضرات اپنی اپنی بیویوں کے پاس نہیں گئے تھے؟ اور کیا انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا؟ یا ان کے ساتھ بھی اس قسم کی کوئی شرط لگائی گئی تھی۔

۱۰۔ اگر لم یقارف کے معنی وہ مراد لئے جائیں جو مسعود احمد صاحب نے لیے ہیں تو اس طرح حضرت عثمانؓ کی ذات تو اس الزام سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ اس لفظ کے معنی و شارحین حدیث نے بیان نہیں کیے اور کوئی نہ کرنے کی جو وجہ انہوں نے بیان کی ہے وہ تو ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس کا قبر سے کوئی خصوصی تعلق نہیں۔ غالباً یہ اس روایت کو بچانے کا ایک ذریعہ زبردستی نیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہمارے علماء کے ذہنوں پر بخاری کی ہیبت کچھ اس طرح مسلط ہے کہ وہ یہ سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے کہ انسان ہونے کی ناتے بخاری اور ان کے راویوں سے بھی غلطی ممکن ہے۔

۱۱۔ کاش ہمارے علماء اس حدیث کی سند پر غور فرما لیتے۔ اور کتب رجال سے ایک ایک راوی کی جانچ پڑتال کر لیتے۔ اور یہ زحمت گوارا کر لیتے کہ اس روایت کی سند میں کوئی زہریلا

ناگ تو موجود نہیں۔ لیکن ان حضرات نے تو بخاری کو بعینہٖ قرآن کی مانند شک وشبہ سے بالاتر سمجھ رکھا ہے۔

آیئے قارئین کرام ہم آپ کو اس مارِ آستین کا اتہ پتہ بتائیں جس نے یہ ڈسنے کی کوشش کی ہے۔ اس ذات شریف کا نام ہے فلیح بن سلیمان

فلیح بن سلیمان

: امام ذہبی لکھتے ہیں اس کا شمار بڑے ائمہ علم میں ہوتا ہے۔ تمام اصحابہ ستہ نے اس سے روایت لی ہے۔

یعنی بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی اور ابن ماجہ نے

امام الرجال یحیی بن معین اور امام ابو حاتم رازی فرماتے ہیں یہ قوی نہیں۔ بلکہ ابن ابی حاتم نے یحیی کا۔ یہ قول نقل کیا ہے کہ نہ یہ خود ثقہ ہے اور نہ اس کا باپ سلیمان ثقہ ہے۔

عثمان بن سعید نے یحیی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ یہ ضعیف ہے۔ عباس دوری کا بیان ہے کہ یحیی بن معین فرماتے اس کی حدیث صحیح نہیں۔

عبداللہ بن احمد کا بیان ہے کہ میں نے یحیی کو یہ کہتے سنا ہے کہ تین اشخاص کی روایت سے بچنا چاہیئے۔ محمد بن طلحہ بن مصرف۔ ایوب بن عتبہ اور فلیح بن سلیمان

میں نے عرض کیا۔ آپ نے یہ بات کس سے سنی ہے آپ کا یا اپنا تخیل ہے فرمایا میں نے مظفر بن مدرک سے سنی ہے اور میں اس قسم کے فیصلے انہی سے لیتا ہوں۔

مظفر بن مدرک

: ابو کامل کی کنیت سے مشہور ہیں بغداد کے حفاظ حدیث میں ان کا شمار ہوتا ہے

ساجی کا بیان ہے کہ یہ فلیح اگرچہ سچا تھا۔ لیکن اسے وہم ہوتا تھا۔

ابو داؤد کہتے ہیں فلیح کی حدیث حجت نہیں ہو سکتی۔

یحیی بن معین نے ابو کامل سے نقل کیا ہے کہ یہ فلیح صحابہ پر تبرا کیا کرتا تھا ۱۶۸ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ میزان ج ۳ ص ۳۶۵۔

امام ذہبی کی اس بحث سے یہ امر واضح ہو کر سامنے آگیا کہ بخاری کے ہم عصر اور ان کے اساتذہ فلیح کی کسی روایت کو حجت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ناقابل قبول تھا۔ اور یہ خالص برائی شخص تھا۔ صحابہ کرام سے بغض رکھتا تھا۔ اور مذکورہ روایت اس کے بغض کا ایک نمونہ ہے امام نسائی لکھتے ہیں۔ یہ فلیح مدنی ہے۔ قوی نہیں ہے۔ کتاب الضعفاء والمتروکین صـ ۸۸
گویا ابو داؤد اور نسائی نے اس سے جو روایات لی ہیں وہ ثقہ سمجھ کر نہیں لیں بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہو گی۔ ورنہ ان حضرات کے نزدیک ضعیف ہے۔

حافظ ابن حجرؒ تقریب التہذیب میں رقم طراز ہیں۔

فلیح بن سلیمان بن ابی المغیرۃ الخزاعی ابو یحیی المدنی۔ کہا جاتا ہے۔ فلیح اس کا لقب ہے اور عبدالملک نام ہے۔ اگرچہ سچا ہے لیکن غلطیاں بہت کرتا ہے۔ تقریب صـ ۲۷۷

کیوں نہ اس روایت کو ایک غلطی شمار کیا جائے۔ اور ہمارے علماء جنہوں نے اصول حدیث کا مطالعہ کیا ہو گا وہ خوب جانتے ہیں کہ لفظ صدوق بہت گرے ہوئے درجہ کا لفظ ہے جو ہر ایسے شخص پر بول دیا جاتا ہے جس کے جھوٹے ہونے کا ثبوت موجود نہ ہو۔ کیونکہ اسلامی نقطہ نگاہ سے ہر دعویدار ایمان سچا ہے تاوقتیکہ اس سے کوئی خلاف ایمان بات ثابت نہ ہو۔ اور ویسے بھی حافظ ابن حجر بخاری و مسلم کے ہر خطرناک راوی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی سچا ہے لیکن غلطیاں کرتا ہے۔ سچا ہے لیکن وہم ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

امام عبدالرحمان بن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ رقم طراز ہیں۔

فلیح بن سلیمان ابو یحیی یہ شخص سلیمان بن ابی المغیرۃ بن حنین کا بیٹا ہے۔ یہ مدینہ کا رہنے والا ہے۔ یہ قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا تعلق قبیلہ اسلم سے ہے۔ اور عبید اللہ بن حنین اس کا باپ کا چچا تھا۔ اس کا نام عبدالملک تھا۔ لوگ اسے فلیح کہنے لگے تھے۔ پھر فلیح سے مشہور ہو گیا۔ اس نے زہری۔ عامر بن عبداللہ بن زبیر۔

بلال بن علی اور سہیل بن ابی صالح سے احادیث روایت کی ہیں۔ اس سے ابن وہب جسن بن محمد بن اعین الحراتی، سعید بن منصور، محمد بن الصلت۔ حجاج بن ابراہیم بن الازرق۔ یحییٰ بن صالح الوحاظی۔ سلیمان بن داؤد العتکی۔ محمد بن بکار۔ منصور بن ابی مزاحم اور معافی بن ابی سلیمان نے احادیث روایت کی ہیں۔ عبدالرحمان کہتے ہیں میں نے یہ بات اپنے والد ابو حاتم رازی سے سنی ہے۔

عبدالرحمان کا بیان ہے کہ عباس بن محمد الدوری نے یحییٰ بن معین کا یہ قول بیان فرمایا ہے کہ فلیح بن سلیمان قوی نہیں۔ اور اس کی حدیث حجت نہیں ہو سکتی۔ اس کا درجہ دراوردی سے کم ہے بلکہ دراوردی اس سے زیادہ قابل قبول ہے۔

عبدالرحمان کا بیان کہ میں نے اپنے والد ابو حاتم سے اس فلیح ابن سلیمان کے بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے فرمایا یہ قوی نہیں ہے۔ الجرح والتعدیل ج، ص ۸۵

ہم نے تمام تفصیلات قارئین کے سامنے پیش کر دی ہیں۔ قارئین اس روایت کے بارے میں غور کر کے خود ہی فیصلہ کر لیں۔ یا علماء کرام سے معلوم کر لیں۔ ہم تو ایک معمولی سے طالب علم ہیں۔ ہم کیا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ذہن میں رہے کہ یحییٰ بن معین اور ابو حاتم جو اس فلیح کو ناقابل اعتبار قرار دے رہے ہیں یہ بخاری کے اساتذہ ہیں۔ ابو کامل بخاری کے استاد الاستاد ہیں۔ بقیہ اکثر حضرات یعنی ابو داؤد۔ نسائی۔ عباس بن محمد الدوری اور ساجی وغیرہ ہم عصر ہیں۔ لیکن یہ تمام حضرات اس مغالطہ کے شکار نہ بنے تھے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ الصحیح البخاری ان بیچاروں کے تو فرشتوں کو بھی اس فیصلہ کی خبر نہ تھی۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی کوئی نرم گوشہ اختیار کر لیتے۔

میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی

ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور احمد ابن حنبل نے حضرت سفینہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ میری امت میں خلافت تیس سال رہے گی، پھر اس کے بعد ملک ہو گا۔ سعید بن جمہان کا بیان ہے کہ پھر حضرت سفینہ رضؓ نے مجھ سے فرمایا تو ابو بکرؓ و عمرؓ، اور عثمانؓ و علیؓ کی خلافت کو دیکھ لے تو تجھے صاف نظر آ جائے گا کہ یہ تیس سال ہوتے ہیں، اور ایک روایت میں مزید اضافہ یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ حضرت حسنؓ کے چھ ماہ بھی شمار کر لو۔

سعید بن جمہان راوی کہتا ہے کہ میں نے حضرت سفینہ رضؓ سے عرض کیا کہ بنی امیہ تو یہ گمان کرتے ہیں کہ خلافت ان کے پاس ہے۔ وہ بولے بنو زرقا جھوٹ بولتے ہیں بلکہ وہ تو بادشاہ ہیں۔ اور بادشاہ بھی بدترین بادشاہ۔ ترمذی ج ۲ ص ۵۵

ابو داؤد کی روایت میں یہ آخری الفاظ قطعاً نہیں پائے جاتے، اور ابتدائی الفاظ میں بھی کچھ معمولی سا فرق ہے، اس کے الفاظ میں "کہ میرے بعد خلافت نبوت تیس سال رہے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا ملک عطا فرمائے گا۔

یہ ایک ایسی حدیث ہے جس پر خلافت راشدہ اور بنو امیہ کی ملوکیت کی پوری عمارت قائم ہے۔ اگر یہ اینٹ اپنی جگہ سے ذرا بھی ہل جاتی ہے تو فلسفۂ ملوکیت کی پوری عمارت سربجود ہو جاتی ہے۔ آج تک جس شخص نے بھی خلافت و ملوکیت پر کچھ قلم اٹھایا ہے اس نے سب سے اول اس روایت کو پیش نظر رکھا ہے اور اس روایت کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا یہ روایت ایک ایسا مسلمہ اصول ہے کہ جسے

دورِ صحابہ سے آج تک ہر فرد بشر تسلیم کرتا آیا ہے، اور جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن اگر اس روایت کی صحت میں اشکال پیدا ہو جاتا ہے تو پھر حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ نہ خلیفہ راشد رہتے ہیں اور نہ امیر معاویہؓ ملوکیت کے بانی رہتے ہیں۔ اور ان تمام امور کو امت نے لازم و ملزوم تصور کر رکھا ہے۔ اس لیے کہ یہ تو ایک یقینی امر ہے کہ امیر المومنین معاویہؓ خلیفہ نہیں بلکہ ملوکیت کے بانی ہیں۔ لہٰذا اس سے پہلے جو کچھ ہے وہ خلافت راشدہ ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا ہر جزئیہ غلط ہے۔ نہ امیر المومنین معاویہؓ ملوکیت کے بانی ہیں اور نہ حضرت علیؓ خلافت راشدہ میں شامل ہیں۔

بلکہ سچی اور دل لگتی بات تو یہ ہے کہ بقول شاہ ولی اللہ خلافتِ نبوت تو حضرت عثمانؓ پر ختم ہو گئی۔ اور اس کے بعد خلافت کا سلسلہ امیر المومنین معاویہؓ سے دوبارہ شروع ہوا۔ حضرت عثمانؓ تک جو خلافت ہے وہ خلافت نبوت ہے۔ اور حضرت معاویہؓ سے جس خلافت کی ابتداء ہوئی وہ خلافت راشدہ ہے اور حضرت علیؓ کا پانچ سالہ دور فتنہ و فساد کا دور ہے۔ نہ حضرت علیؓ کو مملکت اسلامیہ پر قبضہ حاصل ہوا۔ اور وہ نہ انتظام مملکت سنبھال سکے۔ اور آخر میں تو ان کی حکومت صرف کوفہ تک محدود رہ گئی تھی۔

شاہ ولی اللہ نے یہ نظریہ "ازالۃ الخفاء" میں پیش کیا اور اس پر خوب سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے اور اس کی تائید میں دو روایات پیش کی ہیں جن میں خلافت کے اشارے ملتے ہیں اور جو تقریباً متواتر کے درجہ میں ہیں۔ ان روایات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خلافتِ نبوت حضرت عثمانؓ پر ختم ہو چکی۔ اور حضرت علیؓ کے دور کو تمام صحابہ اور تمام تابعین کبار نے فتنہ و فساد کا دور قرار دیا۔

یہی وجہ ہے کہ جنگ صفین اور جنگ جمل وغیرہ کے موقعہ پر صحابہ کرام کی بڑی اکثریت اس جنگ سے علیحدہ رہی۔ جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اپنی کتاب "حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق" میں صـ ۲۱۶ پر رقم طراز ہیں:۔

(امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ (المتوفی ۱۱۰ھ) کا کہنا تو یہ ہے کہ صحابہ کی اکثریت اس جنگ (صفین) میں شریک نہیں تھی۔ امام احمد نے نہایت صحیح سند کے ساتھ ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔

هاجت الفتنة واصحاب رسول الله صلی الله علیہ وسلم عشرات الوف فلم یحضر ھا منہم مائة بل لم یبلغو ثلاثین۔	جس وقت فتنہ برپا ہوا تو صحابۂ کرام دسیوں ہزار کی تعداد میں موجود تھے لیکن ان میں سے سو بھی اس میں شریک نہیں ہوئے۔ بلکہ صحابہ میں سے شرکاء کی تعداد تیس تک بھی نہیں پہنچی۔

نیز امام احمد ہی روایت کرتے ہیں کہ امام شعبہ کے سامنے کسی نے کہا کہ ابو شیبہ نے حکم کی طرف منسوب کرکے عبد الرحمان بن ابی لیلیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جنگ صفین میں ستر بدری صحابہ شامل تھے۔ شعبہ نے فرمایا ابو شیبہ نے جھوٹ کہا۔ خدا کی قسم اس معاملہ میں میرا اور حکم کا مذاکرہ ہوا تھا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ صفین کی جنگ میں بدری صحابہ میں سے سوائے حضرت خزیمہؓ بن ثابت کے کوئی شریک نہیں ہوا۔ حضرت امیر معاویہؓ اور تاریخی حقائق صـ۲۱۶

امام ابن تیمیہ اس روایت کی سند نقل کرکے لکھتے ہیں۔

ھذا الاسناد اصح اسناد علی وجہ الارض	یہ روئے زمین کی تمام سندات میں سب سے صحیح سند ہے۔

محمد بن سیرین کے قول میں ایک لفظ عشرات الوف آیا ہے۔ عشرات عشرہ کی جمع ہے۔ اور الوف الف کی جمع ہے اور عربی زبان میں جمع کا لفظ کم از کم تین پر بولا جاتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ جمع قلت نو پر بولی جاتی ہے۔ اس طرح ابن سیرین کا قول کا مقصد یہ ہوا کہ صحابہ کرام کی تعداد اس وقت کم از کم تیس ہزار اور نوے ہزار کے درمیان تھی۔ لیکن ان تمام فتنوں میں جو حضرت عثمانؓ کے بعد واقع ہوئے تیس صحابہ بھی شریک نہ تھے۔

اگر یہ تیس سال خلافت والی روایت صحیح تھی تو صحابہ کرام کی اتنی بڑی اکثریت اور کبار تابعین نے اس روایت کو کیوں نظر انداز کیا اور خلیفہ کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ اکثر صحابہ نے حضرت علیؓ کی بیعت تک نہیں کی۔ اور مسلمانوں کے خلاف ان جنگوں میں حصہ لینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ بلکہ ان جنگوں کو جن میں تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کی جانیں گئیں فتنہ قرار دیا۔ حتیٰ کہ حضرت سفینہؓ بھی ان علیحدہ

رہنے والوں میں شامل تھے۔ گویا یہ تمام صحابہؓ اس خلافتِ نبوت کے مقابلہ پر متحد ہو گئے تھے یا یہ کہئے کہ صحابہؓ کی اتنی بڑی اکثریت سعید بن جمہان کی اس کہانی سے واقف نہ تھی جس نے صحابہ کے بعد امت میں ایک مسلمہ اصول کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہر دو صورتوں میں یہ روایت جھوٹ قرار پائے گی۔ اور کم از کم حضرت سفینہؓ کو میدان جمل و صفین میں آگے آگے ہونا چاہئے تھا۔ لیکن تاریخ میں ان جنگوں میں ان کا نام تو کیا نظر آتا حضرت علیؓ کے ساتھیوں میں بھی ان کا نام نظر نہیں آتا۔ گویا صحابہ نے اس امر پر اتفاق کیا تھا کہ یہ روایت محض ایک داستان ہے۔ اور حضرت علیؓ خلافتِ نبوت میں داخل نہیں۔

ہمارا مقصد اس وقت تاریخ پر بحث کرنا نہیں ہے بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ روایت ایک ایسی کہانی ہے جس کے خلاف صحابہ کا اجماع ہوا ہے۔ نہ صرف ایک بار بلکہ دو بار اجماع ہوا ہے۔

دوسرا اجماع اس صورت میں ہوا کہ حضرت حسنؓ نے امیر معاویہؓ سے جب صلح فرمائی اور خلافت ان کے سپرد کی۔ تو تمام صحابہؓ نے امیر معاویہؓ کی بیعت کی اور اسی وجہ سے اس سال کا نام عام الجماعت ہوا۔ گویا تمام صحابہ حضرت حسنؓ سمیت خلافتِ نبوت ختم کرنے پر متحد ہوئے۔ اس صورت میں تمام صحابہ گمراہ قرار پائے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ کی فضیلت یہ بیان کی ہے۔

"یہ میرا بیٹا سردار ہے۔ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرائے گا۔"

لیکن اس روایت کے قبول کرنے سے یہ ثابت ہوگا کہ حضرت حسنؓ اور تمام صحابہ نے سب سے بڑا تاریخی جرم کیا کہ خلافتِ نبوت کو ختم کر کے ملوکیت میں تبدیل کیا اور بدترین بادشاہوں کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیدیا۔ ذرا سوچ کر بتائیے کہ یہ حضرت حسنؓ کی فضیلت ہو گی یا مذمت۔ جبکہ حضرت حسنؓ کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت صحیح سند کے ساتھ تمام کتب احادیث میں پائی جاتی ہے۔ اور اس روایت سے حضرت حسنؓ اور تمام صحابہ کا مجرم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ عیاذاً باللہ

اگر یہ روایت درست تھی تو حضرت سفینہؓ نے امیر المومنین معاویہؓ اور ان کے صاحبزادے یزید کی کیسے بیعت کی۔ اور حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کے زمانہ میں تو علیحدہ بیٹھے رہے۔ محدثین کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ایک راوی حدیث بیان کرے اور خود اس کا عمل اس کے خلاف ہو تو وہ

اس روایت کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ روایت ناقابلِ قبول ہے۔

نیز اس پر بھی غور کیجئے کہ حضرت حسنؓ کا انتقال ۴۹ھ میں ہوا۔ اگر وہ حضرت معاویہؓ سے صلح نہ کرتے اور خلافت سے دست بردار نہ ہوتے تو ان کی حکومت کے ابتدائی چھ ماہ تو خلافت نبوت میں داخل ہوتے اور اس کے بعد یہ خلافتِ نبوت ملوکیت میں تبدیل ہو جاتی۔ اور تاریخ کچھ اس طرح بیان کی جاتی کہ حضرت حسنؓ رمضان ۴۰ھ میں خلیفہ ہوئے لیکن ان کی خلافت ربیع الاول ۴۱ھ میں ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ لہٰذا وہ اس طرح ایک بہترین مقام اور بلند سطح سے گر کر پست ترین مقام میں پہنچ گئے۔ یہ ہے فلسفۂ خلافت و ملوکیت لاحول ولاقوۃ الا باللہ

اس "تیس سالہ داستان" کی تردید سنن ابی داؤد کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے نقل کی ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہو تو بیان کرو۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو آئی۔ اس میں آپؐ اور ابوبکرؓ کو تولا گیا تو آپؐ بھاری رہے پھر ابوبکرؓ و عمرؓ کو تولا گیا تو ابوبکرؓ بھاری رہے پھر عمرؓ و عثمانؓ کو تولا گیا تو عمرؓ بھاری رہے" اس کے بعد ترازو اٹھالی گئی۔

ابوبکرؓ کا بیان ہے کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر کچھ ناگواری کے اثرات دیکھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ کو برا معلوم ہوا۔ لیکن آپؐ نے لوگوں کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا

هذا خلافة نبوة ثم يؤتى الله الملك من يشاء — یہ خلافتِ نبوت ہے پھر اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا خلافت عطا فرمائے گا۔

امام ابن تیمیہ اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں واضح فرمایا کہ ان تینوں یعنی ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ کی خلافت، خلافتِ نبوت ہے پھر اس کے بعد ملک ہوگا۔ (یعنی ملوکیت، حکومت یا بادشاہت) اور اس خلافتِ نبوت میں حضرت علیؓ کا ذکر نہیں۔ کیونکہ ان کے زمانہ میں لوگ ان پر جمع نہیں ہو سکے بلکہ ان میں اختلاف رہا۔ اس طرح حضرت علیؓ نہ خلافتِ نبوت کے منتظم بن سکے اور نہ ملک کے۔ منہاج السنہ ج ۱ ص ۲۵۷

بلکہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ خلافت مدینہ میں اور ملک شام میں ہوگا۔ اگرچہ ابن جوزی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر کوفہ میں کیا ہوگا۔ گویا بین بین معاملہ ہوگا نہ خلافت ہوگی اور نہ ملوکیت۔ لیکن ابوداؤد کی اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد ملوکیت کا دور دورہ ہوگا ع ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیئے۔

اس حدیث اور گزشتہ احادیث سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ خلافت نبوت حضرت عثمانؓ پر ختم ہو چکی۔ اور حضرت عثمانؓ کے بعد اللہ جسے چاہے گا ملک دے گا۔ یعنی حکومت۔ اب اگر امیر المومنین معاویہؓ اور ان کے صاحبزادے یزید کی حکومت ملوکیت ہے تو ان احادیث کی رو سے حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کی حکومت بھی یقیناً ملوکیت ہے۔ گویا سوال کی یہ نوعیت کہ ملوکیت کی ابتداء امیر المومنین معاویہؓ سے ہوئی یہ تو قطعاً غلط ہے۔ ہاں اب اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی ملوکیتوں میں کونسی ملوکیت بہتر تھی؟ کس ملوکیت نے مملکت اسلامیہ کو وسعت دی؟ اور کس ملوکیت نے انسانوں کو سکون عطا کیا؟ کونسی ملوکیت نے انسانوں کا سکون اور چین چھین کر انہیں موت کے منہ میں پہنچایا؟ کس ملوکیت نے ان میں انتشار کا دروازہ کھولا۔ اور کس ملوکیت نے مدینہ قیصر یعنی قسطنطنیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو یہ تمام سوالات اپنی جگہ پر غور طلب ہونگے۔ قارئین بھی ان سوالوں کا حل تلاش کریں۔ ہم بھی کچھ نہ کچھ اگر وقت ملا تو حل تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

قارئین کرام یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ ہم نے آپ کے سامنے یہ تخیلات پیش کیے ہیں۔ بلکہ ہم نے تو ان احادیث سے جو کچھ ثابت ہو رہا تھا اس کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ حضرت سفینہؓ کی جس روایت پر تیس سالہ خلافت کی اتنی بلند و بالا عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ وہ بنیاد ایک مٹی کا ڈھیر ہے۔ اس کی بنیاد اتنی کچی ہے کہ یہ پوری عمارت ایک ٹھوکر میں نیچے گر سکتی ہے۔ اس عمارت پر خواہ کوئی کتنے بھی پلاسٹر چڑھائے وہ سب بے کار ہیں۔ میں تو اس روز سے خائف ہوں جس روز یہ فلک بوس عمارت نیچے آئے گی اور ہزارہا افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

حضرت سفینہؓ کی اس روایت کو ایک زبردست جھٹکا اس حدیث سے پہنچتا ہے جو بخاری،

مسلم، ابوداؤد، ترمذی، اور امام احمد نے حضرت جابر بن سمرہ سے بایں الفاظ نقل کی ہے۔

"کہ اسلام اس وقت تک غالب رہے گا جب تک بارہ خلفاء نہ گزر جائیں۔ اور ایک روایت کے الفاظ ہیں اس حکومت میں اس وقت تک تنزل نہ آئے گا جب تک بارہ خلفاء نہ گزر جائیں۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ایسے بارہ خلفاء جن پر امت کا اجماع ہو" اور طبرانی نے اس حدیث میں یہ الفاظ بھی بیان کیے ہیں کہ ان بارہ خلفاء کو کسی دشمن کی عداوت نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

ترمذی نے اس روایت کو صحیح اور تیس سالہ روایت کو حسن کہا ہے۔ اور ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ ترمذی کا کسی روایت کو حسن کہنا کوئی مقام نہیں رکھتا۔ بلکہ ترمذی جس روایت کو حسن کہتے ہیں وہ یقیناً ضعیف ہوتی ہے۔

امام مسلم نے بارہ خلفاء والی روایت نو سندات سے نقل کی ہے۔ مسلم ج ۲ ص ۱۱۹، بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۲، ترمذی ج ۲ ص ۵۵، ابوداؤد ج ۲ ص ۲۳۹

اس حدیث میں بارہ خلفاء تک غلبہ اسلام اور اس دین کے قائم رہنے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اور یہ حضرت سفینہ رض کی حدیث کے معارض ہے۔ اور چونکہ یہ ایک ایسی صحیح حدیث ہے جسے کسی صورت میں بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ سندی لحاظ سے اس پر آج تک کوئی جرح کی گئی ہے۔ لیکن ہمارے شارحین حدیث اور علمائے کرام اس حدیث کو دیکھ کر بےچین ہو جاتے ہیں۔ ایک جانب تو یہ حدیث صحیح انہیں اپنی طرف کھینچتی ہے" اور دوسری جانب ان کی وہ مفروضہ بلند و بالا عمارت ہوتی ہے جو انہیں گرتی نظر آتی ہے۔ لہٰذا اس خود ساختہ عمارت کو سہارا دینے کے لیے دور از کار تاویلات کر کے اس فلک بوس عمارت کو بوسیدہ بلیوں کے سہارے کھڑا رکھنا چاہتے ہیں۔ اور صورت حال کچھ اس قسم کی بنتی ہے جیسے کوئی ایسا شخص پانی میں ڈوب رہا ہو جسے تیرنا نہ آتا ہو اور وہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہو۔ ہمارے قارئین بھی تھوڑا سا تماشا دیکھیں۔

حافظ بدرالدین عینی اس حدیث کی شرح میں رقم طراز ہیں۔

یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حدیث سفینہ رض والی روایت جسے اربعہ نے نقل کیا ہے

اور جسے ابن حبان نے صحیح کہا ہے' اس کے معارض ہے کیونکہ اس میں مدت خلافت تیس سال بیان کی گئی ہے غالباً ان بارہ خلفاء میں خلفاء اربعہ اور حضرت حسنؓ داخل نہیں (یعنی چاروں خلفاء اور حضرت حسنؓ بارہ کی تعداد میں داخل نہیں۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلطی کی آپ کو بارہ کے بجائے سترہ کہنا چاہیئے تھا۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلفاء کی تعداد بارہ سے بہت زیادہ ہے۔

پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ حدیث سفینہؓ میں خلافت نبوت بیان کی گئی ہے۔ (اس کا جواب اوپر گزر چکا) اور جابر بن سمرہ کی حدیث میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ خلفاء بارہ سے زیادہ نہ ہوں گے۔

کہا جاتا ہے کہ ان بارہ خلفاء سے مراد خلفاء بنو امیہ ہیں۔ کیونکہ جب بنو امیہ کی خلافت ختم ہوئی تو بڑے بڑے فتنے واقع ہوئے اور خلافت عباسیہ قائم ہونے کے بعد حالات میں ایک زبردست اور واضح تغیر پیدا ہوا۔ (قارئین ذرا ان الفاظ پر غور فرمالیجئے کہ حافظ عینی کتنے پتہ کی بات کہہ گئے ہیں یعنی بنو امیہ کو مفت میں بدنام کیا گیا۔

ایک قول یہ ہے کہ بارہ خلفاء سے مراد حضرت ابو بکر صدیقؓ سے لے کر عمر بن عبد العزیزؒ تک بالترتیب خلفاء مراد ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے یہ چودہ افراد بنتے ہیں۔ ان میں سے مروان کی خلافت تو درست نہیں اور معاویہ بن یزید کی خلافت بہت مختصر تھی (حضرت حسن کی خلافت بھی بہت مختصر تھی۔) عمر بن عبد العزیز کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی۔ اور اس طرح خیر القرون میں سے پہلا قرن ختم ہوا۔ عمدۃ القاری شرح بخاری ج ۲۴ ص ۲۸۲۔

حافظ عینی کے بقول یہ بارہ خلفاء بالترتیب اس طرح ہیں۔ ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علیؓ بن ابی طالب، حسنؓ بن علیؓ، امیر المومنین معاویہؓ، یزید بن معاویہ۔ عبد اللہ بن الزبیرؓ۔ عبد الملک بن مروان۔ ولید بن عبد الملک۔ سلیمان بن عبد الملک، عمر بن عبد العزیز۔

خلفاء کی اس ترتیب کو اگر قبول کر لیا جائے تو چند امور خود بخود ثابت ہو جائیں گے۔

۱۔ اول تیس سال والی داستان تو غلط ہے۔

۲۔ ملوکیت کا دور دورہ بنو امیہ کے بعد ہوگا۔ بنو امیہ کا دور ملوکیت سے پاک رہا۔ اگر ملوکیت کا تمغہ کسی کے سینہ پر لگایا جا سکتا ہے تو وہ بنو عباس ہیں جنہوں نے علویوں اور ایرانیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ختم کیا اور اس معاشرہ کو جو خالص عربی معاشرہ تھا اسے تبدیل کر کے اس پر سبائیت اور ایرانیت کا غلاف چڑھایا۔ ایک کہاوت ہے کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ یہ جادو کی کرم فرمائی ہے کہ کوشش تو یہ ہو رہی تھی کہ تیس سال بعد خلافت کا کوئی وجود نہیں رہا۔ اور حافظ عینی ثابت یہ کر گئے کہ خلافت ۱۰۱ھ تک یعنی پورے نوے سال قائم رہی۔

جامع ترمذی کے محشی نے اس بارہ خلفاء والی روایت پر جو حاشیہ چڑھایا ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے کارگزاری دکھائی ہے وہ داد دینے کے قابل ہے۔ اس کا کچھ نمونہ ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ بارہ خلفاء سے مراد وہ خلفاء ہوں جو صحابہ کے بعد گزرے ہیں۔ اور وہ لوگ ہیں :۔

یزید بن معاویہ، معاویہ بن یزید۔ ابن الزبیر اس فہرست میں داخل نہیں اس لیے کہ وہ صحابی ہیں۔ اور مروان ان خلفاء میں داخل نہیں ہو سکتا کہ اس کی بیعت ابن الزبیر کے بعد ہوئی۔ اس لیے وہ غاصب ہے۔ اور ان کے بعد عبدالملک، پھر ولید بن عبدالملک، سلیمان۔ عمر بن عبدالعزیز۔ یزید بن عبدالملک۔ ہشام بن عبدالملک۔ ولید بن یزید بن عبدالملک۔ یزید بن ولید بن عبدالملک، ابراہیم بن الولید اور مروان بن محمد۔

گویا محشی کے نزدیک خلفاء کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ خلفاء جو صحابہ ہیں اور یہ سب ایک صف میں داخل ہیں۔ لہٰذا خلفاء اربعہ جن کی مدت خلافت تیس سال ہے۔ ان کے ساتھ امیر المومنین معاویہؓ کی مدت خلافت بیس سال مزید شمار کیجئے۔ اس طرح یہ مدت پچاس سال ہوگی اور اگر اس کے ساتھ ابن زبیرؓ کے آٹھ سال بھی شمار کر لیے جائیں تو یہ اٹھاون سال ہوتے ہیں۔ اور ہر صورت میں تیس سالہ کہانی کالعدم ہو جاتی ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے سوال از گندم جواب از جو۔

۲ ۔ وہ خلفاء ہیر مخالف نہ تھے ۔ اس لحاظ سے بارہ خلفاء والی روایت میں جو اسلام کی عزت اور غلبہ کا ذکر آرہا ہے اس سے مراد خلفاء بنی امیہ ہیں اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سلسلہ میں پیشین گوئی فرما رہے ہیں۔ محشی آگے لکھتے ہیں ۔

ہوسکتا ہے کہ ان بارہ خلفاء سے وہ خلفاء مراد ہوں جو امام مہدی کے بعد ہوں گے ۔ ان میں سے پانچ تو حضرت حسین رض کی اولاد میں سے ہونگے ، پانچ حضرت حسن رض کی اور باقی دو خاندان بنی ہاشم سے ہونگے ۔

سچ کہا ہے کسی نے اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنوں اپنوں کو دے ۔ ابھی تک تو صرف دو مہدیوں کا جھگڑا تھا ایک سنی اور ایک شیعہ ابھی خبر نہ تھی کہ اس امت کو بارہ مہدیوں کے فتنے میں مبتلا ہونا پڑے گا حسینیوں کو سبائی سے بھاگیں گے۔ حسنی اور ہاشمی سینوا سے گلے پڑیں گے ۔ کیونکہ کوئی سبائی غیر حسینی کو برداشت نہیں کر سکتا ۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ بارہ خلفاء سے خاص خاص خلفاء مراد ہوں جن کی تعداد قیامت تک پوری ہوگی.... اور غالباً یہ بتانے کے لیے کہ یہ خاص خلیفہ ہے ۔ امام تشریف لائیں گے یا کوئی پیر صاحب بذریعہ کشف لوگوں کو مطلع فرمائیں گے ۔ ہم تو صرف یہی عرض کر سکتے ہیں کہ ہمیں تو علماء کی اس ہوسناکی نے تباہ کر دیا ہے ۔ اور جب ہمارے علماء کرام یہ حاشیہ پڑھ کر طلباء کو اس حدیث کا یہ مفہوم سمجھائیں گے تو امت کا کیا حشر ہوگا ۔

قارئین کرام آپ نے دیکھا کہ ایک صحیح حدیث سے فرار کے لیے کیا کیا راہیں اختیار کی گئیں تاکہ تیس سالہ کہانی ہاتھ سے جانے نہ پائے ۔ اور یہ فرضی عمارت علی حالہ قائم رہے ۔ لیکن آپ حضرات نے یہ بھی دیکھا کہ الٹ پھیر کے باوجود بارہ خلفاء کو کس طرح تسلیم کیا گیا ۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے ذریعہ غلبۂ اسلام کا تاج ان علماء نے بنی امیہ کے سر باندھ دیا ہے ۔ لیکن قارئین ان علماء کو یہ بات بتلاتے نہیں ۔ اگر آپ نے ان کے سامنے یہ بات کہہ دی تو بنو امیہ کے ظلم وجور کے فسانے شروع ہو جائیں گے ۔ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۔ — حق آیا اور باطل مٹ گیا ۔ کیونکہ باطل مٹنے ہی کی چیز ہے ۔

اگر آپ حضرات یہ تصور کرتے ہیں کہ ہم تو دنیا سے انوکھی باتیں کرنے کے عادی ہیں تو آئیے

سید سلیمان ندوی مرحوم کے خیالات بھی پڑھ لیجئے۔ وہ سیرت النبی میں لکھتے ہیں۔

آپ کے بارہ خلفاء کے ہونے کی بشارتیں کئی مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ میں آئی ہیں۔ صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں۔ اس وقت تک یہ اسلامی حکومت اچھی رہے گی جب تک اس پر بارہ خلفاء حکمران نہ ہو لیں۔۔۔۔۔ بارہ خلفاء تک اسلام معزز اور محفوظ رہے گا۔۔ میرے بعد قریش میں سے بارہ خلیفہ ہوں گے پھر جھوٹے لوگ ہوں گے۔ ابوداؤد کتاب المہدی میں یہ الفاظ ہیں۔ یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا۔ یہاں تک کہ اس میں بارہ خلیفہ گزر جائیں ایسے خلفاء جن پر تمام امت مجتمع ہوگی۔

اہل سنت میں سے قاضی عیاض اس حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ تمام خلفاء میں سے بارہ وہ شخص مراد ہیں جن سے اسلام کی خدمت بن آئی ہو اور وہ متقی ہوں، حافظ ابن حجر ابوداؤد کے الفاظ کی بنا پر خلفاء راشدین اور بنی امیہ میں سے ان بارہ خلفاء کو گنتے ہیں جن کی خلافت پر امت کا اجتماع رہا یعنی

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ، یزید، عبدالملک، ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز، یزید بن عبدالملک، ہشام۔ سیرت النبی ص ۳ ج ۳۰۲ ۔

حافظ ابن حجر کے اس قول سے تیس سالہ والی داستان باطل ہو گئی۔ اور انہوں نے بالترتیب بارہ خلفاء تسلیم کر لیے۔ لیکن ان خلفاء کی ترتیب میں اجماع امت کو ملحوظ خاطر رکھا۔ اسی لیے ابن الزبیر، مروان، معاویہ بن یزید اور حضرت حسنؓ کا نام شامل نہیں کیا۔ لیکن ہمیں افسوس یہ ہے کہ ان حضرات کو اس فہرست میں اس لیے داخل نہیں کیا گیا کہ ان پر اجتماع امت نہیں تو یہ اجماع امت تو حضرت علیؓ پر بھی نہ تھا۔ بلکہ تقریباً چند صحابہ کے علاوہ تمام صحابہ نے ان کی بیعت نہیں کی۔ تو ان کا نام اس فہرست میں کیسے داخل ہوگا بات وہی حق ہے جو شاہ ولی اللہ اور امام ابن تیمیہ نے فرمائی کہ حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ خلیفہ ہی نہیں۔ الغرض ہر صورت میں حدیث سفینہؓ باطل ثابت ہوتی ہے۔ اجماع امت کی شق کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ان بارہ کی ترتیب اس طرح ہوگی۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ۔ امیر معاویہؓ۔ یزید بن معاویہ۔ عبدالملک بن مروان ولید بن عبدالملک۔ سلیمان بن عبدالملک۔ عمر بن عبدالعزیز۔ یزید بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک

اور ولید بن یزید بن عبدالملک۔ اس طرح ان بارہ خلفاء کا دور ۱۲۶ھ پر ختم ہوا۔ اور اس کے بعد امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ مبارک میں بنو امیہ کے دور حکومت کی خوبیاں بیان فرما دیں کہ ان کے دور میں اسلام معزز اور غالب رہے گا۔ اور مسلمانوں میں اجتماعیت قائم رہے گی۔ اور جو لوگ اس اجتماعیت کو ختم کریں گے وہ جھوٹے لوگ ہوں گے۔ ان کے دور میں نہ اسلام کو عزت حاصل ہوگی اور نہ اسلام غالب رہے گا۔ یہ بنو امیہ کی اتنی بڑی فضیلت ہے کہ اس پر خلافت عباسیہ اور خلافت فاطمیہ اور خلافت عثمانیہ سب قربان کی جا سکتی ہیں۔

آمدم برسر مطلب۔ گفتگو چل رہی تھی حدیث سفینہ رض پر کہ اس روایت کو تسلیم کرنے سے جہاں متعدد احادیث کا انکار لازم آتا ہے۔ وہاں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ملوکیت کا فساد پھیلانے میں حضرت حسن رض اور تمام الصحابہ نہ صرف امیر معاویہ رض کے شریک کار ہیں بلکہ اس خوشی میں اس سال کو عام الجماعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جن حضرات نے حدیث سفینہ رض پر بنیاد قائم کر کے حضرت علی رض اور حضرت حسن کو خلافت نبوت میں زبردستی داخل کیا تھا۔ انہوں نے دوسرے مقام پر بارہ خلفاء کے نام گنتے وقت خلفاء بنو امیہ کو شامل کر کے اپنے کئے کرائے پر خود ہی پانی پھیر دیا ہے۔ اور جن لوگوں کو ملزم ثابت کرنے کے لیے تاویلات کا سہارا لیا تھا غلطی سے انہی کو ہیرو ثابت کر دکھایا۔

اب آئیے ایک بہت بڑے محدث و مفسر اور فقیہ کے تخیلات بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ان کا نام گرامی محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن احمد بن العربی المعافری الاشبیلی المتوفی ۵۴۳ھ ہے جو علماء میں قاضی ابوبکر بن العربی کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ اپنی مشہور زمانہ کتاب "العواصم والقواصم" میں رقم طراز ہیں

حدیث سفینۃ لا یصح ولو صح فھو معارض ھذا الصلح المتفق علیہ فوجب الرجوع علیہ۔ العواصم والقواصم ص ۲۰۱۔

حدیث سفینہ رض صحیح نہیں۔ اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو اس صلح کے معارض ہے جس پر سب کا اتفاق ہو چکا۔ لہٰذا اس صلح کی جانب رجوع کرنا واجب ہے۔

قاضی ابوبکر بن العربی شارح ترمذی کے نزدیک حدیث سفینہ رض قطعاً صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر اسے

صحیح مان لیا جائے تو وہ صلح جو حضرت حسنؓ اور امیر المومنین معاویہؓ کے درمیان واقع ہوئی۔ جس پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہوا۔ اور جس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی اور حضرت حسنؓ کی یہ فضیلت بیان فرمائی کہ میرا یہ بیٹا مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرائے گا۔ بلکہ اسی فضیلت کے سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ کو سید کے خطاب سے یاد فرمایا۔ اس حدیث سفینہؓ کو ماننے کے بعد یہ صلح، یہ بشارت اور یہ فضیلت سب کالعدم ہو جائے گی۔

بلکہ اس کے برعکس یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت حسنؓ نے اپنے ہاتھوں خلافتِ نبوت ختم کرکے ملوکیت کے لیے راہ ہموار کی۔ اور تمام صحابہ کرام برضا و رغبت اس فساد پر متفق ہوئے اور تمام صحابہ نے مجموعی طور پر نبوت کی اس یادگار کو ختم کیا۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ۔

اس صورت حال کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم بھی وہی روش اختیار کریں جو قاضی ابوبکر ابن العربیؒ، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ نے اختیار کی۔ ورنہ سبائیوں کا یہ دعویٰ کہ وفات رسول کے بعد سب صحابہ دین سے پھر گئے تھے اس پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے گی۔ گویا یہ حدیث سفینہؓ ایک مخفی تبرا ہے جس کی لپیٹ میں سب صحابہ داخل ہو رہے ہیں۔

علامہ محب الدین الخطیب المصری جو موجودہ صدی کے ایک مسلّم محقق ہیں "العواصم والقواصم" کے حاشیہ پر رقم طراز ہیں۔

حدیث سفینہؓ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت سفینہؓ سے یہ روایت نقل کرنے والا سعید بن جمہان ہے۔ اور اس کے سلسلہ میں محدثین کا اختلاف ہے۔ بعض محدثین کہتے ہیں اس میں کوئی برائی نہیں، بعض کہتے ہیں ثقہ ہے لیکن امام ابوحاتم رازی فرماتے ہیں کہ یہ ایک شیخ ہے لیکن اس کی حدیث کو ہرگز حجت نہ مانا جائے (یعنی کہ ایسی روایت پر عقیدہ کی بنیاد رکھنا) اور سعید بن جمہان سے نقل کرنے والا حشرج بن نباتہ الواسطی ہے جسے اگرچہ بعض نے ثقہ کہا ہے۔ لیکن نسائی کہتے ہیں یہ قوی نہیں۔

عبداللہ بن احمد بن حنبل نے اس روایت کو سوید الطحان سے نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں یہ حدیث میں کمزور ہے۔ اور یہ روایت اس صحیح حدیث کے خلاف ہے جو صحیح

مسلم کتاب الامارت میں حضرت جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا یہ امر اس وقت تک منقطع نہ ہوگا جب تک بارہ خلیفہ نہ گزر جائیں۔ پھر آپ نے آہستہ سے کوئی بات فرمائی جو میں نہ سن سکا۔ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا۔ انہوں نے کہا آپ نے فرمایا تھا کہ یہ بارہ خلفاء قریش سے ہوں گے۔ آپ اس حدیث کو صحیح بخاری میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

نیز سنن ابی داؤد اور مسند احمد میں مسروق بن الاجدع سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے پاس بیٹھے تھے، اور وہ ہمیں قرآن پڑھا رہے تھے۔ ایک شخص نے ان سے عرض کیا۔ اے ابوعبدالرحمان کیا تم صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ اس امت کے مالک کتنے خلیفہ ہوں گے؟ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا جب سے میں عراق آیا ہوں مجھ سے آج تک یہ سوال کسی نے نہیں کیا تھا۔ پھر اس کے بعد فرمایا ہاں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا۔ بارہ خلفاء ہوں گے بنو اسرائیل کے نقیبوں کی تعداد کے مطابق

محب الدین خطیب لکھتے ہیں یہ حدیث مجمع الزوائد ج ۵ ص۱۹۰۔ مسند احمد ج ۵ ص۸۶، ۸۷ پر تین سندات سے ص۸۸، ص۸۹، ص۹۰ پر تین سندات سے ص۹۲ پر تین سندات سے ص۹۳ پر دو سندات سے ص۹۴، ص۹۵ پر دو سندات سے ص۹۷ پر دو سندات سے ص۹۸ پر تین سندات سے ص۹۹ پر تین سندات سے ص۱۰۰، ص۱۰۱ پر دو سندات سے ص۱۰۷ پر دو سندات سے ص۱۰۸ پر دو سندات سے اور مسند ابی داؤد طیالسی میں حدیث نمبر ۷۶۷ و حدیث نمبر ۱۲۷۸ موجود ہے۔ العواصم والقواصم ص۲۰۱، ص۲۰۲۔

قارئین کرام آپ نے دیکھا کہ محب الدین الخطیب المصری نے حوالجات پر کتنا زور صرف کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام انہوں نے بلاوجہ انجام نہیں دیا ہے۔ بلکہ صرف یہ دکھانے کے لیے انجام دیا ہے کہ جس روایت کے بل بوتے پر خلافت راشدہ اور ملوکیت کے چکر ملائے گئے ہیں جہاں وہ روایت ضعیف ہے وہاں وہ صحیح احادیث کے بھی معارض ہے۔

اب صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد کی ایک اور حدیث ملاحظہ ہو۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں نے خواب میں دیکھا ۔

کہ ایک سائبان ہے جس سے گھی اور شہد ٹپک رہا ہے۔ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ہاتھوں سے بھر بھر کر اسے لوٹ رہے ہیں۔ کچھ نے اس میں سے گھی اور شہد خوب لوٹا ہے اور کچھ نے کم ۔

پھر میں نے آسمان سے زمین تک ایک رسی لٹکی دیکھی اور میں نے دیکھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اس رسی کو پکڑا اور اوپر چڑھ گئے۔ پھر ایک اور شخص آیا اس نے رسی تھامی اور وہ بھی اوپر چڑھ گیا۔ پھر ایک تیسرا شخص آیا اور اس نے رسی تھامی اور وہ بھی اوپر چڑھ گیا۔ پھر ایک چوتھا شخص آیا اس نے رسی تھامی لیکن وہ درمیان سے منقطع ہو گئی، وہ رسی پھر خود بخود جڑ گئی اور وہ شخص اوپر چڑھ گیا۔ اور وہ رسی اوپر اٹھالی گئی ۔

حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی تعبیر بیان کروں۔ آپؐ نے انہیں اس کی اجازت مرحمت فرمائی انہوں نے فرمایا۔

سائبان سے مراد اسلام ہے اور اس سے جو گھی اور شہد ٹپک رہا ہے اس سے قرآن کی نرمی اور حلاوت مراد ہے۔ کسی نے قرآن زیادہ حاصل کیا اور کسی نے کم ۔

وہ رسی جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے۔ اس سے مراد وہ حق ہے۔ جس پر آپ قائم ہیں ۔ اللہ تعالیٰ جب آپ کو دنیا سے اٹھائے گا تو آپ کے بعد اسے ایک اور شخص سنبھالیگا۔ لیکن پھر وہ بھی دنیا سے اٹھ جائے گا۔ پھر اس کام کو ایک اور شخص سنبھالے گا لیکن پھر وہ بھی دنیا سے اٹھ جائے گا۔ پھر ایک تیسرا شخص اسے سنبھالے گا۔ لیکن رسی ٹوٹ جائے گی لیکن پھر وہ رسی خود بخود جڑ جائے گی اور وہ شخص بھی اوپر چڑھ جائے گا۔

اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں نے صحیح تعبیر بیان کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کچھ صحیح ہے اور کچھ غلط اس پر ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ کو قسم دیتا ہوں یہ بتلا دیجئے کہ میں نے کیا غلطی کی۔ آپ نے فرمایا قسم نہ دو۔ ابو داؤد ج ۲ ص ۲۸۸

اس حدیث سے یہ وضاحت کے ساتھ ثابت ہو رہا ہے کہ اصل خلافت نبوت تو تین خلفاء

تک ہے اس کے بعد خلافت نبوت تو باقی نہیں رہی ۔ اور تین خلفاء کی مدت پچیس سال بنتی ہے جس سے تیس سال والی روایت تو خود بخود غلط ثابت ہو جاتی ہے ۔

بخاری و مسلم وغیرہ کی ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیں ۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ ہم یعنی صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ایک دوسرے کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابو بکرؓ پھر عمرؓ اور پھر عثمانؓ ہیں ۔ اور ان کے بعد ہم کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دیتے تھے ۔

ابو داؤد کی ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں ۔

حضرت جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک نیک شخص کو ابو بکرؓ کے ساتھ تولا گیا ۔ پھر ابو بکرؓ کو عمرؓ کے ساتھ تولا گیا ۔ پھر عمرؓ کو عثمانؓ کے ساتھ تولا گیا ۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے تو ہم اس امر پر متفق ہوئے کہ اس نیک شخص سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد تھے اور یہ جو ایک کو دوسرے کے ساتھ تولا گیا تو اس سے مراد وہ حکومت ہے جو اس کام پر ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو کام دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کئے گئے ہیں ۔

ہم نے یہ تمام روایات صرف ابو داؤد سے نقل کی ہیں اور یہ صرف اس لیے کہ اس قسم کی روایات کی تعداد اتنی زیادہ ہے جو حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں جس کو تفصیل درکار ہو وہ شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفاء میں ان روایات کا مطالعہ کرلے ۔ لیکن ابو داؤد نے صحیح سند کے ساتھ ایک ایسی روایت پیش کی ہے جو ہمارے نزدیک قطعاً فیصلہ کن ہے ۔ اور ابو داؤد نے اس روایت پر خلفاء کا بیان ختم کر دیا جس سے یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ امام ابو داؤد کا فیصلہ بھی یہی ہے ۔ روایت کا مضمون اس طرح ہے ۔

حضرت سمرۃ بن جندبؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ایک ڈول لٹکایا گیا ہے ، ابو بکرؓ نے اس ڈول کے دونوں کنارے پکڑے اور اس میں سے کچھ پانی پیا ۔ لیکن ان کے پینے میں کچھ ضعف تھا (ضعف سے مراد مدت خلافت کا کم ہونا ہے)

پھر عمرؓ نے اس ڈول کے دونوں کنارے پکڑے اور اس میں سے کچھ پانی پیا، پھر عثمانؓ آئے اور انہوں نے بھی خوب سیراب ہو کر پانی پیا۔ اس کے بعد علیؓ آئے اور انہوں نے ڈول کی لکڑی پکڑی۔ لیکن وہ ڈول ایک جھٹکے کے ساتھ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس ڈول سے پانی کے کچھ چھینٹے ان پر پڑ گئے۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۲۸۹۔

انہی روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں یہ فیصلہ دیا۔ کہ حضرت علیؓ خلیفہ نہیں تھے۔ اس لیے کہ مملکت کا نظام ان کے قبضہ میں نہ آسکا۔ اور ان کے زیر نگیں صرف ایک شہر کوفہ ان کے پاس رہ گیا تھا۔ اس لحاظ سے ان کو خلیفہ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا پانچ سالہ دور فتنہ و فساد کا دور رہا۔ اور یہ پانچ سالہ دور بغیر خلیفہ کے گزرا۔ پھر امیر معاویہؓ خلیفہ ہوئے۔

ابوداؤد کی اس حدیث کو دیکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خلافت کا ڈول ان کے قبضہ میں نہیں آسکا اور نہ وہ اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے۔ ہاں خلافت کے نام کے ان کے اوپر چھینٹے ضرور پڑ گئے۔ اور غالباً امام ابوداؤد بھی یہی بات واضح کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت سمرہؓ بن جندب کی اس حدیث سے حضرت سفینہؓ والی تیس سالہ روایت تو کالعدم ہو گئی۔ بلکہ سمرہؓ کی اس حدیث اور اوپر کی تمام احادیث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ خلافت اربعہ کا جو تصور آج امت میں پایا جاتا ہے دور صحابہ میں اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ صحابہ کرام صرف دو خلافتوں کے قائل تھے۔ ایک خلافت علی منہاج النبوت جس کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ وہ عثمانؓ پر ختم ہو چکی۔ اور دوسری خلافت عامہ۔ اب اس کی خواہ حضرت علیؓ سے ابتداء کی جائے یا امیر معاویہؓ سے بہر صورت یہ خلافت عامہ بھی خلافت کہلاتی تھی۔ اس خلافت عامہ کے سر پر ملوکیت کا سہرا چودھویں صدی کے ان علماء نے سجایا ہے جنہوں نے صرف سبائی روایات پر تاریخ کی بنیاد رکھی اور اس کے ذریعہ انہوں نے صحابہ کرام کے معاملہ میں فیصلہ صادر کیا۔

خلفاء اربعہ کا یہ تصور بنو بویہہ نے چوتھی صدی میں پیش کیا جو کٹر رافضی تھے۔ اور فارسی زبان میں اس کی ترویج کے لیے چہار یار کی اصطلاح استعمال کی۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور

تینوں خلفاء مل کر چھ بارہ بن جاتے ہیں۔

جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر احادیث کا مطالعہ کریگا اس کے سامنے چند حقائق خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

۱۔ اصل خلیفہ صرف تین ہیں

۲۔ اکثر صحابہ نے حضرت علی سے تعاون نہیں کیا۔

۳۔ صحابہ کرام ان آپس کے جھگڑوں کو فتنہ سے تعبیر کرتے رہے۔

۴۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی نشاندہی فرمائی تھی کہ عنقریب ایک فتنہ ظاہر ہوگا جو عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا۔ اور اس سے بچنے کی حضورؐ نے تلقین فرمائی تھی۔ اس مضمون کی روایات مستفیض کے درجہ میں ہیں۔ صحابۂ کرام اور تابعین کبار کے نزدیک یہی فتنہ تھا

۵۔ اس فتنہ کا خاتمہ اس وقت ہوا جب حضرت حسنؓ نے امیر معاویہؓ سے صلح فرمائی۔

۶۔ امیر معاویہؓ سے دوسری خلافت کی ابتدائی ہوئی۔ اور ان تمام صحابہ نے جو حیات تھے متفقہ طور پر ان کی بیعت فرمائی۔

۷۔ اب یہ دو حال سے خالی نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بارہ خلفاء کے سلسلہ میں بشارت دی ہے۔ اس میں پہلے تین خلفاء داخل ہیں یا نہیں اگر داخل ہیں تب بھی اس بشارت میں بنو امیہ کے بارہ خلفاء داخل ہوتے ہیں اور اگر خلفاء ثلثہ علیحدہ ہیں تو بارہ کے بارہ بنو امیہ سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ وہ دور ہے جس میں اسلام غالب رہا ہے۔ اور امت ایک خلیفہ پر مجتمع رہی۔ لیکن بنو امیہ کی خلافت ختم ہونے کے بعد جب بنو عباس خلافت پر قابض ہوئے تو چند سال بعد اندلس میں خلافت امویہ قائم ہوگئی۔ اسی طرح امت دو خلافتوں میں تقسیم ہوگئی اور پھر یہ تقسیم کا عمل روز بروز بڑھتا گیا۔ اور مسلمان روز بروز زوال پذیر ہوتے گئے۔ اس لحاظ سے یہ بنو امیہ کی بہت بڑی فضیلت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہوئی۔ اب اس دور کو ملوکیت اور شہنشاہیت سے وہی شخص تعبیر کر سکتا ہے کہ جو اسلام کا دشمن یا حدیث کے معاملہ میں اس کی نظر انتہائی سرسری سی ہو۔

یہ امر واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ حضرت علیؓ خلیفہ ہوں یا نہ ہوں۔ امیر معاویہؓ خلیفہ ہوں یا ملوکیت کے بانی۔ لیکن ہر دو کے بارے میں یہ تصور کہ انہوں نے رشد و ہدایت کے خلاف کوئی کام انجام دیا۔ یا خلاف شریعت کوئی فعل کیا۔ یا عمداً کسی گناہ کے مرتکب ہوئے۔ یا وہ رشد و ہدایت پر نہ تھے یہ سراسر قرآن کا انکار ہے اس لیے کہ قرآن نے صحابۂ کرام کی شان بیان کی ہے۔

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ	یہ راشد لوگ ہیں
اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ	یہ ہدایت یافتہ لوگ ہیں
اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا	یہ سچے مومن ہیں

قرآن کی ان آیات کی موجودگی میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ امیر معاویہؓ راشد نہ تھے۔ انہوں نے اسلام میں ظلم و عصیان کی بنیاد رکھی۔ مغیرہ بن شعبہؓ رشوت دیا کرتے تھے اور اقتدار کے بھوکے تھے۔ عمرو بن العاصؓ دھوکے دیا کرتے وغیرہ وغیرہ جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ شخص قرآن کو صاف جھٹلا رہا ہے۔ بلکہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیاذاً باللہ غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ الغرض ایسی تمام روایات جو صحابہ کی اس شان کے خلاف ہوں جو قرآن نے بیان کی ہے ان سب روایات کو گٹر میں پھینک دینا چاہیے۔ خواہ وہ طبری کی روایات ہوں یا مسعودی کی، واقدی کی روایات ہوں یا کلبی و سدی کی۔ ایک مومن ہونے کی حیثیت سے قرآن پر ایمان لانے سے نجات ممکن ہے۔ اور ان سبائی مورخوں کی روایات کی تسلیم کرنے پر ہرگز بھی ہماری نجات موقوف نہیں۔

قارئین کرام کتاب و سنت سے ہم نے جو کچھ اخذ کیا وہ آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ مزید تفصیل کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ ہم نے جو یہ بحث کی ہے تو یہ بلحاظ خلافت بحث کی ہے۔ اس سے آپ یہ ہرگز تصور نہ کریں کہ ہم حضرت امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ سے افضل سمجھتے ہیں۔ حاشا و کلا حضرت علیؓ کا مقام حضرت معاویہؓ سے ہزارہا درجہ بلند ہے۔ بلحاظ فضیلت ان ہر دو حضرات میں ہرگز موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس گفتگو کا مقصد صرف اتنا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے سلسلہ میں کیا کیا ارشادات

فرمائے۔ اور صحابہ کا اس معاملہ میں طرزِ عمل ۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اور اس کے بعد صحابہ کا قول و عمل حجت ہے۔ تاریخ حجت نہیں

ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے اس سلسلہ میں ہم سے کہاں کہاں غلطیاں ہوتیں ہیں اور کس کس مقام پر ہم نے ٹھوکر کھائی اس کا فیصلہ تو بارگاہِ الٰہی میں جاکر ہوگا۔ ہم تو اپنے پروردگار سے یہی درخواست کرسکتے ہیں :۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۔ الحشر

اے ہمارے رب ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ایمان میں ہم پر سبقت کر چکے۔ اور اہلِ ایمان کی جانب سے ہمارے دلوں میں کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب آپ رءوف رحیم ہیں۔

مقامِ ولایت

ایک حدیث قدسی

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ کہ جو شخص میرے ولی سے دشمنی رکھے گا میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں۔ بندہ جن چیزوں کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا ہے۔ مجھے ان میں سب سے زیادہ محبوب وہ امور ہیں جو میں نے اپنے بندے پر فرض کئے ہیں۔ اور میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ میرا محبوب بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں میں اس (ولی) کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی بینائی بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کو وہ پھیلاتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

اگر یہ میرا ولی مجھ سے کوئی سوال کرتا ہے تو میں اس کا سوال پورا کرتا ہوں۔ اور اگر پناہ مانگتا ہے تو میں اسے ضرور پناہ دیتا ہوں۔ اور جو مومن موت کو برا سمجھتا ہو۔ مجھے اس کی جان لینے میں جتنا تردد ہوتا ہے اتنا کسی شے میں تردد نہیں ہوتا۔ اور میں اس کی برائی پسند نہیں کرتا۔ بخاری ج ۲ ص ۹۶۳

خطابی کہتے ہیں یہ سب تمثیل ہے۔ اور ہو سکتا ہے مراد وہ اعضا ہوں جن کے ذریعہ انسان ان اعمال کو انجام دے جو اللہ کی رضا کا ذریعہ ہوں۔۔۔۔۔ الفاظ کو خواہ کتنا گھما پھرا لیجئے بات وہیں کی وہیں رہے۔

توضیح میں ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ان باتوں کو مجاز اور کنایہ تسلیم کیا جائے گا۔ اور ان تمام امور سے مراد بندے کی نصرت و اعانت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ خود کو بندے کے اعضاء کی منزل پر پہنچا دیتا ہے جن سے وہ مدد حاصل کرتا ہے۔

سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے لیے تردد ثابت کیا گیا ہے جو ایک

امر محال ہے جسے بلا تاویل قبول کرنا ممکن نہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس حدیث کا ترجمۃ الباب یعنی سرخی سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔ بجز اس کے کہ یہ تاویل کی جائے کہ نوافل کی ادائیگی بھی تواضع میں داخل ہے۔
حاشیہ بخاری ج ۲ صـ ۹۶۳

یہ روایت اپنے ظاہری معنی کے ساتھ تو ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ تاویلات کا سہارا نہ لیا جائے تاویلات کا سہارا لئے بغیر اسے علماء ظاہر کے لئے قبول کرنا انتہائی دشوار ہے۔ ہاں باطنی اور وحدت الوجود کے قائلین اس روایت کا خوب پرچار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں اللہ اور بندے کے درمیان عبدیت کی بجائے جزئیت کا رشتہ ہے یا اس کے وہ افراد قائل ہو سکتے ہیں جن کا عقیدہ یہ ہو کہ علیؓ کے پردے میں خدا کارفرما تھا

ہم تو یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے تردد ممکن ہے یا نہیں۔ اس عقدہ کو یا تو ماہرین علم باطن حل کر سکتے ہیں یا وہ حضرات اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں جنھوں نے ہر روایت کو قرآن کے برابر معتبر سمجھ رکھا ہو شارحین بخاری نے تو اس مسئلہ کو کوئی خاص حل نہیں کیا۔

ہم نے حصہ دوم کے مقدمہ میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ حافظ الحدیث ابوالولید الباجی جنھوں نے بخاری کے چاروں قلمی نسخے دیکھے تھے۔ انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ فربری کے نسخہ میں جو آج کل لوگوں کے پاس ہے اور شائع ہوتا ہے تین سو حدیثیں باقی نسخوں سے زیادہ ہیں۔ کہیں یہ روایت ان فوائد زوائد میں سے تو نہیں؟

حافظ ابوالولید الباجی یہ بھی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے کچھ روایات حاشیہ پر نوٹ کی تھیں اور کچھ روایات پرچوں پر لکھی ہوئی تھیں۔ جنھیں ناقلین نے اپنی اپنی عقل کے مطابق بخاری میں داخل کیا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے جو متعدد روایات ترجمۃ الباب سے تعلق نہیں رکھتیں۔

گویا بقول حافظ ابوالولید الباجی ایک امکان یہ بھی ہے کہ وہ روایات جنکا ترجمۃ الباب سے تعلق نہ ہو وہ کسی پرچہ پر لکھی ہوئی روایت ہوں جو کسی ناقل نے اصل متن میں داخل کر دی ہوں۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ امام بخاری نے جو روایات حاشیہ پر یا علیحدہ کاغذ پر لکھی تھیں وہ اپنی صحیح میں جمع کرنے کے لئے لکھی ہوں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سوچ بچار کے لئے لکھی گئی ہوں۔ اور چونکہ وہ امام بخاری کے قلم کی جمع

کردہ تھیں اس لئے انھیں بخاری میں داخل کر دیا گیا ہو۔

سندی لحاظ سے بھی یہ روایت کافی مشکوک ہے

حافظ بدرالدین عینی رقم طراز ہیں

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اس حدیث کے راوی خالد پر اعتراض ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں اس کی روایات منکر ہوتی ہیں۔ ابوحاتم کہتے ہیں انکی روایت حجت نہیں اور ابن عدی نے خالد کی دس[10] روایات کو منکر قرار دیا ہے جن میں سے ایک روایت یہ بھی ہے۔

گویا ابن عدی ان لوگوں میں داخل نہیں جو بخاری کی روایات کو قرآن کی طرح شک وشبہ سے بالا تر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ روایت منکر ہے۔

اس کے ایک اور راوی شریک پر بھی اعتراض ہے۔ یہ معراج کی حدیث کا راوی ہے۔ جس میں اس نے کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر سے کام لیا ہے۔ اور ایسی روایات بیان کی ہیں جو کسی اور نے بیان نہیں کیں

امام عینی فرماتے ہیں ہمارا جواب یہ ہے کہ خالد کے بارے میں ابن معین کہتے ہیں اس میں کچھ حرج نہیں۔ ابوحاتم کہتے ہیں اس کی حدیث لکھ لی جائے۔ ابوداؤد کہتے ہیں سچا ہے شیعہ ہے اور میرے نزدیک انشاءاللہ کوئی حرج نہیں۔

رہا شریک تو یحییٰ بن معین اور نسائی کہتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔ محمد بن سعد کہتے ہیں ثقہ ہے بہت سی احادیث کا راوی ہے۔ عمدۃ القاری ج ۲۳ ص ۸۹

یہ امام عینی کی اپنی رائے ہے اور یہ بھی بسا غنیمت ہے کہ انھوں نے بخاری کی روایت کی سند پر کلام کیا اور ابن عدی کا قول بھی نقل کر دیا ہے۔ اگرچہ انھوں نے بخاری کی وکالت فرمائی ہے لیکن باقی شارحین حدیث نے تو اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ علامہ بدرالدین عینی جو ایک حنفی ہیں گویا انھوں نے یہ بات تو قبول کر لی کہ اس روایت کی سند پر اعتراضات ہیں۔ اور کچھ لوگ اس روایت کو قبول نہیں کرتے۔

راویوں پر تو ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ ابھی تو ہمیں کچھ اور باتیں کرنی ہیں۔ جس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ بخاری کی یہ روایت ایک ایسی منفرد روایت ہے جسے اس دور کے کسی محدث نے اپنی کتاب

میں نقل نہیں کیا۔ بعد کے مصنفین میں صرف بیہقی نے اس روایت کو لیا ہے۔ لیکن انھوں نے صرف اتنا کام کیا ہے کہ اپنی سند بخاری تک پہنچا دی ہے۔ اور آگے بخاری کی سند ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام بخاری کے زمانہ تک یہ روایت علم سینہ بسینہ کی طرح راز بن کر چلتی رہی اور سات راویوں تک خبر غریب رہی۔ اور ہماری نظر سے آج تک کوئی ایسی روایت نہیں گزری جو پورے ڈھائی سو سال بلکہ پانچ سو سال یعنی بیہقی کے دور تک غریب رہی ہو۔

بعض روایات صحابہ کے دور میں غریب ہوتی ہیں لیکن دور تابعین میں شہرت حاصل کر لیتی ہیں۔ اور بعض کی شہرت تبع تابعین کے دور میں ہوتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی روایت تبع تابعین کے دور تک بھی شہرت نہ پاتے۔ لیکن اس روایت نے تو غربت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ ہاں بعد کی صدیوں میں صوفیار نے اسے کافی استعمال کیا۔ اور اس روایت کو پیش کر کے اپنی دکان بڑھاتے رہے۔

روایت کی ابتدار ولایت سے شروع ہوتی ہے۔ اور ولایت مذہب شیعہ کا سب سے بڑا ستون ہے حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی۔ بلکہ تمام انبیار صرف اس لیے مبعوث کیے گئے تاکہ لوگوں کو ولایت علیؑ کی تعلیم دیں۔ حتیٰ کہ ان کا دعویٰ ہے کہ خم غدیر میں سورۃ مائدہ کی یہ آیت نازل ہوئی۔

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ

اے رسول تمہارے پروردگار کی جانب سے جو کچھ تمہاری جانب نازل کیا گیا ہے۔ اسے دوسروں تک پہنچا دو۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اپنی رسالت کو نہیں پہنچایا۔

نوری طبرسی نے فصل الخطاب میں بیان کیا ہے کہ اس آیت کے اصل الفاظ اس طرح تھے۔

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ فی ولایۃ علی وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ والاعن تک عذابا الیما

اے رسول تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہاری طرف جو نازل کیا گیا ہے (ولایت علی کے سلسلہ میں) اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اپنی رسالت کی تبلیغ نہیں کی اور اس صورت میں میں اسے بھی تمہیں دردناک عذاب دوں گا۔)

سبائیوں کے یہاں قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ بار بار ولایت علی کے اعلان کا حکم دیتا رہا۔ لیکن آپ ابو بکرؓ و عمرؓ اور قوم کے ڈر سے ولایت علی کا اظہار نہ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کو اس آیت میں عذاب اور صفِ رسالت سے خارج کرنے کی دھمکی دی گئی تو آپ اعلان پر مجبور ہوئے۔ اور ۱۸ ذی الحجہ سنہ کو خم غدیر میں اس کا اعلان فرمایا۔

ہم یہ سب باتیں اس لیے تحریر کرنے پر مجبور ہوئے کہ اس روایت کا ایک راوی ملتِ سبائیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا نام خالد ہے۔ اور حافظ بدرالدین عینی نے بھی اس کے شیعہ ہونے کا ذکر کیا ہے تو آئیے اب حافظ ذہبی کی زبانی ہم اس کا حال ملاحظہ فرمائیں

خالد بن مخلد القطوانی :

یہ شخص کوفہ کا باشندہ ہے۔ اس کی کنیت ابوالہیثم ہے۔ بخاری، مسلم اور نسائی نے اس سے روایات لی ہیں۔

ابوداؤد فرماتے ہیں سچا ہے لیکن تشیع سے کام لیتا ہے۔ احمد بن حنبل فرماتے ہیں اس کی روایات منکر ہوتی ہیں۔ یحییٰ وغیرہ کہتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔ ابوحاتم رازی کا قول ہے اس کی روایت لکھ لی جائے لیکن اس کی حدیث حجت نہیں۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ منکر الحدیث ہے اور بہت غالی شیعہ ہے۔

ابن عدی نے اس کا ذکر کرکے اس کی دس روایات کو منکر قرار دیا۔ جس میں سے ایک روایت یہ بھی ہے۔ پھر فرمایا۔ یہ بہت سی روایات نقل کرتا ہے۔ لیکن انشاء اللہ اس میں کوئی برائی نہیں۔

جوزجانی کا بیان ہے کہ یہ کھلم کھلا شیعہ تھا۔ بہت گالیاں دیا کرتا تھا۔ اور ابونعیم بھی کوفی المذہب تھا یعنی شیعہ (فضل بن دکین، جو بخاری و مسلم کا استاد ہے) اور عبیداللہ بن موسیٰ تو اس سے بھی بدتر تھا (ان کی روایات تمام صحاح میں پائی جاتی ہیں)

امام ذہبی کہتے ہیں اسی طرح عبدالرزاق اور متعدد افراد ہیں (جو شیعہ ہیں)

اس کے بعد امام ذہبی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

فهذا الحديث غريب جدا- ولولا هيبته الجامع الصحيح لعدوه في منكرات خالد بن مخلد و ذلك لغرابة لفظه ولانه مما ينفرد به شريك وليس بالحافظ ولم يرد هذا المتن الا بهذا الاسناد ولا خرجه من عدا البخاري ولا اظنه في مسند احمد

میزان ج ۱ ص ۶۴۳ ۔

یہ حدیث انتہا سے زیادہ غریب ہے۔ اگر جامع صحیح بخاری کی ہیبت محدثین کے دلوں پر طاری نہ ہوتی تو تمام محدثین اس روایت کو خالد بن مخلد کی منکرات میں شامل کرتے۔ اول تو اس کے الفاظ بہت غریب ہیں۔ دوئم اسے شریک کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا اور وہ حافظ الحدیث نہیں۔ اور اس روایت کی کوئی اور سند نہیں۔ اور بخاری کے علاوہ اسے کسی نے روایت نہیں کیا اور میرے خیال میں یہ مسند احمد میں بھی موجود نہیں ۔

ہمیں کوئی صاحب منکر حدیث قرار نہ دیں۔ اور نہ ہم پر کوئی الزام قائم فرمائیں کیونکہ ابن سعد، ابن عدی ذہبی اور امام احمد بن حنبل نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ اور تمام ان باتوں کا اقرار کیا ہے جس کے ہم نے دعوے کئے تھے ۔

اصول حدیث کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شیعہ ایسی روایات پیش کرے جس سے اس کے مسلک کی تائید ہوتی ہو، اسے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ اور اس روایت کے ذریعہ نہ صرف ولایت ثابت کی جارہی ہے بلکہ یہ بھی ثابت کیا جارہا ہے کہ ولی کے روپ میں اللہ تعالیٰ ظہور پذیر ہوتے ہیں ۔

اب دوسرے راوی شریک کا بھی حال سنیئے ۔

شریک بن عبداللہ بن ابی نمر :

ہم گزشتہ صفحات میں ایک شریک بن عبداللہ کا حال بیان کرچکے ہیں۔ وہ شریک بن عبداللہ بن سنان کوفی کا یا شندہ تھا جو بائی المسلک تھا۔ یہ شریک بن عبداللہ بن ابی نمر المدنی ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے احادیث روایت کرتے ہیں۔ ان کی روایات تمام صحاح میں پائی جاتی ہے ۔

یحییٰ بن معین کا قول تو یہ ہے کہ ان میں کوئی حرج نہیں اور دوسرا قول ہے کہ قوی نہیں۔ نسائی بھی

بھی یہی کہتے ہیں۔ ابوداؤد کہتے ہیں ثقہ ہے۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ اگر ان سے ثقہ راوی روایت کرے تو ثقہ ہے

علامہ ابن حزم نے حدیث معراج کے باعث اسے واہی قرار دیا ہے۔ اس روایت کے آخر میں ہے۔

"حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور رب العزت جبار کے قریب ہوئے تو رب العزت نیچے جھک آیا حتیٰ کہ آپ میں اور رب العزت میں دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا"

ذہبی لکھتے ہیں یہ روایت صحیح بخاری کی غریب روایات میں سے ہے۔ میزان ج ۲ صفحہ ۲

گویا مذکورہ روایت کے دو راوی مجروح ہیں اور خالد بن مخلد تو خالص سبائی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ستر وعدے فرمائے تھے

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ ہم باہم یہ گفتگو کیا کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ستر ایسے وعدے فرمائے ہیں جو کسی اور سے وعدے نہیں کئے۔ میزان ج ۲ صفحہ ۱۶

ذہبی کا بیان ہے یہ روایت منکر ہے اور اسے اربد تمیمی کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا۔

اور اس سے یہ روایت نقل کرنے والا منہال بن عمرو ہے جو کٹر شیعہ ہے اور اس کا حال پہلے گزر چکا ہے کہ یہ کٹر شیعہ ہے یحییٰ بن سعید اور ابن حزم وغیرہ نے اس کی روایت ترک کی ہے۔

جوزجانی کا بیان ہے کہ ضعیف ہے۔ میزان ج ۴ صفحہ ۱۶۲

حضرت ثعلبہؓ پر تبرّا

سبائیوں نے صحابہ کرام میں سے کوئی فرد بشر ایسا باقی نہیں چھوڑا جس کے لئے کوئی تبرائی داستان وضع نہ کی ہو۔ اور بعض اوقات وہ داستانیں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ اچھا خاصا انسان ان میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسی داستان کو فقر اور تصوف کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا ہے۔ ایسی ہی تبرائی داستان حضرت ثعلبہؓ بن حاطب بدری کے بارے میں وضع کی گئی ہے۔ قارئین بھی اس داستان سے مستفیض ہو جائیں تو بہتر ہے۔

مفسر قرطبی نے علی ابن زید عن القاسم کی سند سے حضرت ابوامامہ الباہلی سے نقل کیا ہے کہ ثعلبہؓ بن حاطب الانصاری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ مجھے خوب مال عطا فرمائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ تھوڑا مال جس کا شکر ادا کیا جائے اس کثیر مال سے بہتر ہے جسے انسان برداشت نہ کر سکے انہوں نے دوبارہ عرض کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو اللہ کے نبی کے مثل ہو جائے۔ اگر میں چاہتا تو پہاڑ سونے میں تبدیل ہو کر میرے ساتھ چلتے۔

ثعلبہؓ نے عرض کیا اس اللہ کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے۔ اگر آپ اللہ سے دعا فرمائیں پھر وہ مجھے رزق عطا فرمائے تو میں ہر حق دار کا حق پورے پورے طور پر ادا کرونگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے دعا فرمائی۔

انہوں نے ایک بکری خریدی۔ اس نے اس طرح بچے جننے شروع کئے جیسے کیڑے بچے جنتے ہیں (یعنی لاتعداد) حتیٰ کہ مدینہ کی سرزمین ان کی بکریوں کے لئے ناکافی ہو گئی انہوں نے مدینہ چھوڑ دیا اور مدینہ کی ایک وادی میں جا کر بس گئے حتیٰ کہ صرف ظہر اور عصر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے لگے۔ باقی نمازیں ترک کر

دیں۔ پھر بکریوں نے اور بڑھنا شروع کیا حتیٰ کہ انہوں نے جمعہ کے علاوہ سب نمازیں ترک کر دیں۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ان کے مالوں سے صدقہ لیجئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو افراد صدقہ کی وصولیابی کیلئے بھیجے اور انہیں حکم دیا۔ کہ ثعلبہؓ اور بنی سلیم کے فلاں شخص کے پاس جانا۔ اور ان سے صدقہ یعنی زکوٰۃ وصول کرنا۔ یہ دونوں ثعلبہؓ کے پاس پہنچے اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط سنایا۔ انہوں نے جواب دیا یہ زکوٰۃ کیا شے ہے یہ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے۔ اچھا اس وقت تو جاؤ۔ پھر کسی اور وقت ہمارے پاس آنا۔ قرطبی لکھتے ہیں یہ حدیث مشہور ہے۔

ایک ضعیف قول یہ ہے کہ ثعلبہؓ اپنے چچا زاد بھائی کے وارث بنے اور وہ مالدار تھا۔ اس طرح یہ مالدار بن گئے۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت ثعلبہؓ بن حاطب کے بارے میں نازل ہوئی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور ضرور صالح بن کر رہیں گے مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولت مند کر دیا تو وہ بخل پر اتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انھیں اس کی پرواہ تک نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اس دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا جس روز اللہ سے ملاقات ہوگی

مفسر قرطبی فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس آیت کا شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ کا شام سے مال آرہا تھا۔ اس کے پہنچنے میں کچھ دیر واقع ہوئی۔ انھوں نے انصار کی ایک مجلس میں

قسم کھائی کہ اگر میرا مال صحیح سالم پہنچ گیا تو وہ اس مال میں سے صدقہ بھی کرینگے اور صلہ رحمی بھی کرینگے جب وہ مال صحیح وسالم پہنچ گیا تو انہوں نے بخل سے کام لیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

امام قرطبی فرماتے ہیں حضرت ثعلبہؓ بدری اور انصاری صحابی ہیں۔ اور بدر میں کے ایمان کی اللہ اور اس کے رسول نے شہادت دی ہے۔ ان سے جو یہ واقعہ روایت کیا گیا ہے یہ صحیح نہیں۔

ابو عمرو بن عبد البر بھی فرماتے ہیں جس شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ آیت ثعلبہؓ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ کیونکہ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید یہ صحیح نہیں۔ واللہ اعلم۔

ضحاک مفسر کا قول ہے کہ یہ آیت ان تین منافقین میں سے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے نبتل بن الحارث جد بن قیس اور معتب بن قشیر تفسیر قرطبی ج ۴/۸ ص ۲۰

یہ بھی اللہ کا شکر ہے۔ کہ امام قرطبی نے خود ہی اس واقعہ کو رد کر دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ابن عباسؓ کے نام سے یہ شاخسانہ چھیڑ دیا کہ یہ آیت حاطب بن ابی بلتعہؓ کے بارے میں نازل ہوئی اور اس پر قرطبی نے کوئی کلام نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت حاطبؓ ابی بلتعہ بھی بدری صحابی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ مہاجرین مکہ میں داخل ہیں۔ اسے کہتے ہیں یک نہ شد دو شد۔ حالانکہ امام قرطبی کو چاہئے تھا کہ اس کا بھی رد کرتے۔

حیرت تو ابو عمرو بن عبد البر پر ہے کہ وہ تردید بھی کر رہے ہیں تو شاید کہہ کر یعنی شاید صحیح بھی ہو سکتی ہے۔

عقلی طور پر تو مفسر قرطبی نے بھی اس واقعہ کو قبول نہیں کیا۔ لہٰذا ہم عقلی طور پر تو کوئی بحث چھیڑنا نہیں چاہتے۔ آئیے ہم ذرا سندی لحاظ سے بھی اس پر نظر ڈال لیں۔

(امام قرطبی نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ روایت علی بن زید نے قاسم سے نقل کی ہے۔ اور قاسم حضرت ابی امامہؓ باہلی سے۔ تو آئیے ہم پہلے علی بن زید کے چہرے مہرے کو دیکھیں کہ کہیں اس کا تہبند ٹیڑھا تو نہیں۔

علی بن زید۔ اس کا پورا نسب نامہ یہ ہے۔ علی بن عبد اللہ بن زہیر ابی ملیکہ بن جدعان۔ ابو الحسن کنیت ہے قبیلہ قریش کی شاخ بنی تیم سے تعلق رکھتا ہے۔ بصرہ میں سکونت پذیر تھا۔ مسلم۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی

اور ابن ماجہ نے اس کی روایات نقل کی ہیں۔ اس کا شمار علماء تابعین میں ہوتا ہے۔

اس نے انسؓ، ابو عثمان النہدی اور سعید بن المسیب سے احادیث روایت کی ہیں۔ اس سے شعبہ، عبدالوارث اور ایک مخلوق نے احادیث روایت کی ہیں۔

اس علی بن زید کے بارے میں علماء حدیث کا اختلاف ہے۔

جریری کا بیان ہے کہ بصرے کے تین فقہاء کی اچانک بینائی جاتی رہی۔ قتادہ۔ اشعث الحدانی اور علی بن زید۔

منصور بن زاذان کا بیان ہے۔ کہ جب حسن بصری کا انتقال ہوا تو ہم نے علی بن زید سے عرض کیا کہ اب آپ حسن کی مسند سنبھالئے۔

موسیٰ بن اسمٰعیل کہتے ہیں کہ میں نے حماد بن سلمہ سے دریافت کیا کہ وھیب کا دعویٰ ہے کہ علی بن زید حدیث کو یاد نہیں رکھ سکتے۔ حماد نے فرمایا وھیب اتنی ہمت کہاں رکھتے ہیں کہ علی بن زید کے ساتھ بیٹھ سکیں۔ علی بن زید تو بڑے بڑے علماء کے روبرو بیٹھتے ہیں۔

شعبہ جب علی بن زید کی روایت بیان کرتے تو کہتے ہم سے علی بن زید نے اس وقت حدیث بیان کی تھی جب کہ اس کے دماغ نے جواب نہیں دیا تھا۔ اور وہ پاگل نہیں ہوا تھا۔

امام سفیان بن عیینہ اسے ضعیف قرار دیتے ہیں۔

حماد بن زید جب اس کی روایت بیان کرتے تو فرماتے ہم سے علی بن زید نے حدیث بیان کی اور وہ حدیث میں تبدیلیاں کرتا رہتا تھا۔

فلاس کا قول ہے کہ امام الرجال یحییٰ بن سعید القطان اس علی بن زید کی روایت سے دور رہا کرتے تھے۔

امام یزید بن زریع سے منقول ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ علی بن زید تو رافضی تھا اسی لیے تو اس کو تبرا کی ضرورت پیش آئی)۔

امام احمد کا قول ہے یہ ضعیف ہے۔ یحییٰ بن معین نے ایک بار فرمایا یہ قوی نہیں۔ اور ایک بار فرمایا کچھ نہیں۔

احمد العجلی کا بیان ہے کہ یہ شیعہ تھا۔ یہ قوی نہیں ہے۔ بخاری اور ابو حاتم فرماتے ہیں ان کی حدیث حجت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کی روایت لکھ ضروری جائے سو یعنی بغرض تحقیق کیونکہ یہ یزید بن ابی زیاد سے زیادہ بہتر ہے۔

فسوی کہتے ہیں یہ بڑھاپے میں سٹھیا گیا تھا۔ ابن خزیمہ کہتے ہیں میں اس کے حافظ کی خرابی کے باعث اس کی حدیث کو حجت نہیں مانتا۔

ترمذی کہتے ہیں یہ سچا ہے دارقطنی کہتے ہیں میرے نزدیک یہ ہمیشہ ہی کمزور رہا۔ ابن عدی اور ذہبی نے اس کی متعدد روایات کو منکر قرار دیا ہے۔ میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۲۹ الجرح والتعدیل ج ۶ ص ۱۸۶

حاصل کلام یہ کہ علی بن زید سچا ہے۔ لیکن آخر عمر میں حافظہ خراب ہو گیا تھا۔ اس کا شروع ہی سے حافظہ خراب تھا۔ اس کی حدیث حجت نہیں۔ یہ ضعیف ہے۔ قوی نہیں۔ یہ کچھ نہیں۔ یہ حدیث میں تبدیلیاں کیا کرتا تھا۔ اس کی روایات منکر ہوتی ہیں۔ یہ شیعہ ہے۔ رافضی ہے۔

قارئین اب خود ہی فیصلہ فرمالیں۔ کیونکہ اگر ہم فیصلہ کرینگے تو اکابر کی شان میں گستاخی ہو گی۔ اور ہم جیسے لاعلم صحیح مسلم کے مسلمہ راویوں میں اگر کیڑے نکالیں گے تو منکر حدیث قرار پائینگے۔ کیونکہ مسلم کا راوی ہونے کے باعث یہ جناب معصوم ہیں اور حضرت ثعلبہ بدری نہ معصوم ہیں اور نہ ان کی اتنی پوزیشن ہے کہ ان کی عزت بچانے کیلئے مسلم کے کسی راوی پر اعتراض کیا جائے اور غالباً اسی لئے قرطبی اور ابن عبدالبر نے اس کی سند پر کوئی گفتگو نہیں کی استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ۔

عبدالحسین شرف الدین موسوی جو عراق کے ایک مشہور فقہ جعفریہ کے عالم ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "المراجعات" میں اُن سبائی راویوں کے حالات پیش کئے ہیں جن سے سنی محدثین نے روایات لی ہیں اور پھر بطور الزام اس امر کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں اس علی بن زید کا بھی تذکرہ کیا ہے تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے "المراجعات" ص ۱۰۸۔

قاسم بن عبدالرحمان۔ یہ شخص صاحب ابی امامہ یعنی ابو امامہؓ صحابی کے ساتھی کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کی کنیت ابو عبدالرحمان ہے دمشق کا باشندہ ہے آل معاویہ کا غلام تھا۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔ علی بن یزید جرعانی نے اس سے عجیب و غریب روایات نقل کی ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ سب داستانیں قاسم نے تیار کی ہیں۔ الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۱۱۳

ابن حبان کہتے ہیں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے یہ معضل روایات نقل کرتا ہے۔ معضل اصطلاح حدیث میں اُس روایت کو کہتے ہیں جس کی سند میں سے دو راوی گرا دیئے جائیں۔ یعنی جب یہ کسی صحابی سے روایت نقل کرتا ہے تو درمیان سے دو راوی گرا کر صحابی کی جانب منسوب کرتا ہے۔ جس سے لوگوں کو یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ اس نے اُس صحابی سے خود حدیث سنی ہے۔

اثرم کا بیان ہے کہ ابو عبد اللہ (غالباً بخاری) کے روبرو اس قاسم کی ایک روایت بیان کی گئی تو ابو عبد اللہ نے اسے منکر قرار دیا۔ اور فرمایا یہ اُس نے خود تیار کی ہوگی۔ یعنی اپنی خانگی فیکٹری میں۔

ابن حبان فرماتے ہیں یہ قاسم صاحب دعویٰ کرتے تھے کہ اس نے چالیس بدری صحابہ سے ملاقات کی ہے۔ حالانکہ یہ عام صحابہ سے بھی جو روایات نقل کرتا ہے۔ وہ سب معضل ہوتی ہیں اور روایات میں تبدیلیاں کر کے ثقہ راویوں کی جانب منسوب کرتا ہے اور میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ یہ سب روایات خود اس کی تیار کردہ ہوتی ہیں۔

جوزجانی کہتے ہیں یہ بہت نیک اور فاضل شخص تھا۔ ترمذی کا قول ہے یہ ثقہ ہے۔ جابر بن یزید کا بیان ہے کہ میں نے قاسم ابو عبد الرحمان سے افضل کوئی شخص نہیں دیکھا۔ ہم قسطنطنیہ میں تھے۔ لوگوں کو بطور روزینہ یومیہ دو دو روٹیاں ملتی تھیں۔ یہ ایک روٹی صدقہ کر دیتا۔ اور روزہ رکھتا اور ایک روٹی سے افطار کرتا۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۷۳

حدیث کے معاملہ میں نیکی کوئی خاص کام نہیں آتی بلکہ امام یحییٰ بن سعید القطان تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ ہم نے ان نیک لوگوں سے زیادہ حدیث میں جھوٹا کوئی انسان نہیں دیکھا۔

اور ویسے بھی اس کی نیکی کا ڈھنڈورہ پیٹنے والا جابر بن یزید جیسا بزرگ ہے۔ یہ وہی بزرگ ہے جس کے بارے میں ترمذی نے کتاب العلل میں امام ابو حنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ما رأیت اکذب من جابر الجعفی کا لنی [illegible] میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا کوئی شخص نہیں دیکھا

یؤمن بالرجعۃ دیکھا۔ وہ دنیا میں حضرت علی کی دوبارہ آمد پر ایمان رکھتا تھا۔

یہ جابر اس پر ایمان رکھتا تھا کہ حضرت علیؓ دنیا میں دوبارہ تشریف لائینگے (یعنی بجائے مہدی کے) اور بادلوں کے اڑن کھٹولے میں اڑتے پھرتے ہیں۔

یہ وہی جناب جابر ہیں جس کا قول امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں نقل کیا ہے کہ یہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس امام باقر کی ستر ہزار احادیث ہیں اور میں نے ان میں سے آج تک ایک بھی بیان نہیں کی۔ (غالباً سینوں سے درنہ اصول کافی وغیرہ میں اس کی کافی روایات موجود ہیں)

اب جس ہستی کو یہ جابر نیک قرار دے ہم جیسے بے چارے اس کی نیکی میں کیا شبہ کر سکتے ہیں؟

ایک فرضی ممبر

حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا روز ہو گا میرے لئے ایک ممبر رکھا جائے گا۔ جو میل لمبا ہو گا پھر علیؓ کو بلایا جائے گا اور وہ ایک سیڑھی نیچے بیٹھیں گے۔ جس سے مخلوق کو معلوم ہو گا کہ محمدؐ سید المرسلین ہیں اور علیؓ سید المومنین ہیں الحدیث میزان ج ۲۵۲/۱

اتنے طویل ممبر پر نہ رسولؐ نظر آئیں گے اور نہ حضرت علیؓ۔ تو کسی کو کیسے معلوم ہو گا کہ کون بیٹھا ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں اس کا واضع اسمٰعیل بن موسٰی ہے جو اسے علی بن یزید الذہبی سے روایت کر رہا ہے۔ میزان ج ۲۵۲/۱

ذہبی لکھتے ہیں کہ علی بن یزید الذہبی نے حضرت علی کی فضیلت میں ایک جھوٹی حدیث روایت کی ہے۔ اور اس کے علاوہ اس روایت کو کوئی بیان نہیں کرتا۔ ج ۲۶۳/۳

ذہبی نے اس علی بن یزید الذہبی کا کچھ تذکرہ نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ یہ کوئی فرضی نام ہو۔

خلافتِ نبوّت

از قلم جناب حکیم علی احمد عباسی صاحب

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ خلافتِ نبوّت امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ پر ختم ہو گئی اور اس کے بعد سے ملوکیت کا دور رہا۔ اس تصوّر کو آلِ بوَیہ کے وقت سے اتنا اچھالا گیا ہے کہ جیسے یہ بھی شریعت اسلامیہ کا کوئی مسئلہ اور عقائد کا کوئی جزیہ ہو۔ بیشک امت میں یہ تصور پہلے سے موجود تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک خلافتِ نبوت کا دور رہے گا، پھر ملوکیت آجائے گی اور اس کے بعد پھر آخر میں خلافتِ نبوت کا قیام عمل میں آئے گا۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پیش گوئیوں کو لوگوں نے اپنے اپنے وقت پر منطبق کرنے کی کوششیں کیں۔ اور چونکہ بات بے جوڑ تھی، نصوصِ صریحہ کے خلاف تھی، اس لیے محض بعض شخصیتوں سے مرعوب ہو کر امت بلاوجہ الجھنوں میں گرفتار ہو گئی۔ کاش اُسے شریعت کا مسئلہ بناتے وقت ان بزرگواروں سے پوچھ لیا گیا ہوتا جنہوں نے شریعت قائم کی، جان و مال قربان کر کے دین برپا کیا، اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء اہل عالم کو سمجھایا۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی راہ سے ہٹ کر جو بات پیدا کی جائے گی اور جو نظریہ بنایا جائے گا وہ کبھی موجبِ طمانیت نہ ہو گا اور ہرگز تعمیری نہ بن سکے گا۔

اہل تشیّع کا خیال بلکہ عقیدہ ہے اور عقیدہ بھی بنیادی کہ خلافتِ نبوت سرے سے قائم ہی نہیں ہوئی اور اگر ہوئی تو اسی وقت جب سیدنا علی مرتضیٰ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ اور نظم امت درہم برہم ہو گیا یعنی ان کے نزدیک امت کے افتراق و انتشار و اختلال کا جو زمانہ ہے وہ تو صحیح معنی میں خلافتِ نبوت کا دور ہے لیکن اس سے پہلے اور اس کے بعد کا زمانہ غاصبوں اور ظالموں کی مستبدانہ حکومتوں کا دور رہا۔ جس میں دین غارت ہوا، کتاب ضائع کر دی گئی اور مقصدِ نبوت فنا ہو گیا۔ سیدنا علیؓ کے بعد خلافتِ نبوت پھر زاویۂ خمول میں چلی

گئی اور اس کا ظہور ان کے اس امام غائب کے زمانہ میں ہوگا جس کا یہ لوگ انتظار اسی طرح کر رہے جس طرح قرونِ ماضیہ میں اقوام عالم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا انتظار تھا۔ اسی لیے ایک ہزار برس کی اس مدت میں انہیں اسلام اور مسلمانوں سے کوئی لگاؤ پیدا نہیں ہوا اور ان کی زندگی کا مقصد یہ رہا کہ صحابۂ کرام اور خلفائے اسلام پر لعنت کریں۔ اور مسلم حکومتوں کو زیر و زبر کرنے کی کوششوں میں مشغول رہیں۔

خوارج کا خیال ہے کہ خلافتِ نبوت کا دور امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے یہ امت گمراہی اور باطل پرستی میں مبتلا ہے۔ انہوں نے بطور خود اپنے چند آدمیوں کو امیر المومنین کہا جو سب کے سب مارے گئے۔ اس طرح دعوتِ محمدیہ کا کوئی نظام دنیا میں رہا ہی نہیں۔ اور اسی لیے ان کا مقصدِ حیات بھی یہی رہا کہ سیدنا فاروق اعظمؓ کے بعد جتنے صحابہ زندہ رہے اور اسلام میں جتنے خلفاء ہوئے ان پر لعنت کریں اور ہر مسلم حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے رہیں۔

پھر کچھ لوگ ہوئے جو کہتے تو چلے آرہے ہیں اپنے آپ کو سنت کا پابند اور جماعت سے وابستہ لیکن ان کا خیال ہے کہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد "اس امت کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی" یعنی دور ملوکیت شروع ہو گیا۔ ان لوگوں کی حیثیت رہی تو ہے ہر زمانہ میں انفرادی لیکن چونکہ یہ اصحابِ تصنیف ہیں، اس لیے اُن کی تحریروں کا زہر امت مسلمہ میں پھیلتا چلا گیا، اور اب اکثر ناواقف مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ خلافتِ نبوت کا دور صرف تیس برس رہا جس کے پورے پانچ برس اختلال کی نذر ہو گئے اور جس میں تین خلفا کے گلوں پر چھری پھیر دی گئی۔ ان لوگوں کا ایک طرف تو دعویٰ ہے کہ جس نبی کے یہ نام لیوا ہیں وہ آخری نبی ہے اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس کی لائی ہوئی کتاب آخری کتاب ہے کہ اب کوئی کتاب نہیں آئے گی اور اس کی برپا کی ہوئی امت آخری امت ہے، اب کوئی نئی امت ایسی پیدا نہیں ہوگی جس کا تعلق سلسلۂ نبوت سے ہو اور اس کا لایا ہوا نظامِ حیات آخری نظام ہے، اب اس نظام کی علمبردار کوئی قوم پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن پھر اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ جس امت کو اللہ تعالیٰ نے خیرِ امت کہا ہے اور جس گروہ کو اس نے زمین پر اپنا گواہ بنایا ہے، اس بہترین امت اور اس گروہِ باصفا نے اپنے آخری نبی کا لایا ہوا نظام تیس برس بھی قائم نہ رکھا اور اپنے ہی ہاتھوں اپنا نظام تباہ و برباد

کر ڈالا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جس دین کو غالب کرنے کا دعویٰ کیا تھا وہ غلط نکلا اور اپنے جن بندوں کو اس نے کہا تھا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (یہی ہیں سچے مومن) وہ سب اپنا دین کھو بیٹھے اور ایک ایسے نظام حیات پر راضی ہو گئے جو ان کے نزدیک اللہ و رسولؐ کے منشاء کے خلاف تھا اور مقاصدِ نبوت کے منافی۔ نعوذ باللہ من شرور الناس۔

معلوم نہیں اس ناپاک تصور کی بنیاد دین کے کس اصول پر ہے۔ باقی معاملات میں تو یہ لوگ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماعِ صحابہ اور قیاس ہی پر اپنے دین کی بنیاد رکھتے ہیں۔ لیکن خاص اس اہم ترین مسئلہ میں انہوں نے سب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ایک خود ساختہ تصور کو پے بہ پے بیان کر کے اس بدعت و ضلالت کو اتنا رواج دیا کہ اب یہ مسلمات میں سے ہے بلکہ اس سے اختلاف کرنے والا شاید مبتدع کہلائے حالانکہ ان کا وضع کردہ یہ تصور قطعاً بے بنیاد ہے۔ بلکہ جیسا کہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اجماعِ صحابہ اور قیاس کے خلاف ہے اور اسی لیے اس کا مآل بھی ایک درجہ میں وہی نکلا جو روافض اور خوارج کے تصورات کا ہے کہ امت آج اپنے اسلاف کرام سے سوءِ ظن میں مبتلا ہے اور اپنی تاریخ پر فخر کرنے کی بجائے مایوسیوں کا شکار ہے اور دل کی گہرائی سے یہ سمجھتی ہے کہ دین فرسودہ ہو گیا، امت کا دور ختم ہو گیا اور اس کی نشاۃ ثانیہ کے اب امکانات نہیں۔

بات یہ ہوئی کہ جب آلِ بُوَیہ نے عروج پکڑا اور نظامِ خلافت پر اتنے حاوی ہو گئے کہ جیسے انہی کے ہاتھ میں امتِ محمدیہ کے امور کا انصرام آ گیا ہو، تو جہاں اور قسم قسم کی بدعات انہوں نے پھیلائیں اور اسلامی معاشرہ میں زندقہ و الحاد کو فروغ دینا چاہا اس کے لیے انہوں نے ضروری سمجھا کہ اس یاس انگیز تصور کو امت کے دلوں میں القاء کریں، تاکہ تاریخِ اسلام مسخ ہو، اور ائمۂ اسلام کے اجتہاد کی حجیت ختم ہو جائے۔

چونکہ عباسیوں کی خلافت تھی اور آلِ بُوَیہ اپنے آپ کو ان کی بیعت میں اسی طرح کہتے تھے جیسے ان کے متقدمین نے سیدنا علیؓ کا دامن پکڑ رکھا تھا اس لیے انہیں علانیہ ملوک کہنے کی ہمت نہ کر سکے۔ ادھر جمہور اہلِ اسلام کو خلفاء ثلاثہ سے عقیدت تھی اس لیے ان لوگوں کو اپنا نظریہ کھل کر سرکاری بنانے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہوں نے جب لعنت اور سبّ و شتم کا سلسلہ شروع کرنا چاہا اور اس سے مسلمان برافروختہ ہوئے تو اس سے

بھی یہ لوگ ایک درجہ میں باز آ گئے۔ لیکن یہ مسئلہ بہر حال اٹھا دیا کہ خلافتِ نبوت کو چاروں اصحاب پر ختم سمجھ لیا جاتے۔

امویوں کی خلافت جاتی رہی تھی، لہٰذا انہیں جباروں میں شامل کرنا چنداں دشوار نہ تھا، اور نہ ان کی خلافت کے مبارک دور کو جاہلیت کا تسلط بنا دینا مشکل تھا۔ روایتوں کی ٹکسال اُن کے ہاتھ میں تھی اور جس قسم کی حوایات رائج کرنا چاہتے تھے، اس کی حمایت میں جیسی نص کی ضرورت ہوتی وہ تیار کر لی جاتی تھی۔ اپنے انہی مقاصد کے تحت انہوں نے یہ بات طے کرا دی کہ خطبوں میں صرف چار خلفاء کا نام لیا جائے اور باقی عشرہ مبشرہ کا ذکر اجمالاً ہو۔ ناموں کی تصریح نہ کی جائے۔ خلیفۂ عصر کے لیے البتہ دعاء کی اجازت تھی۔ مگر اس طرح کہ ساتھ ساتھ خود ان کا مردود نام بھی لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بنات طاہرات میں سے صرف حضرت سیدہ فاطمہ صلوات اللہ علیہا کا تذکرہ ہو اور آپ کی اولاد کی اولاد میں سے صرف سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کا۔ سیدنا عباس رض کا ذکر خلفاء عباسیہ کے مورث ہونے کی بناء پر روکا نہیں جا سکتا تھا اسی لیے سیدنا حمزہ رض کا نام بھی شامل کر دیا۔ اگرچہ ان کے خطابات "اسد اللہ" اور "سید الشہدا"۔ ان سے چھین لیے گئے۔ سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ میں چونکہ ان لوگوں کے نزدیک جاہلیت کی رگ تھی اور وہ سیدنا علی رض کی زندگی ہی میں سیدنا معاویہ رض سے جا ملے تھے، اس لیے ان کا نام لینا ممنوع ٹھہرا، اور اسی کی پاداش میں سیدنا جعفر طیار رض کا مبارک نام بھی ساقط کر دیا گیا۔

غرض یہ ہے کہ آلِ بویہ اور مسلمانوں کے درمیان یہ ایک قسم کا غیر مکتوب سمجھوتہ تھا جس پر عمل شروع کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے بھی بزرگانِ پیشین کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے اس بدعت کو برداشت کر لیا کہ بہرحال خلفاء اربعہ کا نام لینے کی سبیل تو نکلی۔ ورنہ بغداد کا حال تو یہ تھا کہ علانیہ مساجد کے دروازوں پر خلفائے اسلام کے نام لے لے کر لعنت لکھی جاتی تھی جسے رات کو مسلمان مٹا دیا کرتے تھے[۱] (ملاحظہ ہو محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ الدولۃ العباسیۃ، ص ۳۸۲)

---

[۱] آلِ بویہ کے تسلط سے پہلے عباسی امامت میں سنت کا اتباع کیا جاتا تھا، جماعت کی حرمت برقرار (باقی اگلے صفحہ)

لوگوں کی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آتی کہ کسی کا خلیفہ ہونا یا نہ ہونا اعتقادی مسئلہ نہیں ہے کہ لوگ جب چاہیں اور جس قسم کا نظریہ چاہیں بنالیں۔ ایسے امور کا فیصلہ ہمعصر لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے بعد کے لوگوں کی رائے کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر کسی شخص کے خلیفہ اور امام ہونے پر ہمعصر امت نے اجماع کر لیا تو وہ خلیفہ اور امام ہے ورنہ نہیں۔ یہ کوئی خیالی اور نظری بات نہیں ہوتی واقعی اور حسّی ہوتی ہے عقل اگر خبط ہو جائے اور واقعات کی دنیا سے نکل کر آدمی خیالی فضاؤں میں پرواز شروع کر دے تب البتہ یہ کر سکتا ہے جو ایک صاحب تصنیف صوفی صاحب نے کیا کہ سیدنا علی شبیہ نصوم رضی اللہ عنہ کے اسم گرامی

تھی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ یکساں عقیدت و محبت کا عالم تھا۔ پھر احوال بدل گئے۔ معاصرات کے حوالے سے جو کچھ یہاں بیان کیا جا رہا ہے وہ اس عہد کی معتبر تاریخ میں ہر جگہ بیان کیا گیا ہے۔

فقد كان أهل بغداد قبل الدولة البويهية على مذهب اهل السنة والجماعة ويفضّلون الشيخين ابابكر وعمر على سائرهم ولا يقدحون في معاوية ولا غيره من سلف المسلمين

فلما جاءت هذا الدولة وهي متشيعة غالية ثمّا مذهب الشيعة ببغداد ووجد له من قوة الحكومة انصارًا فقد كتب على مساجد بغداد ۳۵۱ھ ما صورته

" لعن الله معاوية ابن ابي سفيان ولعن من غصب فاطمة رضي الله عنها فدكاً ومن منع ان يدفن الحسن عند قبر جده عليه السلام ومن نفى

بویہی حکومت سے پہلے اہل بغداد سب مذہب اہل السنۃ والجماعت کے پیرو تھے۔ تمام صحابہ کی عزت کرتے تھے اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر دونوں بزرگواروں کو سب سے افضل مانتے تھے۔ حضرت معاویہ کی جناب میں سوء ادب سے احتراز تھا اور کسی دوسرے گذرے ہوئے مسلمان پر طعن کرتے تھے۔

لیکن جب یہ فرقہ پرست غالی حکومت آئی تو بغداد میں شیعہ مذہب پروان چڑھا اور حاکمانہ اقتدار کے بل پر اس کے مددگار پیدا کیے گئے۔

۳۵۱ھ میں بغداد کی مسجدوں پر یہ عبارت لکھوائی گئی

" خدا معاویہ بن ابی سفیان پر لعنت کرے اور اس شخص پر لعنت کرے جس نے فاطمہؓ (باقی اگلے صفحہ پر)

کے ساتھ موٹے موٹے حروف میں "امیر المومنین" لکھ دیا۔

امیر المومنین ایک شرعی اور سیاسی اصطلاح ہے اور سوائے اس شخص کے جو امتِ مسلمہ کا حاکمِ اعلیٰ ہو کسی دوسرے کے لیے مستعمل نہیں ہو سکتی۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ صحابۂ کرام اور جمہورِ امت نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے جب بیعت کی تو انہوں نے یہ بیعت کن الفاظ میں لی، اور کس خطاب سے آپ کو مخاطب کیا۔

دورِ خلافت ختم ہو کر دورِ ملوکیت شروع ہونے کے معنی ہیں اسلام کے سیاسی نظام میں ایک بنیادی تبدیلی۔ صحابۂ کرام نے کبھی اس بنیادی تبدیلی کا اعلان کیا ؟ یا بیعت کے الفاظ میں، یا حاکمِ اعلیٰ کے خطاب میں

(بقیہ حاشیہ) اباذر الغفاری ومن اخرج العباس من الشوریٰ۔"

کا فدک کا حصہ غصب کیا اور اس پر جس نے حسنؓ کو ان کے نانا علیہ السلام کے پاس دفن نہیں ہونے دیا، نیز اس پر جس نے ابوذر غفاریؓ کو شہر بدر کیا، اور اس پر جس نے عباسؓ کو شوریٰ سے خارج کر دیا۔"

والخلیفة کان محکوماً علیه لا یقدر علی المنع واما معز الدولة فبامره کان ذلک۔ فلما کان اللیل حکّه بعض الناس واراد معز الدولة اعادته فاشار علیه وزیره ابو محمد المهلبی بان یکتب مکان ما محی:

خلیفہ وقت بے دست و پا تھے اور اسے روکنے کی ان میں قدرت نہ تھی۔ یہ صرف معز الدولہ تھا جس کے حکم سے یہ حرکت کی گئی۔ جب رات ہوئی تو بعض لوگوں نے اسے مٹا دیا۔ معز الدولہ نے چاہا کہ اس کا اعادہ کرے لیکن اس کے وزیر محمد المہلبی نے مشورہ دیا کہ جو عبارت مٹا دی گئی ہے اس کی بجائے صرف حسبِ ذیل عبارت لکھ دی جائے۔

لعن الله الظالمین لآل رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ ولا یذکر احداً فی اللعن الا معاویة"

فعل ذلک

"خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جنہوں نے آلِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کیا" نام لے کر کسی پر لعنت نہ کی جائے سوائے معاویہ کے۔"

چنانچہ اسی پر اس نے عمل کیا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

کوئی ترمیم کی، جس سے معلوم ہو کہ منصب کی نوعیت بدل گئی۔ صحابۂ کرام نے حضرت صدیق اکبرؓ کو خلیفۂ رسول اللہ کہا" اور حضرت فاروق اعظمؓ کو "خلیفۂ رسول اللہ" گویا سیدنا عثمانؓ کو کہتے "خلیفۂ خلیفۂ خلیفۂ رسول اللہ" اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے سیدنا عمرو بن العاص نے لفظ "امیر المومنین" تجویز کیا اور یہی لفظ تمام خلفاء کے لیے رائج ہو گیا۔ اب صحاح کی کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صحابۂ کرامؓ نے سیدنا معاویہؓ کو "امیر المومنین" کے علاوہ کسی دوسرے خطاب سے یاد کیا ہو۔ وہ تو آپس میں بھی ان کا ذکر امیر المومنین ہی کہہ کر کیا کرتے تھے (صحیح بخاری: ج ۱، ص ۵۳۱، کتاب المناقب، طبع اصح المطابع

یہ جن حضرات پر لعنت کی گئی ان میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ فدک کے غاصب سے مراد حضرت صدیق اکبرؓ ہیں، سیدنا حسنؓ کو روضۂ شریف میں دفن نہ ہونے دینے والے سیدنا مروان بن الحکم ہیں۔ سیدنا ابوذرؓ کو شہر بدر کرنے والے سے مراد سیدنا عثمانؓ ہیں اور سیدنا عباسؓ کو شوریٰ میں شامل نہ کرنے والے سیدنا عمرؓ ہیں۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

سیدنا عباسؓ کا نام محض خلیفۂ وقت کا غصہ دھیما کرنے کے لیے ٹانک دیا گیا ہے ورنہ سب جانتے ہیں کہ ان کے ہاں ان کی کتنی عزت ہے (ملاحظہ ہو نواب محسن الملکؒ کی آیات بینات، ص ۱۸۰، طبع دار الاشاعت کراچی) ہم یہ عبارت نقل کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتے۔ البتہ اہل ایمان کو بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لیے اپنے بعد جن چھ حضرات کو نامزد کیا تھا ان میں سیدنا عباسؓ کو قطعاً شامل نہیں کیا۔ حضرت فاروقؓ کے دل میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اتنی عظمت و عقیدت تھی کہ جب قحط پڑتا تو انہی کے وسیلہ سے دعا مانگا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرتا تھا۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری: ج ۲، ص ۳۰۱، طبع مصر:-

عن انس رضی اللہ عنہ ان عمر بن الخطاب کان اذا قحط استسقی بعباس بن عبد المطلب فقال اللّٰھم انا کنا نتوسل الیک بنبینا صلی اللہ علیہ وسلم فتسقینا وانا	حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امیر المومنین عمر بن الخطابؓ کی عادت تھی کہ جب قحط پڑتا تو سیدنا عباس بن عبد المطلب کے وسیلہ سے بارش کی دعا کیا کرتے تھے اور (باقی اگلے صفحہ پر)

قیل لا بن عباس هل لك فی امیر المؤمنین معاویة فانه ما اوتر الا بواحدة قال اصاب انه فقیه

حضرت ابن عباسؓ سے عرض کیا گیا: ذرا دیکھئے تو امیر المؤمنین معاویہؓ نے کیا کیا۔ انہوں نے وتر کی ایک ہی رکعت پڑھی"۔ فرمایا۔ "اچھا کیا۔ انہیں دین کی سمجھ ہے"۔

صحابہ کرام نے جب جلوت وخلوت میں سیدنا معاویہؓ کو ہمیشہ اسی خطاب سے یاد کیا جو حضرت فاروق اعظمؓ کا تھا تو کیسے سمجھ لیا جا سکتا ہے کہ ان کی منصبی حیثیت کو وہ کچھ اور سمجھتے تھے۔ پھر ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ان کے حقوق کی رعایت میں صحابہ کرام نے کیا فرق برتا؟ وہ تو ان کے احکام کے ویسے ہی پابند تھے جیسے

(بقیہ حاشیہ) نتوسل الیك بعم نبینا قال فیسقون۔

عرض کرتے "خدایا ہم پہلے تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کیا کرتے تھے اب اپنے نبی کے چچا کے وسیلہ سے دعا کرتے ہیں (سیدنا انسؓ) فرماتے ہیں کہ بارش ہو جاتی تھی"۔

اسی طرح جب وظائف کا دیوان مرتب ہوا ہے اور صحابہ نے چاہا کہ اوّل امیر المومنین سے ابتدا کریں تو آپ نے فرمایا "نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے سے ابتدا کرو اور عمرؓ کو وہیں رکھو جہاں اس کا مقام ہے"۔ چنانچہ سب سے پہلے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی لکھا گیا۔ پھر بقیہ بنو ہاشم کا۔ بہرحال ہمیں اور امت کو اس پر غور کرنا چاہیئے کہ خلفائے عباسیہ کی موجودگی میں اور ان کا مذہب جانتے ہوتے معز الدولۃ یا اس کے کسی پیرو کو اس سے کیا مطلب تھا کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے سیدنا عباسؓ کو شوریٰ میں شامل کیا یا نہیں۔

رہا فدک کا مسئلہ تو ہم بحث میں پڑنے کی بجائے اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ اگر فدک پر اہل بیت کا مالکانہ کوئی حق تھا تو امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانہ میں اس پر ذاتی قبضہ کر سکتے تھے۔ لیکن آپ نے نہیں کیا تو اس کے بعد پھر کسی کو بولنے کا یارا ہی کیسے ہو سکتا ہے۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی تدفین کے بارے میں انہی صفحات میں روشنی ڈال دی گئی ہے اور سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کو شہر بدر کرنے کا جو افسانہ تراشا گیا ہے اس کی بھی قلعی کھول دی گئی ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت صدیقؓ اکبر اور حضرت فاروق اعظم کے احکام کی پابندی کیا کرتے تھے۔ ان کے اجتہاد پر ایسے ہی عمل ہوتا تھا جیسے خلفاء پیشین کے اجتہاد پر۔ ان کے جھنڈے کے نیچے جہاد کو اسی طرح افضل العبادات سمجھا جاتا تھا، ان کا حاصل کیا ہوا مالِ غنیمت اسی طرح طیب اور نعمتِ الٰہی کہلاتا تھا۔ زکوٰۃ اور عشر انہیں اسی اصولِ دین کے تحت ادا کیا جاتا تھا جس طرح پہلے خلفاء کو۔

زندگی کے چھوٹے بڑے مسئلہ میں اگر صحابۂ کرام نے حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت معاویہؓ کی حکومت میں کوئی فرق کیا ہوتا تو اس تصور کی گنجائش تھی جو لوگوں نے بے دلیل وضع کر لیا ہے۔ ورنہ قطعاً

آلِ بُوَیہ کی اسی ناپاک حرکت کا ردعمل تھا جو امام ابوبکر ابن العربی نے بیان فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عالم اسلام کو آل بُوَیہ کے تسلط سے نجات دی تو مسلمانوں نے بغداد کی مسجدوں کے دروازوں پر یہ عبارت لکھ دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین ہستی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تھی، پھر حضرت عمرؓ کی، پھر حضرت عثمانؓ کی، پھر حضرت علیؓ کی اور پھر اہل ایمان کے ماموں حضرت معاویہؓ کی۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین۔ ورنہ مسجدوں پر یہ کلمات لکھنے کی کیا ضرورت ہوتی۔

یہ معز الدولہ ہی ہے جس نے عشرۂ محرم کو ماتم کرنے کا حکم دیا اور پھر جشنِ غدیر منانے کا۔ یہی خاندان ہے جس نے اپنے خوشامدیوں سے ایسی کتابیں لکھوائیں جو سلف صالحین پر طعن سے مملو ہیں۔ مسعودی اسی دربار کا وظیفہ خوار تھا۔

محمد خضری کی بیان کردہ اس تفصیل میں ایک بات البتہ تعجب خیز ہے کہ انہوں نے آلِ بُوَیہ کو زیدی مذہب کا تبع بتایا ہے اور کہتے ہیں (محاضرات، ص ۳۰۸، الدولۃ العباسیۃ)

وكان يخطر ببال معز الدولة ان يزيل	معز الدولہ کے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ بنو عباس
اسم الخلافة ايضاً عن بني العباس	کے نام سے خلافت کا نام مٹا دے اور کسی علوی کو قائم
وليوليها علوياً لان القوم كانوا شيعة	کرے کیونکہ یہ لوگ زیدی شیعہ تھے اور اسلامی تعلیمات
زيدية لان التعاليم الاسلامية وصلت	ان تک حسن بن زید کے ذریعہ پہنچی تھیں اور پھر حسن

نہیں۔ سیدنا معاویہؓ کی خلافت پر امت کا ایسا ہی اجماع ہوا جیسے صدیق اکبرؓ کی خلافت پر ہوا تھا۔ ان کے خلاف کھڑے ہونے والوں کو صحابہ کرام نے اسی طرح باغی اور واجب القتل جانا جس طرح حضرت صدیق اکبرؓ کے خلاف کھڑے ہونے والوں کو۔ یہ وہ امور ہیں جن کا انکار آفتاب نصف النہار کے انکار کے مترادف ہے۔

اب ہم آتے ہیں نصوصِ شرعیہ اور آثارِ صحابہ کی طرف کہ ایک صاحبِ ایمان کے نزدیک صرف وہی حجت ہیں۔

لتوصل ایک بعو نبینا فاسقنا قال فیسقون   الاطروش کے ذریعہ۔ اور یہ دونوں زیدی تھے۔

ان دونوں ہاشمیوں کا زیدی ہونا مسلم ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ انہی کے ذریعہ آل بویہ تک اسلام پہنچا۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ مذہباً آلِ بویہ زیدی شیعہ تھے۔ اقتدار جب ان کے ہاتھ میں آیا تو انہوں نے زیدی مذہب کو خیرباد کہا بلکہ اس صحیح النسب فاطمی خاندان سے اپنا ظاہری تعلق بھی توڑ دیا۔ ۳۵۵ھ تک آلِ اطروش کا وجود جبال دیلم میں موجود تھا۔ اور یہ زمانہ آلِ بویہ کے انتہائی عروج کا ہے ایک طرف ان لوگوں کی اتنی طاقت تھی کہ اگر چاہتے تو خلیفۂ عباسی کی امامت ہی ختم کر دیتے۔ چنانچہ پہلا کام معزالدولہ نے یہ کیا کہ اپنے برسرِ اقتدار آنے کے بعد چالیس دن کے اندر اندر امیرالمومنین المستکفی باللہ رحمہ اللہ کو معزول کر دیا، قصرِ خلافت کو لوٹ لیا۔ حتیٰ کہ وہاں کچھ باقی نہ رہا تو امیرالمومنین کو پابجولاں معزالدولہ کے گھر تک لایا گیا تھا اور ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ انہوں نے ان بدباطنوں کا غلبہ برداشت نہیں کیا۔

اگر ان لوگوں کے دل میں اپنے ان آئمہ کی کوئی قدر ہوتی جنہوں نے انہیں کلمہ شریف پڑھایا تھا، تو ان کی سسکتی ہوئی حکومت کو بحال کرتے، اور نہیں کیا تھا تو کم از کم ان کے عقائد ہی کی پیروی کرتے۔ زیدی مذہب میں خلفاءِ ثلٰثہ پر طعن حرام ہے۔ ان کی خلافت کو وہ درست سمجھتے ہیں اور جمہور صحابہ کی تعظیم ان کا شعار ہے۔ سیدنا معاویہؓ اور اموی۔۔۔ت کے ساتھ جو ان میں سے بعض کی بے ادبی کا ثبوت ملتا ہے تو یہ بعد کی باتیں ہیں۔ خود حفظی سے امام زید رضی اللہ عنہ کے خروج کے کوائف بیان کرتے وقت یہ متفق علیہ بات بیان کی ہے کہ جب امام زیدؓ نے خروج کی تیاری مکمل کر لی تو آپ کے ہاتھ پر جان دینے کی بیعت کرنے والوں نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ ابوبکر

کتاب اللہ

آیتِ استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو زمین پر خلافت دینے کا جب وعدہ کیا تو اس میں مطلقاً اس کا اشارہ نہیں کہ یہ وعدہ صرف تیس برس کے لیے ہے

(النور : ۵۵)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي

اللہ تمہارے ان لوگوں سے وعدہ کرتا ہے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے کہ وہ یقیناً انہیں زمین پر ایسے ہی حکومت عطا فرمائے گا جیسے اس نے ان

عمر کی بابت آپ کی رائے کیا ہے ؟" آپ نے جواب دیا تھا (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ ، ج ۲ ص ۱۹۵)

رحمهما الله وغفر لهما ما سمعت احداً من اهل بيتي يقول فيهما الاخيرا وان اشد ما اقول فيما ذكرتم انا كنا احق بسلطان من رسول الله صلى الله عليه وسلم من الناس اجمعين فدفعونا عنه ولم يبلغ ذلك عندنا بهم كفراً وقد ولوا فعدلوا في الناس وعملوا بالكتاب والسنة "

" اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ان کی خطائیں بخشے ، میں نے اپنے گھر والوں میں کسی کو ان کا ذکر بھلائی کے سوا کسی دوسری طرح کرتے نہیں سنا تم نے جو کچھ کہا اس پر میں جو سخت سے سخت بات کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ سب لوگوں کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے حقدار ہم تھے لیکن انہوں نے ہمیں اس سے دور رکھا ، یہ بات ہمارے نزدیک کچھ کفر کی نہیں کیونکہ یہ لوگ جب حاکم ہوئے تو انہوں نے لوگوں کے ساتھ عدل کیا اور کتاب و سنت پر عمل رکھا "

جو لوگ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے مذہب پر ہیں ان کی زبان و قلم سے وہ کلمات ہرگز نہیں نکل سکتے جو الفاظ معزالدولہ نے مسجدوں کے دروازوں پر لکھوائے ، چنانچہ یہاں ہم زیدی مذہب کے ایک بڑے عالم محمد بن الحسن دیلمی یمانی کی کتاب قواعد عقائد آل محمد کے وہ ابتدائی کلمات نقل کرتے ہیں جو انہوں نے اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ کے مذہب کے بطلان پر لکھی ہے یہ کتاب مرحوم امام یحییٰ حمید الدین کے کتب خانہ میں محفوظ تھی ، اور سن ۱۹۵۰ء میں مطبعۃ السعادۃ مصر

ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امناً ہ یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً ومن کفر بعد ذلک فاولیک ھم الفاسقون۔

سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی۔ اور وہ یقیناً اُن کے لئے وہی دین برپا رکھے گا جو اس نے اُن کے لئے پسند کیا ہے اور وہ یقیناً ہر خوف کے بعد انہیں امن سے نوازے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے، اس (وعدہ کی موجودگی میں بھی) کوئی انکار کرے تو یہی لوگ ہیں فاسق (یعنی بدراہ)"۔

(بقیہ حاشیہ) سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی ابتدا ان کلمات سے ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قبل الاشتغال ببیان مذھب الباطنیۃ تذکر طرفاً من مذھب الغلاۃ والمفوضۃ لانھم منھم ایضاً۔ وذلک لان اصول مذھب الغلاۃ والمفوضۃ والباطنیۃ من الاسماعیلیۃ والامامیۃ الاثنی عشریۃ مختلط بعضھا ببعض فی کثیر من المسائل ولذلک قیل الامامیۃ دھلیز الباطنیۃ وکلھم دخلوا فی الشیعۃ من جھتھم وکلھم یدعون التشیع ویغلون فی الدین ویخرجون من طریق المسلمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باطنیوں کا مذہب بیان کرنے سے پہلے ہم غالیوں اور مفوضوں کی بعض باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ لوگ بھی انہی میں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ غالی ہوں یا مفوضی، اسماعیلی باطنی ہوں یا اثنا عشری امامی، ان سب کے مذہبی اصول بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ امامیہ کا مذہب باطنی مذہب کی دہلیز ہے۔ انہی کے ذریعہ لوگ شیعیت میں داخل ہوتے ہیں اور سب کے سب تشیع کے مدعی ہو کر دین میں غلو کرتے ہیں اور مسلمانوں کے طریق سے نکل جاتے ہیں۔

مفوضہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے کاروبار سیدنا علیؓ کے اور ان کی اولاد کے سپرد کر رکھا ہے۔

اب یہ کیا غضب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس عام وعدہ کو جو قیامت تک کے لیے پوری امت سے ہے، صرف تیس برس کے لئے سمجھ لیا جائے، جس میں سے پانچ برس خالص اختلال کی نذر ہو جائیں اور فتنہ بر فتنہ بپا ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ امت اس لیے بپا کی تھی اور اس غرض سے انہیں زمین پر گواہ بنایا تھا کہ وہ اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظام پورے تیس برس بھی نہ چلا سکے۔ اور یہ توفیق نہ ہو کہ اگر گردابِ فتن میں مبتلا ہو جائے تو اس سے نکل کر وعدۂ الٰہی کا مورد بن سکے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا

ان اللہ تعالیٰ فوض امر العالم الی الائمۃ الی علیؓ والحسن والحسین علیہم السلام وباقی الائمۃ من بعد ھو وھو یخلقون ویرزقون ویمیتون ویحیون ویبعثون ویعاقبون ویثیبون (ص ۱)

"اللہ تعالیٰ نے کارِ جہاں ائمہ کے سپرد کر رکھا ہے یعنی سیدنا علی کے سیدنا حسن کے اور سیدنا حسین علیہم السلام کے اور اسی طرح ان کے بعد آنے والے باقی اماموں کے یہی لوگ پیدا کرتے ہیں، رزق دیتے ہیں، مارتے ہیں، زندہ کرتے ہیں قیامت کے دن اٹھائیں گے اور پھر جزا و سزا دیں گے۔"

پھر آگے چل کر (ص ۱۰۵ میں) باطنیوں کے کفر کی دسویں وجہ بتاتے ہیں:۔

منھا انھم یکفرون الامۃ المسلمۃ یا جمعھا ویسمونھم الامۃ المنکوسۃ ای عن رشدھا ویسمون الائمۃ والعلماء والفضلاء من لدن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی یومنا الطواغیت الاصنام . . . فاول صنم من اصنام الطاغوتیۃ ابوبکر ثم عمر ثم عثمان ومن کان مثلھم فی کل وقت و زمان . . .

وھل ھذا الا کفر صراح وشرک محض؟

"علاوہ ازیں یہ لوگ (یعنی باطنیہ) تمام امت مسلمہ کی تکفیر کے قائل ہیں اور انہوں نے ان کا نام امتِ سرنگوں رکھا ہے یعنی راہِ ہدایت چھوڑ دینے والی امت۔ پھر یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر آج تک کے ائمہ، علماء اور فضلائے امت کو شیاطین اور اصنام کہتے ہیں ان کے نزدیک شیطانی بتوں میں پہلے بت ابوبکر ہیں پھر عمر ہیں پھر عثمان ہیں اور انہی کی قسم کے دوسرے سب حضرات ہیں جو کبھی اور کسی وقت پیدا ہوتے رہے۔ کیا یہ خیال صریح کفر اور شرک محض نہیں ہے۔"

ہے کہ وہ ہمیشہ ان کا دین برپا رکھے گا اور ہر خوف کے بعد امن سے نوازے گا، لیکن یہ مجدد و مجتہد بننے والے لوگ یاد کرانا چاہتے ہیں کہ تیس برس کے بعد سے نہ دین برپا رہا، نہ خوف کے بعد امن نصیب ہوا اور نہ احتلال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کی کوئی سبیل پیدا کی۔ گمراہی کا جو نظام امیر المومنین معاویہؓ کے عہد سے قائم ہوا، اسی پر یہ امت چل پڑی۔ اب یا تو انہیں چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو غلط یا عارضی قرار دیں (نعوذ باللہ من ذلک) یا پھر سمجھیں کہ خود یہ غلطی پر ہیں اور صحابہ کرام اور ان کا اتباع کرنے والی جماعت حق پر تھی، اور جو منہاج انہوں نے قائم کیا وہ صواب تھا۔

دراصل لوگوں نے خلافتِ نبوت کے متعلق خیالی اور وہمی باتیں پیدا کر لی ہیں اور خلفائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے منہاج کی حقانیت اپنے خود ساختہ تصوّرات کے تحت ظاہر کرنے کے لئے ایسی ایسی احمقانہ روایتیں گھڑی ہیں کہ ان کی عقلوں پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ حضرت امیر المومنین

(بقیہ حاشیہ) غرض یہ ہے کہ خضری کا یہ بیان کسی درجہ میں درست نہیں کہ آل بویہ زیدی مذہب پر تھے اور نہ ان لوگوں کا قول درست ہے جو انہیں معتزلی المذہب کہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ سلف صالحین کا منہاج چھوڑ چکے تھے۔ انہیں [illegible] ان زیدی ائمہ سے کچھ علاقہ نہ تھا جن کے ہاتھ پر ان کا مسلمان ہونا بتایا جاتا ہے۔ یہ تو سبائیوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے۔ اگر انہیں ادنیٰ ترین درجہ میں بھی حسن الاطروش سے کچھ عقیدت ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے زیرنگیں علاقوں میں ان کا مذہب اور ان کی نسل دونوں کو ختم کر دیں۔ زیدی مذہب کا احیاء تو آل بویہ کے ختم ہو چکنے کے بہت بعد کیا گیا اگرچہ بعض زیدی لوگ [illegible] کے مذہب سے دور جا پڑے ہیں لیکن اصولاً ان کے ہاں جماعت کی حرمت ہے جمہور صحابہ کی تعظیم کرتے ہیں [illegible] ان کو ایمان [illegible] سے اور سنت کے [illegible] استمساک کرتے ہیں۔ مرحوم امام یحییٰ [illegible] حنفی و شافعی و مالکی و حنبلی پر بھی [illegible] تھا اور چلتے پھرتے بھی [illegible] فتویٰ دے دیا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زیدی لوگ اپنی اصل میں جماعت سے کس درجہ قریب ہیں۔ آل بویہ اور دوسرے سبائیوں کو ان زیدیوں سے کیا علاقہ؟

علی کرم اللہ وجہہ کی بابت مسعودی کا بیان ہے (مروج الذہب، ج ۲، ص ۴۳۱)

لم یلبس علیہ السلام فی ایامہ ثوباً جدیداً ولا اقتنی ضیعۃ ولا ربعاً الا شیئاً کان لہ بینبع مما تصدق بہ وحبسہ	"(سیدنا علی) علیہ السلام نے اپنی خلافت کی پوری مدت میں نیا کپڑا نہیں پہنا اور نہ کوئی گاؤں خریدا اور نہ زمین رکھی سوائے ینبع کی کچھ جائداد کے جو آپ نے صدقہ اور وقف کر دی تھی۔"

گویا آپ کے لئے کارگاہ میں پہلے ہی سے پرانا کپڑا بُنا جاتا تھا، یا دوسروں کی اُترن پہنا کرتے تھے۔ یعنی اوروں کے لیے نیا کپڑا پہننا جائز تھا مگر سیدنا علیؓ کے لیے ناجائز۔ یہ فرضی اور خیالی بات جو مدح سے زیادہ ذم ہے، اس شخص کے متعلق کہی گئی ہے جس کے سامنے قرآن مجید کی ایک ایک آیت اُتری اور جو تیئس برس تک جلوت وخلوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا۔ جس نے زندگی میں نو نکاح کیے اور ان کے علاوہ کئی اولاد والی لونڈیاں (امہات اولاد) چھوڑیں جس کے تیس سے زیادہ اولادیں ہوئیں، جس پر اُن کا نان ونفقہ فرض تھا، جس کی محض زکوٰۃ کی رقم ہزاروں دینار ہوتی تھی۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔ ایسی ہی فضول اور لغو باتیں حضرت فاروق اعظمؓ حضرت صدیق اکبرؓ بلکہ خود سرور معلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت وضع کی گئی ہیں جن کا نہ سر ہے نہ پیر۔

پھر ان لوگوں کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ خلافت یا ملوکیت یا بادشاہت یا ریاست یا مملکت یا جو بھی اس کا نام رکھا جائے، اس کا انحصار سربراہ حکومت کی شخصیت یا کارکنوں کی ذاتوں پر نہیں ہوتا اس سے مراد ہوتا ہے وہ اجتماعی سیاسی نظام جو رائج الوقت ہو، وہ قوانین جن پر حکومت کی بنیاد ہو اور وہ دستور جس کے تحت سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام چلایا جائے۔

اللہ تعالےٰ نے اسلامی حکومت اور خلافتِ نبوت کے مقاصد بتا دئے ہیں جن کی تاویل وتفصیل کے لئے رازیؒ وزمخشریؒ سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر عربی داں عیاناً جانتا اور سمجھتا ہے۔ ارشاد ہے (الحج : ۴۱)

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ	وہ لوگ جنہیں ہم زمین پر جب حکومت عطا فرماتے

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔

ہیں، تو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اچھی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں اور تمام امور کی انجام دہی اللہ کے ہاتھ ہے۔"

جس حکومت نے ان شعبہائے زندگی کو منظم رکھا، اس نے مقاصدِ الٰہی پورے کر دیئے۔ اگر ایسی حکومت کو بھی خلافتِ نبوت سے تعبیر نہیں کیا جائے گا تو پھر کتاب و سنت کی روشنی میں خلافت کی کوئی تعریف ہی نہیں۔

اولی الامر

قرآن حکیم میں جا بجا اولوالامر کی اطاعت کا حکم ہے۔ مثلاً (النساء : ۵۹)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔

اے اہل ایمان اللہ کی اطاعت کیا کرو، اور اس کے رسولؐ کی بھی اطاعت کیا کرو، اور ان کی بھی جو تم میں سے حاکم ہوں۔ اب اگر کسی مسئلہ میں تمھارا اختلاف ہو جائے تو اس کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ہے سب سے بہتر طریقہ اور نتیجہ کے لحاظ سے بہتر صورت۔"

یہاں اور ایسے ہی دوسرے مقامات پر اس کی قطعاً کوئی تحدید نہیں کہ اولوالامر فلاں طبقہ اور فلاں پیشے کے ہوں گے، فلاں زمانہ سے اُن کا تعلق ہوگا، یا فلاں طریقہ پر بر سرِ اقتدار آئیں گے۔ یا اس حکم کا اطلاق فلاں وقت تک ہوگا اور اس کے بعد اولوالامر کی اطاعت اللہ و رسولؐ کی اطاعت نہیں رہے گی۔

صرف ایک آیت ہے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (شوریٰ) (وہ اپنے معاملات باہم مشورہ سے طے کیا کریں گے) لیکن کسی زمانہ میں اور کسی صاحبِ عقل نے اس کا مطلب یہ نہیں لیا کہ اپنے گھر کے معاملات میں اپنے محلے والوں سے مشورہ لیا کریں، یا مریض کی بابت انجینیر سے رائے لی جائے، یا طبیعات کا مسئلہ اور علم کیمیا کی کوئی اُلجھن ہو تو اس کا حل فقیہ سے دریافت کیا جائے، یا علم عروض کی بات ہو تو درزی سے اس کی تحقیقات کی جائے۔ زندگی کے ہر شعبہ کے لوگ الگ الگ ہوتے ہیں۔ سیاست کا تعلق اربابِ

حل وعقد سے ہے، یعنی ان لوگوں سے جو عمل سیاست کے ماہر ہوں، یا معاشرہ میں ان کی یہ حیثیت ہو کہ اجتماعی مسائل میں جب یہ رائے دیں، تو اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاسکے۔ ارشاد خداوندی ہے: (النساء ۸۳)

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۚ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو اُسے شہرت دینے لگتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اُسے رسول اللہ تک پہنچا دیں اور اپنے حاکموں تک تاکہ جو لوگ اس قسم کے مسائل اور صورت حال کا مآل دیکھ سکتے ہیں وہ بات کی تہ تک پہنچ سکیں۔ اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند کے علاوہ باقی سب تم شیطان کے پیچھے ہو لیا کرتے۔

اس آیت مبارکہ میں ایک اہم دستوری مسئلہ بیان ہوا ہے کہ امورِ سیاسی پر غور و فکر اور رائے زنی کا حق اربابِ سیاست کو ہے۔ عسکری امور سے باخبر رہنا اور خطرناک نتائج سے بچنے کی تدبیریں کرنا امرائے عساکر کا کام ہے۔ نظری حیثیت سے مسئلہ کا ما لہٗ و ما علیہ دریافت کرنا فقہاء اور قانون داں لوگوں کے ذمہ ہے۔ بہ شرطیکہ بات اُن تک پہنچائی جائے جو مسئلہ کا حل دریافت کر سکتے ہیں۔ اس سے ان سب لوگوں کی تردید ہو گئی جو اس بات کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہر قسم کا مسئلہ ہر کس و ناکس کے سامنے رکھ دیا جائے اور جو بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان کی بھی رائے لی جائے۔

دوسرا اہم معاشرتی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ افواہیں پھیلانا اور بے تحقیق باتوں کو ایک کان سے دوسرے کان میں پہنچانا شیطانی فعل ہے۔ اس کے ذیل میں وہ سب لوگ آ جاتے ہیں جنہوں نے جھوٹی راویوں کی [illegible] اپنی کتابوں میں بھر دی ہیں اور روایت و عدل کو بھی بالائے طاق رکھ کر [illegible] کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا۔ ان کی بیان کردہ باتوں کو جب تک سند بنا کر لوگ پیش کرتے رہیں گے، ان سب کی گمراہی کا وبال ان مصنفوں پر پڑے گا، اور ان کے نامۂ اعمال کی سیاہی قیامت تک بڑھتی چلی جائے گی۔

تیسرا اہم بیانی مسئلہ یہ بیان ہوا کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم

کی راہ سے بحث کریں یا ان کے اجماع کی توہین کرکے کوئی دوسری راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، وہ عیاناً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کتاب وسنت کا علم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں تھا، انہیں ہے۔ اس طرح یہ سب شیطان کے پیرو بن گئے۔

اہل عالم پر یہ اللہ کی رحمت اور دین کا فضل ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی جماعت کو ہمیشہ جماعت رکھا اور ہر زمانہ میں اسلام کی نمائندگی کا شرف اسی متبعِ سنت جماعت کے ہاتھ میں رکھا، یہ برکت صحابۂ کرام کے قائم کیے ہوئے نظام خلافت کی ہے اور اسی کا مآل یہ نکلا ہے کہ آج تک کبھی اور روئے زمین کے کسی گوشہ میں اہل عالم نے یہ نہیں سمجھا کہ اسلام کے متعلق صحیح معلومات پیش کرنے کا حق کسی درجہ میں انہیں بھی ہے جو جماعت سے کٹ گئے اور اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر اپنا سود و زیاں جماعت سے جدا کر لیا۔ اسلام اور مسلمانوں کی جب بات ہوگی، شمال میں جنوب میں، مشرق میں، مغرب میں، مسلمانوں کے حلقے میں یا کافروں کے اداروں میں وہ بات ہمیشہ اسی قرآن مجید سے ہوگی جو امتِ محمدیہ کے ہاتھ میں ہے، اسی نظام خلافت سے ہوگی جو حضرت صدیق اکبرؓ اور آپ کے خلفاء کا ہے اور اسی نظام فقہی سے ہوگی جو حضرت امام اعظم سے لے کر حضرت امام احمدؒ کے عہد تک مدون ہوا۔

امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے جتنے خلفا ہوئے، ان کے برسرِ اقتدار آنے کے طریقے مختلف رہے، کسی کے طریقۂ انتخاب میں دوسرے طریقۂ انتخاب سے مماثلت نہیں۔ اس اختلاف میں وجہ اتفاق صرف ایک ہے یعنی امت کا اجماع اور یہی اصل اصول ہے۔ یہ کہنا کہ انتخاب کا فلاں طریقہ درست ہے اور فلاں غلط، فلاں صواب ہے اور فلاں مشتبہ، یہ لوگوں کی اپنی خیالی باتیں ہیں اور صحابۂ کرام کے ساتھ گستاخی پر مبنی۔ یہ جو لوگ جمہوریت جمہوریت کی رٹ لگاتے ہیں، اگر یہ اپنے ہی زمانہ کو دیکھیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ایک لفظ جمہوریت کی کتنی تعبیریں موجود ہیں، انگلستان، امریکہ، فرانس، روس، چین اور ہندوستان سب جگہ جمہوریت ہی کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور یہ دعویٰ سب کو تسلیم بھی ہے تو ان کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ اسلام میں جمہوریت کا جو تصور ہے اس کی بھی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ویسے اگر انصاف اور اخلاص سے دیکھا جائے کہ صحیح معنوں میں کس شخص کو اپنے منتخب ہونے سے پہلے ہی جمہور اہل اسلام کی تائید حاصل تھی، تو تاریخ اسلام میں ایسا سب سے

پہلا شخص امیر المومنین معاویہؓ ہیں۔ باقی سب کے لیے محدود استصواب ہوا تھا اور بعض کے لیے استصواب قطعاً نہیں ہوا، اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ اسلام صرف جمہوریت کا قائل ہے کہ جو شخص برسرِ اقتدار آ جائے اسے امت قبول کر لے اور اس کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت جانے اس کے خلاف کھڑے ہونے والوں کا ساتھ نہ دے بلکہ انہیں باغی اور واجب القتل سمجھے۔

سُنّت: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر اپنے بعد خلافت کے بارے میں تصریحات کی ہیں، وہاں بھی کوئی بات ایسی نہیں جس سے زمانہ کی قید نکالی جا سکے۔ بلکہ زمانہ کی قید نکا لنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ کا لایا ہوا دین، آپ کی بنائی ہوئی امت اور آپ کا برپا کردہ نظام تھوڑی سی مدت کے لیے ہے۔ ارشاد مبارک ہے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبیٌّ خلفہ نبیٌّ وانہ لا نبی بعدی فسیکون خلفاء فیکثرون قالوا فما تامرنا قال فوا ببیعۃ الاوّل فالاوّل اعطوھم حقھم فان اللہ سائلھم عما استرعاھم۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے فرمایا: آپ کا ارشاد ہے "بنو اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کے ہاتھ میں تھی ایک نبی کا جب انتقال ہوتا تو ان کی جگہ دوسرا نبی کا تقرر ہو جاتا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے (یا یہ کہ ایک وقت میں کئی کھڑے ہو جائیں گے) صحابہ نے عرض کیا" پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا جو بھی پہلے آ جائے اس کی بیعت پوری کرو، اور ان کے حقوق ادا کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ ان کی رعایا کے بارے میں ان سے خود ہی باز پرس کرے گا (بخاری و مسلم)

اس متفق علیہ حدیث کی موجودگی میں خلفاء کی تعداد مقرر کرنا انتہائی جرأت کا کام ہو گا۔ دین کی شوکت اور تمام عالم اسلام میں ایک مستحکم امامت کے قیام کے متعلق آپ نے پیشگوئی فرمائی، (صحیح بخاری: کتاب الاحکام، صحیح مسلم: کتاب الامارۃ):۔

عن جابر بن سمرۃ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول یکون اثنا عشر امیراً فقال کلمۃ لم اسمعہا فقال ابی انہ قال کلہم من قریش

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ بارہ امیر ہوں گے۔ پھر آپؐ نے کچھ فرمایا جو میں سن نہ سکا تو میرے والد نے بتایا" فرما رہے ہیں کہ سب قریش میں سے ہوں گے"

اس کے بعد مسند احمد میں نہایت قوی سند سے سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے (ج ۱، ص ۳۹۸)

عن مسروق بن الاجدع الہمدانی قال کنا جلوساً عند عبد اللہ بن مسعود وھو یقرئنا القرآن۔ فقال لہ رجل یا ابا عبد الرحمٰن ھل سألتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کم یملک ھذہ الامۃ من خلیفۃ۔ فقال عبد الرحمٰن مسعود ماسألنی عنہا احد منذ قدمت العراق قبلک ثم قال نعم ولقد سألناھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اثنا عشر کعدۃ نقباء بنی اسرائیل

حضرت مسروقؓ بن اجدع ہمدانی سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں ہم حضرت عبد اللہ بن مسعود کی خدمت میں حاضر تھے اور آپ ہمیں قرآن مجید پڑھا رہے تھے ایک صاحب نے دریافت کیا" اے ابو عبد الرحمٰن! کیا آپ حضرات نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ اس امت میں کتنے خلیفہ با اختیار ہوں گے؟ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا" جب سے میں عراق آیا ہوں تم سے پہلے کسی شخص نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا۔" پھر فرمایا۔ ہاں ہم نے واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا اور آپ نے فرمایا تھا" بارہ" یعنی جتنے بنی اسرائیل کے نقیب تھے۔

یہ حدیث حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد کی ہے اور اسی وقت سے صحابۂ کرام نے امت کو بتا دیا تھا کہ ان کے دور میں بارہ با اختیار خلیفہ ہوں گے۔ گویا یہ اختتام خلافتِ امویہ تک کی بشارت ہے۔ یہ شرف اموی خلفاء کو حاصل رہا کہ تمام عالمِ اسلام کا ایک سیاسی مرکز تھا اور صرف ایک امام ہوتا تھا، جس کا حکم پوری اسلامی دنیا پر چلتا تھا۔ اور یہ شرف بھی صرف اموی خلفاء کو حاصل ہے کہ صحابۂ کرام نے ان سے

بیعت کی۔ بعد کے خلفاء زمانہ گزر جانے کی بنا پر اس شرف سے محروم رہے۔ یہ سعادت بھی اموی خلفاء ہی کو حاصل تھی کہ ان کی مملکت کے کارکنوں میں صحابہ کرام ہوتے تھے۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ آخر عہد اموی تک کا زمانہ صحابہ کرام کا زمانہ ہے اور جو نظام مملکت تھا وہ صحابہ ہی چلا رہے تھے اور انہی کی رائے اور منشاء کے مطابق کاروبار جہانبانی قائم تھا۔

ایک اہم حدیث

سیاسیات اسلامیہ کے متعلق صحاح میں ایک نہایت ہی اہم حدیث ہے جس پر عموماً توجہ نہیں کی جاتی۔ اور اگر کسی نے اس پر توجہ کی بھی تو تعبیر میں غلطی کی۔ (صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب کیف الامر اذا لم تکن جماعۃ)

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

كان الناس يسألون رسول الله صلى الله
عليه وسلم عن الخير وكنت اسأله
عن الشر مخافة ان يدركني۔ فقلت
يا رسول الله انا كنا فی جاهلية
وشرٍّ فجاءنا الله بهذا الخير
فهل بعد هذا الخير من شرٍّ؟ قال نعم،
قلتُ وهل بعد ذالك الشرّ من خير
قال نعم وفيه دخن، قلتُ وما دخنه
قال قوم يهدون بغير هدي تعرف
منهم وتنكر۔ قلت فهل بعد ذلك
الخير من شرٍّ؟ قال نعم دعاةٌ على
ابواب جهنّم من اجابهم اليها قذفوه
فيها۔ قلتُ يا رسول الله صفهم لنا؟

لوگ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی بابت
پوچھا کرتے تھے لیکن میں شر کے متعلق بات کیا کرتا تھا
کہ کہیں میرے زمانہ میں بپا نہ ہو۔ میں نے عرض کیا "یا
رسول اللہ! ہم جاہلیت اور شر میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ
ہمارے پاس یہ خیر لے آیا (یعنی اسلام) تو کیا اس خیر
کے بعد کچھ شر آجائے گا؟" فرمایا "ہاں" میں نے عرض
کیا "اس شر کے بعد خیر ہوگی؟" فرمایا "ہاں مگر اس
میں کمزوری رہے گی"۔ میں نے عرض کیا "کمزوری کیا
ہوگی؟" فرمایا "ایسے لوگ ہوں گے جو میری ہدایت
کا خیال کئے بغیر عمل کریں گے۔ کوئی بات تمہیں ان کی
گوارہ ہوگی اور کوئی ناگوار"۔ میں نے عرض کیا "پھر
اس خیر کے بعد تو شر نہیں آئے گا؟" فرمایا "ہاں
جہنم کے دروازوں پر بلانے والے کھڑے ہوں

قال هم من جلدتنا و يتكلمون بألسنتنا۔ قلت فما تأمرني ان ادركني ذلك؟ قال تلزم جماعة المسلمين و امامهم۔ قلت فان لم يكن لهم جماعة ولا امام؟ قال فاعتزل تلك الفرق كلها ولو ان تعض باصل شجرة حتى يدركك الموت وانت على ذلك۔

گے، جو بھی ان کی طرف ان کے کہنے سے جھکے گا وہ اسے اس میں (جہنم میں) دھکیل دیں گے۔" میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ان کی علامت تو بتایئے؟" فرمایا "ہم ہی میں سے ہوں گے اور ہماری ہی زبان بولیں گے۔" میں نے عرض کیا "اگر ایسا وقت مجھ پر آجائے تو پھر میرے لیے آپ کا کیا حکم ہے؟" فرمایا "مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے وابستہ رہنا۔" میں نے عرض کیا "اگر ان کی جماعت اور امام نہ ہو تب؟" فرمایا "تو پھر ان سب فرقوں سے الگ ہو کر بیٹھ رہنا، اگرچہ کسی درخت کی جڑ کو دانتوں سے پکڑنا پڑے، یہاں تک کہ تمہیں موت آجائے اور تمہیں اس حال میں پائے"

امامت کے بارے میں یہ حدیث بڑی اہم نص ہے۔ سیدنا حذیفہؓ پر اللہ کی یہ بڑی رحمت تھی کہ فتنہ پھیلنے سے پہلے ہی آپ کو اٹھا لیا گیا۔ امیر المومنین سیدنا عثمان صلوات اللہ علیہ کی شہادت سے کچھ ہفتے بعد مدائن میں وفات پائی اور ان ہنگاموں کا آپ پر کچھ اثر نہ ہوا جو مرکزِ اسلام میں بپا تھے۔

اس ارشادِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے اور حقیقت بھی یونہی ہے کہ اسلام کے بعد جو شر آیا وہ تمام عالم کو محیط ہو جاتا، اگر اللہ تعالیٰ ارتدادِ عرب کے وقت حضرت صدیق اکبر صلوات اللہ وسلامہ علیہ کو قائم کر کے آپ کو وہ عزیمت نہ بخشتا جس نے اسلام کو معجزانہ بچا لیا۔

اس کے بعد خیر کا زمانہ ہے وہ صدیوں تک کا ہے، یعنی اس وقت تک کا جب مسلمانوں کی جماعت اور اس کا امام نہ ہو۔ اس دورِ خیر میں اس جماعت اور اس کے ائمہ کے حلقہ سے باہر وہ لوگ ہوں گے جو جہنم کے دروازوں پر کھڑے بلا رہے ہوں گے۔ کسی ایک دروازہ پر نہیں بلکہ سب دروازوں پر، اور قسم قسم کی گمراہیاں اور عقائد باطلہ لے کر امتِ محمدیہ کو تباہ کرنے کے درپے ہوں گے۔ اس صورت میں پناہ کی ایک ہی سبیل ہوگی کہ آدمی جماعت اور اس کے امام سے وابستہ رہے، ہر وہ تحریک جو جماعت کو کمزور اور امام

جماعت کی فاعلیت کم کرنے کے لیے چلائی جائے گی۔ وہ جہنم میں دھکیل دینے کے مترادف ہوگی۔

یہ کمزوری خود مسلمانوں میں بھی ہوگی۔ وہ اور ان کے امام سب کے سب یک گونہ اس کمزوری میں مبتلا ہوں گے۔ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو دین سے عقیدتاً وابستہ اور جماعت میں شامل رہنے کے باوجود معیاری زندگی بسر نہیں کریں گے۔ ان کی بعض باتیں اچھی ہوں گی اور بعض بُری۔ ہر بڑی قوم میں جس کا حلقۂ اثر و نفوذ وسیع اور مدت بقاء طویل ہو، اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ چھوٹے پیمانہ پر تو ممکن ہے کہ ہر شخص معیاری زندگی بسر کرے اور تعلیمات اس میں پورا رچا ہوا ہو، لیکن یہ امر فطرتِ انسانیہ کے خلاف ہوگا کہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد جب ہو، اور ملک کے ملک ان کے تصرف میں ہوں تو ان کے اندر کوئی خرابی اور کمزوری نہ آئے۔

دعوتِ محمدیہ کی بنیاد فطرۃ اللہ پر ہے جس کا ایک بنیادی اصول ہے: "کُلٌّ یعمل علی شاکلتہ" (ہر شخص اپنی افتادِ طبع کے مطابق عمل کرتا ہے)۔ غلطیاں ہوتی ہیں، گناہ ہوتے ہیں، خرابیاں آتی ہیں، کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود چونکہ وہ اپنی زندگی کا معیار عقیدتاً وہی رکھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے مقرر فرمایا ہے، اس لیے دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں نوازتا ہے۔ انہیں سزائیں ملتی ہیں لیکن ہر خوف کے بعد امن اور ہر ذلت کے بعد انہیں سربلندی عطا ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ دعوتِ نبوت کا علمبردار ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا رتبہ بلند ہے اور تمام اقوامِ عالم کے مقابلہ میں حق کی گواہی کا شرف انہی کو حاصل ہے (الفاطر ۳۲):-

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ۔	"پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جنہیں اپنے بندوں میں سے چن لیا تھا۔ بعض ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، بعض درمیانی راہ چلنے والے اور بعض ایسے جو اللہ کے حکم سے نیکیوں کی طرف رغبت کے ساتھ بڑھیں۔ یہ ہے بڑا فضل۔"

جب تک جماعت اور اس کا امام موجود ہے وہ خیر کا مرکز ہے اور رحمتِ الٰہی کا مورد، اگرچہ

اس امام یا اس کی جماعت کے افراد کے افکار و اعمال معیاری نہ ہوں۔ وجہ ظاہر ہے کہ کتاب کی وراثت نے انہیں سب کو برگزیدہ کر دیا ہو گا اور چونکہ نظام بہرحال برپا ہو گا، اس لیے اس کی یہ برکت بھی مشہور ہو گی کہ اصلاح کے امکانات قوی رہیں۔ جب تک جماعت اور اس کا امام ہے اس وقت تک کسی قسم اتار چڑھاؤ مہلک نہیں ہو سکتا اور نہ جماعت پراگندہ ہو سکتی ہے۔ ہر ٹھوکر کے بعد سنبھلیں گے اور ہر انتشار کے بعد مرکزیت کی طرف دوڑیں گے۔

لیکن جب وہ وقت آجائے کہ مسلمانوں کی جماعت ہو اور نہ اس کا امام تو پھر وقت ہو گا اپنے اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر کا۔ مسلمانوں میں اگر کچھ جان ہو گی تو پھر وہ قرونِ اولیٰ کی طرف لوٹنے کی کوشش کریں گے، کہ نئے سرے سے امّت کی شیرازہ بندی ہو اور اس میں مرکزیت پیدا کر کے امام کے نصب کا انتظام کیا جائے۔

امت کی پوری تاریخ میں یہ منحوس زمانہ ہمارا ہے کہ عالمِ اسلام کا کوئی امام نہیں اور نہ جماعت کا کوئی نظام ہے۔ سب کے سب جغرافیہ، نسل اور فرقہ بازی کے شرک میں مبتلا ہیں اور محض ادنیٰ زمینی اور مادّی منافع کے درپے۔ وہ مقصد علیا جس کے لئے اس امّت کی تشکیل کی گئی تھی۔ سب نے پس پشت ڈال دیا مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں اور حکومتیں موجود ہیں، لیکن سب کی سب آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں لیکن جو ملتیں حقیقتاً اور عقیدتاً اسلام کی دشمن اور مسلمانوں کو فنا کرنے کے درپے ہیں، ان کے سامنے سب کے سر خم ہیں۔ ان کفار نے اور ان مکذبانِ دعوتِ محمدیہ نے عالمِ اسلام کو آپس میں بانٹ رکھا ہے اور ان کی کوشش ہے کہ مسلمان کسی طرح ایک جھنڈے کے نیچے جمع نہ ہونے پائیں۔

عالمِ اسلام کی اس صورتِ حال سے دعوتِ محمدیہ کے مقاصد ضائع ہو رہے ہیں، اور مسلمانوں میں روز بروز اپنے دین سے بیگانگی بڑھ رہی ہے۔ اگر کسی طرف سے کوئی آواز اٹھتی ہے اور کسی طبقہ میں جذبہ بیدار ہوتا ہے تو اپنوں ہی کے ہاتھوں وہ بارور نہیں ہو پاتا۔ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو امتِ عالم کا منصب عطا فرمایا تھا۔ لیکن مسلمانوں کا عالم یہ ہے کہ کسی کے گلے میں صلیب ہے اور کسی کے سر پر زنار ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جو ملک جماعت سے کٹ کر امام کے حلقۂ اثر سے باہر ہوا اسی پر کفر نے چھاپہ مارا۔ سب سے پہلے اندلس نے علیحدگی اختیار کی تھی، وہی سب سے پہلے دارالکفر بنا، اور ایسا کہ اب سے دارالاسلام

بناخواب وخیال ہوگیا۔ ہندوستان نے بھی امیر المومنین کی بیعت سے انکار کیا، اس پر انگریز مسلط ہوگیا، یہی حال مصر کا ہوا، بخارا کا ہوا، "تا آنکہ نوبت بجز کہ عرب نے لگایا۔

حدیث بالا میں یہ الفاظ بہت غور طلب ہیں "وہ ہماری ہی نسل اور ہماری ہی زبان کے ہوں گے۔" ہوتے تو رہے، سب ہی شہر کے وائی نام کے مسلمان اور عربی بولنے والے کیونکہ عربی ہی سرکاری زبان تھی لیکن یہ کارنامہ صرف عربوں کا ہے اور وہ بھی ہاشمیوں کا کہ جو ملک ڈیڑھ ہزار برس سے دارالاسلام تھے۔ یعنی عراق وشام، ان پر نصاریٰ مسلط ہوگئے اور ساتھ ہی فلسطین میں "اسرائیل" کا مستقل ناسور جسد اسلام کو کھاجانے کے لیے جڑ پکڑ گیا۔

یہ خمیازہ اس جرم عظیم کا ہے کہ عربوں نے امیر المومنین کے خلاف بغاوت کی اور اس کے لیے سہارا لیا، اُن کا جن کے متعلق صریح حکم ہے (المائدہ: ۵۱)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ○

اے ایمان لانے والو! یہود ونصاریٰ کو اپنا کارساز مت بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے کارساز ہیں جس نے بھی ان سے دلی دوستی رکھی وہ انہی میں ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ظلم کیش لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

جس امت کے نبی کی آخری وصیت یہ تھی "اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب" (یہود ونصاریٰ کو عرب کے جزیرہ سے نکال دینا)، اسی ہادی برحق کی اولاد میں ایک شخص نے جان بوجھ کر یہود ونصاریٰ دونوں کو سرزمین عرب پر مسلط کر دیا۔ اشتر نخعی سے لے کر شریف حسین تک سب وہی لوگ امت کو تباہ کرنے کے درپے رہے جو اسلام کا جامہ پہنے رہتے تھے نسلاً عرب تھے یا عربی بولتے تھے۔ اِنَّ فِی ذَالِکَ لَعِبرَۃً لاولی الابصار۔ کافروں سے کسی جنگ میں مسلمانوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی۔ ہر میدان انہوں نے مارا۔ البتہ ہر فتح کو شکست میں تبدیل کرنے والے وہ نام نہاد مسلمان تھے جو کافروں سے مل گئے، اور ان میں اکثر وبیشتر سبائی گروہ کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تیرہ سو برس کی اس تاریخ سے بے اعتنائی برتنا انتہائی حماقت

اور بدترین جہالت ہو گی۔

ایک اور حدیث

سیدنا نعمان بن بشیرؓ نے سیدنا حذیفہؓ سے اسی مضمون کو ایک اور طرح نقل کیا ہے۔ اگرچہ حدیث کا ماخذ قوی نہیں لیکن واقعات کے مطابق ہے اور اس میں ایک بات ہے بہت غور طلب۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یوں بیان کیا گیا ہے:۔

" تم میں نبوّت کا وجود اس وقت تک باقی رہے گا جب تک خدا چاہے گا، پھر اللہ تعالیٰ نبوّت کو اٹھا لے گا اور اس کے بعد نبوّت کے طریقہ پر خلافت ہو گی جب تک خدا چاہے گا پھر اللہ تعالیٰ خلافت کو اٹھا لے گا اور اس کے بعد ملوکیت ہو جائے گی کاٹنے والی۔ جب تک خدا چاہے گا اسے قائم رکھے گا۔ پھر اس کے بعد نبوّت کے طریقہ پر خلافت ہو گی۔" اتنا فرما کر آپ خاموش ہو گئے۔ (مسند احمد و سنن بیہقی)

اس حدیث کے راوی کا بیان ہے کہ جب عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے تو میں نے ان کو یہ حدیث لکھ کر بھیج دی اور امید ظاہر کی کہ آپ ہی وہ خلیفہ ہیں جن کا ذکر اس حدیث میں کاٹنے والے بادشاہ اور جبر کی حکومت کے بعد کیا ہے (حضرت امیرالمومنین) عمر بن عبد العزیزؒ اس سے بہت خوش ہوئے۔

مقدس نوشتوں کی اسی قسم کی تاویل سے عجیب پیچیدگی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ راوی حدیث نے اسے اس زمانہ پر منطبق کر دیا جو اسلام کی عظمت و عروج کا زمانہ تھا اور پھر ارشادِ نبوی کو اشخاص کے بارے میں سمجھ لیا۔ حالانکہ صراحۃً ذکر نظام کا ہے۔ کسی صرفی اور نحوی اصول یا علم معانی کے اعتبار سے اسے خلفاء کی شخصیتوں پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں پانچ قسم کی حکومتوں کے دور بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ **حکومتِ نبویہ** :- یہاں اختلاف و اجتہاد کا کوئی سوال نہیں محض سننا اور اطاعت کرنا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی حکم دیں اس کی تعمیل ہے چون و چرا واجب ہے۔ اختلاف صرف ان امور میں تھا جو آپ بحیثیت بشر یا فردِ ملت کے بیان فرمائیں اور اجتہاد صرف ان امور میں جب آپ امام کی حیثیت سے کوئی رائے دیں۔ نبی کی حیثیت سے جو فرمائیں ان کی اطاعت فرض محض ہے بمثال کے طور پر غزوۂ احد کا ذکر کافی ہو گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کی حیثیت سے یہ رائے ظاہر کی

کی تھی کہ حملہ آوروں کا مقابلہ شہر میں رہ کر کیا جائے۔ لیکن صحابہ میں سے وہ حضرات جو شوقِ شہادت سے سرشار تھے وہ باہر نکل کر لڑنا چاہتے تھے اور یہی اکثریت کی رائے ہو گئی۔ آپ نے تال عیاناً دیکھ چکنے کے باوجود اکثریت کے اس فیصلہ کو قبول کر لیا اور اندر ہتھیار لگانے تشریف لے گئے۔ اس عرصہ میں صحابہ پر انفعالی کیفیت طاری ہوئی اور سب نے فیصلہ کیا کہ جو حضورؐ کی رائے ہے اسی پر عمل کیا جائے اور جب آپ باہر تشریف لائے تو سب نے معافی مانگی اور عرض کیا کہ حضور جس طرح فرماتے ہیں اسی پر عمل فرمائیں۔ لیکن آپؐ نے فرمایا نبی جب ہتھیار لگا لیتا ہے تو پھر مہم سر کئے بغیر نہیں اتارتا۔

پہلا حکم بحیثیت امام کے تھا جس سے اختلاف کیا جا سکتا تھا لیکن دوسرا حکم بحیثیت نبی کے تھا جس سے سرتابی کی مجال نہیں۔ فردِ ملت ہونے کی حیثیت سے آپ کے بہت سے مشورے آپ کے اصحاب رد کر دیا کرتے تھے۔ نظامِ اسلامی میں فرد آزاد ہے اور اپنی رائے کا مختار۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ خود قرآن مجید میں موجود ہے کہ انہیں آپؐ نے بار بار مشورہ دیا کہ اپنی زوجہ محترمہ کو طلاق نہ دیں، مگر انہوں نے دے دی۔ یہ اُن کا حق تھا جو انہوں نے استعمال کیا۔ کیونکہ میاں بیوی میں ایک دن نہ نبھی۔ بہرحال اس نہج کی حکومت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اب کوئی انسان ایسا نہیں آسکتا جس کی بات محض اس لیے مانی جائے کہ اس کی ہے اور نہ کسی کا ایسا حکم چل سکتا ہے جو اللہ و رسولؐ کے منافی ہو یا شخصی آزادی پر اس سے حرف آتا ہو۔ جس کا بھی حکم چلے گا وہ اسی وقت جب شریعت کے مخالف نہ ہو

۲۔ خلافتِ نبوّت : یہ دوسرے کتاب و سنت کے مطابق دینوی حکومت کا۔ اس حکومت کے چلانے والوں میں کوئی شخص مطاعِ مطلق نہیں۔ اصل مطاع صرف اللہ اور اس کا رسول ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ خلفاء اور ائمہ کا کام ہے اللہ و رسولؐ کے احکام کا نفاذ۔ قانوناً کسی اصلِ دینی اور حکمِ صریح کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔ اس حکومت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان ایک مرکز کے تحت ایک جماعت کی صورت میں امامتِ عالم کے فرائض انجام دیں اور اقوامِ عالم میں وہ نظامِ عدل برپا رکھیں جو منشاء بعثتِ انبیاء ہے۔ اس حکومت میں کوئی شخص قانون سے بالا نہیں اور نہ کسی کا یہ منصب ہے کہ وہ قوانین بنائے اختیارات شخصِ واحد کے ہاتھ میں ہوں، یا ایک با اثر حلقہ کے۔ یہ حلقہ امام نے چنا ہو یا رعایا نے منتخب کر کے

امام کی مدد کے لیے بھیجا ہو۔ یا انتخاب محدود استصواب پر مبنی ہو یا رائے عامہ لی جائے۔ یہ لوگ اپنی طرف سے خود کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ البتہ اللہ و رسول کے عطا کیے ہوئے احکام کے نفاذ اور ان احکام کی روح اور منشاء کو بروئے کار لانے کے لیے اجتہاد کر سکتے ہیں۔ اسی لیے فقہائے اسلام نے یہ شرط رکھی ہے کہ جو لوگ کاروبارِ حکومت چلائیں ان میں اجتہاد کی قابلیت ہونی چاہیئے تاکہ ماحول کے مطابق احکامِ الٰہی کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور فعال بنا کر معاشرہ میں زندگی اور ارتقاء برقرار رکھ سکیں۔ خامیاں سب ہی ہوتی ہیں اور غلطیاں سب سے ہوتی ہیں لیکن چونکہ مرجع موجود ہے لہٰذا اصلاح ہر وقت ہو سکتی ہے۔

۴۔ ملک عضوض : نظامِ خلافت ختم ہونے کے بعد کثکھنی حکومت قائم ہوگی۔ ہر حکومت کی اپنی وفاداری، اپنا دستور اور اپنا منہاج ہوگا۔ سب ایک دوسرے کو حریفانہ دیکھیں گے اور اگر آپس میں ملیں گے بھی تو چند ادنٰی مادی اور دنیوی مفاد کے لیے۔ مسلمانوں کی ایسی حکومتیں بھی قائم ہوں گی جو صراحت کر دیں کہ ان کی حکومت دینی نہیں ہے اور نہ مملکت کا مذہب اسلام ہے۔

اور ایسی حکومتیں بھی ہوں گی جو کہلاتی تو ہوں گی مسلم اور اس انتساب پر انہیں فخر بھی ہوگا لیکن اللہ کی حرام کی ہوئی چیزیں اُن کے ہاں قانوناً حلال ہوں گی اور ان کبائر کے ارتکاب کے لیے سرکاری طور پر آسانیاں فراہم کی جائیں گی۔ عدالتوں میں سودی کاروبار کے فیصلے ہوا کریں گے، سود خوروں کو سرکاری حمایت حاصل ہوگی، زنا کے لئے سرکاری اجازت نامے دیئے جائیں گے اور شراب خانوں کو سرکاری ٹھیکے ملیں گے۔ آب کاری کا محکمہ حکومت کا ایک مستقل شعبہ ہوگا اور اس کے افسروں اور کارکنوں میں وہ لوگ ہوں گے جو بظاہر نماز روزہ کے پابند ہوں گے خود نشہ نہ کرتے ہوں گے، اُسے حرام بھی جانتے ہوں گے۔ لیکن ان ملازمتوں کو حلال اور اپنی آمدنی کو طیب جانیں گے۔ نماز کا انتظام انفرادی ہوگا کہ جس کا جی چاہے پڑھے اور جو نہ چاہے نہ پڑھے۔ زکوٰۃ کی وصولیابی کا ان کے ہاں کوئی بندوبست نہیں ہوگا، لیکن ٹیکس لگانے پر یہ حکومتیں دلیر ہوں گی۔ جب یہ جنگ کریں گی تو مقصد اعلاء کلمۃ اللہ نہیں ہوگا، بلکہ ان کا جہاد ہوا کرے گا فی سبیل الوطن۔ غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکومتِ اسلامیہ کے جو فرائض بتائے ہیں وہ سب ان حکومتوں میں نظر انداز کئے جائیں گے۔ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسی ایک بات کو بھی سرکاری حیثیت نہیں دی جائے گی اور پھر بھی دعویٰ

ہو گا مسلم حکومت ہونے کا اور بات بات میں اسلام اور سلف صالحین کا نام لیا جائے گا۔ ان ملکوں کے مغضوب ہونے کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ انہوں نے عربی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی بجائے اسے ملک بدر کر رکھا ہے۔ اللہ نے اپنی مصلحتوں کی بناء پر انسان کی اس فطری اور قدیم ترین زندہ و پائندہ زبان کو اپنی آخری کتاب کے لیے چنا اور صرف یہی وہ زبان ہے جو مسلمانانِ عالم کو ذہنی طور پر قریب لا سکتی ہے، لیکن اب سیاست کے معنی ہیں کہ اس زبان کے الفاظ اپنی اپنی زبان سے نکال دیے جائیں، تاکہ مسلمانوں کی اجنبیت مکمل ہو جائے اور جب وہ اپنے سالانہ بین الاقوامی اجتماع میں اپنے مرکز پر جمع ہوں تو ایک دوسرے کا منہ تکیں۔ عربی زبان سے بے نیازی بالآخر حج کو ختم کر کے رہے گی، جسے بے روح تو پہلے ہی کر دیا گیا ہے، عنقریب اس کا تصور بھی سرد ہو جائے گا۔

۴۔ جبر کی حکومت: جب مسلمانوں کی یہ حالت الم نشرح ہو جائے گی تو پھر انہیں مجبوری کی زندگی بسر کرنے کا عذاب دیا جائے گا۔ ان پر کفار مسلط کر دیے جائیں گے اور معمولی فرائض و نیز ادا کرنے کے لیے مسلمان اپنے ان کافر آقاؤں کے چشم و ابرو کو دیکھا کریں گے جیسے ہندوستان کے مسلمان ۱۹۴۷ء سے پہلے تھے، یا جیسے آج کے مسلمان کسی ایک کافر حکومت کے زیر فرمان بنے ہوئے ہیں یا کسی دوسرے کافر جتھے کے۔ کہ اپنی سیاست، اپنی معیشت اور اپنی معاشرت سب دوسروں کے ہاتھ میں دے کر عملاً ان کے محکوم بنے ہوئے ہیں۔ جس سے نمایاں مثال چین اور روس کے کروڑوں مسلمانوں کی ہے۔ کہ جو مجبوری کی زندگی ان کی ہے ایسی حالت شاید ہی کسی جگہ کے مسلمانوں کی ہوئی ہو۔ جبر اپنی پوری شان سے مسلط ہو رہا ہے۔

یہ حالت جب انتہا کو پہنچ جائے گی تو پھر بطور ردِ عمل کے یا تو خود مسلمانوں میں آزادی کی حرکت ہو گی یا اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق نظامِ خلافت کے احیاء کے لیے کسی دوسری قوم کو حلقہ بگوشِ اسلام بنا کر اپنا کام لے گا۔ اس نے پہلے بھی ایسا کیا ہے، پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے، اور آئندہ بھی ایسا کرنے کی اسے قدرت ہے وہ تو ہم لوگوں کا محتاج نہیں، ہم ہی اس کے محتاج ہیں۔

اقوامِ عالم کی تاریخ یہ ہے کہ ایک دور کے بعد اپنا دوسرا دور شروع نہیں ہوتا، بلکہ آئندہ پیدا ہونے

یں اور ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، تا آنکہ ایک دور بالکل ختم ہو جائے اور دوسرا دور بالکلیہ نمودار ہو جائے۔ اگر حدیث زیرِ نظر پر غور کریں تو واقعات کے بالکل مطابق ہے، تسبیح کے دانوں کی طرح ایک کے بعد دوسرا واقعہ رونما ہوتا رہا۔ اندلس اور ہندوستان وغیرہ کی علیحدگی سے لے کر عربوں کی بغاوت تک پہلا دور ختم ہو گیا۔ اس کے بعد خلافتِ اسلامیہ کا کہیں وجود نہیں، نہ مسلمان سیاسی حیثیت سے ایک جماعت ہیں اور نہ ان کا کوئی امام ہے اور نہ خلافت کے احیاء کے فی الحال امکانات ہیں۔

البتہ حریف مسلم ممالک ہیں جو کسی طرح ایک وحدانی نظام میں منسلک ہونے پر آمادہ نہیں۔ ان ممالک نے کفر کے دو حلقوں کے تحت مجبوری کی زندگی شروع کر دی ہے، تا آنکہ وہ وقت آ جائے جب تمام عالم اسلام مجبور و مقہور ہو اور ان کا یہ تصور مٹ جائے کہ کفر کے سہارے کے بغیر بھی زندہ رہنے کا امکان ہے۔ جیسے ہر بھیڑیہ عذر پیش کرتا ہے کہ فی الحال بالکل غیر جانبدار رہنے کی سبیل نہیں۔ کسی نہ کسی حلقے میں شامل ہونا پڑے گا ورنہ ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ (المائدۃ ، ۵۲)

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ	تم دیکھو گے کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ ان میں گھُسے پڑتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم پر کوئی افتاد نہ پڑ جائے۔

ابھی تو کفر کے اصرار پر یا اہلِ کفر کی خوشامد میں بعض "مسلم" حکومتوں نے "اسرائیل" کو تسلیم کیا ہے، پھر حکماً ایسا کرنا ہو گا۔ جب ذہنی غلامی اور سیاسی پستی انتہا کو پہنچ جائے گی تو غیرتِ حق کو حرکت ہو گی اور خلافتِ نبوّت برپا کرنے کا وقت آ جائے گا۔

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ۔	ہو سکتا ہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ فتح سے ہمکنار کرے یا کوئی اور صورت پیدا کر دے اور پھر دلوں میں یہ باطل خیال پالنے والے اپنی کوتاہ عقلی پر پشیمان ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو اُمَّةً وَّسَطًا بنایا ہے (درمیانی امّت) یہ ہر اعتبار سے درمیانی ہے جغرافیائی حیثیت سے یہ کفر کے دونوں حصوں کے درمیان حجابِ حاجز ہے اور غیر جانبدار رہ کر تصادم کو

روک سکتی ہے۔ معاشی اعتبار سے بھی درمیانی چال چلتی ہے، نہ اس کے ہاں سرمایہ داری ہے اور نہ شخصی ملکیت کی نفی، معاشرتی امور میں اس کا موقف فطری اور عادلانہ ہے، نہ اس کے ہاں طلاق حرام ہے اور نہ ایسی آسان کہ خاندان کی وحدت برقرار ہی نہ رہ سکے، دین اس کا دنیوی ہے، یعنی تمام دینی امور ادا کرنے کے لئے اسے دنیا میں منہمک ہونا پڑتا ہے، نہ بالکل مادّی طرزِ زندگی ہے اور نہ مادّہ کی نفی کر کے خالص روحانی۔ اس کی آخرت کا انحصار اس کی دنیا پر ہے۔ اس میں طبقاتی کشمکش کے امکانات نہیں۔ اس کی حکومت میں نہ فرد اتنا آزاد ہے کہ جو چاہے نظریات رکھے اور جس قسم کے چاہے اعمال رکھے اور نہ فرد اتنا مجبور اور مقہور ہے کہ بطور خود نہ کچھ سوچ سکے اور نہ اپنی ذمہ داری پر کچھ کر سکے۔ غرض یہ ہے کہ ظاہراً و باطناً اس کے پاس وہ تمام وسائل موجود ہیں کہ اگر یہ دین کو پکڑے تو جغرافیہ، نسل اور زبان کی افتراق انگیزیوں سے نجات پاکر ایک عادلانہ وحدت بن سکتی ہے اور جب اللہ چاہے گا کہ خلافتِ نبوّت قائم ہو تو اسے وحدت بن کر رہنا ہوگا۔ بہر حال مسلمانانِ عالم اگر اپنے دین سے اسی طرح بیگانہ رہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے پر مائل نہ ہوئے تو پھر جب تک چاہے گا اللہ ڈھیل دے گا اور جب پکڑے گا تو اس کے چنگل سے یہ نکل نہ سکیں گے۔ وَاُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ (میں انہیں ڈھیل دیتا رہتا ہوں مگر میرا دل مضبوط ہوتا ہے) آخری فتح ہمیشہ اللہ اور رسولوں کی ہوتی ہے كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ (اللہ نے یہ لکھ رکھا ہے کہ غلبہ اسے اور اس کے رسولوں ہی کو ہوگا)

سطور بالا سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سیدنا حذیفہؓ کی بیان کردہ حدیث کا جو مطلب اس کے راوی نے لیا تھا وہ کس درجہ بے اصل تھا اور منشائے نبوّت کے کتنے خلاف۔

حدیث سفینہ: صحیح مسلم[1] کی ایک حدیث ہے جسے ایک منکرِ حدیث مؤرخ نے بطور حجت پیش کر کے "تاریخ الامت" میں یہ فیصلہ دے دیا کہ خلافت ختم ہو گئی اور سیدنا معاویہؓ کے عہد سے ملوکیت کا دور شروع ہو گیا۔ جو لوگ حدیث سے استناد کرتے ہیں انہوں نے نقد و جرح

---

[1] یہ حدیث صحیح مسلم میں نہیں بلکہ ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ (حبیب الرحمان)۔

کے تمام اصول بالائے طاق رکھ کر اس حدیث کو صحیح سمجھ لیا۔ محض اس لئے کہ اس کی روایت امام مسلمؒ نے کی ہے حالانکہ ہم بیان کر چکے کہ صحیحین کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ ان میں وارد شدہ تمام حدیثوں کو بے چون وچرا تسلیم کر لیا جائے۔ حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ جیسے امام حدیث کا قول ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

حدیث کے الفاظ ہیں" خلافت تیس برس رہے گی اور پھر ملک ہو جائے گا" اسی حدیث کو لوگوں نے اس موضوع پر حرفِ آخر قرار دے کر تمام نصوص کے مقابلہ میں اسے کھڑا کر دیا۔ گویا وہ دین جو قیدِ زمانی و مکانی سے آزاد ہے اس کا نظام صحیح بنیاد پر صرف تیس برس رہا۔ اہل تاریخ جانتے ہیں کہ یہ تیس برس کس طرح پورے ہوئے پھر بھی اس حدیث کو حجت بنایا جاتا ہے۔

اس تحدیدِ زمانی کے معنی یہ ہوئے کہ سیدنا علیؓ اگر شہید نہ ہوتے تو ۴۱ھ سے وہ خلیفہ راشد رہنے کی بجائے بادشاہ بن جاتے، بلکہ کٹکھنے بادشاہ۔ یا اگر سیدنا معاویہؓ کی بجائے اجماعِ امت سیدنا سعد بن ابی وقاص پر ہو جاتا، جو ایک وقت میں خلافتِ راشدہ کے لئے نامزد کئے جا چکے تھے تو انہیں ۵۴ھ تک زندہ رہنے کی یہ سزا دی جاتی کہ ان کی بیعت ہوتے ہی خلافت ختم اور کٹکھنا ملک شروع۔

دراصل یہ حدیث محض اموی خلفاء کی بے حرمتی کے لئے وضع کی گئی ہے۔ اسی لئے سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ جیسے غیر سیاسی اور مرنجان ومرنج صحابی کی زبان سے امویوں کو مہذب گالی دلوائی گئی ہے "کنجی آنکھ والی کی اولاد۔"

دریافت طلب ہے کہ سیدنا سفینہؓ نے امیر المومنین معاویہؓ سے بیعت کی تھی یا نہیں، اگر کی تھی تو اللہ اور رسولؐ کے نام پر جس شخص کی اطاعت کا انہوں نے عہد کیا تھا، اس امام کے متعلق یہ ناشائستہ الفاظ کس حد تک درست ہیں ؟ صحابۂ کرام جس طرح بیعت کیا کرتے تھے اس کے الفاظ صحاح میں مروی ہیں۔ مثلاً سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے امیر المومنین عبد الملکؒ سے ان الفاظ کے ساتھ بیعت کی تھی (بخاری: صحیح کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس ج ۴، ص ۲۴۵، طبع مصر)

الیٰ عبد اللہ عبد الملک امیر المومنین	"اللہ کے بندے امیر المومنین کی جناب میں!
انی اُقرُّ بالسمع والطاعۃ لعبد اللہ عبد الملک	میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے بندے عبد الملک

امیر المومنین علی سنۃ اللہ و سنۃ رسولہ فیما استطعت وانّ بنیّ قد اقرّوا علیٰ ذالک۔

المومنین کا حکم میں سنوں گا اور اطاعت کروں گا (میرا یہ اقرار) اللہ کی سنت اور اس کے رسول کی سنت کی پیروی میں ہے جس حد تک بھی میرا مقدور ہوگا (یعنی تاہی نہ کروں گا) یہی اقرار میرے بیٹوں نے بھی کیا ہے"۔

اب سوچنا چاہیئے کہ ان الفاظ کے ساتھ جس شخص سے بیعت کی جائے گی وہ کٹکھنا بادشاہ "شر الملوک (بدترین بادشاہ) ہوگا یا خلیفۂ رسول اللہ اور امام المسلمین؟ امیر المومنین عبد الملکؒ بہت بعد میں آئے ہیں اور تابعی ہیں، سیدنا ابن عمرؓ نے اسی قسم کے الفاظ کے ساتھ ان سے پہلے خلفاء سے بیعت کی تھی۔ بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی۔ ظاہر ہے کہ سیدنا سفینہؓ نے بھی اسی طریقہ پر بیعت کی ہوگی تو پھر کیسے ممکن ہے کہ ان کی زبانِ مبارک سے وہ الفاظ نکلے ہوں جو اس حدیث کے مختلف طرق میں مذکور ہیں، مثلاً مصنّف ابن ابی شیبہ میں۔

امام ابوبکر ابن العربیؒ نے (العواصم من القواصم: ص ۲۰۱ میں) مسلم شریف کی اس حدیث کو غیر صحیح بتایا ہے۔ ویسے بھی اس کی سند میں کوئی صاحب ایسے نہیں جن کا معتبر ہونا معرضِ بحث نہ ہو۔ پھر امام ابن العربیؒ نے کیا عمدہ بات فرمائی ہے کہ" اگر بالفرض یہ حدیث صحیح ہو تب بھی قابلِ قبول نہیں کیونکہ نصوصِ صریحہ کے خلاف ہے"۔ دیکھا جائے تو محض دوسری احادیث صحیحہ ہی کے نہیں جن میں سے بعض اوپر مذکور ہو چکیں بلکہ کتاب اللہ سنتِ رسول اللہؐ، اجماعِ صحابہ اور قیاس سب کے خلاف ہے۔

علاوہ ازیں سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ کو اگر واقعی خلافت جیسے اہم ترین اجتماعی مسئلہ کی بابت جمہور صحابہ سے ہٹ کر کوئی مخصوص علم دیا گیا تھا کہ خلافت تیس برس رہے گی، اور پھر ملک ہو جائے گا تو انہوں نے جمیعت صحابہ کو کیوں متنبہ نہیں کیا کہ سیدنا علیؓ کی خلافت تیس برس کے اندر قائم ہوئی ہے، اس لئے ان سے اختلاف کی گنجائش نہیں، اور جو ان کے خلاف کھڑا ہوگا وہ خلیفہ راشد کے خلاف کھڑا ہونے کی بناء پر مثل مرتد کے ہو جائے گا اور جو ان کی بیعت نہیں کرے گا وہ بھی حلال الدم ہوگا۔

پھر سیدنا معاویہؓ کو پسِ پشت بُرا کہنے سے تو بہتر یہ تھا کہ خود انہی سے صاف کہہ دیتے کہ تم خلیفہ

نہیں ہو، اس لئے تمہیں اللہ و رسول کی بیعت لینے کا حق نہیں۔ ہم تمہارے ملک میں رہتے ہیں تمہارے قوانین کی پابندی کریں گے، مگر یہ نہیں ہے کہ تم سے اختلاف کو عصیان سمجھیں، اور تمہاری اطاعت کو موجب رضا الہی جانیں، کیونکہ تم محض بادشاہ ہو۔

کیسی عجیب بات ہے کہ بیعت تو کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی سنت پر اور اس کی پیروی میں بات سننے اور اطاعت کرنے کی، لیکن سمجھتے ہیں بادشاہ، جو خود قانون ساز ہوتا ہے قانون سے بالا ہوتا ہے اور الہی قانون کا التزاماً پابند نہیں ہوتا۔

عقلاً و نقلاً ہم یہ کبھی باور نہیں کر سکتے کہ سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہی ہوگی جو تمام نصوص صریحہ صحیحہ اور اجماع صحابہ کے خلاف ہے۔

سنن ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد **الراشدون** : نقل کیا گیا ہے۔

علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین من بعدی تمسکوا بھا و عضوا علیھا بالنواجذ	اپنے اوپر میری سنت اور میرے بعد میرے ان خلفاء کی سنت کی پابندی لازم سمجھو جو ہدایت یافتہ اور ہدایت بخش ہوں گے۔ اسی سے وابستہ رہنا اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑنا۔

معلوم نہیں عربی زبان کے کن قواعد کے تحت اور دین کے کس اصول کے مطابق اس حدیث سے چار کی تخصیص کر دی گئی۔ حالانکہ الفاظ اور جملوں کی ترکیب میں ادنیٰ ترین اشارہ بھی اس کا نہیں کہ پانچواں خلیفہ راشد نہیں ہوگا یا کہ راشد صرف چار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو اور بعد ان کا اتباع کرنے والے تمام امتیوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا	لیکن اللہ نے تو تمہارے نزدیک ایمان کو محبوب کیا ہے اور اسی سے تمہارے قلوب کو آراستہ فرمایا اور تمہارے دلوں میں کفر سے بے راہ روی اور نافرمانی سے نفرت ڈال دی۔ یہی لوگ ہیں راشد

فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (ہدایت یافتہ) یہ اللہ کا فضل و نعمت ہے اور اللہ ہی ہے تمام باتوں کا جاننے والا۔ اور حکمت کے ساتھ پورے کار لانے والا۔"

اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کی اس توصیف میں ان کا راشدین ہونا اور ان کے احوالِ قلبیہ کا مزکّی و مطہر ہونا بطور امرِ واقعہ بیان کیا ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ مذہب ہے کہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں اور بعد کے اصحابِ رجال کی جرح و تعدیل سے بالا۔ یعنی ایک حدیث کی روایت میں سند کے ہر شخص کو پرکھا جائیگا، لیکن جب صحابی تک سند بطریقِ صحیح پہنچ جائے تو اس صحابی کی عدالت میں شک نہیں کیا جائے گا، اگرچہ ان کے اجتہاد سے اختلاف ہو۔

انفرادی طور پر ہر صحابی کا فتویٰ یا مذہب قابلِ استدلال ہے اور مجموعی طور پر جب وہ کسی امر میں متفق ہو جائیں یعنی بھاری اکثریت سے، تو ان کا موقف ایسا ہی حجت ہے جیسے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت صحابۂ کرام کے اجماع کا منکر نفس دین کا منکر ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے اس انکار کے ذریعہ اس گروہ کی حجیت ختم کر دے جن سے ہمیں دین ملا ہے، جنہوں نے دین قائم کیا ہے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا گواہ بتایا ہے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا صحابی اور مجتہد ہونا مسلم ہے۔ اب بڑی دلچسپ بات ہو گی کہ آپ جو کچھ صحابی اور مجتہد ہونے کی حیثیت سے حکم دیں وہ قابلِ پذیرائی ہو۔ لیکن امت کے حاکمِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے جو فرمائیں اور حکم نافذ کریں اس کی تعمیل واجب نہ رہے، اور موجب رضائے الٰہی نہ ہو، کیونکہ وہ حکم ہو گا ایک غیر راشد بلکہ کٹکھنے بادشاہ کا۔ ایسا حکم سنت بھی نہیں کہلائے گا، کیونکہ یہ ۴۱ھ کے بعد کا ہو گا اور اس وقت خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہو چکا ہو گا۔

مؤطا شریف، بخاری شریف اور صحاح کی دوسری کتابوں میں امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ کے جو فتاوی مذکور ہیں اور آپ کے فقہی اجتہادات بیان ہوتے ہیں وہ اب فقہا کے لیے نظیر نہیں رہیں گے اور کسی اسلامی حکومت کی دفعات میں انہیں بار نہیں ملے گا۔ کیا کبھی تیرہ سو برس کی

اس مدت میں کسی صاحب ایمان نے ایسی بات کہی ہے یا کہہ سکتا ہے؟

امیرالمومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی جو حیثیتِ امامت تھی وہ صحابۂ کرام اور اموی دور میں تو تھی ہی لیکن بعد میں بھی یعنی خلافتِ عباسیہ میں بدستور قائم رہی۔ مؤطا کی تدوین امیرالمومنین عبداللہ المنصورؒ کے فرمان کے مطابق کی گئی تھی۔ امیرالمومنین محمد المہدی، امیرالمومنین ہارون الرشید، امیرالمومنین محمد الامین اور امیرالمومنین عبداللہ المامون کو خود حضرت امام مالکؒ سے اس کی سماعت کا شرف حاصل ہے۔ یہ سب ائمہ دین اس مبارک اور عظیم ترین کتاب الآثار میں امیرالمومنین سیدنا مروان اور امیرالمومنین سیدنا عبدالملک کے قضائی فیصلے اور مرویات پڑھتے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

آدھی دوزخ تیری ہے اور آدھی میری

حضرت علیؓ فرماتے ہیں میں دوزخ تقسیم کروں گا۔ اس میں آدھا حصہ میرا ہوگا اور آدھا تیرا ہوگا۔ (یعنی رافضیوں کا) میزان۔ ج ۴/۲۶

عبایہ:۔ اس روایت کا ناقل عبایہ بن ربعی ہے جو حضرت علیؓ کا ایک شاگرد ہے۔ اور یہ عبایہ غالی شیعہ ہے۔ میزان، ج ۲/۳

موسیٰ بن طریف:۔ عبایہ سے یہ داستان نقل کرنے والا موسیٰ بن طریف الاسدی الکوفی ہے۔ ابوبکر بن عیاش کا بیان ہے کہ یہ کذاب ہے۔ یحییٰ بن معین اور دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ جوزجانی کا بیان ہے کہ یہ گمراہ ہے۔

سلام الخیاط کا قول ہے کہ وہ اہل شام کا حامی تھا۔ اور حضرت علیؓ کا مخالف تھا۔ اس نے عبایہ بن ربعی کا یہ قول بطور مذاق نقل کیا۔ جو حقیقت بن گیا۔ میزان، ج ۲/۳۰۲۔ دارقطنی کا بیان ہے یہ متروک ہے۔ کتاب الضعفاء والمتروکین للدارقطنی ص ۱۶۲

بعد کے اہل تشیع نے اس روایت کو اپنایا۔ ہاں صرف یہ کام ضرور کیا کہ اس روایت کا ابتدائی حصہ برقرار رکھا اور آخری حصہ حذف کر دیا۔ حتیٰ کہ شیعوں کی مشہور کتاب کوکب دری میں اس کا ابتدائی حصہ نقل کیا گیا ہے۔

الراشدون

قرآن وسنت اور مقام صحابہ کی عظمت سے بے خبر لوگوں کو مسلسل پروپیگنڈے کے ذریعہ یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ خلفائے راشدین صرف چار ہیں یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ۔ چنانچہ ان حضرات کی دورِ حکمرانی کو خلافت راشدہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تمام صحابہ کرام کو "اَلرّٰشِدُوْنَ" کے خطاب سے نوازا ہے۔ ارشاد ہے:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً — یہ صحابہ کرام اللہ کے فضل و نعمت سے رشد یعنی ہدایت یافتہ

سیدنا معاویہؓ بھی جماعت صحابہ ہی کے ایک ممتاز فرد ہیں اس لیے لامحالہ ارشاد ربانی سے معاویہؓ وہ "راشد" ہیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپؓ کے ذریعہ قائم شدہ نظامِ حکومت کو خلافت راشدہ کے علاوہ کسی دوسرے نام سے موسوم کیا جائے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ آفات وفتن اور دہشت و کار سے بھرا ہوا "علوی دور" تو خلافت راشدہ ہو اور امن و عافیت، سلامتی و استحکام سے بھرپور حضرت معاویہؓ کے اس عہد مبارک کو ملوکیت اور کھلی بادشاہت کا نام دے کر کیڑے نکالے جائیں، جس کے آغاز کو نہ صرف ہمعصر امت نے "عام الجماعت" کے عنوان سے تعبیر کیا۔ بلکہ تاریخ اسلام اسے اسی ایمان افروز نام سے آج تک اپنے اوراق میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔

از روئے قرآن مجید کی مقدس ہدایات پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص بھی کسی ایسی حکومت کو برے معنی میں بادشاہت یا ملوکیت کہنے کی جرأت وجسارت نہیں کرسکتا، جس کے قیام و سربراہی کے فرائض اللہ کے ارشاد فرمودہ اوصاف کے مطابق، صحابیٔ رسول انجام دے رہے ہوں یا جس میں انتظامی و اصلاحی معاملات اصحاب رسول صلوات اللہ علیہم کی نگرانی میں طے پاتے ہوں۔

فرق مراتب: یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ قرآن وسنت کی رو سے اسلامی خلافت اشخاص و اوقات میں محدود نہیں "الراشدون" کا ربانی لقب پانے والے

صحابۂ کرام اور ان کے بعد دیگر باصلاحیت و خوش قسمت افراد جنہیں آیات استخلاف و تمکین میں بیان کیے گئے اوصاف و خصائص کی حامل حکمرانی کا موقعہ ملا، بلاشبہ وہ سب ہی بشارت نبوی کے مصداق خلفائے اسلام تھے اور ان کا قائم کردہ اجتماعی نظام ہی درحقیقت وہ اسلامی خلافت تھی جس میں نبی صادق صلی اللہ علیہ و اصحابہ وسلم کے ارشاد کے مطابق دین اسلام کو عظمت و شوکت اور سربلندی و سرفرازی حاصل رہی۔ لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لینا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہونے والے تمام خلفاء اور ان کی خلافتیں مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ حاشا و کلاّ۔ ایسا ہرگز ہرگز نہیں۔ بلکہ احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ، سیدنا عمر فاروقؓ اور سیدنا عثمان ذوالنورینؓ جس طرح تمام جماعت صحابہ میں منفرد اور سب سے بلند مقام رکھتے ہیں، اسی طرح ان کی خلافت راشدہ کو بھی بعد کی تمام خلافتوں سے اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ سیدنا معاویہؓ بھی خلیفہ راشد ہیں اور آپ نے اپنی خلافت راشدہ کے زمانے میں اسلام اور انسانیت کی بیش از بیش خدمات انجام دیں۔ نیز یہ بھی ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ آپ کے صاحبزادے سیدنا یزیدؒ صحابی نہیں ایک جلیل القدر تابعی تھے جن کے عہد خلافت میں کاروبار خلافت عملاً صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں میں تھا۔ بایں ہمہ ان ہر دو "سیدین" "کریمین" کی خلافت کو خلفائے راشدین ثلاثہ کے برابر اور ہم پلہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرات خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت صدیق اکبر، حضرت فاروق اعظم اور حضرت عثمان ذوالنورین علیہم السلام کو فضیلت و خلافت ہر دو اوصاف میں وہ بلند و ممتاز درجہ حاصل ہے جہاں امت کا بڑے سے بڑا شخص بھی رسائی نہیں پاسکتا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:۔

كنا في زمن النبي صلى الله عليه وسلم لا نعدل بابي بكر احدًا ثم عمر ثم عثمان ثم نترك اصحاب النبي صلى الله

علیہ وسلم لا نفاضل بینہم

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۲۳، سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۶۳۶، مشکوٰۃ ص ۵۵۵)

"ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ کو، پھر ہم صحابہ کرام میں سے کسی کو کسی پر فضیلت نہ دیتے تھے۔"

سنن ابو داؤد ج ۲ ص ۶۳۶ کی ایک روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلم کی زندگی اور موجودگی میں یہ بات کہا کرتے تھے۔ نیز طبرانی بحوالہ فتح الباری کی روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ:-

فیسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا ینکر

(حاشیہ بخاری ج ۱ ص ۵۲۳)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری یہ بات سن کر، انکار نہ فرماتے تھے۔")

سیدنا علیؓ کے صاحبزادے سیدنا محمدؒ بن علیؓ۔ جنہیں عموماً "ابن حنفیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:-

قلت لابی ای الناس خیرٌ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ابوبکر فقال قلت ثم من قال عمر وخشیتُ ان یقول عثمان قلتُ ثم انت قال ما أنا الّا رجلٌ من المسلمین

(بخاری ج ۱ ص ۵۱۸، ابو داؤد ج ۲ ص ۶۳۶)

"میں نے اپنے والد (حضرت علیؓ) سے معلوم کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام لوگوں سے افضل کون ہے تو آپ نے جواب دیا کہ حضرت ابوبکرؓ۔ میں نے پھر دریافت کیا کہ ان کے بعد کون؟ تو آپ نے فرمایا کہ عمرؓ مجھے خوف ہوا کہ اب کی مرتبہ آپ حضرت عثمانؓ کا نام لیں گے، اس لیے میں نے عرض کیا کہ پھر (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے بعد) آپ کا مرتبہ

ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ میں تو عام مسلمانوں میں سے ایک ہوں۔

سیدنا ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلم نے صحابہ کرام سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟

اس پر ایک شخص نے کہا۔

رایت کانّ میزانا نزل من السماء فوزنت والوبکر فرجحت انت، ووزن ابوبکر وعمر فرجح ابوبکر، ووزن عمر وعثمان فرجح عمر ثم رفع المیزان فاستائھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی فساءہ ذلک فقال خلافۃ نبوۃ ثم یوتی اللہ الملک من یشاء

(مشکوٰۃ ص ۵۶۰، ابوداؤد ج ۲ ص ۶۳۷، ترمذی ج ۲ ص ۵۲)

"میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک ترازو آسمان سے اتری ہے آپ اور ابوبکرؓ تولے گئے تو آپ کا وزن زیادہ رہا پھر ابوبکرؓ و عمرؓ تولے گئے تو ابوبکرؓ کا وزن زیادہ رہا اور پھر عمرؓ و عثمانؓ تولے گئے تو عمرؓ کا وزن زیادہ رہا۔ پھر ترازو اٹھالی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر گرانی ہوئی۔ اور پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ "خلافت نبوت" ہے اس کے بعد اللہ جسے چاہے گا حکومت دے گا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان فرماتے ہیں:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ارُی اللیلۃ رجل صالح ان ابابکر نیط برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونیط عمر بابی بکر ونیط عثمان بعمر قال جابر فلما قمنا من عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلنا اما الرجل الصالح فرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج رات ایک نیک شخص کو خواب میں دکھایا گیا کہ ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے لٹکائے گئے۔ عمرؓ ابوبکرؓ کے دامن سے اور عثمان عمرؓ کے دامن سے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم کے پاس سے اٹھے تو ہم نے آپس میں کہا کہ وہ نیک شخص جسے یہ خواب دکھایا گیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ

امانوط بعضهم ببعض فهم ولاة هذا الامر الذی بعث اللہ بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم

(ابوداؤد ج ۲ ص ۶۳۷، مشکوٰۃ ص ۵۶۳)

وسلم ہیں اور رہا حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا ایک دوسرے کے دامن سے لٹکنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اس دین کے حاکم و خلفاء ہوں گے جو اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر بھیجا ہے۔"

حضرت سمرۃ بن جندب رضی فرماتے ہیں :-

ان رجلاً قال یارسول اللہ رأیت کأنّ دلواً دلّی من السمآء فجاء ابوبکر فاخذ بعراقیہا فشرب شرباً ضعیفاً ثم جاء عمر فاخذ بعراقیہا فشرب حتی تضلع ثم جاء عثمان فاخذ بعراقیہا فشرب حتی تضلع ثم جاء علیؓ فاخذ بعراقیہا فانتشطت وانتضح علیہ منہا شیءٌ

(ابوداؤد ج ۲ ص ۶۳۷)

ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک ڈول آسمان سے لٹکایا گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ آئے اور انہوں نے اس کا حلقہ پکڑ کر ضعف ونرمی سے پانی پیا، پھر حضرت عمرؓ آئے اور انہوں نے سیر ہو کر پیا۔ ان کے بعد حضرت عثمانؓ آئے انہوں نے بھی سیر ہو کر پیا، پھر حضرت علیؓ آئے اور انہوں نے اس کا حلقہ پکڑا تو وہ ڈول پھٹ گیا اور اس میں سے کچھ چھینٹیں ان پر پڑیں۔"

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ :-

" ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم تنہا بیٹھے ہوئے تھے کہ میں پہنچا اور آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ آئے اور وہ سلام کرکے بیٹھ گئے۔ پھر حضرت عمرؓ آئے پھر حضرت عثمانؓ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سات کنکریاں پڑی ہوئی تھیں آپ نے ان کو اپنی ہتھیلی میں رکھا تو وہ تسبیح پڑھنے لگیں یہاں تک کہ میں نے ان کی تسبیح کی گنگناہٹ سنی جیسے شہد کی مکھیوں کی آواز۔ پھر آپ نے ان کو زمین پر رکھ دیا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ پھر آپ نے ان کو اٹھا کر حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں رکھا تو وہ پھر تسبیح پڑھنے لگیں۔ یہاں تک کہ میں نے ان کی آواز سنی جیسے شہد کی مکھیوں کی آواز ہو

پھر آپ نے ان کو زمین پر رکھ دیا تو وہ پھر خاموش ہوگئیں۔ پھر آپ نے ان کو لے کر حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں رکھا پھر وہ تسبیح پڑھنے لگیں یہاں تک کہ میں نے ان کی آواز سنی جیسے شہد کی مکھیوں کی آواز ہو پھر آپ نے ان کو زمین پر رکھ دیا تو وہ خاموش ہوگئیں پھر آپ نے ان کو لے کر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں رکھ دیا تو پھر وہ تسبیح پڑھنے لگیں یہاں تک کہ میں نے ان کی آواز سُنی۔ پھر آپ نے ان کو زمین پر رکھ دیا تو وہ خاموش ہوگئیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ "خلافت نبوّت" ہے۔"

امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحبؒ لکھنوی مندرجہ بالا روایت بحوالہ بزار، طبرانی فی الاوسط اور سنن بیہقی نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ روایت ابن عساکر نے حضرت انسؓ سے نقل کی ہے اور اس میں اتنا مضمون زیادہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد پھر اور جس قدر صحابی بیٹھے تھے سب کے ہاتھ میں یکے بعد دیگرے وہ کنکریاں آپ نے رکھیں مگر کسی کے ہاتھ میں انہوں نے تسبیح نہ پڑھی۔"

(سیرت خلفائے راشدین ص ۲۱۴)

مندرجہ بالا احادیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حضرات خلفائے راشدین ثلاثہؓ کو پوری جماعت صحابہ میں افضلیت حاصل ہے۔ ہمعصر صحابہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلم کی موجودگی میں بھی کسی بھی دوسرے شخص کو ان کا ہم پلّہ نہیں سمجھتے تھے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمعصر صحابہؓ کے اس فیصلے سے آگاہ ہو کر نکیر نہ فرماتے ہوئے مہر تصدیق ثبت فرمائی۔ دوسری بات ان روایات سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلم کے بعد حضرات خلفائے ثلاثہؓ کی خلافت "خلافت راشدہ علیٰ منہاج النبوت" تھی، جسے امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "خلافت خاصہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی وہ تینوں خلافتیں ہیں جن میں تمکین فی الارض۔ امن وسلامتی اور دینی سربلندی و استحکام کی وہ تمام خصوصیات کامل طور پر پائی جاتی تھیں، جنہیں از روئے آیات واحادیث خلافت راشدہ کے لازمی شرائط کا درجہ حاصل ہے۔ نیز ان ارشادات نبویہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی یہ خلافت "راشدہ علیٰ منہاج النبوت" سیدنا

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی مظلومانہ شہادت پر اختتام کو پہنچی۔ چنانچہ صحابی رسول حضرت ثُمامہ بن عدیؓ کو جو عہد عثمانی میں یمن کے عامل و گورنر تھے، جب حضرت عثمانؓ کی کربناک شہادت کی خبر ہوئی تو مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے شدتِ غم سے رو پڑے اور دیر تک روتے رہے، پھر کہا کہ :-

"آج امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خلافتِ نبوّت کا خاتمہ ہو گیا۔"

(الاستیعاب ج ۱ ص ۹۵، وطبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۰۰)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں :-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دراحادیث بسیار تصریح وتلویح فرمودند کہ خلافت خاصہ بعد حضرت عثمانؓ منتظم نخواہد شد (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۴۹)

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث میں صراحت و وضاحت سے فرمایا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد "خلافتِ خاصہ" منتظم نہ ہوسکے گی۔"

خلافت راشدہ کی اس اعلیٰ قسم یعنی "خلافتِ خاصہ" کے بعد شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اصطلاح کے مطابق "خلافت عامہ" کا دور شروع ہوا۔ جس میں عہد علوی کی پرفتن حکمرانی سے لے کر سیدنا معاویہؓ وسیدنا یزیدؒ کی پرسکون خلافت کے بعد بہت سے خلفاء ہوتے۔ خلافتِ خاصہ کے اختتام پر قائم ہونے والی خلافتوں میں سیدنا معاویہؓ وسیدنا یزیدؒ کی دو خلافتیں ایسی ہیں جنہیں مسلمان قوم کی متفقہ تائید وحمایت حاصل رہی ہے۔ اسی لیے ان کے دوران امن و عافیت۔ انسانی ہمدردی ومحبت، اسلامی خدمات اور تسخیر وفتوحات جیسی تمام صفات پوری طرح موجود رہیں۔ پھر ان باتوں میں بتدریج کمی آتی چلی گئی۔ تا آنکہ بنو عباس نے عجمیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ اور ساز باز کر کے بنو امیہ کا تختہ الٹ دیا۔

عہد مرتضوی چند صفحات پہلے قرآن مجید کی واضح ہدایات کی روشنی میں یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابۂ کرام راشد ہیں۔ چونکہ حضرت علیؓ کا صحابی ہونا محتاج تعارف نہیں۔ اس لیے لازماً یہ تو تسلیم کرنا ہوگا کہ بلاشبہ آپ امام ابوبکرؓ، امام عمرؓ، امام عثمانؓ اور امام معاویہ علیہم السلام کی طرح اولٰئک ہم الراشدون میں داخل ہیں۔ اس لیے اگر آپ کو حسب سابق پرامن

حالات میں ہمعصر امت کی حمایت سے خلافت ملتی تو یقیناً آپ بھی صحابی راشد کی طرح اسلامی خلافت کی ذمہ داریوں سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔ لیکن تاریخ کا المیہ ہے کہ سبائیوں اور عجمی منافقوں نے اوّل تو آپ کی خدمت میں رسائی حاصل کی اور پھر انہوں نے خلیفہ راشد امام عثمانؓ کو شہید کر کے حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق تمام سیاسی اور انتظامی معاملات پر خود مسلط ہو گئے بلکہ حضرت علیؓ کو مدینہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ تاکہ کسی وقت انہیں صحابۂ کرام اور اہل مدینہ کی مشاورت حاصل نہ ہو جائے اور ان باغیین کی گرفت کمزور نہ پڑ جائے جس کے نتیجہ میں حالات نے انتشار اور خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔

نوبت: بایں جا رسید کہ آپ کی خلافت آخر دم تک صحابہؓ وتابعین کی نگاہ میں نزاعی مسئلہ بنی رہی۔ اور اسّی نوّے ہزار صحابہ میں سے بقول محمد بن سیرین۔ جمل وصفین اور خوارج کی جنگ میں تیس صحابہ بھی شریک نہ تھے اور صحابہ کی اس بڑی اکثریت نے غیر جانب داری اختیار کی۔ اور ایک لاکھ مسلمانوں کا خون بہنے کے باوجود حضرت علیؓ کی خلافت کو قیام کا استحکام نصیب نہیں ہوا۔ بلکہ دائرہ حکومت روز بروز کم ہوتا چلا گیا۔ اس طرح آپ کا آزمائشی دور حضرت سمرۃ بن جندبؓ کی روایت کے مطابق ان الفاظ کی صحیح تعبیر ثابت ہوا۔

ثم جاء علی فاخذ بعراقیہا فانتشطت وانتضح علیہ منہا شیٔ۔

ابوداؤد ج ۲ صفحہ ۶۳۴۔

جب اس ڈول کو حضرت علیؓ نے پکڑا تو وہ پھٹ گیا اور اس میں سے کچھ چھینٹیں ان پر پڑیں۔ لیکن افسوس کہ انہیں خلافت کے ڈول سے پانی پینا نصیب نہیں ہوا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں

حضرت مرتضیٰ باوجود وفور اوصاف خلافت خاصہ در وے تمکن نہ شد در خلافت و در اقطار ارض حکم او نافذ نگشت وہر روز دائرہ سلطنت تنگ تر می شد۔ تا آنکہ در آخر ایام بجز کوفہ و ماحول آں محل حکومت نماند۔ ازالۃ الخفاج ۲ صفحہ ۲۴۹۔

حضرت علیؓ خلافت خاصہ کے بہت سے اوصاف رکھنے کے باوجود خلافت پر متمکن نہ ہو سکے اور

نہ ہی زمین میں ان کا حکم نافذ ہو سکا ہر روز ان کی حکومت کا دائرہ تنگ تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ آخری دنوں میں ان کی حکومت صرف کوفہ اور اس کے مضافات تک محدود ہو کر رہ گئی۔

یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ جب ہر دو فریق نے معاملہ حکمین پر چھوڑا اور ان ہر دو ججوں نے حضرت علیؓ کو خلافت سے معزول کیا تو جو نام نہاد خلافت بھی تھی وہ بھی کالعدم ہو گئی۔

اور ایک صاحب علم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ صحابہ کی ایک عظیم اکثریت نے نہ حضرت علیؓ کا ساتھ دیا، اور نہ ان کی بیعت کی۔ اور اس کی وجہ یہ قاتلین عثمان یعنی سبائی گروہ تھا اور جب حضرت علیؓ کو کسی نے خلیفہ تسلیم نہیں کیا تو حضرت امیر معاویہؓ کے باغی ہونے کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ باغی گروہ وہ ہے جس نے امیر المومنین حضرت عثمان کو شہید کر کے یہ انتشار پیدا کیا اور جن کی موجودگی کی وجہ سے صحابہ نے حضرت علیؓ کی بیعت نہ کی اور ان مجرموں نے اپنے عزائم پر پردہ ڈالنے کے لیے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں کو باغی اور مجرم کہنا شروع کر دیا۔ حالانکہ باغی گروہ تو وہ تھا جس نے عثمانؓ کو قتل کیا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت عمارؓ سے فرمایا تھا کہ تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔ اس سے مراد یہ گروہ تھا۔ امیر معاویہ کے ساتھی نہ تھے کیونکہ اگر امیر معاویہ اور ان کے ساتھی حقیقتاً باغی ہوتے تو ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ تمام صحابہ جواب تک خاموش تھے۔ انہیں تو اس واقعہ کے وجود میں آنے کے بعد یہ کرنا چاہیئے تھا کہ سب کے سب مل کر حضرت علیؓ کا ساتھ دیتے اور امیر معاویہ کا مقابلہ کرتے۔ کیونکہ حضور کے فرمان کی رو سے جب امیر معاویہ کا باغی ہونا ثابت ہو گیا تو ان کے لیے ہرگز بھی یہ ممکن نہ تھا کہ ایسی صورت میں وہ حضرت علیؓ کا ساتھ نہ دیتے ان کا ساتھ نہ دینا اس امر کا ثبوت ہے کہ صحابہ کا اس پر اجماع ہے کہ امیر المومنین امام معاویہؓ باغی نہ تھے۔ اور اجماع صحابہ حجت شرعیہ ہے۔ اس کا منکر فاسق ہے۔ اب دو ہی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں کہ یا تو اجماع صحابہ کا انکار کیا جائے جو عملی طور پر آج کل کا ہر مسلمان کر رہا ہے۔ یا امیر معاویہؓ کے بارے میں یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ باغی نہ تھے۔

جو صورت ہم نے اختیار کر رکھی ہے اس کی رو سے اوّل تو یہ لازم آتا ہے کہ صحابہ کا قول و عمل حجت نہیں اور دوسری جانب صحابہ کا گمراہ ہونا لازم آتا ہے، حتیٰ کہ حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کا بھی۔ اس

لیے کہ انہوں نے کبھی صحابہ سے یہ نہیں کہا کہ شہادت عمارؓ سے یہ بات ظاہر ہو چکی کہ حق میرے ساتھ ہے اب غیر جانبداری کی آخر کیا وجہ ہے؟ اور پھر حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ نے بھی یہ بات کسی کے سامنے پیش نہیں کی۔

حیرت ہے کہ حضرت علیؓ حضرت حسنؓ اور صحابہ کرام کو تو یہ دلیل نہ سوجھی لیکن سبائی مورخ طبری اور اس کے ہم عقیدہ لوگوں کو صدیوں بعد یہ دلیل نظر آگئی اور پھر بعد کے سنی علماء نے طبری کو محقق گردانتے ہوئے اس پر ایمان لانا ضروری سمجھا۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

نماز دین کا ستون ہے

یہ ایک مشہور عام حدیث ہے جو عوام و خواص کی زبان پر جاری رہتی ہے۔ اس کے الفاظ میں الصلوٰۃ عماد الدین۔ نماز دین کا ستون ہے۔ لیکن یہ روایت جتنی مشہور ہے اس سے کہیں زیادہ بے اعتبار ہے ملا علی قاری لکھتے ہیں۔

حافظ ابن الصلاح نے "مشکل الوسیط" میں تحریر کیا ہے یہ روایت غیر معروف ہے۔ اس کا اتا پتہ کچھ معلوم نہیں۔ امام نووی "تنقیح" میں لکھتے ہیں۔ یہ روایت منکر ہے، باطل ہے۔ لیکن دیلمی نے اسے حضرت علیؓ کی جانب منسوب کیا ہے۔ جیسا کہ سیوطی نے ذکر کیا ہے اور بیہقی نے "شعب الایمان" میں اسے حضرت عمرؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔ موضوعات کبیر ص۹۔

علامہ محمد طاہر پٹنی لکھتے ہیں۔ مختصر میں ہے کہ یہ روایت "نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے نماز چھوڑ دی اس نے دین کے ستون کو گرایا"۔ اسے بیہقی نے روایت کیا ہے لیکن یہ ضعیف ہے۔ تذکرۃ الموضوعات ص۳۸۔

لولاک لما خلقت الافلاک

یہ ایک ایسی مشہور عام روایت ہے کہ شاید ہی برصغیر کا کوئی مسلمان ایسا ہو جو اس کا ذکر خیر نہ کرتا ہو اور شاید ہی ایسا کوئی منبر ہو جس کی رونق اس روایت کے بغیر قائم ہو اور علی الخصوص ایک طبقہ کی تو دکانداری اسی کے بل بوتے پر قائم ہے۔ بلکہ اس گروہ کا یہ ٹریڈ مارک ہے کہ اس گروہ کے کسی فرد کی کوئی تقریر اس ٹریڈ مارک کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

علامہ نورالدین علی بن سلطان محمد الہروی المعروف بملا علی القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ اپنی کتاب "الموضوعات الکبیر" میں فرماتے ہیں۔

یہ روایت لولاک لما خلقت الافلاک (اے نبی اگر آپ نہ ہوتے تو میں افلاک پیدا نہ کرتا) صغانی کہتے ہیں یہ روایت موضوع ہے۔ جیسا کہ "خلاصہ" میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس کے معنی کا تعلق ہے تو معنی صحیح ہیں اس لیے کہ دیلمی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اسے محمد اگر آپ نہ ہوتے تو میں جنت پیدا نہ کرتا اور اے محمد اگر آپ نہ ہوتے تو میں آگ پیدا نہ کرتا اور ابن عساکر کی روایت میں ہے کہ اگر اے نبی آپ نہ ہوتے تو میں دنیا پیدا نہ کرتا۔ موضوعات کبیر ص ۱۰۱۔

علامہ ناصرالدین البانی رقم طراز ہیں۔

یہ روایت موضوع ہے جیسا کہ صغانی نے اپنی "الاحادیث الموضوعہ" میں صفحہ ۷ پر تحریر کیا ہے اور رہا ملا علی قاری کا یہ دعویٰ کہ اس روایت کے معنی صحیح ہیں اور پھر اس سلسلہ میں انہوں نے دیلمی کی ایک روایت پیش کی اور اس کے بعد ابن عساکر کی روایت بیان کی۔

لیکن میرے نزدیک اس کے معنی کی صحت کا دعویٰ تو اسی وقت کیا جا سکتا ہے کہ جب دیلمی کی روایت

کا صحیح ہونا ثابت ہوجائے کیونکہ کسی اور مصنف نے اسے روایت کو بیان نہیں کیا اور دیلمی کی سند سے میں واقف نہیں۔ لیکن مجھے اس روایت کے ضعیف ہونے میں کوئی تردد نہیں۔ ہمارے نزدیک اس کے ضعف کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ اسے دیلمی کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا اور ابن عساکر نے ایک طویل روایت حضرت سلمان سے مرفوعاً نقل کی ہے لیکن ابن جوزی کہتے ہیں یہ موضوع ہے اور سیوطی نے بھی اللآلی ج ا صـ ۲۷۲ پر اسے موضوع قرار دیا ہے۔ سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ ج صـ ۲۹۹ ۔

ہمارے نزدیک ان روایات میں دو ایسے عیوب پائے جاتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں یہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ تو کیا ہوتے۔ یہ الفاظ تو ایک جاہل عرب بھی استعمال نہیں کرسکتا۔ جس کی دو وجوہات ہیں۔

۱۔ آپ یا تو کے معنی کے لئے یعنی واحد حاضر کے لیے عربی میں انت کی ضمیر آتی ہے۔ جیسے اللہم انت ربی (اے اللہ آپ میرے رب ہیں اور جیسے انت ارحم الراحمین (آپ سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں) اور کاف زیر والا ضمیر مفعول کے لئے آتا ہے جو تجھ کے معنی دیتا ہے جیسے اللہم انا نستعینک ونستغفرک ونؤمن بک ونتوکل علیک (اے اللہ ہم تجھ سے مدد چاہتے ہیں اور تجھ سے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں اور تجھ پر ایمان لاتے ہیں اور تجھ پر بھروسہ کرتے ہیں) اس اصول سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کی عربی تک غلط ہے۔ اس روایت کی اللہ تعالیٰ کی جانب نسبت اس کی ذات پر ایک بہت بڑا افترا ہے۔ یہ قول کسی عرب جاہل کی جانب بھی منسوب کیا جاتا تو ہم اسے جھوٹا تصور کرتے۔ کجا کہ اللہ تعالیٰ کو عربی سے ناواقف تسلیم کیا جائے

۲۔ ما خلقت ماضی کا صیغہ ہے اور ماضی پر لام تاکیدی پوری عربی زبان میں نہیں آتا یہ روایت ا[illegible] کے خدائے اہرمن نے وضع کی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو اس جہالت سے پاک ہے اس کی صفت تو یہ ہے [illegible] بکل شئی علیم کہ وہ ہر شے کو جانتا ہے اور بلحاظ عربیت اس مقام پر ماضی کے بجائے مضارع کا صیغہ آنا چاہیئے تھا۔

نیز افلاک آسمانوں کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ افلاک سے مراد وہ موہوم دائرے ہوتے ہیں جن کے گرد سیارے چکر کاٹتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اس روایت کا تو آگا پیچھا بھی درست نہیں۔ اسے حدیث کہنا بھی گناہِ عظیم ہے۔ بلکہ ان باتوں کے جاننے کے بعد اگر کوئی اسے حدیث کہے تو مجھے تو اس کے کفر تک کا خطرہ ہے۔ واللہ اعلم۔

کیا حضرت عمرؓ بھی شراب پیتے تھے؟

سعید بن ذی لعوہ کا بیان ہے کہ ایک اعرابی نے حضرت عمرؓ کے برتن سے نبیذ پی، اسے نشہ ہوگیا حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کے کوڑے لگائے جائیں۔ اس نے عرض کیا کہ میں نے آپ کے برتن ہی سے نبیذ پی تھی۔ آپ نے جواب دیا میں نبیذ پینے پر کوڑے نہیں لگا رہا ہوں۔ بلکہ نشہ میں مست ہونے پر لگا رہا ہوں۔

ابن جوزی لکھتے ہیں یہ سعید بن ذی لعوہ کا جھوٹ ہے ابوحاتم بن حبان کا بیان ہے کہ یہ دجال ہے اس لیے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس نے حضرت عمرؓ کو نشہ کرتے دیکھا ہے۔ العلل المتناہیہ فی احادیث الواہیہ ج ۲ ص ۶۴۲ غالباً اسی لئے شرابیوں اور شاعروں میں مشہور ہے کہ نشہ حرام ہے پینا حرام نہیں۔ حالانکہ بغیر پئے نشہ ممکن ہی نہیں۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں اس سعید کو ابوحاتم، یحییٰ اور ایک جماعت نے ضعیف قرار دیا ہے اور اس میں جہالت پائی جاتی ہے۔ بخاری کہتے ہیں یہ دوسروں کے مخالف روایات نقل کرتا ہے۔

علی بن المدینی کا بیان ہے کہ مجہول ہے۔

ابوبکر بن عیاش کا قول ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ ابو زرعہ کہتے ہیں یہ قوی نہیں۔

عقیلی اور ابن الجارود نے اس کا اپنی کتاب الضعفا میں ذکر کیا ہے۔

ابن عدی کہتے ہیں کہ مجھے اس کی کوئی مسند حدیث معلوم نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ذی لعوہ کا نام عامر بن مالک ہے۔ لسان المیزان ج ۳ ص ۴۲۔

حضرت ابراہیم اور کذباتِ ثلاثہ

از قلم علامہ مودودی صاحب مرحوم

حضرت ابراہیمؑ کے کذباتِ ثلاثہ کے مسئلے پر میں نے دو جگہ بحث کی ہے ایک رسائل ومسائل حصہ دوم صفحہ ۳۵ تا ۳۹۔ دوسرے تفہیم القرآن بسلسلۂ تفسیر سورہ انبیاء حاشیہ نمبر ۶۰۔ ان دونوں مقامات پر میں نے وہ دلائل بھی بیان کر دیئے ہیں جن کی بنا پر میں اس روایت کے مضمون کی صحت تسلیم کرنے میں متامل ہوں۔ اگر میرے ان دلائل کو دیکھ کر آپ کا اطمینان ہو جائے تو اچھا ہے اور نہ ہو تو جو کچھ آپ صحیح سمجھتے ہیں اسی کو صحیح سمجھتے رہیں۔ اس طرح کے معاملات میں اگر اختلاف رہ جائے تو آخر مضائقہ کیا ہے۔ آپ کے نزدیک حدیث کا مضمون اس لیے قابلِ قبول ہے کہ وہ قابلِ اعتماد سندوں سے نقل ہوئی ہے اور بخاری، مسلم، نسائی اور متعدد دوسرے اکابر محدثین نے اسے نقل کیا ہے۔ میرے نزدیک وہ اس لیے قابلِ قبول نہیں ہے کہ اس میں ایک نبی کی طرف جھوٹ کی نسبت ہوتی ہے، اور یہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے کہ چند راویوں کی روایت پر اسے قبول کر لیا جائے۔ اس معاملہ میں میں اس حد تک نہیں جاتا جہاں تک امام رازی گئے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ "انبیاء کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ اس روایت کے راویوں کی طرف اسے منسوب کیا جائے۔" (تفسیر کبیر جلد ۶، صـ۱۱۳) اور یہ کہ "جب نبی اور راوی میں سے کسی ایک کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنا پڑ جائے تو ضروری ہے کہ وہ نبی کے بجائے راوی کی طرف منسوب کیا جائے۔" تفسیر کبیر جلد ۷ صـ۱۴۵) مگر میں اس روایت کے ثقہ راویوں میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں کہتا کہ انہوں نے جھوٹی روایت نقل کی ہے، بلکہ صرف یہ کہتا ہوں کہ کسی نہ کسی مرحلے پر اس کو نقل کرنے میں کسی راوی سے بے احتیاطی ضرور ہوئی ہے۔ اس لیے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ محض سند کے اعتماد پر ایک ایسے مضمون کو آنکھیں بند کر کے ہم کیسے مان لیں جس کی زد انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر پڑتی ہے؟

میں اُن دلائل سے بے خبر نہیں ہوں جو اس روایت کی حمایت میں اکابر محدثین نے پیش کیے ہیں، مگر میں نے ان کو تشفی بخش نہیں پایا ہے۔ جہاں تک بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هٰذَا اور اِنِّيْ سَقِيْمٌ کا تعلق ہے، ان دونوں کے متعلق تو تمام مفسرین و محدثین اس پر متفق ہیں کہ یہ حقیقۃً جھوٹ کی تعریف میں نہیں آتے۔ آپ تفسیر کی جس کتاب میں چاہیں ان آیات کی تفسیر نکال کر دیکھ لیں۔ اور ابن حجر، عینی، قسطلانی وغیرہ شارحین حدیث کی شرحیں بھی ملاحظہ فرمالیں۔ کسی نے بھی یہ نہیں مانا ہے کہ یہ دونوں قول فی الواقع جھوٹ تھے۔ رہا بیوی کو بہن قرار دینے کا معاملہ تو یہ ایک ایسی بے ڈھب بات ہے کہ اسے بنانے کے لیے محدثین نے جتنی کوششیں بھی کی ہیں وہ ناکام ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اس بحث کو جانے دیجئے کہ جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت حضرت سارہ کی عمر کم از کم ۶۵ سال تھی اور اس عمر کی خاتون پر کوئی شخص بھی فریفتہ نہیں ہوسکتا[1]۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بادشاہ حضرت سارہ کو حاصل کرنے کے درپے ہوا تو حضرت ابراہیمؑ نے آخر کس مصلحت سے کہا کہ یہ میری بہن ہیں؟ اس صورتِ حال میں بیوی کو بہن کہہ کر آخر کیا فائدہ حاصل ہوسکتا تھا؟ شارحین حدیث نے اس سوال کے جو جوابات دیے ہیں وہ ذرا ملاحظہ ہوں:

---

[1] اگرچہ یہ بائیبل کی کتاب پیدائش کا بیان ہے کہ مصر کے سفر کے وقت حضرت سارہ کی یہ عمر تھی۔ لیکن قرآن و حدیث سے بھی اسی کی تائید نکلتی ہے۔ ایک طرف حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سفر کے موقع پر مصر کے بادشاہ نے حضرت ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں نذر کیا اور ان سے حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ دوسری طرف قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ جب والد ماجد کے ساتھ دوڑنے پھرنے کے قابل ہوگئے تو قربانی کا یادگار واقعہ پیش آیا اور اس سے متصل زمانے ہی میں حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی بشارت دی گئی اور اس بشارت پر حضرت سارہ کو سخت اچنبھا ہوا کیونکہ وہ بہت بوڑھی (عجوزہ) تھیں۔ ان دونوں واقعات کے درمیان زیادہ سے زیادہ بارہ تیرہ سال کا فصل ہوسکتا ہے۔ اب کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ ایک عجوزہ خاتون صرف دس بارہ سال پہلے ایسی حسین نوجوان تھیں کہ مصر کا بادشاہ انہیں چھیننے کے لیے بے چین ہوگیا؟

۱۔ اس بادشاہ کے دین میں یہ بات تھی کہ صرف شوہر والی عورتوں ہی سے تعرض کیا جائے اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے بیوی کو بہن اس امید پر کہا کہ وہ حضرت سارہ کو بے شوہر عورت سمجھ کر چھوڑ دے گا۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے بیوی کو بہن اس لیے کہا کہ بادشاہ عورت کو چھوڑنے والا تو ہے نہیں، اب اگر میں یہ کہوں کہ میں اس کا شوہر ہوں تو جان بھی جائے گی اور بیوی بھی اور اگر بہن کہوں تو صرف بیوی ہی جائے گی، جان بچ رہے گی۔

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اندیشہ ہوا کہ سارہ کو بیوی بتاؤں گا تو یہ بادشاہ مجھ سے زبردستی طلاق دلوائے گا، اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ میری بہن ہے۔

۴۔ اس بادشاہ کے دین میں یہ بات تھی کہ بھائی اپنی بہن کا شوہر ہونے کے لیے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حق دار ہے، اس لیے انہوں کو بیوی کو بہن اس امید پر بتایا کہ یہ سارہ کو میرے ہی لیے چھوڑ دے گا (فتح الباری ج ۶ صفحہ ۲۴۷۔ عینی ج ۱۵ صفحہ ۲۴۹۔ قسطلانی ج ۵، صفحہ ۲۸۰)

خدارا غور کیجیے کہ ان توجیہات نے بات بنائی ہے یا کچھ اور بگاڑ دی ہے؟ آخر کس تاریخ سے یہ نادر معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ دنیا میں کوئی دین ایسا بھی گزرا ہے جس میں بے شوہر عورت کو چھوڑ کر صرف شوہر دار عورت ہی سے تعرض کرنے کا قاعدہ مقرر ہو؟ اور یہ ایک نبی کی سیرت و شخصیت کا کیسا بلند تصور ہے کہ وہ جان بچانے کے لیے بیوی کی عصمت قربان کرنے پر راضی ہو جائے؟ اور یہ کس قدر معقول بات ہے کہ زبردستی طلاق دلوائے جانے کے اندیشے سے بیوی کو بہن کہہ کر دوسرے کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ بے طلاق ہی اس سے استفادہ کرے؟ اور یہ کتنی دل لگتی بات ہے کہ بادشاہ بھائی کو تو بہن کا شوہر ہونے کے لیے زیادہ حقدار مانے گا مگر خود شوہر کو شوہر ہونے کے لیے حق دار نہ مانے گا؟ اس طرح کی لاطائل سخن سازیوں سے ایک مہمل بات کو ٹھیک بٹھانے کی کوشش کرنے سے کیا یہ مان لینا زیادہ بہتر نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز یہ بات نہ فرمائی ہوگی اور کسی غلط فہمی کی بناء پر یہ قصہ غلط طریقے سے نقل ہو گیا ہے۔

بعض حضرات اس موقع پر یہ خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر اس طرح کے دلائل سے محدثین کی چھانی پھٹکی ہوئی ایک صحیح السند روایت کے مضمون کو مشکوک ٹھیرا دیا جائے تو پھر ساری ہی حدیثیں مشکوک قرار پائیں گی۔

لیکن یہ خدشہ اس لیے بے بنیاد ہے کہ متن کی صحت میں شک ہر روایت کے معاملے میں نہیں ہو سکتا، بلکہ صرف کسی ایسی روایت ہی میں ہو سکتا ہے جس میں کوئی بہت ہی نامناسب بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوئی ہو اور وہ کسی توجیہ سے بھی ٹھیک نہ بیٹھتی ہو۔ اس طرح کی بعض روایتوں کے متن کو مشکوک ٹھیرانے سے آخر ساری روایتیں کیوں مشکوک ہو جائیں گی؟ پھر یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جن نامناسب باتوں کی کوئی معقول توجیہ ممکن نہ ہو ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونا زیادہ خطرناک ہے، یا یہ مان لینا کہ محدثین کی چھان پھٹک میں بعض کوتاہیاں رہ گئی ہیں، یا یہ کہ بعض ثقہ راویوں سے بھی نقلِ روایات میں کچھ غلطیاں ہو گئی ہیں؟ بتایئے، ایک صاحبِ ایمان آدمی اِن دونوں باتوں میں سے کس بات کو قبول کرنا زیادہ پسند کرے گا۔

علامہ مودودی صاحب مرحوم ایک اور مقام پر رقم طراز ہیں۔

حضرت ابراہیم نے بت شکنی کے اس فعل کو بڑے بُت کی طرف جو منسوب کیا ہے اس سے ان کا مقصد جھوٹ بولنا نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنے مخالفین پر حجت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے اس لیے کہی تھی کہ وہ لوگ جواب میں خود اقرار کریں کہ ان کے یہ معبود بالکل بے بس ہیں اور ان سے کسی فعل کی توقع تک نہیں کی جا سکتی ایسے موقع پر ایک شخص استدلال کی خاطر جو خلافِ واقعہ بات کہتا ہے اس کو جھوٹ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ نہ وہ خود جھوٹ کی نیت سے ایسی بات کہتا ہے اور نہ اس کے مخاطب ہی اسے جھوٹ سمجھتے ہیں، کہنے والا اسے حجت قائم کرنے کے لیے کہتا ہے اور سننے والا بھی اسے اسی معنی میں لیتا ہے۔

بدقسمتی سے حدیث کی ایک روایت میں یہ بات آگئی ہے کہ حضرت ابراہیم اپنی زندگی میں تین مرتبہ جھوٹ بولے ہیں۔ ان میں سے ایک جھوٹ تو یہ ہے (کہ اس بڑے بت نے کیا ہے) اور دوسرا جھوٹ سورۃ صافات میں حضرت ابراہیم کا قول اِنِّیْ سَقِیْمٌ ہے اور تیسرا جھوٹ ان کا اپنی بیوی کو بہن کہنا ہے۔ جس کا ذکر قرآن میں نہیں۔ بلکہ بائبل کی کتاب پیدائش میں آیا ہے۔ ایک گروہ روایت پرستی میں غلو کر کے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے بخاری و مسلم کی چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ اس سے ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ اس ایک روایت کو دیا اسی قسم کی چند دیگر روایات)

لے کر پورے ذخیرۂ حدیث پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ساری حدیثوں کو اٹھا کر پھینک دو کیونکہ ان میں ایسی ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ نہ ایک یا چند روایات میں کسی خرابی کے پائے جانے سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری روایات ناقابلِ اعتماد ہوں۔ اور نہ فنِ حدیث کے نقطۂ نظر سے کسی روایت کی سند کا مضبوط ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کا متن خواہ کتنا ہی قابلِ اعتراض ہو مگر اسے ضرور آنکھیں بند کر کے صحیح مان لیا جائے۔ سند کے قوی اور قابلِ اعتماد ہونے کے باوجود بہت سے ایسے اسباب ہو سکتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ایک متن غلط صورت میں نقل ہو جاتا ہے اور ایسے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی قباحت خود پکار رہی ہوتی ہے کہ یہ باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے سند کے ساتھ ساتھ متن کو دیکھنا بھی ضروری ہے لہٰذا اگر متن میں کوئی قباحت ہو تو پھر خواہ مخواہ اس کی صحت پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ حدیث جس میں حضرت ابراہیمؑ کے تین جھوٹ بیان کئے گئے ہیں۔ صرف اسی وجہ سے قابلِ اعتراض نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کو جھوٹا قرار دے رہی ہے۔ بلکہ اس بناء پر غلط ہے کہ اس میں جن تین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تینوں ہی محلِ نظر ہیں۔ اُن میں سے ایک جھوٹ کا حال ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوئی معمولی عقل و خرد کا آدمی بھی اس سیاق و سباق میں حضرت ابراہیمؑ کے اس قول پر لفظ جھوٹ کا اطلاق نہیں کر سکتا۔ کجا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معاذ اللہ اس سخن ناشناسی کی توقع کریں۔ رہا اِنِّیْ سَقِیْمٌ والا واقعہ تو اس کا جھوٹ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت ابراہیمؑ فی الواقع اس وقت بالکل صحیح و تندرست تھے اور کوئی ادنیٰ سی بھی شکایت ان کو نہ تھی۔ یہ بات نہ قرآن میں کہیں بیان ہوئی ہے اور نہ اس زیرِ بحث روایت کے سوا کسی دوسری معتبر روایت میں اس کا ذکر آیا ہے۔

اب رہ جاتا ہے بیوی کو بہن قرار دینے کا واقعہ تو وہ بجائے خود ایسا مہمل ہے کہ ایک شخص اس کو سنتے ہی یہ کہہ دیگا کہ یہ ہرگز واقعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ قصہ اس وقت کا بتایا جاتا ہے جب حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حضرت سارہؑ کے ساتھ مصر گئے ہیں۔ بائیبل کی رو سے اُس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۷۵ برس اور حضرت سارہؑ کی عمر ۶۵ برس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اور اس عمر میں حضرت ابراہیمؑ کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ شاہِ مصر اس خوبصورت خاتون کو حاصل کرنے کی خاطر مجھے قتل کر دے گا۔ چنانچہ وہ بیوی سے کہتے ہیں کہ جب مصری تمہیں

پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جانے لگیں تو تم بھی مجھے اپنا بھائی بتانا اور میں بھی تمہیں اپنی بہن بتاؤں گا تاکہ میری جان تو بچ جائے (پیدائش باب ۱۲)

حدیث کی زیر بحث روایت میں تیسرے جھوٹ کی بنیاد اسی صریح لغو اور مہمل اسرائیلی روایت پر ہے۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ جس حدیث کا متن ایسی باتوں پر مشتمل ہو اس کو بھی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے پر صرف اس لیے اصرار کریں کہ اس کی سند مجروح نہیں ہے؟ اسی طرح کی افراط پسندیاں پھر معاملہ کو بگاڑ کر اُس تفریط تک نوبت پہنچا دیتی ہیں جس کا مظاہرہ منکرین حدیث کر رہے ہیں۔ تفہیم القرآن ج ۳ صفحہ ۱۶۷

یہ تو علامہ مودودی مرحوم کا بیان تھا لیکن محدثین کے یہاں مدیث کی ایک اصطلاح اور آتی ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی صحیح روایت میں راوی کے الفاظ داخل کر دیے جائیں اور اس راوی کے الفاظ کو غلطی سے حدیث سمجھ لیا جائے تو ہو سکتا ہے راوی نے بطور تشریح اسرائیلی روایت بیان کی ہو اور بعد کے راوی نے اسے حدیث رسول سمجھ لیا ہو اور پھر حدیث رسول کہہ کر بیان کر دیا ہو۔ ایسی حدیث کو مُدرَج بولتے ہیں۔ یہاں مدرج کی تفصیل کی گنجائش نہیں ورنہ ہم اس کی تفصیل پیش کر دیتے۔

علامہ مودودی صاحب مرحوم کی اس تشریح سے ہمیں ذرّہ برابر بھی اختلاف نہیں۔ اور ہم کتاب کے مقدمہ میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ اگر راوی ثقہ ہوں تو روایت بھی صحیح ہو، اور اگر ہم ان راویوں کو ہر صورت میں صادق بھی تسلیم کریں تب بھی بھول اور غلطی کا احتمال باقی رہتا ہے اور یہ محالات میں سے ہے کہ کوئی انسان بھول اور غلطی سے پاک ہو، حتیٰ کہ بھول سے تو انبیاء بھی پاک نہیں۔ اس طرح ان راویوں کا معصوم ماننا لازم آئے گا جو انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت ہے۔

نیز یہ بھی احتمال ہے کہ راوی سے یہ بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو اور اسی لیے امام ابو حنیفہ صحت روایت کے لیے راوی کا فقیہ ہونا شرط قرار دیتے ہیں کیونکہ اکثر روایات بالمعنی مروی ہوتی ہیں اور معنی کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے فقیہ ہونا ضروری ہے۔ واللہ اعلم۔

کیا خضر زندہ ہیں؟

آج تک کوئی صوفی ایسا نہیں گزرا جو حیاتِ خضر کا قائل نہ رہا ہو اور جس کی جنگلوں اور بیابانوں میں جناب خضر سے ملاقات نہ ہوئی ہو اور علی الخصوص اُس صورت میں جب قریب میں کوئی دیکھنے والا اور تردید کرنے والا موجود نہ ہو۔ خواہ وہ خضر کے روپ میں کوئی شیطان ہی کیوں نہ ہو۔ بہرصورت ہم تو صرف اتنی سی بات جانتے ہیں کہ نہ جناب خضر صاحب کسی عام آدمی کو نظر آتے ہیں اور نہ کسی تعلیم یافتہ کو۔ وہ کسی ایسے صوفی اور پیر صاحب کو نظر آتے ہیں جو دینی اور دنیاوی علوم سے نابلد ہوں۔

آمدم برسرِ مطلب۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ فی الحقیقت جناب خضر نظر بھی آتے ہیں یا نہیں یا ان کے روپ میں کوئی شیطان ہوتا ہے۔ یا تصورِ شیخ کے تحت خیالی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں تو یہ عقل سے پیدل لوگ اسے خضر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ہم تو صرف سیدھی سادی باتیں جانتے ہیں کہ اوّل تو یہ مسئلہ حل کیا جائے کہ وہ انسان بھی ہیں یا نہیں۔ کیونکہ اگر وہ انسان ہوتے تو ہر کہ ومہ کو نظر آتے اور ہم جیسے عام آدمیوں کی طرح زندگی گزارتے، کھاتے پیتے اور موج کرتے اور جب وہ ہر ایک کو نظر نہیں آتے اور انسانوں کی طرح زندگی نہیں گزارتے تو لازماً ان کا تعلق انسانوں سے ہرگز نہیں ہے۔

اگر انہیں کچھ دیر کے لیے فرشتہ تسلیم کر لیا جائے تو اصلی صورت میں فرشتہ کسی کو نظر نہیں آسکتا۔ آئے گا بھی تو انسانی صورت میں آئے گا اور انسانی صورت میں ہونے کے باعث یہ اشتباہ واقع ہو گا کہ وہ واقعتاً فرشتہ بھی ہے یا نہیں۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا	اور اگر ہم فرشتے کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے
عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ○	اور اس طرح انہیں شبہ میں مبتلا کر دیتے جس طرح یہ اب مبتلا ہیں۔

تو نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ جب جنگلوں کے باسی فرشتہ بھی نہیں۔ بلکہ اس طویل عمری کے باعث اشتباہ یہ واقع

ہوتا ہے کہ کہیں یہ وہ حضرت تو نہیں جنہیں دھکے دے کر آسمانوں سے نکالا گیا تھا اور جنہیں قیامت تک کی عمر دی گئی تھی۔ ایسی صورت میں جناب ابلیس علیہ اللعنۃ کے تین روپ ہوں گے۔ ایک ابلیس کا روپ ایک جناب خضرؑ کا روپ اور ایک ان حضرت کا روپ جو غائب بھی ہیں لیکن ہر جگہ حاضر بھی ہیں اور اپنے یاروں سے چھپتے پھرتے ہیں اور جن کی تلاش آج تک غاروں گڑھوں اور سمندروں میں جاری ہے۔

قارئین کرام آپ حضرات اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں کہ ہم ان حضرت خضرؑ کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جن کی ملاقات "مجمع البحرین" میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی تھی۔ وہ تو حضرت موسیٰؑ کے ہم عصر تھے اور لازماً حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں یا اس کے کچھ بعد ان کا انتقال ہو چکا ہوگا۔

لیکن اس تمام کہانی کا اصل سلسلہ وہیں سے چلتا ہے۔ جس کے پس پردہ یہ تخیل کارفرما ہے کہ کچھ پہنچے ہوئے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو علم لدنی حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی شریعت کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں قدرت کی طرف سے کرتے ہیں اور انہیں جناب خضر ہدایات دیتے رہتے ہیں۔ وہ خواہ کتنی بھی شریعت کی خلاف ورزی کریں ان کے لیے سب کچھ معاف ہے۔ ... نہ صرف معاف بلکہ ہر شخص شریعت کو چھوڑ کر ان کا اسی طرح محتاج ہے کہ جس طرح موسیٰؑ دوران سفر تمام ہادی خضر کے محتاج ہوتے اور موسیٰؑ سے بھی ان کی ملاقات دوران سفر ہوئی تھی۔ اسی لیے صوفیا کی بھی ان سے ملاقات اس وقت ہوتی ہے جب وہ جنگلوں کی خاک چھانتے اور پتے چباتے پھر رہے ہوں۔ پھر عالم جنون میں جناب صوفی صاحب جو حکم فرما دیں وہ حکم الٰہی ہے۔ یہی وہ فلسفہ خضرؑ ہے جسے جلال الدین رومی سے لے کر آج تک ہر سر پھرا پیش کرتا رہا ہے اور اس فلسفہ کو پیش کر کے شریعت کو ایک چھلکے کی طرح بے کار قرار دیا جاتا رہا۔ تاکہ صوفی صاحبان اپنی رائے سے جسے چاہیں قتل کر دیں اور ان سے کوئی مواخذہ کرنے والا نہ ہو۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے سے ملاقات کا حکم دیا تھا۔ اور اس ملاقات کے بعد حضرت موسیٰؑ سفر پر گئے۔ اثنائے راہ میں اس بندے نے تین ایسے کام کیے کہ جو بظاہر خلاف شریعت تھے اور حضرت موسیٰؑ نے اس پر نکیر فرمائی تھی۔ جس کے جواب میں اس شخص نے یہ کہا تھا کہ یہ کام میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا۔

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ — میں نے یہ کام اپنی رائے سے نہیں کیا۔

یہ تمام واقعہ سورۂ کہف میں پیش کیا گیا ہے۔ سورۂ کہف کی آیات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ اولوالعزم اور جلیل المرتبت رسول تھے اور علوم شرعیہ اور احکام کی تبلیغ ان کا منصب تھا۔ اس لیے وہ ان تکوینی اسرار کے مظاہرے پر صبر نہ کر سکے اور وعدۂ صبر کے باوجود ان امور کو دیکھ کر جو خلاف شرع تھے برداشت نہ کر سکے اور نام نہاد خضر کو ہر بات پر ٹوکتے رہے اور اس طرح نہی عن المنکر کا فریضہ پورا کرتے رہے اور آخر کار جدائی کی نوبت آگئی۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جس میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے چند امور زیادہ ہیں جو بطور تمہید ہیں اور اسی حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ اس عبد صالح کو جس سے حضرت موسیٰؑ نے ملاقات کی تھی خضر کہا جاتا ہے۔

اس مقام پر چند امور قابل ذکر ہیں۔

۱۔ خضر نام ہے یا لقب

۲۔ خضر فقط عبد صالح ہیں یا ولی ہیں۔ نبی ہیں یا فرشتہ۔

۳۔ ان کو حیات ابدی حاصل ہے یا وفات پا چکے۔

مفسرین نے ان ہر سہ سوالات کے جواب میں بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔ چنانچہ پہلے سوال کے جواب میں بعض حضرات کا قول ہے کہ خضر نام ہے۔ لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ خضر لقب ہے اور نام و نسب کے معاملہ میں بھی زبردست اختلاف ہے۔

سہیلی لکھتے ہیں کہ ان کے نام و نسب میں زبردست اختلاف ہے۔ وہب بن منبہ کا قول تو یہ ہے کہ ان کا نسب نامہ اس طرح ہے۔ ایلیا بن ملکان بن فالغ بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح۔

بعض کہتے ہیں بلیا بن عامیل بن سماقعین بن اریا بن علقما بن عیصو بن اسحاق۔ قرطبی ج ۵ صـ۴۰۸۳۔

پہلے نسب نامہ کی رو سے جناب خضر اور حضرت نوحؑ کے درمیان پانچ پشتیں ہیں۔ گویا کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ تک وہ کئی صدیوں کا سفر طے کر چکے تھے۔ اور دوسرے نسب نامے کے لحاظ سے یہ حضرت اسحاق کی چھٹی پشت میں تھے۔ یعنی حضرت موسیٰ کے ہمعصر۔ بعض نے ان کا نام خضرون، بعض نے معمر، بعض نے الیاس اور بعض

نے الیسع کہا ہے۔

مجاہد کا بیان ہے کہ انہیں خضر اس لیے کہا جاتا کہ جہاں یہ نماز پڑھتے وہاں سبزہ اگ آتا اور ترمذی نے ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انہیں خضر اس لیے کہا جاتا ہے کہ جس صاف زمین پر بھی یہ بیٹھتے وہاں سبزہ اگ آتا۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح غریب کہا ہے۔ قرطبی ج ۵ صفحہ ۱۰۵۵ ترمذی ج ۲ صفحہ ۱۹۶ ۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت کافی مشکوک ہے۔ اس کا ایک راوی عبدالرزاق رافضی ہے اور وہ اسے معمر سے نقل کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ معمر کی روایات میں کافی غلطیاں کرتا ہے اور ابو ہریرہؓ سے اسے نقل کرنے والا ہمام بن منبہ ہیں۔ ہمام نے حضرت ابو ہریرہؓ سے بذاتِ خود کوئی روایت نقل نہیں کی۔ بلکہ وہ ابو ہریرہؓ کی روایات اس صحیفہ سے نقل کرتے ہیں جو ان کے بھائی وہب نے انہیں لکھ کر بھیجا تھا۔

دوسرے سوال کے جواب میں بعض کا قول ہے کہ وہ صرف عبد صالح تھے یعنی ولی تھے نبی نہ تھے۔ قرطبی لکھتے ہیں کہ سورۃ کہف کی آیات ان کی نبوت کی شہادت دے رہی ہیں۔ کیونکہ کسی شئے کی اندرونی حقیقت صرف وحی کے ذریعہ معلوم ہو سکتی ہے نیز ہر انسان اسی شخص کی اتباع کرتا اور اس شخص سے تعلیم حاصل کرتا ہے جو اس سے بلند ہو۔ اور یہ ناممکن ہے کہ وہ شخص جو نبی نہ ہو نبی سے بلند ہو اگرچہ ابن عربی جیسے صوفیاء اس کے قائل ہیں کہ جہاں مقامِ نبوت ختم ہوتا ہے وہاں سے مقامِ ولایت شروع ہوتا ہے اور اس فلسفہ کے لیے انہوں نے خضر کو اپنا پیشوا مانا ہے اور انہیں ولی قرار دے کر حضرت موسیٰؑ سے افضل تسلیم کیا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ وہ فرشتہ تھے۔ جبھی تو تکوینی علوم انجام دے رہے تھے۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ وہ نبی تھے۔

ساتھ ساتھ ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ ہمارے یہاں یہ لفظ خِضَر بولا جاتا ہے۔ یعنی خ کو زیر اور ض کو زبر حالانکہ یہ لفظ خَضِر ہے یعنی خ کا زبر اور ض کا زیر اس طرح یہ لفظ عوام و خواص میں غلط استعمال ہوتا ہے۔

اور تیسرے سوال کے جواب میں بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کو حیاتِ ابدی حاصل ہے اور وہ تا حیات زندہ ہیں اور ان کی زندگی کے سلسلہ میں کچھ روایات و حکایات بیان کی جاتی ہیں۔ یہ روایات سب موضوع ہیں۔

بلکہ یار لوگ یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ ہر سال حج کے زمانہ میں خضر و الیاس ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کا سر مونڈتے اور رخصتی کلمات کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

قرطبی نے سہیل کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جناب خضر کے والد بادشاہ تھے اور ان کی والدہ فارسی تھیں جن کا نام الہٰی تھا۔ جو انہیں غار میں جن کر چلی گئی تھیں (یعنی شہربانو کی طرح جن کر غائب ہو گئی تھیں) یہ کچھ عرصہ بعد غار میں پڑے ہوئے ملے۔ اس عرصہ میں گاؤں کے ایک شخص کی بکری انہیں آکر دودھ پلا جاتی۔ وہاں سے بکری کے مالک نے انہیں اٹھایا اور ان کی پرورش کی۔ جب یہ جوان ہوتے تو اتفاق سے بادشاہ کو کچھ کاتبوں کی ضرورت پیش آئی۔ یہ وہاں پہنچ گئے بادشاہ انہیں پہچانتا بھی نہ تھا۔ جب ان کا عمدہ خط دیکھا تو ان پر فریفتہ ہو گیا۔ اس نے انہیں حضرت ابراہیم اور حضرت شیث کے صحیفے لکھنے پر مامور کیا اور ان کے حالات معلوم کرنے شروع کیے جس کے نتیجہ میں یہ عقدہ کھلا کہ یہ تو وہ صاحبزادے صاحب ہیں جن کے نہ باپ کا پتہ تھا نہ ماں کا۔ بادشاہ نے انہیں اپنے سینہ سے لگایا اور تمام امور سلطنت ان کے سپرد کیے لیکن یہ حکومت چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جس کے بہت طویل طویل اسباب ہیں۔ بھاگتے بھاگتے یہ چشمہ آب حیات پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اس کا پانی پیا اور یہ زندہ رہیں گے حتیٰ کہ دجال ظاہر ہوگا وہ انہیں قتل کرے گا۔ اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ پھر زندہ فرما دے گا۔ قرطبی لکھتے ہیں یہ صحیح نہیں۔ تفسیر قرطبی ج ۵۔ ص ۹۳-۱۴۔

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ کی جلد ثانی میں خضر کے سلسلہ میں بارہ تیرہ صفحات میں اسی قسم کی کہانیاں پیش کی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک کہانی یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ اس فرعون کے صاحبزادے تھے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے غرق دریا کر دیا اور بعض منچلے حضرات نے انہیں حضرت آدم کا بیٹا قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ ابن جریر کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ افریدون کے زمانہ میں پائے جاتے تھے اور ذوالقرنین کے ہراول دستہ کے امیر تھے الغرض یہ ایک کافی طویل داستان ہے جو نہ سمجھنے کی ہے اور نہ سمجھانے کی۔

ہم تو صرف اتنی سی بات سمجھے ہیں کہ ان کی والدہ ایرانی تھیں اور جناب امام غائب کی والدہ بھی ایرانی تھیں لہٰذا ہر دو غائب۔ اس طویل العمری کا اصلی راز تو یہ ہے بلکہ اسی باعث سلمان فارسی کی عمر ساڑھے پانچ سو سال تک پہنچا دی گئی۔ لیکن انہیں غائب نہیں کیا گیا۔ گویا جناب خضر کو غائب کرنے کے سلسلہ میں یہودیت اور ایرانیت دونوں کا منفرا

ہیں اور جس طرح جناب خضر کی والدہ بچہ جننے کے بعد غائب ہو گئیں۔ اسی طرح شہر بانو بھی علی بن حسین کو جننے کے بعد غائب ہو گئی تھی اور امام غائب کی ایرانی والدہ نے صاحبزادے کو بھی ہمیشہ کے لیے غائب کر دیا۔

آبِ حیات: اس نام کا کوئی چشمہ آج تک دنیا میں دستیاب نہ ہو سکا۔ ہاں تصوفی داستانوں میں ضرور پایا جاتا ہے۔ درا صل یہ عربی لفظ ماء الحیوۃ کا فارسی میں ترجمہ ہے اور ماءالحیات جنت و دوزخ کے درمیان ایک چشمہ ہو گا جس میں ان لوگوں کو غوطہ دیا جائے گا جو دوزخ سے سزا پا کر کوئلہ بن کر باہر نکلیں گے جس سے یہ لوگ اپنی اصل حالت پر واپس آ جائیں گے۔

قربان جائیے ان ایرانی فتنہ پردازوں کے کہ وہ اسے دنیا میں گھسیٹ لائے اور اس کے لیے روایات وضع کر دیں اور پھر عجمی صوفیہ نے ان روایات کو پر لگا کر دنیا میں پھیلا دیا۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

اس وقت ہمارا موضوع آبِ حیات نہیں بلکہ حضرت خضر اور ان کی طویل حیات ہے جس پر ہم کچھ ابتداء میں تبصرہ کر چکے ہیں۔ آیئے اب مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے خیالات بھی پڑھ لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں۔

قولِ فیصل: ان ہر سہ مسائل میں قولِ فیصل یہ ہے کہ پہلی بات کے متعلق قرآن عزیز میں کوئی تذکرہ نہیں ہے نہ حضرت خضر کا نام مذکور ہے اور نہ لقب بلکہ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا کہہ کر ان کا واقعہ نقل کیا ہے۔ البتہ بخاری و مسلم کی صحیح احادیث میں خضر کہہ کر ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ پس اگر تاریخی روایات سے ہم ان کے نام اور لقب کا پتہ لگا سکتے ہیں تو بآسانی یہ کہہ سکتے کہ فلاں نام ہے اور فلاں لقب۔ مگر اس بارے میں تاریخی اقوال اس درجہ مضطرب ہیں کہ ان سے کسی نتیجہ پر پہنچنا ناممکن ہے۔ لہٰذا ہمارے سامنے ان کی شخصیت کا تعارف صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ ان کو خضر کہا جاتا ہے اور یہ کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاصر ہیں۔ اس سے زیادہ ان کے نام یا لقب یا نسب کی تمام بحثیں بے دلیل محض تخمینی اقوال کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اور دوسری بات کے متعلق راجح قول یہ ہے کہ وہ نبی تھے اس لیے کہ قرآن عزیز نے جس انداز میں ان کے شرف کا ذکر کیا ہے وہ مقام نبوت پر ہی صادق آتا ہے اور مقام ولایت اس سے بہت فروتر ہے مثلاً جب خضر کے قتل کی وجہ بیان کی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا۔

رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ ... اے موسیٰ یہ تیرے پروردگار کی رحمت ہے اور یہ کام

اَمۡرِیۡ   میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا۔

یہ میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ تیرے رب کی رحمت کی بدولت ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ کسی ولی کے لیے جائز نہیں کہ وہ الہام کے ذریعہ کسی شخص کو قتل کر ڈالے اس لیے کہ اس میں مغالطہ کا امکان ہے اور اولیاء اللہ کے بہت سے مکاشفات میں اسی لیے کثرت سے تضاد پایا جاتا ہے اور اسی بنا پر اسے شرعی حجت تسلیم نہیں کیا گیا۔

لہٰذا امور تکوینیہ میں سے ایک ایسا تکوینی امر جو ظاہر سطح میں نہایت قبیح اور بہت بڑا جرم ہے۔ صرف وحی الٰہی کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے۔ اس آیت کے علاوہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضر کے درمیان گفتگو کے واقعہ کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ وہ نبی تھے تب ہی حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر حضرت خضر کی معیت اور ان کے تکوینی علم کے مشاہدہ کے لیے اصرار کرتے ہیں اور تب ہی حضرت خضر جرأت کے ساتھ اپنے علم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان موازنہ کرتے نظر آتے ہیں۔

تاہم مجموعہ کمالات نبوت و رسالت کے اعتبار سے حضرت موسیٰ کا مقام حضرت خضر کے مقام سے بہت بلند ہے کیونکہ وہ خدا کے نبی بھی اور جلیل القدر رسول بھی ہیں صاحب شریعت بھی ہیں اور صاحب کتاب بھی، اور رسولوں میں بھی اولوالعزم رسول ہیں۔ پس حضرت خضر کا وہ جزئی علم جو علم تکوین کے اسرار سے تعلق رکھتا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جامع علم تشریعی پر فائق نہیں ہو سکتا۔ قصص القرآن ج ا ص ۴۴۲ ۔

حضرت خضر نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے ایک بچہ کو بھی قتل کیا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے اس پر نکیر بھی فرمائی۔ لیکن جو اصل کام حضرت موسیٰؑ کو انجام دینا چاہیے تھا وہ انہوں نے نہیں دیا۔ کیوں کہ ان پر یہ حکم نازل ہوا تھا۔

اَلنَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ   جان کے بدلے جان

لہٰذا حضرت موسیٰؑ کو انہیں قتل کرنا چاہیے تھا لیکن حضرت موسیٰ نے نہ انہیں قتل کیا اور نہ اس کا ارادہ کیا تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت موسیٰؑ جانتے تھے کہ وہ کوئی عام انسان نہیں بلکہ نبی ہیں جن کی شراعیت جدا گانہ ہے لہٰذا ان پر حد جاری نہیں ہو سکتی ورنہ اگر صرف پیر یا ولی کی بات ہوتی تو حضرت موسیٰؑ حد جاری کرنے سے گریز ہرگز نہ کرتے اور دنیا میں ایک نئے منصور کا شاخسانہ کھڑا ہو جاتا۔

مولینا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم آگے تحریر فرماتے ہیں۔

اور تیسری بات کے متعلق صحیح رائے علماء محققین ہی کی ہے جو اس امر کے قائل ہیں کہ حضرت خضر کو حیات ابدی حاصل نہیں ہے اور وہ اپنی طبعی عمر کے بعد وفات پا چکے۔ اس لیے کہ قرآن عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو بھی حیات ابدی عطا نہیں فرمائی اور اس کے لیے اس دنیا میں موت ایک امر حق ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ۔ الانبیاء ع ۳ ۔

اور اے نبی ہم نے آپ سے پہلے کسی انسان کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی۔

نیز قرآن عزیز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم نے ہر ایک نبی سے یہ عہد و میثاق لیا ہے کہ جب محمد رسول اللہ کی بعثت ہوگی تو تم میں سے جو بھی اس وقت موجود ہو اس کا فرض ہوگا کہ وہ اس رسول پر ایمان بھی لائے اور اس کی مدد بھی کرے، چنانچہ تمام انبیاء و رسل نے اس کا اقرار کیا اور ان کے اور خدا کے درمیان شہادت و میثاق محکم و مضبوط ہوا۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشَّاهِدِينَ۔

اور یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے انبیاء سے یہ عہد لیا کہ آج ہم نے تمہیں کتاب و حکمت دی ہے پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو ان امور کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہیں تو تمہیں یقیناً اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ پھر اللہ نے سوال کیا کہ کیا تم اقرار کرتے ہو انہوں نے جواب دیا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا گواہ ہو جاؤ میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

پس اگر حضرت خضر زندہ ہوتے تو ان کا فرض تھا کہ وہ علی الاعلان حاضر خدمت ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور تمام غزوات میں آپ کی امداد و اعانت کرتے۔ مگر کسی صحیح روایت سے ان باتوں میں سے کسی بات کا ثبوت نہیں ملتا۔ حالانکہ غزوہ بدر و حنین وغیرہ میں جبرئیل امین اور ملائکہ کی اعانت و امداد کی تصریحات

موجود ہیں ۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ اس رات کو تم نے دیکھا ؟ یہ واضح رہے کہ آج جو شخص بھی بقید حیات ہے ایک صدی گزرنے پر ان میں سے ایک شخص بھی زمین پر زندہ باقی نہیں رہے گا ۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی یہ روایت اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ خضر اب تک زندہ ہیں ۔ اس صحیح حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق حضرت خضر کی حیات ابدی کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلتی اور نہ ان کا استثناء کسی روایت سے ثابت ہوتا ہے ۔ حالانکہ یہ روایت صحیحین کے علاوہ مختلف طریقوں سے دوسری کتب حدیث میں بھی منقول ہے ۔

اسی لیے مشہور محدث حافظ ابن الفتح نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایک بھی صحیح روایت ایسی منقول نہیں ہے جس سے حضرت خضر کے زندہ ہونے کا ثبوت ملتا ہو ۔ بلکہ اس کے برعکس آیات قرآنی اور صحیح روایات ان کی موت کی تائید کرتی ہیں ۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن جوزی، امام بخاری، قاضی ابویعلی حنبلی، ابوطاہر بن علی العباری، علی بن موسیٰ الرضا ۔ ابوالفضل مرسی، ابوطاہر بن العبادی، ابوالفضل بن ناصر، قاضی ابوبکر العربی، ابوبکر محمد بن الحسن (اور قرطبی) جیسے جلیل القدر محدثین ومفسرین ان کی موت ہی کے قائل ہیں ۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے کرائی جن کا نام خضر تھا ۔ ان کو بعض اسرار کونیہ کا وہ علم عطا ہوا تھا جو حضرت موسیٰؑ کو نہیں دیا گیا حضرت موسیٰ کی شان حضرت خضر سے کہیں زیادہ ہے ۔ حضرت خضر کا تذکرہ جس انداز سے قرآن عزیز نے کیا ہے اس سے یہی راجح نظر آتا ہے کہ وہ نبی تھے ۔ تاہم بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ کو قرآن عزیز نے جس طرح مجمل رکھا ہے ہم صرف اسی پر یقین رکھیں ۔ اور اس سے آگے اپنی تحقیق کو دخل نہ دیں ۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے اور چونکہ ان کی حیات ابدی کے لیے کوئی شرعی اور تاریخی دلیل موجود نہیں ہے اس لیے بلاشبہ وہ بھی اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر واصل الی اللہ ہوتے ۔

حضرت خضر کے واقعہ سے متعلق اور بھی بہت سی عجیب وغریب روایات تفسیر و تاریخ کی کتابوں میں

منقول ہیں۔ محققین کی نگاہ میں وہ سب موضوع اور بے اصل ہیں اور اسرائیلیات سے ماخوذ اس لیے ناقابل

اعتماد ہیں۔ قصص القرآن ج ۱ صـ ۵۴۳۔

مولٰینا حفظ الرحمان صاحب مرحوم نے سورت انبیاء کی ایک آیت کا حوالہ پیش فرمایا ہے "کہ ہم نے

آپ سے پہلے کے کسی بشر کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی۔ اس آیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دو امور واضح ہوتے ہیں"

۱۔ حضرت خضر اگر انسان تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل وفات پا چکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ

سے پہلے کے کسی بشر کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی۔

۲۔ اگر انہیں زبردستی زندہ تسلیم ہی کرانا ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ انسان نہ تھے اور ہم نے قرطبی کے

حوالہ سے ایک قول یہ نقل بھی کیا تھا کہ وہ فرشتہ تھے اگرچہ قرطبی نے اس قول کو ضعیف قرار دے کر اس پر کوئی بحث

نہیں کی لیکن علامہ مودودی صاحب مرحوم نے اپنی تفسیر میں اسی قول کو اختیار کر کے اس کے دلائل پیش کیے اور

ماشاء اللہ کافی عمدہ دلائل دیے ہیں ذہن اس جانب راغب بھی ہوتا ہے لہٰذا جب وہ انسان ہی نہ تھے بلکہ

فرشتہ تھے تو ان کی حیات وممات پر بحث ہی بے کار ہے اور اسی باعث علامہ مودودی صاحب نے اپنی تفسیر

میں حیات خضر کے مسئلہ کو چھیڑا تک نہیں۔ بلکہ انہیں فرشتہ قرار دے کر اس مسئلہ کی بنیاد ہی ختم فرما دی۔ فجزاہ

اللہ احسن الجزاء

جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا تعلق ہے کہ آج اس روئے زمین پر جتنے افراد ہیں وہ

سب سو سال کے اندر مر جائیں گے۔ یہ حدیث متعدد صحابہ سے مروی ہے اور حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ آپ نے یہ

بات وفات سے ایک ماہ قبل فرمائی تھی۔ اس کا لازمی تقاضا ہے کہ سنہ کی ابتداء تک روئے زمین کے تمام افراد

کو زمین سے اٹھ جانا ہے اگر خضر زندہ تھے تو اگر وہ انسان تھے تو انہیں بھی لازماً موت واقع ہو چکی۔ ہاں یہ دوسری

بات ہے کہ وہ انسان نہ ہوں۔

ہمارے ذہن میں گزشتہ دلائل کے علاوہ کچھ اور بھی دلائل ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لو کان موسیٰ حیا ما وسعہ — اگر آج موسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں میری اتباع کے

بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوتا

اس کا لازمی تقاضا ہے کہ جو فرد بشر بھی زندہ ہو اور اس تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پہنچی ہو تو آپ پر ایمان لائے بغیر اس کی نجات ممکن نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت خضر زندہ تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے یا نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایمان لائے تو اس کا تاریخی ثبوت درکار ہے۔ اس لیے کہ جو شخص بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا اور آپ کی بیعت کی وہ صحابی کہلاتا ہے اور ہر صحابی کی صحابیت کا تاریخی ثبوت موجود ہے اور متعدد محدثین نے صحابہ کے حالات اپنی اپنی کتابوں میں جمع کیے ہیں۔ ان میں خضر نامی کوئی صحابی نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے تھے اگر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ غائبانہ ایمان لائے تھے تو یہ امر تو خود بخود ثابت ہو گیا کہ ان کا مقام صحابہ سے کم تر ہے۔ کیونکہ انہیں زیارتِ رسول حاصل نہیں ہوئی۔

لیکن اگر وہ غائبانہ ایمان بھی لائے تھے تو شریعت اسلامیہ کی تعلیم کن کن صحابہ سے حاصل کی۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو گویا ان کا مقام تابعی سے بھی گر کر ہے اور یہ سوال تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتا رہے گا کہ کسی تابعی سے مستفیض ہوئے یا نہیں اور جب اس کا ثبوت نہیں تو خیر القرون میں تو ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس صورت میں یا تو یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ ان کی موت واقع ہو چکی یا یہ قبول کرنا ہو گا کہ شریعت اسلامیہ میں ان کا کوئی مقام نہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اس دور میں اپنی طبعی موت مر چکے۔ ورنہ قرآن، حدیث اور قانون فطرت کی تردید لازم آئے گی

اور مزید یہ سوال پیدا ہو گا کہ اگر وہ زندہ ہیں اور بشرطیکہ انسان ہیں تو آیا انہوں نے ازدواجی زندگی گزاری یا صوفیا کی طرح تجرد کی زندگی گزاری ہے اگر انہوں نے ازدواجی زندگی گزاری ہے تو اب تک ان کی نسل سے پورا ایک ملک آباد ہو چکا ہوتا اور اگر تجرد کی زندگی گزاری ہے تو اس تجرد کی انہیں کس نے تعلیم دی۔ کیونکہ کسی نبی یا رسول کی شریعت میں تجرد کی تعلیم نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا اب تجرد کی زندگی گزارنے والوں کو چاہیئے کہ خود کو شریعت محمدیہ کے بجائے شریعتِ خضریہ کی جانب منسوب کریں۔

یا ساریۃ الجبل

یہ الفاظ حضرت عمرؓ کی جانب منسوب ہیں اور قصہ کچھ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ساریہؓ نامی ایک شخص کو لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ اتفاق سے وہ دشمنوں سے شکست کھانے لگا۔ اس لشکر کے قریب کوئی پہاڑ تھا۔ اچانک مدینہ میں حضرت عمرؓ کو اس وقت الہام ہوا جب آپ خطبہ دے رہے تھے۔ آپ نے اسی حالت میں چیخنا شروع کیا یا ساریۃ الجبل الجبل ... اللہ تعالیٰ نے آپ کی آواز ساریہؓ تک پہنچا دی۔ ساریہؓ اہل لشکر کو لے کر پہاڑ کی جانب چلے گئے اور ایک جانب سے جنگ کی۔ نتیجۃً اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح عطا فرمائی۔

علامہ عبد الرحمان بن علی بن محمد الشیبانی الشافعی الاثری رقم طراز ہیں۔

حدیث یا ساریۃ الجبل الجبل۔ یہ بات حضرت عمرؓ نے فرمائی تھی جب آپ جمعہ کے روز خطبہ دے رہے تھے کہ آپ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ وہ لشکر جو انہوں نے ساریہؓ کے ساتھ فارس کی جانب روانہ کیا ہے' ایک وادی میں اس کا دشمن سے مقابلہ ہوا ہے اور وہ شکست کھانے کے قریب ہے اور پاس ہی ایک پہاڑ ہے انہوں نے دوران خطبہ بلند آواز سے یہ الفاظ ادا کیے۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے ساریہؓ کے کان میں ڈال دیے۔ انہوں نے پہاڑ کی پناہ لے کر دشمن سے جنگ کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح عطا فرمائی۔ یہ واقعہ فقیہ واحدی نے اسامۃ بن زید بن اسلم سے نقل کیا ہے اور اسامہ نے اپنے والد زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت عمرؓ سے۔

نیز یہ روایت بیہقی نے دلائل میں اور ابن الاعرابی نے کرامات الاولیاء وغیرہ میں ذکر کی ہے۔ تمیز الطیب من الخبیث فی ما یدور علی السنۃ الناس من الحدیث صفحہ ۱۹۸۔

علامہ عبد الرحمان الاثری نے اس روایت پر کوئی کلام نہیں کیا۔ حالانکہ انہوں نے اپنی کتاب میں وہ روایات جو لوگوں کی زبان پر مشہور ہیں جمع کر کے ان کی صحت یا ان کا سقم بیان کیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ اس روایت پر

پتا کوئی فیصلہ دیتے۔ لیکن غالباً وہ اس روایت پر کسی قسم کا فیصلہ کرنے سے قاصر رہے۔ ہاں انہوں نے اتنا کام ضرور کیا کہ اپنے استاد حافظ سخاوی کی المقاصد الحسنہ کی تلخیص فرما دی۔ اور اس میں سے کئی اہم باتیں حذف کر دی ہیں جو اس امر کی نشاندھی کرتی ہیں کہ یہ باتیں اثری صاحب کا ذہن قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ہم اس روایت پر تبصرہ کرنے سے قبل یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ حافظ سخاوی نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے۔ وہ قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ حافظ سخاوی تحریر فرماتے ہیں۔

یا ساریۃ الجبل الجبل : یہ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ جو انہوں نے خطبۂ جمعہ میں کہے تھے جب کہ ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ وہ لشکر جو انہوں نے فارس کی جانب ساریہ کے ساتھ روانہ کیا تھا اور وہ اس وقت ایک وادی میں تھے اور لشکر شکست کھانے کے قریب تھا اور قریب میں ایک پہاڑ تھا تو حضرت عمرؓ نے خطبہ کے دوران بلند آواز سے یہ الفاظ کہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ ساریہؓ کے کان میں ڈال دیے۔ وہ لوگوں کو لے کر پہاڑ کی طرف چلے گئے اور پہاڑ کی طرف پشت کر کے انہوں نے دشمن سے مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح عطا فرمائی۔

اس واقعہ کو واقدی نے زید بن اسلم سے نقل کیا ہے اور اس نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عمرؓ سے بیہقی نے بھی اسے دلائل میں۔ لالکائی نے شرح السنہ میں۔ دیر عاقولی نے اپنی فوائد میں اور ابن العربی نے کرامات الاولیاء میں ابن وہب کے ذریعہ نقل کیا ہے۔ ابن وہب نے یحییٰ بن ایوب سے انہوں نے ابن عجلان سے انہوں نے نافع سے اور انہوں نے ابن عمرؓ سے کہ حضرت عمرؓ نے ایک لشکر بھیجا اور اس کا امیر ساریہؓ نامی ایک شخص کو بنایا۔ پھر اچانک ایک روز جب عمرؓ خطبہ دے رہے تھے تو انہوں نے تین بار یہ الفاظ کہے یا ساریۃ الجبل جب اس لشکر کا قاصد آیا تو حضرت عمرؓ نے اس سے دریافت کیا تو اس نے عرض کیا اے امیر المومنین ہم شکست کھا رہے تھے اچانک ہم نے ایک آواز سنی جو یہ الفاظ کہہ رہی تھی یا ساریۃ الجبل : یہ آواز تین بار آئی۔ تو ہم نے پہاڑ کو اپنے پس پشت کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کو شکست دی۔ راوی کا بیان ہے کہ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے کہنا شروع کیا کہ آپ اتنے زور سے چیختے ہیں۔ یہ روایت حرملہ نے اپنی جمع میں ابن وہب کے ذریعہ نقل کی ہے۔ اور ہمارے استاد (یعنی حافظ ابن حجر) کا قول ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ نے اسے صحیح کہا ہے اور فرمایا ہے کہ ساریہؓ کے کانوں میں کسی جن نے آواز ڈالی ہوگی۔

اور یہ تو انتہا سے زیادہ پاگل پن ہے۔

ابن مردویہ نے یہ واقعہ میمون بن مہران کے ذریعہ ابن عمرؓ سے اور انہوں نے اپنے والد سے کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ جمعہ کے روز خطبہ دے رہے تھے اثناء خطبہ میں انہوں نے یہ الفاظ فرمائے اے ساریہؓ پہاڑ کی طرف جو شخص بھیڑیے کو پالے گا وہ ظلم کرے گا۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا میں اس بات کی ٹوہ لگاؤں گا کہ یہ الفاظ کس لیے کہے گئے۔ جب حضرت عمرؓ فارغ ہوئے تو لوگوں نے اُن سے سوال کیا۔ انہوں نے فرمایا میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ مشرکین ہمارے بھائیوں کو شکست دے رہے ہیں اور وہ اس وقت ایک پہاڑ سے گزر رہے ہیں اگر یہ لوگ پہاڑ کو پشت پر رکھ کر ایک جانب سے جنگ کریں گے تو کامیاب ہو جائیں گے۔ ورنہ ہلاک ہو جائیں گے۔ اسی سوچ میں میری زبان سے وہ الفاظ نکل گئے جو تم نے سُنے۔ راوی کا بیان ہے کہ ایک ماہ بعد قاصد آیا تو اس نے بیان کیا کہ لوگوں نے فلاں روز عمرؓ کی آواز سنی اور ہم نے پہاڑ کو مورچہ بنایا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح عطا فرمائی۔ المقاصد ص ۴۷۷۔
گویا یہ واقعہ امام ابن تیمیہ کے نزدیک صحیح اور حافظ ابن حجر اور حافظ سخاوی کے نزدیک حسن ہے۔

اس واقعہ کی تین سندات ہیں۔ لیکن سندات پر گفتگو تو ہم بعد میں کریں گے۔ فی الوقت تو ہمارے ذہن میں چند شبہات سر ابھار رہے ہیں پہلے ہم وہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ فارس، ایران اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ پر جتنے لشکر بھیجے گئے اور ان کے جو امیر بنائے گئے آج تک ہمیں کسی تاریخ میں یہ دستیاب نہیں ہو سکا کہ ساریہؓ کو کس لشکر کا امیر بنایا گیا اور کہاں بھیجا گیا۔ اور وہ کونسی جنگ تھی جس میں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ اس سے پوری تاریخ خاموش ہے حالانکہ اتنا اہم واقعہ تو ہر کتاب کی زینت بننا چاہیئے تھا۔

۲۔ یہ روایت جن جن کتابوں میں پائی جاتی ہے وہ علماء کی نظروں میں سب غیر معروف اور نامعتبر ہیں۔ مثلاً حرملہ کی المجمع کا آج کوئی وجود نہیں۔

۳۔ واقدی کے علاوہ جن لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا وہ سب متاخرین میں داخل ہیں۔

۴۔ تاریخ میں جنگ فارس میں ایک واقعہ "واقعہ جسر" کے نام سے مشہور ہے۔ جو ابو عبید ثقفی اور بہمن

کے مابین پیش آیا۔ لیکن اس جنگ کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نو ہزار مسلمانوں میں سے چھ ہزار شہید ہوئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے جو پوری تاریخ اسلام میں واحد واقعہ ہے۔ یہ واقعہ بروز ہفتہ رمضان ۱۳ھ میں پیش آیا تفصیل کے لیے دیکھیے الفاروق صفحہ ۱۳۴ لیکن اتنی المناک شکست کے باوجود وہاں اس جناتی کرامت کا کوئی ظہور نہیں ہوا۔ اور ایک نامعلوم مقام پر اور نامعلوم جنگ میں اتنی بڑی کرامت کا ظہور ہوا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس نے طالب علمی کے دور سے آج تک ہمیں الجھا رکھا ہے۔ اور بچپن سے آج تک ایک لمحہ کے لیے بھی میرے ذہن نے اس کرامت کو قبول نہیں کیا اور نہ آج تک میں یہ معلوم کرسکا کہ یہ ساریہؓ کے ساتھ لشکر کس جگہ گیا تھا اور وہ کون سی جنگ تھی جو پیش آئی تھی۔

۵۔ اس تگ و دو سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ساریہ کا نسب نامہ معلوم ہوگیا جو قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔

ساریۃ بن زنیم بن عمرو بن عبداللہ بن جابر بن نجبۃ بن عبد بن عدی بن دیل بن بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ۔ اس نسب نامہ سے یہ معلوم ہوا کہ ان کا تعلق بنو بکر بن کنانہ سے ہے۔ قریش اور انصار سے نہیں۔

جہاں تک اس کی سندات کا تعلق ہے وہ صرف تین ہیں۔

۱۔ واقدی، اسامۃ بن زید، زید بن اسلم۔ عمرؓ

۲۔ ابن وہب۔ یحیٰی بن ایوب، ابن عجلان۔ نافع۔ ابن عمرؓ

۳۔ میمون بن مہران۔ ابن عمرؓ

پہلی سند کے دو راوی قابلِ اعتراض ہیں، واقدی اور اسامۃ بن زید۔

واقدی: ان ذات شریف کا نام محمد بن عمر بن واقد الاسلمی المدنی ہے۔ اس کا دادا واقد عبداللہ بن بریدۃ بن الحصیب کا غلام تھا۔ یہ واقدی ۱۳۰ھ میں پیدا ہوا۔ ابن جریج، ابن عجلان، معمر اور ثور بن یزید وغیرہ سے روایات نقل کیں۔

ذہبی کا بیان ہے کہ ذی الحجہ ۲۰۷ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس وقت یہ قاضی تھا۔ لیکن امام بخاری نے سن وفات ۲۰۹ھ یا اس کے کچھ بعد بیان کیا ہے۔

ابن ماجہ نے اس کی روایت یہ کہہ کر نقل کی کہ ہم سے ابن ابی شیبہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ایک شخص نے بیان کیا۔ اس نامعلوم شخص سے مراد واقدی ہے۔ جو بغداد کا قاضی تھا۔ حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ابن ماجہ میں اتنی جرأت بھی پیدا نہ ہوسکی کہ وہ واقدی کا نام لیتے۔

(صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ابن ماجہ کے علاوہ کسی نے اس کی روایت نہیں لی اور ابن ماجہ نے بھی صرف ایک روایت لی اور وہ اس کا نام ظاہر کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکے۔ یعنی یہ حضرت اس کا پورا مصداق تھے کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔ یہ احادیث میں تبدیلیاں کرتا۔ زہری کے بھتیجے سے مروی روایات امام معمر کی جانب منسوب کرتا اور اسی قسم کی حرکات کرتا تھا۔

یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ یہ ثقہ نہیں اور ایک بار فرمایا کہ اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔ بخاری اور ابو حاتم کہتے ہیں متروک ہے۔ ابو حاتم اور نسائی یہاں تک کہتے ہیں کہ واقدی احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ دارقطنی کا بیان ہے کہ اس میں کمزوری پائی جاتی ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں اس کی روایات درست نہیں ہوتیں۔ اور تمام آفت اسی کی مچائی ہوئی ہے۔

ابن الجوزی وغیرہ کا بیان ہے کہ اس واقدی کو محمد بن ابی شملہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نام دھوکہ دینے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ تاکہ لوگوں میں اس فرضی نام سے اس کی داستانیں پھیلائی جائیں۔ لیکن امام بخاری نے واقدی کے بعد ابن ابی شملہ کا ذکر کیا ہے، جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابن ابی شملہ کو کوئی دوسرا فرد سمجھتے ہیں۔

ابو غالب ابن بنت معاویۃ بن عمرو کا بیان ہے کہ میں نے امام علی بن المدینی کو یہ کہتے سنا ہے کہ واقدی احادیث وضع کیا کرتا تھا۔

مجاہد بن موسیٰ کہتے ہیں میں نے جن لوگوں سے روایات لکھی ہیں ان میں واقدی سے زیادہ حافظہ کسی کا نہیں پایا۔

ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ بات سچ ہے اس لیے کہ تاریخی واقعات، سیرتیں، غزوات، حوادث زمانہ لوگوں پر گزرے ہوئے وقت اور فقہ ان سب چیزوں میں اسے انتہائی کمال حاصل تھا۔

سلیمان الشاذکوفی کا بیان ہے کہ واقدی یا تو سب سے زیادہ سچا ہے اور یا سب سے زیادہ جھوٹا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اس سے روایات لکھیں۔ جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو میں نے وہ لکھی ہوئی روایات لے کر اس کے پاس آیا اور ان روایات کے سلسلہ میں اس سے سوالات کرنے لگا۔ وہ انہیں بیان کرتا جاتا اور اس تحریر اور اس بیان میں ایک حرف کا بھی تغیّر پیدا نہیں ہوا۔ میں نے بلحاظ حافظہ ایسا کوئی دوسرا انسان نہیں دیکھا۔

ابوداؤد کہتے ہیں مجھ تک علی بن المدینی کا یہ قول پہنچا ہے کہ واقدی تیس ہزار غریب احادیث روایت کرتا ہے اور مغیرۃ بن محمد المہلبی نے ابن المدینی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ میرے نزدیک ہثیم بن عدی واقدی سے زیادہ بہتر ہے میں اس سے نہ تو حدیث میں خوش ہوں۔ نہ انساب میں اور نہ کسی اور شئے میں۔

اسحاق بن الطباع کا بیان ہے کہ میں نے مکّہ کے راستہ میں واقدی کو دیکھا۔ وہ تو نماز بھی اچھی طرح نہ پڑھتا تھا۔

بخاری کہتے ہیں اس سے محدثین نے سکوت اختیار کیا ہے۔ میرے پاس اس کی کوئی روایت نہیں۔
اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ واقدی میرے نزدیک احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ میزان الاعتدال ج ۳ صـ ۶۶۳۔

امام بخاری الضعفاء الصغیر میں لکھتے ہیں۔ محمد بن عمر الواقدی بغداد کا قاضی تھا۔ مالک اور معمر سے روایات نقل کرتا ہے۔ متروک الحدیث ہے ۲۰۹ھ یا اس کے کچھ بعد اس کا انتقال ہوا۔ الضعفاء الصغیر صـ ۱۰۴۔
امام نسائی لکھتے ہیں محمد بن عمر الواقدی متروک الحدیث ہے۔ کتاب الضعفاء والمتروکین للنسائی صـ ۶۳
حافظ ابن حجر نے بھی اسے متروک قرار دیا۔ تقریب صـ ۲۱۳۔
دارقطنی لکھتے ہیں۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے لیکن اس کی حدیث سے اس کا ضعف ظاہر ہے کتاب الضعفاء والمتروکین الدارقطنی صـ ۱۵۳۔

عبدالرحمان بن ابی حاتم رقمطراز ہیں۔
سنید بن ابی داؤد کا بیان ہے کہ ہم ہثیم کے پاس بیٹھے تھے کہ اتنے میں واقدی آگیا۔ اور سوال کیا اے ہثیم فلاں مسئلہ میں آپ کے پاس کتنی حدیثیں ہیں۔ ہثیم نے پانچ یا چھ حدیثیں بیان کیں اور پھر واقدی سے

دریافت کیا تمہارے پاس کتنی حدیثیں ہیں۔ اس نے احادیث، اقوال صحابہ تیس کی تعداد میں بیان کیے اور پھر کہنے لگا۔ میں نے اس سلسلہ میں مالک سے سوال کیا۔ میں نے ابن ابی ذئب سے سوال کیا۔ میں نے فلاں سے دریافت کیا اور فلاں سے دریافت کیا۔ سعید کا بیان ہے کہ میں نے ہشیم کے چہرے کو دیکھا تو ان کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا یہ دیکھ کر واقدی اٹھ کر چلا گیا۔ ہشیم نے کہا اے سعید اگر یہ شخص سچا ہے تو دنیا میں اس کی مثال نہیں اور اگر جھوٹا ہے تب بھی اس کی کوئی مثال نہیں۔

یونس بن عبد الاعلی کا بیان ہے کہ مجھ سے شافعی نے فرمایا کہ واقدی کی تمام کتابیں خالص جھوٹ ہیں۔

یحییٰ بن معین کہتے ہیں ہم نے واقدی کی احادیث پر غور کیا تو وہ اہل مدینہ کی جتنی روایات نقل کرتا ہے وہ سب مجہول راویوں سے ہوتی ہیں اور سب منکر ہوتی ہیں (جیسا کہ واقعہ حرہ اور مدینہ کو حلال کرنا اور ایک ہزار عورتوں کا حاملہ ہونا تو ہمیں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو سکتا ہے یہ سب منکرات اسی کی وضع کردہ ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ روایات ان مجہول راویوں نے گھڑی ہوں اور یہ صرف ناقل ہو۔ لیکن جب ہم نے ان روایات پر غور کیا جو اس نے ابن ابی ذئب اور معمر جیسے لوگوں سے نقل کی ہیں۔ حالانکہ وہ ان کی احادیث یاد رکھنے میں مشہور تھا۔ تو اس نے ان سے بھی منکر روایات نقل کی تھیں۔ جس سے ہمیں یہ یقین ہو گیا کہ یہ سب اسی کی کارستانی ہے۔

ابوزرعہ کا قول ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ (الجرح والتعدیل ج ۸ ص ۲۰)۔

بلکہ سمعانی وغیرہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ واقدی کی جانب جتنی کتابیں منسوب ہیں یہ اس کی کتابیں نہیں بلکہ ابراہیم بن محمد المدنی رافضی کی تصانیف ہیں اور چونکہ وہ بہت بدنام ہو چکا تھا اس لیے واقدی نے اس کی کتابوں کو اپنے نام سے پھیلایا۔ یہی بات نواب مہدی علی خان نے اپنی آیات بینات میں تحریر کی ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ واقدی بہت بڑا تقیہ باز شخص تھا۔ اور تشیع کو پھیلانے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

اس واقدی نے یہ کہانی اسامۃ بن زید المدنی سے نقل کی ہے۔ اب مختصر سا خاکہ اس اسامہ کا ملاحظہ فرمائیں۔

یہ حضرت اسامۃ بن زید صحابی نہیں بلکہ یہ حضرت عمرؓ کے غلام

اسامۃ بن زید اللیثی المدنی : زید بن اسلم کے صاحبزادے ہیں۔ صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ابن ماجہ کے علاوہ کسی نے اس سے روایت نہیں لی۔ آدمی تو بیچارہ نیک تھا لیکن امام احمد کہتے ہیں اس کا حافظہ خراب تھا۔ اس لیے اس کی کوئی بات قابلِ قبول نہیں۔ نسائی وغیرہ کہتے ہیں قوی نہیں۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں ضعیف ہے۔ میزان ج ۱ صـ۱۷۴۔

امام بخاری کا قول ہے کہ یہ قوی نہیں۔ الضعفاء الصغیر صـ۲۰۔

نسائی لکھتے ہیں، اسامۃ بن زید بن اسلم قوی نہیں۔ کتاب الضعفاء والمتروکین صـ۲۰۔

عبدالرحمان بن ابی حاتم رقمطراز ہیں۔

مجھ سے صالح نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے والد امام احمد بن حنبل کا یہ قول مجھ سے بیان کیا کہ اسامۃ بن زید بن اسلم منکر الحدیث اور ضعیف ہے اور عباس الدوری نے مجھ سے یحییٰ بن معین کا یہ قول بیان کیا ہے کہ اس کی حدیث کچھ نہیں اور قطلانی جن لوگوں سے روایت نقل کرتا ہے، یہ ان میں سب سے زیادہ ضعیف ہے۔

ابوزرعہ سے دریافت کیا کہ زید بن اسلم کے دونوں بیٹوں یعنی اسامہ اور عبداللہ میں کون زیادہ بہتر ہے۔ انہوں نے فرمایا اسامہ (اس لیے کہ عبداللہ تو اس سے بھی بدتر ہے) الجرح والتعدیل ج ۲ صـ۲۸۵۔

یہ ہے اس کہانی کی پہلی سند کا حال کہ اگر کچھ دیر کے لیے اسامہ سے چشم پوشی بھی اختیار کر لی جائے تو اس سے نقل کرنے والا واقدی ہے اور غالباً یہ کہانی اسی نے وضع کی ہے۔

جہاں تک ابن مردویہ کی روایت کا تعلق ہے یعنی میمون بن مہران والی روایت تو ابن مردویہ کی کتاب آج دنیا میں دستیاب نہیں اور ابن مردویہ اور حضرت ابن عمرؓ کے درمیان کم از کم سات آٹھ راوی درکار ہیں صرف ایک راوی کا نام ظاہر کرنے سے کوئی کام نہیں چلتا۔ اس طرح اس روایت کی پوری سند مجہول ہے۔ اور اس کا عدم وجود مساوی ہے۔

اب صرف ایک سند باقی رہتی ہے یعنی یحییٰ بن ایوب، ابن وہب، ابن عجلان۔ نافع اور ابن عمرؓ۔
یہی وہ سند ہے جس کے باعث حافظ ابن حجر اور سخاوی نے اسے حسن اور امام ابن تیمیہ نے اسے صحیح
قرار دے کر اسے کسی جن کا کرشمہ قرار دیا۔ غالباً ان حضرات کے پیش نظر یہ تخیل کارفرما ہوگا جو ہمیشہ متاخرین کی راہ
میں حائل ہوتا رہا ہے کہ ابن وہب، یحییٰ بن ایوب اور نافع تمام صحاح ستہ کے راوی ہیں اور ابن عجلان بخاری
کے علاوہ بقیہ تمام کتابوں کے راوی ہیں۔
غالباً یہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر راوی ثقہ ہوں تب بھی روایت ناقابل قبول ہو سکتی ہے کیونکہ ثقہ
ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خطا اور بھول سے معصوم ہو۔
اور ایک یہ بھی اصول ہے کہ واقعہ ایسا ہے کہ اگر وہ پیش آتا تو سینکڑوں اور ہزارہا افراد اسے نقل کرتے
لیکن صرف ایک یا دو افراد اسے نقل کر رہے ہوں تو یہ صورتِ حال خود اس روایت کے جھوٹے ہونے کی دلیل
ہوتی ہے۔ اور امام ابن القیم نے اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے حدیث قلتین جو انتہائی صحت سند کے ساتھ
مروی تھی اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔
غور کیجئے کہ دوران خطبہ جمعہ بلند آواز سے یہ الفاظ دہرائے جا رہے ہیں۔ واقعہ مسجد نبوی کا ہے
ہزارہا افراد موجود ہیں لیکن بجز ایک ابن عمرؓ کے اسے کوئی بیان نہیں کرتا۔ ابن عمرؓ سے نافع کے علاوہ کوئی
نقل نہیں کرتا۔ نافع سے ابن عجلان کے علاوہ کوئی ناقل نہیں۔ ابن عجلان سے یحییٰ بن ایوب کے علاوہ کوئی
روایت نہیں کرتا اور پھر یحییٰ سے ابن وہب کے علاوہ کوئی ناقل نہیں اور پھر کسی مشہور محدث نے اسے اپنی
کتاب میں نقل کرنا پسند نہیں کیا، حتیٰ کہ صرف ایک حرملہ نے اپنی جمع میں اسے نقل کیا ہے اور وہاں سے
بعد کے حضرات نے۔ حالانکہ حرملہ کی کتاب سے آج روئے زمین پر کوئی واقف کار موجود نہیں بلکہ مشہور محدثین
کی صف میں حرملہ کا شمار تک نہیں ہوتا۔ آخر یہ تمام حضرات محدثین اتنی صحیح روایت سے کیسے غافل رہے
یہ دو حال سے خالی نہیں یا تو متقدمین کے دور میں اس روایت کا کوئی وجود نہ تھا اور اگر اس کا وجود
تھا تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ان سب حضرات محدثین نے اسے ناقابلِ قبول تصور کیا۔
نیز اس پر بھی غور کیجئے کہ سرزمین فارس میں اس آواز کو بقول راوی پورے لشکر نے سنا جو ظاہر

ہے کہ ہزارہا افراد پر مشتمل ہوگا۔ لیکن ان میں سے بھی کوئی فرد اسے نقل نہیں کرتا۔

سندی لحاظ سے اگرچہ حرملہ نے ایسے راویوں سے نقل کیا جو بخاری و مسلم کے روات ہیں لیکن جب کتب رجال کے ذریعہ ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو ان میں سے بعض روات پر اعتراضات ہیں اس سلسلہ میں سب سے اوّل یحیٰی بن ایوب کا حال ملاحظہ فرمائیں۔

یحیٰی بن ایوب الغافقی المصری : ان کی کنیت ابوالعباس ہے۔ اہل مصر کے عالم اور ان کے مفتی ہیں، تمام صحاح ستہ کے مصنفین نے ان سے روایات نقل کی ہیں۔

یحیٰی بن معین کہتے ہیں اس کی حدیث اچھی ہوتی ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں یہ میرے نزدیک سچا ہے امام احمد فرماتے ہیں اس کا حافظہ بہت خراب تھا۔ ابن القطان الفاسی کا قول ہے کہ میں اس کا حال اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کی حدیث حجت نہیں۔ دارقطنی کا بیان ہے کہ اس کی بعض روایات مضطرب ہوتی ہیں۔ ابن عدی اور ذہبی نے اس کی دس روایات کو منکر قرار دیا۔ ۱۶۸ھ میں ان کا انتقال ہوا میزان ج ۴ ص ۳۶۲۔

نسائی لکھتے ہیں کہ یحیٰی بن ایوب قوی نہیں۔ کتاب الضعفاء والمتروکین ص ۱۱۸۔

عبدالرحمان بن ابی حاتم رقمطراز ہیں کہ عبداللہ بن احمد نے مجھے لکھ کر بھیجا ہے کہ ان کے والد امام احمد فرمایا کرتے تھے۔ یحیٰی بن ایوب کا حافظہ بہت تھا۔ یہ حدیث میں حیوہ اور سعید بن ابی ایوب سے کمتر سمجھا جاتا ہے۔

عبدالرحمان کا بیان ہے کہ میرے دادا ابوحاتم رازی سے سوال کیا گیا کہ آپ یحیٰی بن ایوب کو زیادہ پسند کرتے ہیں یا ابن ابی موالی کو۔ انہوں نے فرمایا ابن ابی الموالی کے مقابلہ میں مجھے یحیٰی زیادہ پسند ہے اور یحیٰی اگرچہ سچا آدمی ہے۔ اس کی حدیث لکھ لی جائے۔ لیکن اس کی حدیث کو حجت نہ سمجھا جائے۔ الجرح والتعدیل ج ۹ ص ۱۲۸۔

یعنی اکثر آئمہ محدثین کے نزدیک اس کی روایت حجت نہیں ہوسکتی۔ اور نہ اس کی روایت کو دلیل بنایا جاسکتا ہے۔

جب اس روایت کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا اور یحیی بن ایوب کا حافظہ خراب تھا۔ تو یہ روایت کراموں کے سلسلہ میں دلیل کیسے بن سکتی ہے۔ اب آیئے ایک اور راوی محمد بن عجلان کا حال ملاحظہ فرمائیں۔

اس سے بخاری کے علاوہ تمام محدثین نے روایت نقل کی ہے حدیث میں مشہور

محمد بن عجلان: امام ہے سچا ہے۔ امام احمد یحیی بن معین ابن عیینہ اور ابو حاتم کے نزدیک ثقہ ہے۔ حاکم کا بیان ہے کہ مسلم نے اس سے تیرہ روایات لی ہیں اور سب بطور شواہد لی ہیں۔ لیکن ہمارے ائمہ میں سے متاخرین نے اس پر کلام کیا ہے کہ اس کا حافظہ خراب تھا۔ یحیی بن سعید القطان کہتے ہیں کہ اسے نافع کی حدیث میں اضطراب ہوتا ہے۔

عبدالرحمان بن القاسم کہتے ہیں کہ امام مالک سے سوال کیا گیا کچھ اہل علم حدیث بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا وہ کون لوگ ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ابن عجلان۔ انھوں نے فرمایا۔ ابن عجلان تو احادیث کو پہچانتا بھی نہیں۔ اور وہ عالم شخص نہیں ہے۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۶۴۴

اگرچہ اکثر محدثین نے محمد بن عجلان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ لیکن یحیی بن سعید القطان کے بقول نافع کی روایت میں اسے اضطراب ہوتا ہے۔ گویا ابن عجلان کی وہ روایت قابل قبول نہیں جو وہ نافع سے نقل کرے۔ اور یہ روایت بھی نافع سے نقل کی جارہی ہے۔

گویا اس روایت میں اولین نقص تو یہ ہے کہ محمد بن عجلان کی نافع والی روایت قابل قبول نہیں۔

ثانیاً یحیی بن ایوب کا حافظہ خراب تھا۔ اس کی حدیث قطعاً حجت نہیں۔

ہمیں حیرت تو اس پر ہے کہ امام ابن تیمیہ نے اسے صحیح قرار دے کر اور پھر ذہنی طور پر جنات کو وسیلہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ دونوں ہی امور غلط ہیں۔ کیونکہ اول تو روایت ہی درست نہیں اور جنات کا وسیلہ یہ صرف امام ابن تیمیہ کی ذہنی پرواز ہے جو خود دلیل کی محتاج ہے۔ اور انھوں نے غالباً یہ سوچ کر ایسا کہا ہوگا کہ کسی انسان کی آواز مدینہ سے فارس تک پہنچنا اور پھر وہاں آواز سنی جانا ایک امر محال ہے۔ اور کراموں کے ذریعہ وہ امور ہرگز تبدیل نہیں ہوتے جو محال ہوں۔ لہذا یہ داستان بلحاظ روایت اور بلحاظ درایت ہر طرح سے غلط ہے۔

تمت

گذارش: ماخذ علمی کے لئے دیکھئے "مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت" حصہ چہارم